
ماہنامہ
شعاع
دسمبر 2017
DECEMBER 2017

نہایت اہم التماس

قارئین انتظار کے لیے معذرت خواہ ہیں لیکن آپ بخوبی واقف ہیں کے دُنیا میں ہر کوئی اپنے کاروبار کے لیے محنت کرتا ہے تاکہ منافع حاصل کر سکے لیکن اگر ہماری وجہ سے کسی کے کاروبار کو نقصان کا اندیشہ ہو تو ہمیں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ دیکھیں ہر ڈائجسٹ کے پبلشر بہت محنت کے ساتھ ہر مہینے ڈائجسٹ شائع کرتے ہیں تاکہ وہ مارکیٹ میں فروخت ہو سکے اور اُن کو منافع حاصل ہو سکے لیکن آج کے اس انٹرنیٹ دور میں جب وہی ڈائجسٹ یا رسالہ مارکیٹ میں پوری طرح آنے سے قبل ہی آن لائن پی ڈی ایف میں مل جائے تو مارکیٹ سے خریداری بہت کم رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے پبلشر کا بہت نقصان ہوتا۔ لہذا اس سارے معاملے کو خاطر میں رکھتے ہوئے urdusoftbooks.com کی انتظامیہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کے آئندہ ماہ سے کوئی بھی ڈائجسٹ رواں مہینہ کی 30 تاریخ سے پہلے Upload نہیں کیا جائے گا تاکہ پبلشرز کا نقصان نہ ہو۔

خوشخبری

انشااللہ آئندہ urdusoftbooks.com پر تمام ڈائجسٹ بغیر واٹر مارک کے Upload ہوا کریں گے تاکہ قارعین کو پڑھنے میں دکت کا سامنا نہ کرنا پڑے

قارئین سے مزید درخواست ہے کہ urdusoftbooks.com کے لیے اپنے ویب براوٗزر سے Adblocker ڈس ایبل کر دیں تاکہ ویب سائٹ پر سپانسر اشتہارات نظر آسکیں اور ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن ہو سکے انہی سپانسر اشتہارات کی آمدن سے ویب سائٹ کے ماہانہ اخراجات پورے کیے جاتے ہیں لہذا آپ کا تھوڑا سا تعاون urdusoftbooks.com کو مستقل آن لائن رکھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگا۔ شُکریہ

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37-اردو بازار کراچی

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER
APNS
CPNE



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)------700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ----6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا---7000 روپے



مستقل سلسلے

دسمبر 2017
جلد 32 شمارہ 4
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ [illegible]

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسیہ جمیل

پہلی شعاع

دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

کائنات کی سب سے افضل ہستی جن کے ذکر کو خالق ارض و سما نے خود آسمانوں پر رفعت بخشی۔ وہ اسم مبارک جو چودہ سو سال سے دہر میں اجالا کر رہا ہے۔ جن کی تعلیمات اور انقلاب آفریں پیغام روز آخر تک کائنات کو منور کرتا رہے گا۔ وہ عظیم ہستی جنہیں انبیاء علیہ السلام میں بھی سب سے افضل مقام حاصل ہے۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی، کوئی پیغمبر، کوئی رسول نہیں آئے گا۔

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جب کائنات کی کامل ترین ہستی کا ظہور ہوا۔ احمد مجتبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور قدسی کائنات پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی خوشی میں جشن منائے جاتے ہیں، سڑکوں، گلیوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ جلسے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ گھر گھر میلاد کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ لیکن کیا ہم ایک لمحے کے لیے بھی سوچتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کیا تھیں؟ آپ کیا پیغام لے کر دنیا میں آئے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ جو ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔ ہم اس کی کتنی پیروی کرتے ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا ایک حسین پہلو اخلاق تھا جس کے دشمن بھی معترف تھے۔ آپ اخلاق کے بلند ترین درجے پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آپ کے اخلاق کی تعریف فرمائی۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی دشمن کے لیے بھی برا کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ گالی تو کجا کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی نازیبا کلمہ بھی ادا نہیں ہوا، جھوٹ، بدگوئی، بدگمانی، تہمت، بہتان تراشی کی سختی سے ممانعت فرمائی اور ہم جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔ آپ کی محبت کے دعوے دار ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارا میڈیا، دانش ور، مصنفین، علما جو زبان استعمال کر رہے ہیں، وہ اخلاق کے کسی معیار پر پورا نہیں اترتی۔ انہیں بدگوئی اور بدزبانی سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ بہت سارے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

سانحہ ارتحال،

ماہ و سال کے سفر میں زندگی کے مختلف مرحلوں میں ہمارے ساتھی، ہمارے رفیق، ہمارے رشتہ دار ہم سے بچھڑتے جاتے ہیں۔ ان کی جدائی کا غم ایک کسک بن کر ساتھ رہتا ہے۔ ان کی یادیں زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ میری بڑی بہن قریشہ آپا کے شریک حیات فاروق عزیز آفندی اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ؕ

ایک طویل رفاقت کے بعد ان کی جدائی قریشہ آپا اور ہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت اور دائمی سکون کے لیے دعا گو ہیں۔

قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ تبدیلی آگئی ہے،
- سدرہ حیات کا ناول۔ کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں،
- ثمرہ بخاری کا ناولٹ۔ بندلیوں کی بات،
- عائشہ اکرم چودھری اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- ایمل رضا، رضیہ مہدی، قرۃ العین خرم ہاشمی، میمونہ صدف، ماجرہ ریحان اور قرۃ العین سکندر کے افسانے،
- صبیح ثانی اور شبنم ثانی کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

رفعتیں تیرے لیے، سب عظمتیں تیرے لیے
خالقِ حرف و بیاں سب مدحتیں تیرے لیے

زندگی تیرے لیے اور بندگی تیرے لیے
اُلفتیں تیرے لیے، سب چاہتیں تیرے لیے

تُو کہ لامحدود ہے، حدِ مکاں بھی تجھ سے ہے
سرحدِ امکاں تلک سب رفعتیں تیرے لیے

عقل حیراں ہے کہ کیسا ہے نظامِ کائنات
اے حکیمِ بے بدل! سب حکمتیں تیرے لیے

میں کہ بندہ ہوں تو پھر بندے کا کیا اختیار
قادرِ مطلق ہے تُو، سب قدرتیں تیرے لیے

حرف سب تیرے لیے ہیں، لفظ سب تیرے لیے
صورتِ اظہار کی سب صورتیں تیرے لیے

ڈاکٹر محمد امین

نعت رسولِ مقبول ﷺ

تُو حبیبِ ربِ جلیل ہے تری عظمتوں کا جواب کیا
تُو مقامِ فخرِ خلیل ہے تری حُرمتوں کا حساب کیا

تری اک نگاہ پڑی جہاں وہاں ظلمتوں کا گزر کہاں
ترے ایک جلوہ کے سامنے مہ و مہر کی تب و تاب کیا

تری عظمتوں کے نشاں کبھی نہ مٹیں گے شورشِ کفر سے
یمِ بے کراں سے اُلجھ سکے گی حقیر جوئے کم آب کیا

جو ترے جمال میں کھو گیا ہوا بے نیازِ غمِ جہاں
وہ رہینِ سُود و زیاں ہو کیوں کہ عذاب کیا ہے ثواب کیا

ترے میکدے سے جو پی گیا، ترا کیف جس نے سمو لیا
اسے فکرِ عرصۂ دہر کیوں، اسے خوفِ روزِ حساب کیا

کہاں تُو کہ باعثِ کُن فکاں، کہاں فکرِ ثاقبِ خستہ جاں
بھلا مدحتِ شہِ انس و جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

ثاقب زیروی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

بدلہ لینا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی چیز کو عورت کو نہ خادم کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ ہاں مگر آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے (جس میں آپ یقیناً دشمن کو مارتے) اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو کسی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی اور آپ نے تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ لیا ہو۔ ہاں، اگر اللہ کے محارم میں سے کسی چیز کی ہتک کی جاتی تو آپ یقیناً اللہ کے لیے انتقام لیتے (یعنی مرتکب حرام کو سزا دیتے۔ (مسلم۔)

حسن اخلاق

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

''میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور آپ کے اوپر ایک موٹے کنارے والی نجرانی چادر تھی۔ (راستے میں) ایک دیہاتی آپ کو ملا اور آپ کی چادر کو سختی کے ساتھ پکڑ کر کھینچا۔ چنانچہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کی جانب دیکھا تو چادر کے کنارے سختی کے ساتھ کھینچنے کی وجہ سے اس پر نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس دیہاتی نے کہا۔

''اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس جو اللہ کا مال ہے، اس میں سے میرے لیے بھی حکم دو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مسکرائے، پھر آپ نے اسے دینے کا حکم فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن، خلق اور صبر وضبط کا بیان ہے۔ آپ نے اس دیہاتی کی نازیبا حرکت کو ایک مسکراہٹ کے ساتھ نظرانداز فرما دیا اور اسے عطیہ دینے کا حکم فرمایا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔

''میں (اب بھی) گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

''اس نبی کو اس کی قوم نے مار مار کر لہولہان کر دیا تھا، وہ اپنے چہرے سے خون صاف کرتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔ ''اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے کیونکہ وہ بے علم ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ: علما نے لکھا ہے کہ اس سے مراد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ہے اور یہ بھی آپ کا کمال اخلاق ہے کہ اپنے آپ پر بیتی ہوئی بپتا کو مبہم انداز میں بیان فرمایا اور اپنی قوم کی صراحت نہیں فرمائی۔

طاقت ور

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''طاقتور وہ نہیں ہے جو پچھاڑ دے۔ اصل طاقتور (پہلوان) تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ: لوگ جسمانی لحاظ سے تنومند اور طاقتور شخص کو پہلوان سمجھتے ہیں لیکن اصل پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس پر اسے بعد میں پشیمانی ہو، جیسے

عام لوگ غصے میں بہت سے ایسے کام کر لیتے ہیں اور بعد میں پھر ندامت کے آنسو بہاتے یا اس سے ہونے والی تباہی پر خون کے آنسو روتے ہیں۔

تکلیفیں برداشت کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور غصے کے پینے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند فرماتا ہے۔" (آل عمران۔13)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور وہ شخص جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا، بے شک یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔" (الشوریٰ۔43)

تعلق جوڑنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا۔

"یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں، وہ مجھ سے تعلق توڑتے ہیں۔ میں ان سے حسن سلوک کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے بردباری سے پیش آتا ہوں، وہ مجھ سے نادانی سے پیش آتے ہیں۔"

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے بیان کیا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے اور جب تک تو ایسا کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک مددگار رہے گا۔" (مسلم)

فائدہ: حدیث میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کیا جائے اور درگزر سے کام لیا جائے کیونکہ حسن اخلاق اور اسوہ حسنہ کی پیروی کا تقاضا یہی ہے۔

احکام شرعیہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور جو اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی تعظیم کرے گا تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔" (حرمات اللہ سے مراد دین کے احکام و شرائع ہیں جن کی تعظیم ضروری ہے۔) (الحج۔30) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو مضبوط کر دے گا۔" (محمد۔7)

فائدہ آیات: اللہ کی مدد کا مطلب ہے اس کے دین پر عمل کرنا اور کافروں سے اس کا دفاع کرنا۔ قدموں کو مضبوط کرنے سے مراد ہے۔ جہاد میں تمہیں ہمت و ثابت قدمی عطا کرے گا۔

لوگوں کا خیال رکھنا

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔

فلاں آدمی کے ہمیں لمبی نماز پڑھانے کی وجہ سے میں صبح کی نماز میں پیچھے رہ جاتا ہوں۔"

پس میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی وعظ میں اتنا غضب ناک نہیں دیکھا جتنا اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کا اظہار فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"لوگو! تم میں سے بعض لوگ نفرت دلانے والے ہیں، پس تم میں سے جو شخص لوگوں کی امامت کرائے اسے چاہیے کہ اختصار سے کام لے، اس لیے کہ اس کے پیچھے بوڑھے، بچے اور ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں ایک تو ایسی بات کی شکایت کرنے کا جواز ہے جس سے لوگ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ دوسرے، دین کے معاملے میں غضب ناک ہونے کا جواز ہے۔ تیسرے، امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدیوں کا خیال رکھے اور زیادہ لمبی نماز نہ پڑھائے۔

2- مختصر قرات یا نماز کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ طریقۂ نبوی اور تعدیل ارکان ہی کا خیال نہ

رکھے اور کوے کی ٹھونگیں مارنے کی طرح نماز پڑھا دے جیسا کہ بدقسمتی سے عام مسجدوں کے اماموں کا حال ہے کہ ان میں نماز کا کوئی رکن بھی سنت نبوی کے مطابق ادا نہیں کیا جاتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

3- عذر شرعی کی بناء پر جماعت سے پیچھے رہنا جائز ہے۔

4- امام کو ایسا وتیرہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے لوگ عبادت کی ادائیگی ہی سے متنفر ہو جائیں۔

انصاف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

''قریش کو اس مخزومی عورت کے معاملے نے' جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے (آپس میں) کہا: اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کون بات کرے گا؟ انہوں نے کہا۔

یہ جرات تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت اسامہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد پر سفارش کرنے لگا ہے؟''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطاب فرمایا۔

''تم سے پہلے لوگوں کو بھی صرف اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں سے کوئی ضعیف آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ (یاد رکھو!) اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو یقیناً میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ اللہ کی حد میں کسی کے لیے سفارش کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی یہ جسارت کرے تو حاکم مجاز کے لیے اس کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔

2- مجرم کا تعلق اگر کسی اونچے خاندان سے ہو تو یہ خاندانی شرف و عزت اس کی سزا میں رکاوٹ نہیں بننی چاہیے۔ ہر بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب دونوں کے لیے قانون اور سزا یکساں ہے۔ سزا اور قانون میں ان کے درمیان محض امارت و غربت کی وجہ سے فرق و تمیز کرنا بڑا جرم ہے۔ ایسا کرنا بلاشبہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

قبلہ کا احترام

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلے (کی جانب دیوار) میں تھوک (لگا ہوا) دیکھا، آپ کو یہ بات بہت گراں گزری، حتی کہ اس کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر دیکھے گئے۔ آپ کھڑے ہوئے اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھرچ دیا اور فرمایا۔

''جب تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اور اس کا رب اس کے اور اس کے قبلے کے درمیان ہے۔ چنانچہ تم میں سے کسی شخص کو قبلے کی طرف نہیں تھوکنا چاہیے بلکہ (اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو) اپنے بائیں جانب یا اپنے پیر کے نیچے (تھوک لے)۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر کا ایک کنارہ پکڑا اور اس میں تھوکا، پھر اس کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے مسل دیا، پھر آپ نے فرمایا: ''یا وہ اس طرح کر لے۔'' (بخاری و مسلم)

امام نووی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں: اپنے بائیں جانب یا پیروں کے نیچے تھوکنے کا حکم اس صورت میں ہے جب وہ مسجد سے باہر ہو لیکن مسجد میں اپنے کپڑے میں تھوکنے کے علاوہ کہیں نہ تھوکے۔

فوائد و مسائل:

1- اس میں مسجد کا ایک نہایت اہم ادب بیان

کیا گیا ہے کہ مسجد کے اندر قبلہ رخ نہ تھوکا جائے۔ حدیث میں اس کے لیے جو طریقہ بتلایا گیا ہے عین نماز کے دوران اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر انسان نماز میں نہ ہو تو اب وضوخانوں میں وافر پانی کا اہتمام ہر مسجد میں ہوتا ہے، رومال یا چادر کا کونہ استعمال کرنے کے بجائے صفائی کے لیے یہ وضو خانہ ہی سب سے بہتر جگہ ہے۔

2- مسجد میں گندگی نظر آئے تو اسے فوری طور پر صاف کردیا جائے اور مسجد کو گندگی سے ملوث کرنے سے مکمل گریز کیا جائے۔

نرمی اور شفقت کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''اپنے پیروکار مومنوں کے لیے اپنے بازو پست رکھ۔'' (یعنی ان سے تواضع سے پیش آ۔) (الشعراء -215)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے، احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی، منکرات اور ظلم و زیادتی کرنے سے منع فرماتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔'' (النحل-90)

ذمہ داری

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

''تم سب ذمہ دار ہو اور تم سب سے اپنی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں پوچھا جائے گا: امام ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت (اہل خانہ) کی بابت سوال ہوگا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ تم میں سے ہر ایک (اپنے اپنے معاملات کا) ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت (معاملے) کے بارے میں پوچھا جائے گا۔'' (بخاری و مسلم)

فائدہ: ارباب اختیار کی جو ذمہ داری ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو عنداللہ مجرم ہوں گے جس کی باز پرس روز قیامت ان سے ہوگی۔

دھوکا دینا

حضرت ابویعلی معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

''اللہ تعالیٰ کسی رعیت کی رکھوالی جس آدمی کے سپرد کردے اور وہ انہیں دھوکا دیتے ہوئے مرجائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی۔'' (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ۔

''اس نے خیر خواہی کے ساتھ ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کی وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔''

مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ''جو حاکم بھی مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنے، پھر وہ ان کے مسائل کے حل کے لیے بھرپور کوشش اور ان کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔''

فائدہ:

1- اس میں حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ بہت ہی اہم منصب ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مسائل و معاملات کے وہ ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ پوری توجہ، ہمت اور خیر خواہی سے ان کے مسائل حل نہیں کریں گے تو اللہ کے ہاں وہ مجرم ہوں گے۔ ان کی رعایا تو اپنے ایمان و عمل کی بدولت جنت میں چلی جائے گی لیکن یہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔

اس لیے حکمران اقتدار کے نشے میں بدمست اور عوام کے معاملات سے غافل نہ ہوں بلکہ عنداللہ جواب دہی کے احساس سے سرشار ہوکر انہیں عدل و انصاف اور امن و سکون مہیا کرنے کی بھرپور کوشش

کریں۔

نرمی کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس گھر میں فرماتے ہوئے سنا۔

''اے اللہ! جو شخص بھی میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے، پھر وہ انہیں مشقت میں ڈالے تو تو بھی اس پر سختی فرما۔ اور جو شخص میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے، پھر وہ ان کے ساتھ نرمی کرے تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی فرما۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1- کتنا خوش نصیب ہے وہ حکمران جو عوام کو عدل و انصاف مہیا کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے خاص کا مستحق بن جائے اور اسی حساب سے کتنا بدنصیب ہے وہ حکمران جو عوام کے ساتھ ناانصافی کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعاؤں کا مستحق بنالے۔

2- اس میں عدل و انصاف سے حکمرانی کرنے کی ترغیب اور عوام پر ظلم و زیادتی سے اجتناب کرنے کی تاکید ہے۔

3- اس میں حکمرانوں کے ماتحت افسر بھی آ جاتے ہیں کہ ان سے بھی اس کی باز پرس ہوگی، نیز ہر ذمہ دار جس کے ماتحت افراد ہوں اسے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بنی اسرائیل کی سیاست ان کے پیغمبر کرتے تھے۔ جب ایک پیغمبر فوت ہو جاتا تو اس کا جانشین دوسرا پیغمبر بن جاتا۔ اور (یاد رکھو!) میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں، میرے بعد خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

''یارسول اللہ! پس آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟

آپ نے فرمایا: ''جس سے پہلے بیعت کرو، اسے پورا کرو، پھر اس کے بعد والے سے بیعت کرو، پھر انہیں ان کا حق دو اور تمہارے اپنے جو حقوق ہیں، ان کا سوال اللہ سے کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بابت، جن کا انہیں والی بنائے گا، خود ہی ان سے پوچھ لے گا۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- سیاست بری چیز نہیں۔ اگر بری ہوتی تو انبیاء سیاست نہ کرتے۔ انبیاء کے سیاست کرنے کا مطلب ہے: جہاں بانی اور حکومتی معاملات بھی ان ہی کے سپرد ہوتے تھے۔ یعنی دین اور دنیا، دونوں امور کے ذمہ دار انبیاء علیہ السلام ہوتے تھے۔ دین اور دنیا کے درمیان تفریق نہیں، یکجائی تھی، جیسے خلافت راشدہ اور اس کے کچھ عرصے بعد تک اسلام میں بھی یہ صورت رہی۔ اس لیے ایک نبی کی وفات کے بعد دوسرا نبی آ جاتا اور اس کا جانشین بن جاتا، جیسے حکمرانی کے منصب میں ہوتا ہے۔ ایک کے بعد کوئی دوسرا حکمران بن جاتا ہے۔

2- اس میں ختم نبوت کا مسئلہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے اور دعویداران خلافت زیادہ ہوں تو اس کا حل بھی بیان فرما دیا کہ پہلے خلیفہ کی بیعت پوری کرو۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے مدعی خلافت کی طرف توجہ مت دو۔

3- حکمرانوں کی کوتاہیوں کا حل بھی تجویز فرما دیا اور وہ ان کے خلاف بغاوت اور احتجاجی مظاہرے نہیں بلکہ انتظامی معاملات میں ان کی اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کی بارگاہ میں دعا کرنا ہے۔

کتاب کہانی

سمیرا حمید

فرینک زپا کا کہنا ہے کہ
''دماغ ایک پیراشوٹ کی طرح ہے، جب تک کھلے گا نہیں، کام نہیں کرے گا۔''

زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، کام کرنے کے لیے دماغ کے پیراشوٹ کو کھولنا پڑتا ہے۔ کائنات میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے جو رکی ہوئی ہو اور حرکت میں نہ ہو۔ اس لیے کوئی جذبہ ہو، قوت، یا فن، اسے بھی ہمیشہ حرکت میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیق کار کو ہر روز، ہر پل نئی سے نئی چیزیں سیکھنی ہوتی ہیں تاکہ وہ اپنے فن کو ہر قدم پر دو قدم آگے لے کر جا سکے۔

پچھلے کچھ عرصے سے ایک لفظ ''خداداد صلاحیت'' بار بار سننے میں آ رہا ہے۔ میں خداداد صلاحیت کے ہونے پر یقین رکھتی ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں اسے ہی کل سمجھتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو دیکھ کر اپنے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کچھ کرنا چاہیں، کچھ سیکھنا اور پانا چاہیں اور ہم پر خداداد صلاحیت کے نہ ہونے کا ٹھپہ لگا ہمیں رد کر دیا جائے۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں، ہمارا رجحان ہماری منزل طے کرتا ہے لیکن ہمارا جنون، ہمیں منزل عطا کرتا ہے۔ جو ہم واقعی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ پا ہی لیتے ہیں۔

نیوٹن کا باپ سائنس دان نہیں تھا، پھر بھی وہ سائنس دان تھا۔ ہٹلر آرٹسٹ تھا، گانے بھی گاتا تھا۔ لیکن وہ ایک لیڈر بنا کیونکہ وہ لیڈر بننا چاہتا تھا۔ (ظالم ہی سہی) تو وارثت، جینز، اور خداداد صلاحیت انسان کے ارادوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ (یہ ایک لمبا موضوع ہے جس پر میں جلد ہی لکھوں گی۔)

اسی طرح اگر آپ رائٹر بننا چاہتے ہیں تو ایک چیز ''خداداد صلاحیت''، آپ میں ہے یا نہیں اور آپ اس سے لاعلم ہیں تو آپ دوسری چیز کے بارے میں معلوم کریں۔ ''آپ میں جنون ہے؟''، شوق ہے؟

اگر ہاں تو آپ خود سے یہ سوال بھی ضرور پوچھیں کہ ''کیا واقعی میں آپ رائٹر بننا چاہتے ہیں۔''، اگر ہاں تو کس لیے؟ شہرت کے لیے؟ پیسے کے لیے یا تخلیقات کے لیے؟

کچھ لوگ بس لکھنا چاہتے ہیں، کچھ بھی...... اپنا نام چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، کچھ تعریفیں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسے لوگوں کو اس طرف نہیں آنا چاہیے کیونکہ یہ آرٹ کی تذلیل ہے۔ کچھ لوگ محض وقت گزاری کے لیے لکھتے ہیں۔ سائنس نے وقت گزاری کے لیے بیش بہا چیزیں دریافت کر لی ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں لیکن لکھنے کا نہیں۔

لیکن اگر آپ واقعی رائٹر بننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قلم تیار کرنے سے پہلے آپ کو خود کو تیار کرنا ہے۔ چونکہ آرٹ میں کوئی بھی چیز حرف آخر نہیں ہوتی (کیونکہ یہ سائنس نہیں ہے۔ ویسے تو سائنس میں بھی کوئی چیز حرف آخر نہیں ہے۔) اس لیے ان باتوں سے آپ مدد لے سکتے ہیں لیکن یہ حرف آخر نہیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آرٹ ایک ایسا شعبہ ہے، جس میں باقاعدہ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بے قاعدہ سیکھے بغیر صادقین خود بخود بن جاتے ہیں۔ نصرت فتح علی خان کو خواب میں دھنیں مل جایا کرتی تھیں۔ ملتان کے ظروف سازوں کو پانی میں گھول کر کاشی گری سکھا دی جاتی ہے۔ ہر

Monthly Shuaa December 2017

فن کے لیے باقاعدہ یا بے قاعدہ بہت جان مارنی پڑتی ہے۔ تب ہی تخلیق کی کونپلیں، بنجر زمین کو گلستاں کرتی ہیں۔

جے کے رولنگ کا کہنا ہے کہ،

"لکھنے کے لیے اتنا زیادہ پڑھ لیں جتنا زیادہ اور زیادہ سے زیادہ پڑھ سکتے ہیں۔"

پڑھے بغیر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی جادو سے، بغیر بیج کے گندم کا کھیت اُگا لے۔ میں جانتی ہوں کہ نئے لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا تعلق ایسے علاقوں سے ہے جہاں مطالعہ کے لیے ڈائجسٹ کے لیے علاوہ کچھ میسر نہیں۔ لیکن میرا یقین کیجیے، آپ بھی مطالعہ کر سکتے ہیں، اور بہت زیادہ کر سکتے ہیں۔

جس ماحول میں آپ رہتے ہیں اس کا، اپنے آس پاس کے لوگوں کا۔ ان کے جذبات، رویوں، اور ان کی مشکلات، ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا۔ موسم کا، سردی، گرمی، بہار کا۔ کھیت، درختوں اور پرندوں کا بھی۔

منشا یاد کی کہانیاں ہمارے معاشرے کی کہانیاں ہیں، اگر آپ ان کی کہانیاں پڑھیں تو آپ کو ایسا لگے گا کہ آپ اپنے ماحول کی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ روس کے بہت سے ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اپنے گاؤں، گاؤں کے ماحول کی کہانیاں لکھ کر ادب میں بڑا نام بنایا۔ کیوں؟ کیونکہ انہوں نے اپنے ماحول، اپنے لوگوں کا مطالعہ بہت شوق سے کیا تھا۔ آپ بھی کریں۔ جو کہانیاں ہمیں ہمارا ماحول سناتا ہے، وہ دنیا کی کسی کتاب میں پڑھنے کے لیے نہیں ملتیں۔ اس لیے اپنے ماحول کی کہانیاں پڑھیں، سمجھیں اور انہیں لکھنے کی کوشش کریں۔ جب کوئی بھی رائٹر معاشرے کی بند کتاب کو مشاہدے کی کھلی آنکھ سے پڑھنے لگتا ہے تو اسے، بڑا لکھاری بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

نئے لکھنے والوں کو سب سے پہلے اپنے اندر الفاظ کی روانی بڑھانی چاہیے۔ جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے تو اس کے پاس تھوڑے بہت الفاظ تو ہوتے ہیں لیکن ان کی درست ترتیب نہیں ہوتی۔ ایسے ہی جب کوئی لکھنا شروع کرتا ہے تو اسے لفظوں کو ترتیب دینے میں مشکل ہوتی ہے۔ ہمارا دماغ چونکہ روزمرہ کی باتیں سمجھنے --- کا عادی ہوتا ہے، جس میں ہم گرائمر کی غلطیاں کرتے ہیں اور املا (ساؤنڈ) کی بھی، اس لیے قلم سے لکھتے ہوئے بھی دماغ ہمیں وہی معمول کی باتیں دیتا ہے جو دراصل غلط، کمزور اور ناکافی ہوتی ہیں۔

اس لیے جب آپ لکھنا شروع کریں تو کہانی لکھنے سے بہت پہلے الفاظ لکھنے کی مشق شروع کریں۔ نئے الفاظ، زیادہ الفاظ بنانے کی مشق۔ کچھ بھی لکھیں۔

موسم پر، شہر پر، گاؤں پر۔ میں صبح اٹھی، ناشتہ کیا، گھر کا کام کیا۔ کھانا ایسے ایسے پکایا۔ مجھے فلاں فلاں چیز پسند ہے۔ معمولی، غیر معمولی سب باتیں۔ بس کچھ بھی۔ روز لکھیں، لکھ لکھ کر رکھتے جائیں۔ دس دن بعد انہیں پڑھیں۔ ان کی غلطیاں درست کریں۔ آپ نوٹ کریں گے کہ پہلے دن کی مشق سے دسویں دن کی مشق تک آپ کا قلم رواں ہونے لگا ہے۔ بہت سے نئے الفاظ اور نئے جملے خود بخود بننے لگے ہیں۔ یہ مشق مسلسل کریں، ہر روز کریں۔

مکالمہ لکھیں۔

آپ سادہ کاغذ پر صرف مکالمہ لکھیں۔ دو بہنوں میں، ماں بیٹی، دو دوستوں میں، ٹیچر اسٹوڈنٹ میں۔ کسی بھی موضوع پر، کچھ بھی۔ صرف اور صرف جملے لکھیں اور بنا کر لکھیں۔ اس مشق سے آپ کا دماغ خودکار طریقے سے کام کرے گا۔ آپ کے اندر سے خود بخود جملے نکلنے لگیں گے۔ ہر بار مشق میں کم سے کم بیس، تیس جملے لکھیں۔ دس، بیس دن بعد آپ نوٹ کریں گے کہ آپ کا مکالمہ مضبوط ہو رہا ہے۔ روانی آتی جا رہی ہے۔

اس مشق کے ساتھ ساتھ اب یہ کوشش کریں کہ جملوں کو دوٹوک انداز میں لکھنا شروع کر دیں۔ ایسے جملے جو کردار کی خوبی یا خامی کو ظاہر کریں۔ جو کردار کی

شخصیت پر روشنی ڈالیں۔ مثلاً،

''تم مجھے چور کہہ رہی ہو؟ ان چوروں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، جو ایوانوں میں بیٹھ کر چوری کرتے ہیں۔''

''چوری تخت پر بیٹھ کر کی جائے یا تخت سے نیچے رہ کر، بات بھی ایک ہی ہے اور گناہ بھی۔''

پہلا جملہ چور کا ہے، دوسرا جملہ چور کو چوری سے باز رکھنے کی کوشش کرنے والے کا ہے۔ یعنی اب اس طرح کے جملے لکھیں جن سے کردار کی شخصیت ظاہر ہو۔

بیانیہ:

کہانی کہنا بیانیہ کہلاتا ہے (کہانی بیان کرنا)۔ کہانی کی تین مرکزی بنیادیں ہیں۔ مرکزی خیال یعنی کہانی، کردار نگاری، اور کہانی کی بنت۔ یہ تینوں حصے ایک چیز بیانیہ سے آپس میں جڑتے اور بیان کیے جاتے ہیں۔ جب آپ اُوپر درج دونوں مشق کرلیں گے تو اب کہانی بیان کرنے کی مشق کریں۔

ہمیشہ چھوٹی کہانیوں سے لکھنے کی ابتدا کریں۔ افسانہ نویسی یا مختصر کہانی کہنے سے کہانیوں کے مرکزی خیال کو سمجھنے، بیان کرنے، کرداروں کے انداز و بیاں کو پیش کرنے کے فن پر گرفت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے اگر کوئی سمندر کو کوزے میں بھرنا سیکھ لے تو پھر کوزے سے سمندر نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو پہاڑی بچوں سے دیتی ہوں جو موسم، ماحول، اور حالات کی سختی کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ میدانی علاقوں کی سختیاں انہیں سہل لگنے لگتی ہیں۔ افسانہ نویسی بھی کہانی کی دوسری اصناف کو آپ کے لیے آسان کر دے گی۔ بانو قدسیہ اشفاق احمد، ممتاز مفتی، ان سب بڑے ناموں نے پہلے صرف افسانے لکھے، مختصر نویسی کی۔

کہانی کے مرکزی خیال پر پوری طرح سے غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں بنیادی طور پر چھتیس کہانیاں ہیں جنہیں ہر رائٹر اپنے اپنے انداز میں لکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہم جو بھی کہانی لکھتے ہیں، وہ روایتی ہی ہوتی ہے، جو زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ تو نیا کیا ہوگا؟ نیا ہوگا ہماری سوچ کا انداز۔ کہانی



کو پیش کرنے کا انداز۔

کہانی کی بنت (treatment)۔ کہانی کے نئے پہلو، نئے الفاظ، نئے خیالات۔

کہانی لکھنا شروع کریں تو قلم روکیں نہیں۔ جو لکھا جا رہا ہے، جیسا بھی لکھا جا رہا ہے، وہ غلط ہے، درست ہے، کہانی کے مطابق ہے، کہانی کے مخالف ہے۔ جو بھی ہے بس رکیں نہیں۔ اسے ”رو،، (flow) کہتے ہیں۔ اس روانی کو نہیں روکنا چاہیے۔ دنیائے ادب میں جو کتابیں شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں وہ اسی ”روانی،، کے زیر اثر تخلیق پائی ہیں۔

ان میں سے ایک زندہ مثال راجہ گدھ کی ہے۔

نئے لکھنے والے ہمیشہ یہ کریں کہ جو کچھ بھی لکھیں، اسے لکھ کر رکھ لیں۔ اسی وقت پڑھنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کچھ وقت بعد پڑھیں گے تو تحریر کا جھول اور خامیاں نظر آنے لگیں گی۔ ان خامیوں کو ٹھیک کریں۔ کہانی کو ترتیب دے دیں۔ ایک بار، دو بار، بار بار لکھ لیں، جب تک آپ کو خود یقین نہیں ہو جاتا کہ کہانی واقعی کہانی بن چکی ہے۔

بار بار کی درستگی سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مشق کسی کو بھی اپنے فن میں ماہر کر دیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جیسے بڑے ادیب ہر کہانی کو کم سے کم تین بار لکھتے ہیں۔ اپنے ناول ”بہاؤ،، کے لیے انہوں نے سیالوں نوٹس بنائے تھے۔ اور ایک زبان بھی تخلیق کی تھی۔ علامہ اقبال —— جو شعر لکھتے تھے، اس کی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ الفاظ کی ترتیب بدلتے رہتے تھے۔ دنیائے ادب کے سب سے بڑے اور مشہور ادیب ٹالسٹائی سو بار سے زیادہ اپنے مسوّدات پر نظر ثانی کرتے تھے۔

اگر آپ عجلت پسند ہیں، آپ میں صبر نہیں ہے تو پھر آپ بڑا کام تو کر سکتے ہیں لیکن بڑی تخلیق نہیں۔ ”کہاں، کتنا، اور کیا،، یہ تین پیمانے ہیں جن کے ملاپ سے ایک بہترین کہانی تیار ہوتی ہے۔ ہر لفظ، خیال، جملہ، جو رائٹر کے پاس ہوتا ہے، وہ ہر کہانی کے لیے نہیں ہوتا۔ یہی رائٹر کی حقیقی قابلیت ہے کہ وہ سمجھ جائے کہ اسے کہاں، کیا، کیسے، اور کتنا لکھنا ہے۔ رائٹر بننے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد بھی بنیں۔ اپنی تحریر کی خامیاں خود نکالیں۔ اپنی تحریر پر کڑی تنقیدی نظر رکھیں۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ کیا ایسے اچھا لگے گا کہ دنیا بھر میں کمہار، ترکھان، موچی، باورچی، مستری، کاشی گر، وغیرہ تو اپنے اپنے کام میں ماہر ہوں۔ حتیٰ کہ مکئی کے چنے ریت میں بھوننے والا، اور دوپٹوں کو رنگنے والا رنگ ساز تک اپنا کام ٹھیک کرتے ہوں لیکن لکھاری اپنے کام میں جھول رہنے دے۔ املا کی، گرائمر کی بے شمار غلطیاں کرے۔ جس زبان کا وہ ادیب ہے، اسے وہ زبان ہی ٹھیک سے نہ آتی ہو۔

اس لیے وہ سب نئے لکھنے والے جو لکھنا چاہتے ہیں، وہ ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اپنی املا اور گرائمر کی غلطیاں ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی اردو بہتر کریں۔ آپ کی کہانیاں جب ایڈیٹر کی میز پر آئیں، تو وہ اتنی جامع، مکمل، اور مستند ہوں کہ نہ صرف شائع ہوں بلکہ بہت زیادہ پسند کی جائیں۔

دنیا میں کوئی ایک بھی انسان ایسا نہیں ہے جو پرفیکٹ ہو۔ لیکن دنیا میں بہت سے ایسے انسان ہیں جو پرفیکٹ ہونے کے لیے ہر دن، ہر لمحہ کوشش کرتے ہیں اور اپنی جد و جہد چھوڑتے نہیں۔ غور و فکر، مشاہدہ اور ہر روز کچھ نہ کچھ نیا سیکھنا، یہ ایسی چابیاں ہیں، جو بہت سے بند دروازے کھولتی چلی جاتی ہیں۔ اگر کوئی بھی انسان کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو اللہ اسے سکھانا چاہتا ہے۔ بس سیکھنے والے کو شوق ہونا چاہیے۔ کیونکہ علم غافلوں پر مہربان نہیں ہوتا۔ نکمے، سست لوگوں کو پسند نہیں کرتا اور تنگ دلوں پر روشن نہیں ہوتا۔ اس لیے غفلت، سستی، اور تنگ دلی سے بچیں۔ رائٹر بننے کے لیے قلم سے پہلے خود کو تیار کریں۔

آئندہ ہم کہانی کے کچھ اور پہلوؤں پر بات کریں گے۔

☆



بندھن

شبنم ثانی ہمراہ سمیع ثانی

شاہین رشید

نئے شادی شدہ جوڑوں کی سوچ اور پرانے جوڑے کی سوچ میں اور رکھ رکھاؤ میں کافی فرق ہوتا ہے......کیونکہ پرانے یا سینئر جوڑے بہت سے تجربات سے گزر کر کندن بنتے ہیں تو جنہیں اپنا بندھن مضبوط کرنا ہے وہ سینئرز کے تجربات سے ضرور فائدہ اٹھائیں۔

آج آپ کی ملاقات ایک سینئر جوڑے سے کروا رہے ہیں جو شوبز کا جانا پہچانا نام ہیں، سمیع ثانی اپنی اداکاری اور شبنم ثانی اپنی تحریر اور اداکاری کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔

''کیا حال ہے شبنم صاحبہ؟''

''جی......اللہ کا شکر ہے۔''

''ماشاءاللہ سے شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں اور بچے کتنے ہیں، کیا کرتے ہیں؟''

''شادی کو ماشاءاللہ 31 سال ہو گئے ہیں بلکہ جولائی 2018ء میں 31 سال ہوں گے......اور ماشاءاللہ ہمارے تین بیٹے ہیں......بڑا بیٹا ''شاہ رخ'' ہے جس کی شادی ہو چکی ہے اور ان کے دو بیٹے بھی ہیں، یہ کینیڈا میں رہتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کا نام ''شاہ زیب'' ہے جو کہ ایم بی اے کر رہا ہے۔ تیسرا بیٹا ''شاہ زر'' ہے اور یہ اے لیول میں ہیں۔''

''اتنے سالوں میں مزاجوں اور شخصیت میں کیا فرق آیا اور لکھنے کا ادراک شادی سے پہلے ہی تھا یا شادی کے بعد ہوا ؟''

''مزاجوں میں تو یہ فرق آیا ہے کہ طبیعتوں میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ ایک دوسرے کی بات کو تحمل سے سنتے

اور سمجھتے ہیں۔ دنیاوی رشتوں کی زیادہ سمجھ میں آ گئی ہے۔ میچور پہلے بھی تھے اب اور زیادہ ہو گئے ہیں...... اور لکھنے کا رجحان تو بچپن سے ہی تھا کیونکہ میں سوچتی بہت تھی اور دنیا کو دیکھنے کا میرا الگ ہی زاویہ تھا اور اب میں نے خود ہی اس کو ''ڈسکورڈ'' کیا ہے...... شادی کے بعد جب اللہ نے نعمتوں سے نوازا تو انہی کے تعلیم و تربیت میں مصروف ہوگئی اور کچھ ایکسٹرا کام کرنے کا ٹائم ہی نہیں ملا۔ اگر ملا بھی اور لکھا بھی تو سب کچھ اپنے پاس ہی رکھا...... اور ابھی تک رکھا ہے...... تو لکھنے کا سلسلہ گاہے بہ گاہے جاری رہا مگر اپنے تک۔ مگر اب میرا دوسرا سیریل آنے والا ہے ''حنا'' کے نام سے اور ''نور جہاں'' سیریل تو آپ کو یاد ہی ہوگا، کافی مقبول ہوا تھا۔''

''زندگی کے اس سفر میں کتنے دشوار گزار راستے آئے یا سب کچھ اچھا رہا؟''

الحمدللہ...... ایسے کچھ دشوار گزار راستے تو نہیں آئے۔ لیکن ظاہر ہے زندگی کسی کی بھی ٹریک پہ نہیں چلتی۔ دشواریاں آتی ہیں۔ زندگی ایک امتحان ہی تو ہے۔ خواہ امتحان چھوٹے ہوں یا بڑے...... زندگی تو بس سیکھنے کا عمل ہے اور یہ عمل ساری زندگی — جاری رہتا ہے۔ بہت شکر ہے اللہ کا کہ اس نے اچھا وقت گزار دیا...... اور آئندہ بھی گزارے اور ہمیشہ گزرا ہوا وقت اچھا لگتا ہے۔

''ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے لڑکیوں کو ہی قربانی دینی پڑتی ہے۔ آپ کے ساتھ مسائل ہوئے؟''

''جی...... یہ صحیح ہے کہ قربانی لڑکیوں کو ہی دینی پڑتی ہے اور مرد قربانی تو نہیں دیتا مگر اس میں صبر کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ تو الحمدللہ سمیع صابر رہے اور ہیں اور اب میں گزری زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے بہت قربانی دی۔ کرائسس اس طرح کے آئے کہ کئی جگہوں پہ سمیع نہیں پہنچ پاتے تھے تو میں ہی جاتی تھی۔ سسرال والوں سے نبھانا۔ ہر چیز میں آگے آگے رہنا، بچوں کی تربیت کی نوے فیصد ذمہ داری میں نے اٹھائی' سمیع اپنے کام کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ سمیع کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہوئی کسی بھی معاملے میں تو میں آگے آگے رہی اور سمیع کو ہمیشہ میں نے فری ہینڈ دیا...... تو اس لحاظ سے ساری قربانیاں میں نے ہی دیں۔''

''ساتھ تو دیا ہوگا آپ کا...... یا اس سفر میں اکیلا چھوڑ دیا؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے...... سمیع نے میرا بہت ساتھ دیا...... راستے میں جو بھی مشکلات آئیں۔ سمیع میرے ساتھ ساتھ رہے۔ مگر سب کچھ ہینڈل کرنے کا اختیار بھی مجھے ہی دے دیا کہ ''تم دیکھ لو'' کیونکہ اگر دو لوگ کسی مسئلہ کو ہینڈل کرتے ہیں تو مسئلہ الجھ ہی جاتا ہے مگر چونکہ مجھے اختیار دیا تو میرے لیے بھی آسانی ہوگئی اور سمیع کے لیے بھی اور ہم الجھنے سے بچ گئے۔''

''سسرال والوں سے تعلقات کیسے رہے؟''

''سسرال والوں سے ماشاءاللہ بہت اچھی نبھی، کیونکہ میں اکلوتی بہو تھی...... میری ساس بہت اچھی تھیں' بالکل دوستوں کی طرح۔ بہت پیار دیا انہوں نے اور میں نے بھی، تقریباً سال قبل ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے...... نند میری ایک ہی ہیں جو کہ ملک سے باہر رہتی ہیں۔ بالکل سگی بہنوں کی طرح ہماری آپس میں محبت ہے...... اور میرے بچوں کے لیے بھی وہ بڑی بہنوں کی طرح سے ہی ہیں۔''

''آپ دونوں میں لڑائیاں ابھی بھی ہوتی ہیں کیا؟''

''ارے جناب لڑائیاں کب ختم ہوتی ہیں۔ گھر میں مل جل کر رہیں گے تو کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ مگر سچ بتاؤں، ہمارے درمیان لڑائی بہت کم ہوتی ہے۔ کبھی سالوں میں ایک آدھ بار...... مجھے ہی غصہ آجاتا ہے'

سمیع کو نہیں۔"

"شادیوں کے رسم و رواج میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟"

"شادیوں میں تو اب بہت فرق آ گیا ہے' اب شادیوں میں شو آف زیادہ ہوتا ہے۔ پہلے گھر میں گھریلو ماحول میں ڈھولکی رکھی جاتی تھی اور بہت رونق ہوتی تھی' مہمان آنا شروع ہو جاتے تھے تو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا...... اب بہت بناوٹ آ گئی ہے۔ اب فیشن، ڈیزائننگ، پارلر اور اب گانوں سے زیادہ ناچنے پر زور ہوتا ہے۔ فوٹو سیشن...... بہت کچھ ہونے لگا ہے۔ تو جو مزہ پہلے کی شادیوں میں تھا اب کی شادیوں میں نہیں ہے' اب پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ تھکن بھی ہو جاتی ہے اور جو سکون و اطمینان حاصل ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔"

"بچوں کی سالگرہ اور اپنی شادی کی سالگرہ اہتمام سے مناتی ہیں آپ؟"

"بچے چھوٹے تھے تو ان کی سالگرہ مناتے تھے۔ ان کے دوستوں کو بلا کر اہتمام کر لیتے تھے ہم لیکن جب بچے بڑے ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ یہ تو فضولیات ہیں تو اہتمام ختم ہو گیا البتہ کیک کاٹ لیتے تھے گھر والے ہم سب مل کر...... یا ڈنر پر چلے جاتے ہیں۔ مگر اب یہ رجحان بھی کم ہو گیا ہے اور تحفے تحائف تو ماشاءاللہ سارا سال ہی چلتے رہتے ہیں بس اب تو ایک دوسرے کو وش کر لیتے ہیں اور ڈنر پر چلے جاتے ہیں۔"

"اتنے سالوں میں محبتوں میں کمی ہوئی، اضافہ ہوا یا نارمل رہے؟"

"محبتوں میں تو اضافہ ہی ہوتا ہے اگر آپ ساتھ رہیں اور ساتھ بھی بہت اچھا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس طرح سے ہمارا ساتھ رکھے۔ اور مزید اضافہ ہو۔ ہاں شکلیں بدل جاتی ہیں تو اظہار کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں اور طریقہ ایک دوسرے کی عزت میں بدل جاتا ہے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے میں بدل جاتا

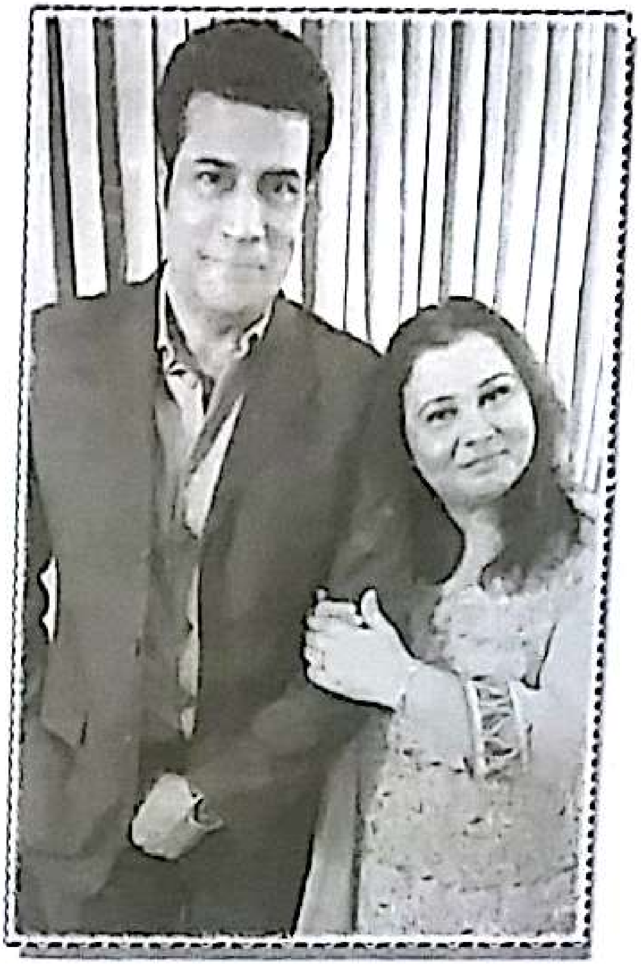


ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اصل محبت تو یہی ہے اور اس میں ماشاءاللہ اضافہ ہوا ہے۔"

"شوبز کی فیلڈ خطرناک فیلڈ بھی ہے تو کبھی خوف آیا یا احساس ہوا کہ سمیع کو اس فیلڈ میں نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

"جی خطرناک سے زیادہ یہ ایک مشکل فیلڈ ہے۔ اس میں اگر قدم رکھا ہے تو پوری طرح رکھیں نہیں تو پھر چھوڑ دیں اسے۔ اس فیلڈ میں مشکلات تو بہت آئیں اور ہمارے لیے تو کچھ زیادہ ہی آئیں...... سمیع کو شہرت شروع میں ہی مل گئی تھی پر اسے برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ سمیع زیادہ سوشل نہیں ہیں' بلاوجہ میں ملنا ملانا انہیں پسند نہیں ہے۔ اب تو لکھنے کے حوالے سے میں بھی اس فیلڈ میں آ گئی ہوں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ فیلڈ ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔"

"پہلی اولاد، پہلی سالگرہ اور پہلا تحفہ...... یاد ہو تو بتائیے؟"



''اولاد کی پیدائش اور پہلی اولاد کی پیدائش تو ایسی ہوتی ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے کل کی ہی بات ہو۔ مجھے اپنے تینوں بچوں کی پیدائش کا ایک ایک لمحہ ایسے یاد ہے جیسے یہ کل کی ہی بات ہو، بڑے بیٹے کی پیدائش تو ایسی لگتی ہے کہ جیسے وہ ابھی پیدا ہوا ہے۔ ابھی میری گود میں آیا ہے..... اور پہلے بچے کی سالگرہ بھی بہت اچھے انداز میں منائی تھی۔ اور پہلی سالگرہ پہ سمیع خاص طور پر کویت سے آئے تھے..... کیونکہ میں پاکستان میں تھی اور سمیع نے مجھے پہلا تحفہ ایک انگوٹھی دی تھی۔ گولڈ کی اور وہ آج تک میرے پاس ہے اور شادی پہ انہوں نے مجھے ہیرے کی انگوٹھی دی تھی اور وہ بھی میرے پاس ہے۔ مجھے سب اہم دن اور سب تحفے یاد ہیں اور کچھ میں نے سنبھال کر بھی رکھے ہوئے ہیں۔''

اور اب کچھ باتیں سمیع ثانی صاحب سے

''بہت عرصے بعد آپ سے بات ہو رہی ہے۔ تو یہ بتائے کہ کیسے ہیں آپ؟''

''جی..... اللہ کا شکر ہے۔''

''یہ بتائیے کہ شبنم کو شادی کے بعد کیسا پایا اور وقت کے ساتھ ساتھ کیا تبدیلیاں آئیں ان میں؟ اچھی بیوی رہیں، نارمل یا لڑاکا؟''

''آپ نے ایک ہی سوال میں تین چار سوال پوچھ لیے..... لیکن میں ایک چھوٹی سی بات کرنا چاہوں گا کہ آج جہاں میں کھڑا ہوں یا میری فیملی کھڑی ہے۔ میرے بچے پروان چڑھ گئے ہیں اور سب سیٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ سب شبنم کی محنت ہے۔ شبنم صرف ایک اچھی بیوی، ایک اچھی بہو اور ایک اچھی ماں ہی نہیں ہے بلکہ ان میں اور بھی بے شمار خوبیاں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ معلوم ہوئیں جس نے ہم سب کو بھی حیران کیا۔ اور دیگر لوگوں کو بھی تو میں تو یہ کہوں گا کہ مجھے ایک بہت ہی سمجھ دار دوست اور سمجھ دار بیوی ملی اور بہو بھی بہترین ثابت ہوئیں کہ ان کی میری امی سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اور چونکہ امی کو لٹریچر سے پیار تھا تو انہی کا ذوق شبنم کے اندر بھی منتقل ہوا اور انہوں نے لکھنا شروع کیا اور میں بہت فخر سے کہوں گا کہ ہم ایک بہت اچھی اور خوش گوار زندگی گزار رہے ہیں اور اس کا محور صرف اور صرف شبنم ہیں۔''

''آپ کی امی کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے تھے اور یہ ایک روایتی بہو تھیں یا مختلف؟''

''میری والدہ جو کہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین اور اسپورٹس کی دل دادہ تھیں اور اپنے وقت میں پاکستان کی نمبر 2 کھلاڑی تھیں ''ٹیبل ٹینس'' کی اور کراچی کالج فار ویمن میں لیکچرار تھیں..... شبنم سے ان کی بہت دوستی رہی اور کبھی روایتی ساس بہو کی لڑائی نہیں ہوئی، کیونکہ دونوں طرف سے ہی پڑھے لکھے لوگ تھے، شبنم کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا اور خود بھی پڑھی لکھی تھیں اور پھر چونکہ ہماری فیملی بہت چھوٹی تھی تو اتنے پرابلم نہیں ہوئے، بلکہ ہوئے ہی نہیں کہ کبھی ماں کو منا رہا ہوں تو کبھی بیوی کو..... الحمدللہ بہت اچھی

زندگی گزری۔"

"شبنم نے روایتی بیوی کی طرح آپ کا خیال رکھا کہ کھانے بھی پکانے ہیں۔ استری بھی کرنی ہے۔ میاں کے سارے کام خود کرنے ہیں؟"

"میں اور شبنم آپس میں میاں بیوی سے زیادہ دوست رہے ہیں ایک دوسرے کے اور ہیں بھی روایتی میاں بیوی والی زندگی نہیں گزاری کہ شوہر آ گیا ہے تو اس کی خدمت کرنی ہے۔ اس کے لیے کھانے پکانے ہیں اور ٹیبل پہ سجانے ہیں......لیکن ایک بات ہے کہ شبنم کے ہاتھ میں لذت بھی بہت ہے اور بہت پھرتی سے نبٹاتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک ہانڈی پکانے میں سارا دن لگا دیا اور پہلے دن سے جو ہمارا لائف اسٹائل ہے۔ وہ ہی آج تک ہے۔ پہلے وہ میرے اور امی کے لیے کرتی تھیں۔ پھر بچے ہوئے تو ان کے لیے کیا۔ تو عمر کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ عورت بھی آرام کرنا چاہتی ہے۔ مگر شبنم آج بھی زیادہ کام خود ہی کرتی ہیں۔ خاص طور پر کھانا تو خود ہی پکاتی ہیں۔"

"شبنم اچھی ماں، اچھی بہو اور اچھی بیوی تو ثابت ہوگئیں۔ یہ بتائیے کہ یہ اچھی لکھاری بھی ہیں کیا؟"

"بہت سی چھپی ہوئی صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت بعد میں پتا چلتی ہیں۔ شبنم میں بہت خداداد صلاحیتیں ہیں۔ یہ بہت کمانڈنگ ہیں اور قوت فیصلہ ان میں بہت اسٹرونگ ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی ہیں۔ شروع سے ہی لکھنے اور شاعری کرنے کا شوق تھا اور یہ اپنی شاعری اکثر مجھے سنایا کرتی تھیں اور میں کبھی داد دے دیتا تھا اور کبھی سنی ان سنی کر دیتا تھا اور پھر اس نے کہا کہ میں نے کہانیاں لکھی ہیں اور اب میں ڈراما لکھنا چاہتی ہوں تو وہ آپ نے سنا ہی ہوگا کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے تو بندہ توجہ نہیں دیتا پھر مجھے یاد ہے کہ 1998ء میں جب ہم نے پہلی ٹیلی فلم بنائی "ایک مہمان مہربان" تو پھر جب وہ مشہور ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اس میں تو بہت ٹیلنٹ ہے۔ مگر پھر کچھ وجوہات کی بناء پر سلسلہ رک گیا......اور اب تقریباً سال دو سال پہلے اس نے ڈراما سیریل "نور جہاں" لکھا جسے بہت پسند کیا گیا اور معروف رائٹرز نے بھی تعریف کی۔ اور اب "حنا" کے نام سے ایک سیریل ڈائریکٹ کر رہا ہوں میں جو کہ شبنم نے ہی لکھا ہے اور جیو سے آن ایئر ہوگا۔ تو شبنم Creative mind (تخلیقی ذہن) رکھتی ہے اور لکھنے کے معاملے میں ان میں بہت صلاحیتیں ہیں۔"

"آپ کی خوش حال ازدواجی زندگی کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے ہیں یا کچھ کہتے ہی نہیں......اور کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ کسی نے آپ کا بندھن توڑنے کی کوشش کی ہو؟"

"کہتے ہیں نا کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا، چہرے پہ مسکراہٹ سجانے والے کے دل کا حال تو آپ نہیں جانتے، شوبز میں رہتے ہوئے میری کوشش یہی رہی کہ گھریلو حالات خراب نہ ہوں تو میں نے اپنی طرف سے ایسے مواقع آنے ہی نہیں



دیے۔ شبنم تو اس فیلڈ میں بھی نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا میری ہی طرف سے ہونا تھا مگر میں نے ہونے نہیں دیا...... باقی ازدواجی زندگی میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہی ہیں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایکسٹریم (extreme) پہ کبھی بات گئی نہیں نہ ہی میں نے کبھی سوچا۔ اور جہاں تک لوگوں کی بات ہے تو بظاہر ہنس کے ملتے ہیں مگر اندر ان کے کچھ اور ہوتا ہے ''کینہ'' ہوتا ہے پیٹھ کے پیچھے چھرا چھپایا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے نہ ہم لوگوں کی باتوں میں آتے ہیں نہ ان پر انحصار کرتے ہیں اور نہ ہی امیدیں باندھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی بہت اچھی گزری اور گزر رہی ہے۔''

''اپنے بچوں کو ان کی پسند سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے؟''

''جب ہم نے اپنی پسند سے شادی کی تو اپنے بچوں کو بھلا کیوں منع کریں گے۔ مگر اس میں والدین کی مرضی ضرور شامل ہونی چاہیے کیونکہ صرف لڑکی لڑکے کا ملاپ نہیں ہوتا بلکہ دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ میں لبرل ضرور ہوں۔ مگر ہماری آنکھیں کھلی ہوئی ضرور ہیں، ہمیں سب پتا ہوتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے اور بے شک جوڑے آسمانوں پہ بنے ہوتے ہیں مگر پھر بھی جو ہوگا چھان بین کے بعد ہوگا۔''

''بہت شکریہ آپ دونوں کا کہ آپ نے ٹائم دیا...... بس آخر میں شبنم صاحبہ سے ایک سوال کہ ''بیٹی'' نہیں ہے آپ کے پاس، بیٹی کی کمی محسوس ہوتی ہے یا بہو نے یہ کمی پوری کر دی؟''

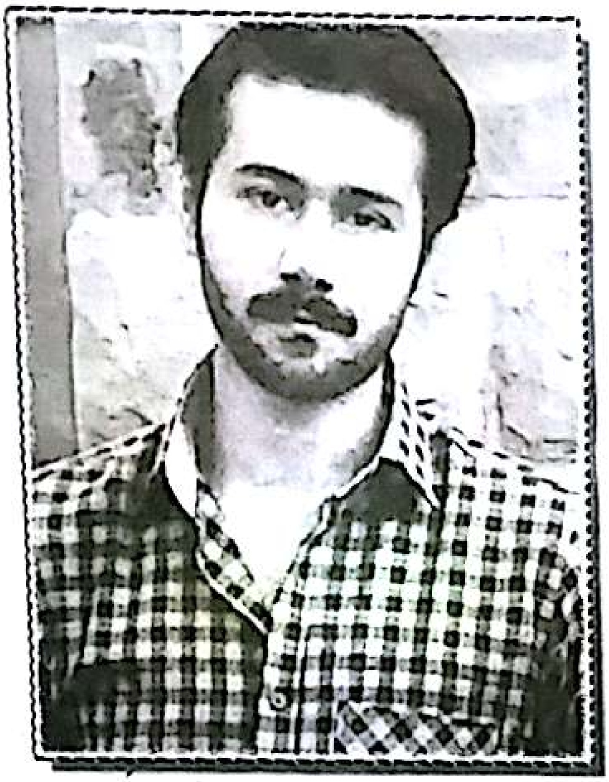
''بیٹی تو پھر بیٹی ہی ہوتی ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی کمی محسوس نہ ہوئی ہو۔ میں خود اپنے ماں باپ کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ تو بچپن سے خواہش تھی کہ بہن ہو، شادی ہوئی تو بیٹی کی خواہش ہوئی، کیونکہ بیٹی سے رونق ہی الگ ہوتی ہے بیٹے تو باہر کی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں اور بیٹیاں ساتھ رہتی ہیں۔ ہم دونوں کو بیٹی کی بہت خواہش رہی۔ مگر اللہ کو منظور نہیں تھا اور بہو ایک تو ملک سے دور رہتی ہے اور پھر اتنا ساتھ بھی نہیں رہا ہمارا۔ مگر وہ بھی بہت اچھی ہے اگرچہ بیٹی کی کمی تو پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ بیٹی سمجھ لینا اور بیٹی ہونا میں بہت فرق ہے۔ لیکن اگر آپس میں انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ چلیں تو پھر یہ رشتہ اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ میرا اور میری ساس کا آپس کا رشتہ تھا۔ میں نے اپنی ساس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور انہوں نے سکھایا اپنی شخصیت سے ...... تو بہر حال میں بھی ایسا ہی چاہوں گی۔ مگر کمی تو بہر حال کمی ہی ہے۔''

سرورق کی شخصیت

ماڈل	عالیہ خان
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی	موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

شاہین رشید



علی عباس

''کیا حال ہے اور کیا آن ایئر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟''

''جی الحمد للہ...... سب ٹھیک ہے اور کیا آن ایر ہے تو ایک سیریل ''فیصلہ'' اور ''میں ماں نہیں بننا چاہتی'' آن ایئر ہیں اور ''خالی ہاتھ' جو بہت پاپولر ہوا، وہ کچھ ہی عرصہ قبل ختم ہوا اور آج ایک سیریل ''سیٹ'' یہ ہے جو کہ سیونتھ اسکائی کا ہے اور اس میں ''حرامانی'' میرے ساتھ لیڈ رول کر رہی ہیں۔''

''خالی ہاتھ''، ''فیصلہ'' اور ''میں ماں نہیں بننا چاہتی'' تینوں میں آپ کے نگیٹو رول ہیں...... تو تواتر کے ساتھ نگیٹو رول کرنے کی کیا وجہ ہے؟''

''خالی ہاتھ'' تو اب ختم ہو چکا ہے اور باقی دو جو آن ایئر ہیں، مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں میں میرے نگیٹو رول نہیں تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا ایک امیج بن چکا ہے ''اینگری ینگ مین'' کا اور اس امیج کی وجہ سے جو کردار مجھے آفر ہوتے ہیں جس کو میری ایک اسپیشلیٹی سمجھا جا رہا ہے۔ وہ ایک اینگری ینگ مین کا ہے۔ ''خالی ہاتھ'' میں اپنے کردار کو نگیٹو اس لیے نہیں کہوں گا کہ وہ آخری قسط میں سب کی ''ہمدردیاں'' لے گیا۔ اس نے اپنی محبت ثابت کر دی ''مشعل'' کے لیے، اپنی جان دے کر۔ وہ اپنی طرف سے ہر چیز ٹھیک کر رہا تھا کیونکہ اسے اپنی محبت پانا تھی، اس کی شادی مشعل کی بہن سے زبردستی کرائی گئی تھی۔ اس طرح ''فیصلہ'' میں غصے کے نقصانات کو بتایا گیا کہ غصے میں ایک فیصلہ کیا بیوی کو طلاق دے دی اب وہ اس فیصلے کو ٹھیک کرنا چاہ رہا ہے اور ''میں ماں نہیں بننا چاہتی'' کا کردار بالکل مختلف ہے چونکہ وہ ایگریسیو ہے اسی لیے وہ نگیٹو لگ رہا ہے۔ وہ ہیرو ہے مگر غصے والا ہیرو ہے۔''

''ان تینوں سیریلز میں اپنا بیسٹ رول کون سا لگا۔ اور زندگی کے قریب کون سا لگا...... اور کیا یہ کردار ہمارے معاشرے میں نظر آتے ہیں؟''

''کردار آپ کے بچے کی طرح ہوتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے ان تینوں ڈراموں میں اپنے کردار بہت اچھے لگے تھے...... مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ ''خالی ہاتھ'' میرا اب تک کا سب سے بہترین کردار رہا ہے، کیونکہ اس کو

بہت زیادہ پذیرائی ملی ہے۔ باقی دو سیریلز آن ایر ہیں......اور ان دونوں سیریلز میں بھی مجھے بہت پذیرائی مل رہی ہے ماشا اللہ سے۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب کچھ یوں ہے کہ ڈراموں کے کردار میں ہمیشہ عام زندگی کے لوگوں سے انسپائر ہو کر ہی دکھاتا ہوں......اور رائٹرز کی نظر میں بھی یہ کردار ہوتے ہیں تب ہی وہ لکھتے بھی ہیں۔ ڈراما ''خالی ہاتھ'' کے دوران مجھے ایسے بہت سے میسجز آئے کہ ہم ایسے انسان کو جانتے ہیں جس کو اپنی ''سالی'' پسند تھی اور وہ اپنی بیوی سے زیادہ اپنی سالی پر توجہ دیتا تھا۔

اسی طرح فیصلہ میں ایک غصیلے انسان کا کردار تھا جو کہ ہمارے معاشرے میں بہت پائے جاتے ہیں......اسی طرح جبران کا (میں ماں نہیں بننا چاہتی) کردار بھی عام زندگی سے متعلق ہے اس طرح ایک سیریل ''تتلی'' میں نے کیا تھا اور اس کے کردار کے بارے میں بھی میں ذاتی طور پر دو ایسے لوگوں کو جانتا تھا جن کے ساتھ بیگمات بہت برا سلوک کرتی ہیں مگر وہ پھر بھی رشتے کو نبھاتے رہے۔ اپنے فرض کو نبھاتے رہے......تو ڈراما بنیادی طور پر معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور جب ہمیں اس میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو ہم نظریں (ہم سے مراد لوگ) چرا لیتے ہیں......لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر کردار عام زندگی سے ہی لیا جاتا ہے۔''

''ان تین ڈراموں کا ذکر ہم بار بار کر رہے ہیں تو علی آپ یہ بتائیں کہ ان تینوں ڈراموں کی لڑکیوں ''ایمن''، ''رباب'' اور سونیا مشال میں کس کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا کس کو زیادہ باصلاحیت پایا؟''

''مجھے لگتا ہے کہ تینوں بہت باصلاحیت ہیں......اور اپنی کو آرٹسٹ کے ساتھ میری بہت جلدی دوستی ہو جاتی ہے اور دوستی میں اس لیے بھی جلدی کر لیتا ہوں تاکہ ڈرامے میں ہماری کیمسٹری اچھی رہے اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان سکیں، کیونکہ میں ایک سیکیور انسان ہوں۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ میرے ماشا اللہ دو بچے ہیں۔ اور میں اپنی بیگم اور اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اور یہ بات پوری انڈسٹری کو پتا بھی ہے......تو لڑکیاں بھی میری فرینڈلی نیچر سے واقف ہیں اور وہ بھی اپنے آپ کو سیکیور فیل کرتی ہیں......اور اگر کوئی لڑکی ایمانداری کی بات ہے کچھ پرابلم کرتی بھی ہے تو میں اسے کلیئر بھی کر دیتا ہوں کہ تم بے فکر ہو جاؤ تم میرا ٹائپ ہی نہیں ہو......میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا......اور اس کے بعد وہ ایزی ہو جاتی ہے خواہ کسی کو غلط فہمی ہو یا خوش فہمی، کیونکہ میرا ''چوائس آف اسٹینڈرڈ بہت ہائی ہے۔''

''کیا ہمارے ڈراموں کے موضوعات بہت بولڈ نہیں ہو گئے 'ایک باپ' بیٹی کا نکاح ''حلالہ'' کی نیت سے کرواتا ہے۔ اور اسی طرح کے دیگر موضوعات؟''

''دیکھیں جی......ہر ڈراما اچھا نہیں ہوتا......جیسے ہر انسان اچھا نہیں ہوتا......تو کچھ ڈرامے برے بھی ہوتے ہیں......ڈرامے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں......مجھے بہت برے لگتے ہیں وہ لوگ جو صرف ڈرامے کا نام دیکھ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ڈرامے میں کیا پیغام دیا گیا ہے......اب جیسے ''میں ماں نہیں بننا چاہتی'' کے لیے مجھے کئی لوگوں نے فون بھی کیے اور میسج بھی کہ ہم اپنے بچوں کو یہ ڈراما کیسے دکھا سکتے ہیں جس کا ٹائٹل ہی ایسا ہو......میں سب کو یہ بات کہنا چاہتا ہوں آپ کے ''پلیٹ فارم'' سے کہ ''آپ ڈرامے کے ٹائٹل پہ اتنا سوچ رہے ہیں اس کے کانٹینٹ کو دیکھے بغیر جس میں ایک بہت اچھا سوشل میسج ہے کزن میرج پر، بچوں کے ابنارمل ہونے کے، تو ایک ڈرامے کے ٹائٹل میں اتنی بڑی سوچ ڈال دی ہے رائٹر نے اور آپ ہیں کہ اتنا بڑا فیصلہ سنا رہے ہیں کہ یہ ڈراما نہیں دیکھنا اس کا ٹائٹل بدل دیں، ہمارے بچے کیسے دیکھیں گے یہ ڈراما۔

کاش کہ آپ اس ملک میں ''ووٹ'' ڈالتے



سے پہلے اتنا سوچتے...... آپ کاش اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں اتنا سوچتے۔ کراچی شہر کچرے سے بھرا ہوا ہے۔ کاش آپ کچرا پھیلانے سے پہلے اتنا سوچتے...... کاش آپ کسی کا دل دکھانے سے پہلے اتنا سوچتے...... تو زندگیاں ہماری بہترین ہو جائیں...... ہمارے آج کل ڈرامے سوشل پرابلم پر بیس کرتے ہیں اور ایسے ڈرامے بننے چاہئیں۔ اگر ہم سوسائٹی تک میسج پہنچانا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنا دل اور دماغ وسیع کرنا پڑے گا۔ ہمیں اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔ اگر ہم جاہل رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم باقی معاشروں کی طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تلخ حقیقتوں کو فیس کرنا پڑے گا۔ اپنے بچوں کو سکھانا پڑے گا یہ بہت ضروری ہے۔

''بولڈ موضوعات سے منفی اثرات تو پڑتے ہیں نا؟''

''میں ایک بیٹی کا باپ ہوں اور مجھے اپنی بیٹی سے بے حد محبت ہے...... لیکن میں شاید پڑھ لکھ گیا ہوں یا شاید کتابیں بہت پڑھتا ہوں...... یا شاید دماغ بہت کھل گیا ہے میرا، مجھے لگتا ہے کہ اگر میری بیٹی مجھ سے کوئی سوال کرے گی اور وہ ایک بولڈ سوال ہوگا لیکن اس کے جواب سے اگر میں اس کا فیوچر سیکیور کرسکتا ہوں...... اس کے جواب سے اگر میں اسے یہ اعتماد دے سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے چھپائے بغیر اپنی زندگی کی ہر بات مجھ سے کرسکتی ہے تو میں اس کی ضرور حوصلہ افزائی کروں گا...... یقین کیجیے ایسا ہی ہوگا۔

مجھے اپنی بیٹی کو بیٹوں جیسا بنانا ہے۔ بہادر، عقل منداور خودمختار۔ اور بولڈ ٹاپک بالکل ان کے سامنے لے کر آنے چاہئیں...... کم سے کم ''بے بی ڈول میں سونے دی'' ''چٹیاں کلائیاں وے'' جیسے گانے ہمارے بچے سن رہے ہیں اور ہم خود گھر میں لگا کر ناچ رہے ہیں اور گاڑی میں لگا کر انجوائے کر رہے ہیں، اس سے بہت بہتر ہے کہ ہم بولڈ موضوعات ان کے سامنے لے کر آئیں...... بند کرنا ہے تو پھر ان چیزوں کو بند کریں۔ بند کرنا ہے تو ان گھٹیا ملبوسات کو بند کروایے جو آپ انڈین فلموں میں ان کو دکھاتے ہیں۔ اور گانوں کے تھرڈ دکھاتے ہیں۔

آپ مجھے خود بتایئے کہ ''من جاوے مینوں شاپنگ کرادے'' جیسے گانوں کی شاعری بچوں پہ غلط اثرات نہیں ڈال رہی، بہ حیثیت مسلمان اور بہ حیثیت ماں باپ کے آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ چیزیں بچوں پہ غلط اثرات ڈال رہی ہیں...... لیکن اگر ڈراموں کے ذریعے اگر ہم ایک اچھا پیغام دے رہے ہیں تو اس پہ آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں۔''

''اپنے والد کے ساتھ کام کر کے کیسا لگتا ہے؟''

''والد صاحب کے ساتھ یہ میرا تیسرا سیریل ہے۔ لیکن تینوں سیریلز میں میرا ان کے ساتھ زیادہ کام نہیں تھا...... والد صاحب پاکستان کے بہترین اداکاروں میں سے ایک ہیں اور ان کے ساتھ کام کرنا ایک بہت مشکل کام ہے...... ان کی آنکھوں میں اتنا تاثر ہے کہ آپ ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کام نہیں کرسکتے تو چونکہ وہ میرے والد بھی ہیں تو ان کے ساتھ کام کرنا مجھے مشکل لگتا ہے...... اور ''سین'' میں ظاہر ہے کہ وہ میرے والد نہیں ہوتے اور بعض سین

میں بدتمیزی لکھی ہوئی ہوتی ہے...... تو...... میں ہمیشہ یہی سوچتا ہوں کہ اگر میرے کسی سیریل میں وہ بھی ہیں تو میرا ان کے ساتھ کم سے کم کام ہو۔"

"فلم کی آپ نے؟"

"فلم پروگریس میں ہے...... پاکستان میں اب تک بہت سلو پروسس ہے فلم بننے کا...... تو دیکھیں جب تھوڑی مکمل ہوگی تو پھر ضرور بتاؤں گا فلم کے بارے میں۔"

صبا قمر

"ڈراما سیریل باغی میں تو کمال پرفارمنس دی ہے آپ نے آپ کو خود یہ سیریل کیسا لگا؟"

"جی...... کہانی اسٹرونگ ہو تو پھر کام کرنے میں مزہ بھی آتا ہے اور باغی کی کہانی بہت اسٹرونگ ہے...... ایک لحاظ سے میرے لیے چیلنجنگ رول تھا۔"

"بہت کم وقت میں بہت زیادہ ترقی کی ہے آپ نے؟"

"کم وقت کہاں...... 2006ء میں اس فیلڈ میں آئی تھی...... اور اب دیکھیں کیا چل رہا ہے، تو ٹائم تو کافی ہوگیا ہے۔"

"مگر شہرت کے حساب سے کم...... کیونکہ بعض لوگ تو برسوں محنت کرتے ہیں تب کہیں جا کے صلہ ملتا ہے۔"

"جی یہ تو ہے...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"ڈھیر سارے ڈراموں میں اپنے مشہور ڈراموں کے نام گنوا سکتی ہیں......؟"

"بہت مشکل سوال ہے۔ پھر بھی آج کل "باغی" بہت پاپولر ہو رہا ہے اور اس میں کام کر کے مجھے بھی مزہ آ رہا ہے۔ کہاں تم کہاں ہم۔ میں عورت ہوں۔ فصل جاں سے آگے۔ امر بیل۔ وہ صبح کب آئے گی۔ تیری اک نظر۔ اڑان۔ پانی جیسا پیار۔ ملال۔ مات" اور "ڈائجسٹ رائٹر" ابھی تو یہی ذہن میں ہیں میرے۔"

"کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا؟"

"سب کے ساتھ...... سب ہمارے ساتھی...... ہمارے دوست ہیں۔ نعمان اعجاز بہت اچھے اداکار بہت اچھے انسان ہیں۔ ان کے ساتھ کام کر کے بھی بہت اچھا لگا...... طلعت حسین میرے پسندیدہ آرٹسٹ ہیں۔"

"آپ خوش ہیں اس فیلڈ میں؟"

"جی...... بالکل خوش ہوں...... بہت اچھا لگ رہا ہے سب کچھ پا کے...... اور اگر شوبز میرے نصیب میں نہ ہوتا تو پھر یقیناً میں ڈاکٹر یا ایک اچھی فیشن ڈیزائنر ہوتی ہے۔"

"اس فیلڈ میں جب قدم رکھا تھا تو کیا امیدیں تھیں؟"

"جب شوبز میں قدم رکھا تھا تو ہرگز یہ نہیں سوچا تھا کہ مجھے اتنی شہرت وعزت اور پیسہ ملے گا۔ میں یہ عزت وشہرت ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔"

"لوگ ملتے ہیں تو الجھن کا شکار ہوتی ہیں؟"

"ارے نہیں...... لوگوں کی محبت نے ہی تو یہ مقام دیا ہے۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوتی ہے جب کوئی مجھے پہچان کر میری تعریف کرتا ہے...... میری اداکاری کی تعریف کرتا ہے تو بہت فخر محسوس کرتی ہوں۔"

"ٹی وی، فلم ماڈلنگ...... ترجیح کیا ہوگی؟"

"ٹی وی کے لیے اگر میں کہوں کہ میری پہلی ترجیح ہے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ٹی وی نے ہی مجھے نامور کیا...... اور ٹی وی کے ذریعے میں ہر طرح کے رول کر کے مشہور ہوئی۔ سب کو پتا چلا کہ مجھ میں کیا کیا صلاحیتیں ہیں۔"

"ہم سب امید سے ہیں جیسا پروگرام پھر شروع نہیں ہوا۔ اس پروگرام نے بھی آپ کو شہرت دوام دی؟"

"بالکل...... بہت مزہ آتا تھا "ہم سب امید سے ہیں" کر کے...... ایسے پروگرام کی بہت ضرورت ہے۔ یہ بہت اصلاحی پروگرام بھی تھا۔"

☆



جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

س س

بہت پرانی قاری ہوں آپ کے پرچوں کی۔

میرے اس شوق پہ، صرف میں خود اپنے ہمراہ رہی۔

میرے میاں کے بقول انسان رسالے پڑھ کے پاگل ہو جاتا ہے، اس لیے بھی انہوں نے خوشی سے رسالے لے کے نہیں دیے، ہر ماہ پاکٹ منی جمع کر کے خود مارکیٹ سے ڈائجسٹ لے آتی اب عمر کی نقدی ختم ہو رہی ہے تو میرا چھوٹا بھائی یہ فرض ادا کرتا ہے ہر ماہ۔

چار، پانچ سال سے بلڈ کی کمی کا شکار ہوں، ٹیسٹ کروائے، بیماری کوئی نہیں، بس ہر چھ ماہ بعد بلڈ لگتا ہے جو کہ مشکل سے ملتا ہے۔ ''او نیگیٹو'' گروپ ہے میرا،

میری ایسی حالت، شوہر اور کچھ سسرال کی وجہ سے ہوئی اور کچھ میں جذباتی بھی ہوں۔

''جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے'' یہ کالم میں شوق سے پڑھتی ہوں دل چاہتا کہ اس میں میں بھی شامل ہوں مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے رہ جاتی، خون کی کمی سے چہرہ، ہاتھ پاؤں سوجے رہتے ہیں، کمزوری رہتی ہے، مگر ایسی حالت میں بھی گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں آہستہ آہستہ پوری کرتی ہوں یہی دعا ہر لمحہ ہونٹوں پہ رہتی ہے کہ یا اللہ مجھے کیسی کا محتاج نہ رکھ۔۔ آمین''

اب طبیعت کچھ بہتر ہے تو قلم اٹھایا ہے میں کوئی لکھاری نہیں ہوں نہ ہی لفظوں سے کھیلنا آتا ہے مگر چاہتی ہوں میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو، سکون سے مروں، آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ کے پرچے کے توسط سے میں کہنا چاہوں گی کہ میرا بلڈ گروپ ''او نیگیٹو'' ہے، مجھے ضرورت ہے، کہ اپنے بچوں کے لیے مجھے زندہ رہنا ہے، موت کو شکست دینی ہے، پاکستان میرا اپنا ہے اور اس تکلیف میں مجھے میرے اپنوں کی ضرورت ہے میں تنہا ہوں میرا ساتھ دیجیے۔''

س: شادی کب ہوئی؟

ج: 11 نومبر 2000ء۔

س: شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج: میرے ابو صحافی تھے تو بس مطالعہ اور گھر کے چھوٹے موٹے کام۔

س: رشتے میں مرضی؟

ج: میری مرضی اس حد تک تھی کہ لڑکا گاؤں میں رہتا تھا مجھے گاؤں کی خوبصورتی بہت بھاتی ہے تو میری پسند بھی تھی، وہ غیر تھے ''وارن'' تو میری فیملی کچھ کشمکش کا شکار تو تھی مگر زیادہ پریشانی نہیں ہوئی کچھ اللہ کی بھی رضا تھی تو ہو گیا رشتہ۔

س: جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟

ج: میں شروع ہی سے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔ چاندرات انجوائے کرنا، مطالعہ کرنا، قدرتی مناظر کو دیکھنے کی خاطر ادھر ادھر گھومنا، میں کچھ تنہائی پسند تھی" اب بھی ہوں، زیادہ سوشل نہیں ہوں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں تو شوہر ایسا نہ تھا۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟

ج: ہمارا نکاح ہوا تھا، دو سال رہا جب بھی ڈیٹ شادی کی فکس ہوتی، کوئی نہ کوئی قریبی عزیز فوت ہو جاتا تھا، میرے ابو بھی کافی عرصہ بیمار رہے میری رخصتی کے وقت وہ اٹھ کے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے اور میری شادی کے پندرہ دن بعد وہ فوت ہو گئے تھے۔

س: شادی کے لیے کوئی قربانی؟

ج: ہاں۔۔اپنی ہنسی۔۔اور خوشیاں۔

س: رسموں کے لین دین پہ کوئی جھگڑا؟

ج: نہیں، کوئی خاص نہیں ہوا تھا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کے کیا کہا؟

ج: میں یہ بتاتی چلوں کہ میرے میاں کی یہ دھواں دھار لو میرج تھی مگر پھر بھی مجھے دیکھ کے کچھ نہیں کہا۔ پلیٹ میں ٹھنڈے چاول رکھے تھے، بولے، کھاؤ گی۔"

میں نے کہا "نہیں"

میں اپنی فیملی کو یاد کر کے بہت رو رہی تھی۔

س: شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟

ج: میرے میاں گھر کے بڑے بیٹے ہیں (صرف نام کے) وہ ہیں تو نرم مزاج مگر ڈرپوک ہیں۔ کمزور فطرت اور کم ہمت ہیں۔۔ کسی بھی حالات میں وہ میرے سپوٹر نہیں بنے۔۔ میں اکیلی روتی، چپ ہو جاتی مجھے نہیں یاد کبھی انہوں نے پاس بیٹھ کے کوئی تسلی دی ہو، حوصلہ دیا ہو، بس اٹھ کے باہر چلے جاتے۔

س: کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

ج: شادی کے تین چار دن بعد پہلا کام میں نے گھر کی صفائی کی تھی۔ میرے میاں کی فیملی کی خواتین پھوہڑ اور کاہل تھیں، اب بھی ہیں۔ میری ساس گھر گرہستن خاتون نہیں ہیں۔ وہ گھومنے پھرنے کی شوقین ہیں کبھی یہاں کبھی وہاں۔ انہوں نے گھر کی جانب توجہ دی ہی نہیں، میرے میاں یا میرے دیور گھر کی صفائی کرتے یا جیسا تیسا کھانا بنا ہی لیتے۔ ان کے خاندان میں مردوں کی اتنی اہمیت نہیں، اندر باہر کی مالک عورتیں ہیں میرے سسرال میں میری ساس سودا لاتیں، شادی کے بعد میری نندیں اپنے گھر کے بجائے یہاں کی مالک ہیں ہم بہویں مہمان ہیں، ہماری کوئی اہمیت نہیں۔ میرے سسر میری ساس نے اپنی بیٹیوں کو گھر کا مالک بنایا ہے۔ سب خرچ ان کے ہاتھ میں ہے۔ میری بڑی نند رات کے وقت چینی کو ہوا لگواتی، صبح چینی تالے میں۔

میں دو تین سال اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہی، میں خاصی صفائی پسند ہوں آج بھی اپنی بیماری کے باوجود میرا گھر چمکتا ہے، میرے بچے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ٹائم پہ کھانا اور ہر چیز تیار ہوتی ہے۔ پانچ پانچ منٹ میں ریسٹ کر کے سب خود کرتی رہتی ہوں، تو شادی کے بعد بھی صفائی والی عادت میری سزا بنی۔ میری بڑی نند کے بچے گندگی پھیلاتے، میں ان کو روکتی ایک دن میرے سسر اور ساس نے میرے میاں کو بلا کے کہا کہ اپنے دانے الگ کر لو، تمہاری بیوی بچوں کو روکتی ٹوکتی ہے۔ اس وقت ان کی جاب نہیں تھی۔۔ میری ساس نے سہاگ رات کو جو ٹوٹی ہوئی چارپائی سیٹ کی تھی وہ اٹھا کے لی گئیں اور پنکھا بھی۔ آج تک میری ساس سسر نے مجھے کوئی چیز نہیں دی۔ شادی کے بعد جب لکڑیاں جلانے کی وجہ سے مجھے سانس کی بیماری ہوئی تو میں نے اپنے سونے کے جھمکے فروخت کیے، چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے میں اپنے چھوٹے موٹے

زیور بیچتی گئی جب گلو بند بچا تو وہ میرے سسر نے لے لیا کہ اگلی فصل پہ دے دوں گا مگر وہ دن اور آج کا دن، انہوں نے نام نہیں لیا، دو تین بار مانگا تو کہنے لگے ہم نے شادی پہ جو خرچا کیا اسی میں کٹ گیا دکھ تو ہوا مگر چپ کر گئی۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟

بس تھوڑا بہت فرق ہے۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف، تنقید ہوئی؟

ج: میرے سسرال والے میری صفائی والی اور سستی نہ کرنے والی عادت پہ تعریف کرتے ہیں، اب بھی۔۔۔ میں شروع ہی سے سحر خیز ہوں۔۔۔ میں چونکہ ان کے خاندان کی نہیں ہوں تو بچوں سے کافی فرق رکھتے ہیں، ویسے تو پیار کرتے ہیں مگر خالی خولی پیار، دینے دلانے کا نہیں تو تنقید ہوتی ہے کہ بنا کے نہیں رکھتی جبکہ ان کا کھلا ڈھولا ماحول مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ مردوں کو آزادی ہے، بنا اجازت سر پر سوار ہو جاتے ہیں میری امی کے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا تو اس وجہ سے بھی میں سسرال میں ایک فاصلے پہ رہی۔ اپنے دیوروں، سسر اور ان کے خاندان کے مردوں سے فاصلہ رکھا۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: پہلے سسرال کا ماحول دیکھیں کہ وہاں آپ کے سسر، ساس آپ کو کیسی اہمیت دیتے ہیں تاکہ ہم بھی اپنے گھر والا خواب پورا کریں، سجائیں، بنائیں مگر جہاں شادی کے بعد بھی بیٹیاں مالک ہوں، وہاں آنے والی کیا گھر بنائے گی۔ میری ساس کا کہنا ہے

میں بہوئیں، بیٹوں کو چھوڑ سکتی ہوں بیٹیوں کو نہیں، یہ نہیں سوچتیں کہ اب بیٹی کی شادی ہو گئی ہے، ان کو اپنا گھر بنا کے دو۔ میری دو نندیں اور دو دیور ہیں، میری نندیں شادی کے بعد بھی میکے کے مزے لے رہی ہیں۔ تو اگر ایسا غیر فطری ماحول ہو تو الگ ہی رہیں تو اچھا۔

س: پہلے بچے کی پیدائش۔۔۔؟

ج: میرے چاروں بچے میری امی کے گھر ہوئے۔ میرے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں تو سسرال والے جب اپنا کام وقت پہ نہیں کرتے تو میرا اور بچّے کا کیا کرتے نہ ہی وہ زیادہ پُرجوش ہوتے ہیں۔

س: سسرال میں مقام؟

ج: جب پورا گھر سنبھالا، ساس، نند کو چارپائی پہ بٹھا دیا تھا تو سب خوش تھے۔ مقام بھی تھا پھر بچے کے ساتھ، ظاہر ہے کاموں کا ٹائم ٹیبل بھی بدل جاتا ہے مگر سب کے خیال میں، میں ایک مشین ہوں، تو کام کرتی، مقام ہوتا، نہ ہو پاتا تو مقام ختم، سارے ہی رشتے مطلب کے ہیں نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

س: شوہر سے تعلقات؟

ج: شروع میں اتنی سمجھ دار نہیں تھی نہ یہ جانتی تھی کہ ان کی نیچر کیسی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ پتا چلا کہ میں تو ریت کی دیوار کے سائے میں ہوں، اکیلی ہوں، کوئی ایک لفظ میری ذات کے لیے بولنے والا نہیں ہے، نہ تھا نہ ہوگا، میں اپنی ذات میں تنہا ہوں، تو شوہر سے تعلقات دوستانہ نہ عاشقانہ رہے، دل ہی مر گیا اس میں تمام امنگیں، جذبے بھی ختم، پھر آخر میں زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

میری تمام بہنوں اور والدین سے گزارش ہے کہ بیٹی کی شادی کرتے وقت سسرال کا ماحول دیکھیں کہ وہاں بیٹی اور بہو کا کیا مقام ہوگا۔ شادی کے بعد بیٹی کا اصل گھر شوہر کا ہوتا ہے مگر اس کو اپنا گھر بنانے، سجانے میں کوئی تعاون نہیں کرتا، شوہر بھی نہیں۔ جو عورتیں ساس کے عہدے پہ فائز ہیں ان سے درخواست ہے کہ بہو کو اہمیت دیں، گھر کا مان دیں اور بیٹیوں کو شادی کے بعد اپنا گھر بنانے کی نصیحت دیں ورنہ نہ بیٹی کا گھر آباد ہوگا نہ بہو، بیٹے کا اور مجھ جیسی حساس اور جذباتی لڑکیاں تو کڑھ کڑھ کے اپنا آپ ختم کر لیتی ہیں۔

یہ بھی دیکھیں کہ شوہر مضبوط شخصیت کا مالک ہو۔ اور مالی طور پہ بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہو۔

عفت سحر طاہر

خوشبو کا سفر

انیسویں قسط

آسان راستہ ہویا دشوار ' مسترد
اے عشق تیرا فلسفہ بے کار' مسترد

لوگوں کی عام تام سی تخلیق،، واہ واہ
میرے تراشے سارے ہی شاہکار مسترد

میں تیرے ہاتھ لگ گئی مالِ غنیم سی
پھر تیرے ہاتھ سے ہوئی ہر بار مسترد

جلنے دو جسم دھوپ میں اب ضد کی بات ہے
وہ گھر تو کیا،، وہ سایہ دیوار مسترد

زندہ ہیں لوگ بس ذرا مردہ ضمیر ہیں
اے زیست تیرے جینے کے معیار مسترد

نمیر کی کال نے شاپنگ کرتی سومیہ کو حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ اس نے شاپنگ بیگز دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے موبائل شانے اور کان کے بیچ پھنسایا اور کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے لگی۔

" کیسی ہو۔۔؟"

" ہوں۔۔ٹھیک تم سناؤ" کافی وقت کے بعد ہونے والی بات چیت نے دونوں کے مابین ایک تکلف کی فضا قائم کردی تھی۔ وہ پرس شولڈر بیگ میں رکھ کر ہاتھ میں موبائل سنبھال کر شاپ سے باہر نکل آئی۔

" کہاں ہو اس وقت۔۔۔مل سکتی ہو؟"

"ہوسٹل سے باہر ہوں"

" کہاں ہو۔اپنی لوکیشن بتاؤ میں پک کرلیتا ہوں تمہیں"۔ وہ بولا۔ شاپنگ سینٹر سے باہر نکل کر رکشے کی تلاش میں نظر دوڑاتی سومیہ نے گہری سانس بھری۔

" کیا ضروری ہے ملنا؟ کال پہ بات نہیں ہوسکتی ؟"

"نہیں ہو سکتی۔" وہ فی الفور بول کر لحظہ بھر کو چپ ہو گیا۔ پھر اضافہ کیا۔

"لیکن اگر تم نہیں ملنا چاہتیں تو تمہاری مرضی ہے۔" سومیہ نے اسے اپنی لوکیشن بتا کر کال کاٹ دی۔ اور شاپنگ مال کے احاطے میں موجود گھاس کے چھوٹے سے قطعے میں نصب دو بینچوں میں سے ایک پر آ بیٹھی۔ ذہن اسی پزل کو حل کرنے میں مصروف تھا کہ نمیر کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ وہ اگلے پانچ منٹوں کے بعد وہاں پہنچ چکا تھا۔ گاڑی سے اتر کر سومیہ کی طرف آتے۔۔۔۔ سومیہ نے دیکھا وہ کتنا شاندار نظر آ رہا تھا۔ وہ اس سے نظر پھیر گئی۔ (اونہوں۔۔ کسی کی چیز)

"کچھ کھانا ہے تو اندر ریسٹورنٹ بھی ہے۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ سومیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ لنچ کر کے نکلی تھی میں" ۔ نمیر نے اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگز لے لیے۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی کی طرف بڑھی۔ وہ اسے آئس کریم پارلر لے گیا۔ معروف آئس کریم کے دو کپ سامنے رکھے وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ اسے مہرماہ کی بے وقوفی کی تمام کہانی سنا چکا تھا۔

"تو اس صورت حال میں اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم نے اس کے سامنے حالات ہی ایسے بنا دیے ہیں کہ وہ کسی بھی طرح تم سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ تبھی تو کیسے بھی کر کے اس بلیک میلر کو پیسے تک دے آئی۔"

"تم اس سے ملو سومیہ اور ذرا عقل سکھاؤ اسے۔"

"ہاہ۔۔۔ میں تو خود ساری بازیاں ہاری ہوئی ہوں۔" وہ آئس کریم کے کپ میں یونہی چمچ ہلا رہی تھی۔ نمیر نے بے اختیار اسے دیکھا۔ تو وہ اپنی بے اختیاری پر خفیف سی ہو کر جلدی سے بات بدل کر بولی۔

"تم نے اس بے چاری کو دشمنی کی اس جنگ میں استعمال کر کے محض اس کی زندگی برباد کی ہے اور کچھ نہیں۔ اس کے آغا جان کو رتی برابر بھی فرق نہیں پڑا اس نکاح سے۔ الٹا اس معصوم لڑکی کے خواب اجاڑ دیے ہیں تم نے۔"

"مانتا ہوں اپنی غلطی کو" ۔ وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ آفندی ہاؤس کے لوگ اس قدر ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ انہیں تو نکاح پر نکاح کرنا بھی گناہ نہیں لگا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سب میرے اور مہرماہ کے نکاح کی خبر اور طلال سے شادی ٹوٹنے پر تڑپ اٹھیں گے اور میرا بھی بدلہ پورا ہوگا۔ مگر آغا جان کی سفاکی تو صحیح معنوں میں اب کھلی ہے مجھ پر۔"

"ابھی تو شکر کرو پھپھو نے تمہاری حمایت میں یہ قدم اٹھا لیا۔ ورنہ اور کون تھا اس وقت ۔ موحد آفندی کے سوا جو مہرماہ کو اپنا تا اپنے نکاح میں رکھتا۔ پردہ بھی رہ گیا تمہارا۔" سومیہ نے جتایا تو وہ مسکرا دیا۔

"یہ تو ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔"

"اور مہرو۔۔۔ جائیداد حاصل کرنے کے بعد اس کا مستقبل کیا ہوگا۔۔؟"

"تم بتاؤ۔۔۔ کیا کرنا چاہیے مجھے۔۔۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میں اس کی زندگی کی ہر خوشی کو ختم کر چکا ہوں" ۔

"تمہیں چاہیے کہ اب تم اس کو اپنی زندگی کی طرف لاؤ۔" دل پر پتھر رکھ کر سومیہ نے اسے پابند کرنا چاہا۔

"اس کے مطالبے کے باوجود اسے طلاق نہ دو نمیر۔ وہ بہت معصوم اور بے قصور لڑکی ہے۔" وہ خاموشی سے آئسکریم ختم کرتے ہوئے۔ پھر ٹشو سے ہونٹ صاف کرتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"اور وہ جو نفرت اس کے دل میں بھری ہے میرے لیے۔۔؟"

"تم اس سے محبت کرنے کا سوچو نمیر۔۔۔ جلد یا بدیر سب کو محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑتے ہیں۔"

"م۔۔ح۔۔۔ب۔ت۔۔۔؟" وہ کھینچ کر بولا پھر بھنوؤں کو استفہامیہ انداز میں اچکا کر اسے دیکھنے لگا۔

"نفرت سے نکاح کر سکتے ہو تو کیا محبت کر کے اسے نبھا نہیں سکتے؟" سومیہ کی بات نے اسے لاجواب کیا تھا۔

"محبت کا تو پتا نہیں سومیہ! لیکن اتنا تو طے ہو چکا کہ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔" وہ قطعیت سے بولا تو اس کی بات سن کر سومیہ نے بے ساختہ کہا۔ "ابھی مت مانو۔ مگر اکیلے میں اپنا تجزیہ ضرور کرنا۔ تم اس سے محبت کرنا شروع کر چکے ہو۔" وہ یقین سے بولی۔ مگر نمیر ان سنی کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ اور موحد ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔"

"جو اسے اپنا ہمدرد نظر آئے گا وہ اس کے قریب ہو گی نمیر!"

"لیکن اسے سوچنا چاہئے کہ وہ میرے نکاح میں ہے۔"

"ہاہ۔۔۔ ایک ایسا رشتہ جس میں ماسوائے مفاد کے اور کوئی جذبہ نہیں' اس کے بارے میں وہ زندگی بھر کچھ اچھا نہیں سوچ سکے گی نمیر۔"

"میں اپنے کیے کا' اپنی غلطی کا مداوا کروں گا سومیہ۔ مجھے آفندی ہاؤس والوں کے رویے سے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں نے ایک غلط مہرہ چن لیا تھا"

"اب بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟"

"تم صرف یہ کرو کہ مہرماہ آفندی کی برین واشنگ کر دو نمیر کے لیے۔" وہ کرسی سے ٹیک لگائے سنجیدہ تھا۔ سومیہ بے ساختہ بولی۔

"لیکن اگر اس نے موحد کو چنا تو؟" چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔

"پھر۔ میں اس کی زندگی سے نکل جاؤں گا سومیہ!" توقف کے بعد وہ اٹل لہجے میں بولا تو سومیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

نمیر سے بات ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔۔۔

اور اب۔۔۔ گزرے تین دنوں سے اب تک وہ مسلسل اسی ادھیڑ بن میں تھی۔۔۔ اسے اپنے دل پر پیر رکھنا چاہیے یا نمیر آفندی کے؟

☆☆☆

مہرماہ متحیر تھی۔ موحد کا زرنگار سے اتنا التفات؟ اسے دھیان آیا۔ شاید موحد نے یہ نرم دلی اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ ثمرہ بھی تو زرنگار اور وقار کی حمایت کرتی رہتی تھیں۔ لیکن زرنگار کے چہرے پر پہچان کے کوئی تاثرات نہ تھے۔ وہ تو بس چپ چاپ سی کھڑی موحد کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔۔ مہرماہ نے نگاہ کا زاویہ بدلا۔

(سارے تاثرات تو موحد آفندی کے چہرے پر تھے)

"تم۔۔۔۔؟" زرنگار نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچے تو موحد کو پہلی بار جیسے مہرماہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لیکن زرنگار کے اس ایک لفظ میں مکمل سوال چھپا تھا۔ وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں۔۔۔ بھی آپ کا بیٹا ہوں ماں جی۔۔" ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر موحد نے شدت جذبات سے کہا۔ مہرو کا منہ حیرت سے کھلا۔ لو جی میری ساس ان کی ماں ہو گئیں۔

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ کوئی آتا تو تھا ملنے مجھے۔۔۔ یاد نہیں۔۔۔ یہ کون ہے؟" زرنگار نے الجھے لہجے میں

کہہ کر پھر مہرو کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس نے گہری سانس بھر کر مہرو کو دیکھا۔ جس کے اعصاب اپنے ممکنہ تعارف کو سوچ کر تن گئے تھے۔ (نمیر کی بیوی۔۔ آپ کی بہو یہی کہتا وہ)

"یہ۔۔۔" وہ تیکھی نگاہ مہر ماہ پر ڈال کر لحہ بھر کو رکا پھر کاٹ دار لہجے میں بولا۔

"یہ آپ کے دشمنوں کی بیٹی ہے" مہر ماہ بھک سے اڑی۔ کیا تعارف کروایا تھا موصوف نے۔

"میرے دشمن۔۔۔؟ مگر میرا تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے بیٹا" وہ ان کا ہاتھ تھام کر بستر کی طرف بڑھا۔

"آپ اب یہیں رہیں گی تو میں آپ کو آہستہ آہستہ آپ کے سب دشمنوں کے بارے میں بتاتا رہوں گا۔" انہیں بستر پر بٹھایا۔

"فضول باتیں مت ڈالو ان کے ذہن میں موحد۔" وہ ناگواری سے بھنچے لہجے میں بولی۔ موحد پلٹ کر تیکھی نظروں سے مہر ماہ کو دیکھنے لگا۔

"تو کیا غلط ہے اس میں۔ لیکن اگر تم دوسرا تعارف ہی کروانا چاہتی ہو تو میں وہی کروا دیتا ہوں۔" اس نے چبا چبا کر کہا تھا۔ مہر ماہ چپ رہ گئی اب وہ کون سا اتنا معتبر تعارف تھا کہ مہرو اس کے حوالے سے پہچانے جانے کی متمنی ہوتی۔

"اس گھر میں ان کی حیثیت کا تعین کرانا ہے موحد۔۔۔ یقین کرو وہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ ہے" کچھ سوچ کر وہ جوش سے بولی تو موحد بیزار نظر اس پر ڈال کر گہری سانس بھرتا زرنگار کو دیکھنے لگا۔ ان سے انسیت کی پھوٹتی شعاعوں کو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ آغا جان کو بتانا ناگزیر تھا سہیل آفندی نے اس بار پہل کی۔ ان کو تو سب کچھ ہاتھوں سے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ آغا جان پہلے تو بے یقینی کے عالم میں بیٹھے رہ گئے پھر اتنی اونچی آواز میں دھاڑے کہ آفندی ہاؤس کے در و دیوار لرز گئے۔

"اور تم۔۔۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوا موحد۔۔ ثمرہ؟" جانے وہ غصے میں زیادہ تھے یا بے یقینی میں۔ موحد سینے پر بازو لپیٹے خاموش کھڑا رہا۔ اس سوال کا جواب ثمرہ نے دیا تھا۔

"مجھے آج سے پندرہ سال پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا آغا جان!" ان کے تحمل سے دیے گئے جواب نے آغا جان کے ضبط و برداشت کی دھجیاں اڑا دیں۔

"مگر مجھے ہے اعتراض۔۔ آج سے پندرہ سال پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اسی شد و مد سے۔"

پھر انہیں مہرو کی خبر لینے کا دھیان آیا۔ وہی لڑکی اس سارے فساد کی جڑ ثابت ہو رہی تھی۔

"مہرو کہاں ہے میں اس سے پوچھوں۔ کہاں سے یہ فتنہ اٹھا کر گھر لے آئی ہے وہ؟"

"نامساعد حالات سے گزر کر وہ دوبارہ آپ کے در پر آ ہی گئی ہے آغا جان تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے ہم لوگ پندرہ سال پہلے ہوئی غلطی کا مداوا کر لیں۔ اور اللہ جب غلطی کا مداوا کرنے کا موقع دیا کرتا ہے تو وہ بڑے نصیب کی بات ہوا کرتی ہے۔"

"غلطی۔۔۔؟" انہوں نے پھولتی سانسوں کے ساتھ گرج کر یوں دہرایا جیسے اس لفظ کا نام پہلی بار سنا ہو۔ پھر تنفر سے بولے۔

"آغا ذوالفقار نے آج تک کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

"لیف آغا جان (بہت ہو گیا)۔۔۔" اتنی دیر سے چپ کھڑا موحد بیزاری سے بولا بھی تو کیا۔

"مہر ماہ آج بھی نمیر آفندی کے نکاح میں ہے اور یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ اس نے مجھ سے شادی پر ہامی بھر کر صرف آپ کے غلط فیصلے سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر وہ اس طرح نمیر سے چھٹکارا پانا چاہتی

ہے تو کیا مضائقہ ہے؟"

"تو یہ سب ڈراما کیا تھا تم لوگوں نے؟" ان کے اعصاب کو جھٹکا لگا۔

"آپ اسے جو بھی سمجھیں۔ لیکن الحمدللہ ہم لوگ نکاح پر نکاح کو حرام ہی سمجھتے ہیں آغا جان! اگر اس وقت آپ مہرماہ کا" کہیں بھی "رشتہ کر دینے پر تلے ہوئے نہ ہوتے تو میں کبھی موحد کا نام اس دوسرے نکاح کے لیے پیش نہ کرتی۔"

آغا جان چند لمحوں کے لیے تو کچھ کہنے سے ہی معذور ہو گئے گویا۔

"بہت خوب۔۔۔" چند لمحے لگے تھے انہیں سنبھلنے میں۔

"تو اب آغا کو اس طرح ایک سائیڈ پر لگایا جائے گا۔"

"صرف اس لیے یہ قدم اٹھایا کہ جس طرح ہم مہرماہ کے پہلے نکاح کی حرمت کا احساس کرتے ہیں اور کوئی نہ کرتا آغا جان۔" ثمرہ کا حوصلہ قابل دید تھا۔ اتنی بات اور کوئی بہو آغا جان کے سامنے نہ کر پاتی تھی۔

"بکواس بند کروا اپنی۔۔۔ تم۔۔۔ تم لوگ آغا کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔۔۔ اور آج اس گناہوں کی پوٹلی کے غلیظ قدم پھر سے میرے گھر میں آ گئے۔ گولی مار دوں گا میں مہرو کو بھی۔ قصہ ہی تمام ہو اس نکاح کا۔ مگر اپنی برسوں کی بنائی عزت پر داغ نہیں لگنے دوں گا۔"

"عزت اللہ بنایا کرتا ہے آغا جان۔ نمیر کی قسمت میں اس گھر کا داماد بننا لکھا تھا۔ اس کی قسمت میں تھا کہ آپ کی پوتی اس کی بیوی بنے۔ اب اگر اس کی قسمت میں یہ زمین و جائیداد بھی ہے تو ہم تو کیا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا" موحد کا لب و لہجہ پرتپش تھا۔ آغا جان کا تو پورا وجود ہی بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

"ابھی میں زندہ ہوں موحد! اور میرے جیتے جی وہ املاک میں حصہ داری کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔"

"بہرحال۔۔۔ میں نمیر آفندی کا قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔" موحد کا انداز قطعی تھا۔

"اس کی ماں اس گھر میں آ گئی ہے۔ تو وہ بھی اس کے پیچھے آئے گا آغا جان! تب یہ سب حساب اسی سے چکتا کر لیجیے گا۔ اس کی منکوحہ ہے یہاں۔"

"تو یہ بات تمہیں مہرو سے نکاح کرواتے وقت معلوم نہیں تھی کیا۔؟ پھر کیوں تم اس معاملے میں آئے۔ میں کہیں بھی اس کی شادی کروا دیتا۔"

"اسی مزید خطا سے بچایا ہے آپ کو آغا جان"۔ موحد نڈر ہو کر بولا۔

"موحد۔۔۔" آغا جان بولے نہیں دھاڑے اور ساتھ ہی ان کا ہاتھ اٹھا مگر موحد اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا ثمرہ نے ہی بے اختیار اس کا بازو تھام کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اب تم لوگ مجھے بتاؤ گے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔"

"اب وہ یہیں رہیں گی۔ جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا"۔ موحد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ورنہ ان کے ساتھ پندرہ سال پہلے کی طرح ہم بھی دوبارہ اس گھر سے نکلیں گے آغا جان! لیکن اس بار کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔"

وہ دونوں ماں بیٹا جا چکے تھے۔ آغا ذوالفقار اپنی کرسی پر ڈھے سے گئے۔ ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تو کیا ان کے مات کھانے کے دن آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کو اٹھا کر دیکھا۔

"تو کیا یہ ہاتھ اب کمزور ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے پوتے پر اٹھنا گوارا نہیں کیا۔ ایسی کمزوری تو میں نے وقار آفندی کی بار بھی محسوس نہیں کی تھی" ان کا ذہن سنسنا رہا تھا۔

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے موحد۔وہ سامنے آئے گا تب ہی تو یہ تماشا ختم ہوگا۔ورنہ تو یونہی آنکھ مچولی چلتی رہے گی ساری عمر۔اور سزا۔۔۔۔۔۔میں خود سخت سزا دوں گا اسے۔دنیا تماشا دیکھے گی اس کا۔"انہوں نے تپتے ذہن کو مثبت کرنا چاہا تو بلند فشار خون کو واپس اپنی جگہ پر آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

"آغا جان! آپ کل کے اس بچے سے مات کھا گئے۔اس کی بکواس پر غور مت کریں۔یاد نہیں ثمرہ اور فاران بھی ایسے ہی وقار کی حمایت کیا کرتے تھے۔انہیں تو شروع ہی سے اس گندگی کا احساس نہیں تھا جو وقار نے اپنے دامن پر سجالی تھی"۔سہیل آفندی کے منہ میں سائرہ چچی کی زبان بول رہی تھی ورنہ آغا جان کے سامنے بات کرنے کی ان کی مجال نہیں ہوتی تھی۔

"میں کمزور نہیں ہوا سہیل! مسئلہ صرف یہ ہے کہ مجھے فاران کے بیٹے سے محبت بہت ہے۔شاید اس لیے کہ اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔اللہ نے ایک ہی پوتا دیا ہے،اسی لیے اس کی نادانیاں نظر انداز کر دیتا ہوں"انہوں نے پتا نہیں کس رو میں اعتراف کر لیا تھا۔مگر پھر ایک دم چپ سے ہو گئے۔

"کیا اب نمیر کا حوصلہ نہ بڑھے گا،کس دیدہ دلیری سے اس نے اس گھر میں انٹری دی ہے۔مہر ماہ سے نکاح کر کے شب خون مارا اور اب اپنی ماں کو بھیج دیا۔اور میں تو مہر ماہ کو بھی قصوروار کہوں گا آغا جان! اب کیا ہم اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اس بے نام ونشان شخص کے ہاتھوں بلیک میل ہوں گے۔"

"تھوڑا ہی وقت ہے سہیل! غصہ تو مجھے بھی بہت آیا تھا مگر پھر سوچا کہ ایک بار اس شخص کو سامنے آلینے دو پھر سارے حساب کتاب چکتا ہو جائیں گے"۔آغا جان نے دبنگ لہجے میں کہا۔

"تو پھر موحد اور ثمرہ بھابی کو مہرو کے نکاح کا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"وہ جلبلا کر بولے۔آغا جان نے ہنکارا بھرا۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔اب تو اس وقت کا انتظار ہے جب یہ سارا ڈراما ختم ہوگا۔"

آغا جان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اب اس معاملے پر مطمئن تھے۔سہیل آفندی دل مسوس کر رہ گئے۔

مگر کمرے میں آتے ہی سائرہ چچی شروع ہو گئیں۔

"بس آپ اسی طرح سر جھکا کر باتیں سن کر آجایا کریں سب کی۔ایک موحد آفندی کم تھا جو اب نمیر کی اماں کو لے آئی مہرو۔مجھے تو۔۔لگتا ہے کہ مہرو بھی اس سارے کھیل کا حصہ ہے۔"

"خدا کو مانو۔وہ بے وقوف تھی جو اپنی اچھی بھلی زندگی برباد کر لیتی۔"

"ساری عمر لگا دی آپ نے اس کاروبار پر۔ایک پوتے کو تو پہلے ہی آغا جان نے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔دوسرے کو بھی کہیں سینے سے لگا لیا تو آپ تو بس ہاتھ ہی ملتے رہ جائیں گے۔"چچی جان نے منٹوں میں سارا تجزیہ کر کے رکھ دیا تھا۔

"اری نیک بخت! ذرا دم تو لو۔ایک تو تم عورتوں کی فکریں بھی نا۔"وہ جھنجلا گئے۔اپنی ہمت تو اتنی تھی ہی نہیں۔بیوی کے ہمت بندھانے پر ہمت کر بھی لیتے تو دلائل میں اتنا دم نہیں ہوتا تھا کہ آغا جان کو اپنی سوچ پر ڈھال لیتے۔

"زرنگار کو جس طرح ثمرہ نے سینے سے لگایا ہے میں تو حیران رہ گئی۔ویسے صدیقہ بھابی کا غرور اللہ نے اچھی طرح توڑا ہے۔جس کو بے نام ونشان ہونے کے طعنے دیتی رہیں وہی ان کا داماد بن گیا۔"

"اللہ کی پناہ مانگو سائرہ! بہت کڑا امتحان پڑا ہے ان پر"۔

"ہونہہ۔۔۔جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔۔۔اب تو موحد مٹھی میں ہے ان کی۔داماد ہے جب اور جتنا جی چاہے

نکلوائیں اس سے۔" وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔
"اب ایسی بھی لوٹ نہیں مچی ہوئی۔ وہ کل کا بچہ سہی مگر اس نے بزنس کو رشتہ داری سے بالکل الگ رکھا ہوا ہے" انہوں نے باور کرایا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے بیڈ شیٹ جھٹکنے لگیں۔

☆☆☆

"یہ لو۔۔۔۔" موحد نے کاغذات کی ایک فائل دراز سے نکال کر ٹیبل کی سطح پر پھینکی۔ اس کے مقابل بیٹھے شخص کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ اس نے بے اختیار آگے جھک کر وہ فائل اٹھا کر کھولی اور پھر اختیار موحد کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔
"میں اپنے وعدوں کا بہت پکا ہوں الحمدللہ"۔
"میں جانتا ہوں۔"
"تم نے بہت ساتھ دیا ہے میرا۔ تمہارے بنا کچھ بھی ممکن نہیں تھا" موحد نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔
"تم اب بھی کسی موقع پر مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے"۔ وہ اٹل انداز میں بولا۔ تو موحد کچھ سوچ کر ذرا آگے کو جھکا۔
"اور۔۔۔۔ اور کچھ؟ کسی اور معاملے میں میری فیور؟"
وہ چونک کر موحد کو دیکھنے لگا۔ (وہ کیا پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا) اس نے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا اور فائل اٹھا کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ایک بار پھر بہت شکریہ"۔ موحد نے مسکراتے ہوئے ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائی اور ہلکے ہلکے جھولتے ہوئے محظوظ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
"میری آفر لانگ ٹرم (لمبے عرصے کے لیے) ہے۔ تم جب چاہو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو"۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے موحد کی مسکراتی ہوئی آواز سنی تھی۔ اس کے قدم ایک بار پھر ٹھٹکے مگر وہ رکا نہیں تھا۔

☆☆☆

آغا جان نے زرنگار کو اس کے بیڈ روم تک محدود رہنے کا حکم دیا تھا (جہاں اب مہروان کے ساتھ شفٹ ہو گئی تھی)
سومیہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی تو زرنگار کے بالوں کو برش سے سلجھاتی مہر ماہ چونکی۔
"اسلام وعلیکم۔۔۔۔ کیسی ہو؟" مہر ماہ اٹھ کر خوش دلی سے ملی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی جب سومیہ زرنگار سے گلے مل کر بڑی بے تکلفی سے ان کا حال پوچھنے لگی۔ جیسے پہلے بھی ان سے ملتی رہی ہو۔
"تم۔۔۔ انہیں جانتی ہو؟" مہر ماہ سے رہا نہیں گیا تو حیرت اور بے یقینی سے پوچھ ہی لیا سومیہ ٹھٹکی۔ دفعتاً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ یہاں نمیر کی دوست نہیں بلکہ موحد آفندی کی کزن کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس کا زرنگار سے التفات مہر ماہ کو تو انوکھا لگنا ہی تھا۔
"بھئی یہ آنٹی تمہارے کمرے میں ہیں تو تمہاری کچھ لگتی ہی ہوں گی نا۔" وہ سنبھل کر مسکرائی۔
"یہ بھی میری چچی ہیں۔"
سومیہ نے ہونٹ سکیڑے۔
"نمیر کی والدہ"۔
مہر ماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"گڈ ڈیسیون (اچھا فیصلہ)"۔
مہرماہ نے ان کے بال چٹیا میں لپیٹے اور انہیں لیٹنے کا کہہ کر سومیہ کے ساتھ ثمرہ کے کمرے میں آگئی۔
"موحد کیسا ہے؟" اس کے پوچھنے پر مہرماہ کو یاد آیا شاید وہ موحد کو پسند کرتی تھی مگر درمیان میں مہرو آگئی تو وہ سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا تھا۔
"ٹھیک ہی ہوگا" مہرو نے شانے اچکائے۔ "میرا اس سے کیا واسطہ"۔
"ظاہر ہے جیسے حالات جا رہے ہیں اس سے واسطہ ہو بھی نہیں سکتا"۔ سومیہ نے سمجھ کر سر ہلایا۔
"لیکن زندگی ایسے بھی تو نہیں گزر سکتی نا"۔ اس نے مہرماہ کو گہری نظر سے دیکھا۔
"بس اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ ایک بار آغا جان ثمیر کو اپنا خون تسلیم کر لیں تو پھر میں آزاد ہو جاؤں گی"۔ وہ پر امید تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے تمہارے آغا جان اس کی حیثیت تسلیم کر لیں گے؟" مہرماہ نے اس کی بات پر سوچ کر نفی میں سر ہلایا۔
"لیکن تم یہ کام بہت آسانی سے کروا سکتی ہو مہر!" سومیہ نے آہستہ سے کہا مہرماہ بری طرح چونکی۔
"میں۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی آغا جان نے اس پورشن تک محدود کر دیا ہے"۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح تمہیں اپنی من مانی کا موقع مل سکتا ہے"۔
"جتنی من مانی کر چکی ہوں نا۔۔۔ شکر ہے اسی پر آغا جان نے گولی نہیں مار دی"۔ وہ اداسی سے بولی۔
"میرے خیال میں تو بس تم ہی ہو جو ثمیر کو اس گھر میں اس کی حیثیت دلوا سکتی ہو"
"میں۔۔۔؟۔۔۔ میں تو بس اس انتظار میں ہوں کہ کب اس بندے سے میری جان چھوٹے۔ ایک بار بس وہ اپنے بل سے باہر نکل آئے۔ آغا جان سے اس کا سامنا ہو جائے"۔ مہرماہ نے دعا کی۔
"ہو سکتا ہے وہ اتنا برا نہ ہو مہر! وقت اور حالات اکثر لوگوں کا منفی چہرہ دکھاتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ خود زمانے کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں"۔
"میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی کی خوشیاں چھین لیں مجھ سے۔ امتحان بنا دیا ہے میری زندگی کو۔ بنا قصور کے سزا دی ہے اس نے مجھے"
"اللہ ہم میں سے کسی ایک کو چن لیا کرتا ہے آزمائش کے لیے مہر! اور وہ اللہ کا بہت پیارا بندہ ہوتا ہے"
"کاٹ تو رہی ہوں آزمائش۔ بنا کسی قصور کے"۔ وہ خفگی سے بولی۔
"میرا تو مخلصانہ مشورہ ہے مہر! اس کی زخمی انا کو تسکین کسی کے ہمدردانہ رویے سے ہی مل سکتی ہے۔ اور تم مانو یا نہ مانو تم سے زیادہ قریبی رشتہ اور کسی کا نہیں اس کے ساتھ فی الحال"۔
"کیسی ناممکن باتیں کر رہی ہو سومیہ۔۔۔ نفرت ہے اس شخص سے مجھے۔" وہ خفت سے لال ہوتا چہرہ لیے خفگی سے بولی۔
"بعض لوگوں سے مل کر ہی یہ حقیقت کھلتی ہے کہ درحقیقت وہ" کس قابل "ہیں مہر!" سومیہ آخری بات کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مہرماہ الجھی ہوئی سی اس کے ساتھ دروازے تک آئی۔
"کسی بھی بھٹکے ہوئے انسان کی واپسی کا راستہ بند نہیں ہوا کرتا مہرماہ! بعض اوقات بھٹکے ہوئے لوگ کسی اپنے کی آواز کے منتظر بھی ہوتے ہیں۔ مگر مخلص شرط ہے۔"
سومیہ چلی گئی تھی مگر اس کی آخری بات مہرماہ کے ذہن پر ابھی تک دستک دے رہی تھی۔

☆☆☆

موحد آفس جانے سے پہلے زرنگار کو الوداعی طور پر ملنے اور حال پوچھنے آیا تھا۔ انہوں نے حسب عادت بنا پہچانے بے ریا سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دروازے کی طرف مڑا تو مہر ماہ کی طنزیہ آواز نے قدم روک لیے۔

"میری ساس کے ساتھ تمہارے اس قدر التفات کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" اپنی طرف سے اس نے بہت کڑا طنز کیا تھا۔ موحد ایڑیوں پر گھوم کر اس کی طرف مڑا۔ ابرو کو استفہامیہ اچکایا۔ پھر چبا کر بولا۔

"میرے خیال میں ان سے میرا ابھی ایک الگ سے رشتہ ہے مہر ماہ آفندی!" پھر جیسے وہ ٹھنڈا پڑا کچھ سوچ کر۔

"ویسے اچھا لگا یہ جان کر کہ تم اپنے اور ان کے "اصل" رشتے کا تعین کر چکی ہو" مہر ماہ پر تو جیسے کسی نے یک لخت ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو۔ موحد کے ہونٹوں پر آئی محظوظ سے مسکراہٹ نے اس کا خون کھولا دیا۔

"شٹ اپ۔۔"

"شکریہ"۔ وہ تعظیماً ہلکا سا جھکا اور یونہی مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ مہر ماہ کا جی چاہا سر دیوار پر دے مارے۔ اپنی زبان کو بھی کوسا ضرورت ہی کیا تھی اس کھڑوس کے سامنے بولنے کی۔

اس نے انتقاماً سومیہ کی کہی باتوں کو پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ جو رات ہی سے بار بار اس کے ذہن کے کواڑ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

"زندگی تمہاری برباد ہوئی تھی مہر! لیکن اس کے بعد نہ تمہارے والدین نے تمہیں اس طرح سپورٹ کیا جیسے کرنا چاہیے تھا اور آغا جان نے بھی تمہارے زخموں پر پھاہا رکھنے کے بجائے نمیر سے اپنی دشمنی نبھانا زیادہ ضروری سمجھا۔"

سومیہ کا لب و لہجہ ہمدردی لیے ہوئے تھا۔

"نمیر سے بات کرو۔۔۔ تم چاہے اسے ساری عمر معاف مت کرنا۔ مگر دربدری کے ان چودہ سالوں کے زخم تو دیکھ لو اس کے وجود پر۔ پھر شاید وہ بری بھی ہو جائے تمہاری عدالت سے"۔

اس نے گہری سانس بھر کر یا سیت سے ایک ہی جگہ بت بنی بیٹھی زرنگار کو دیکھا۔ یہ عورت اسے بہت قابل ہمدردی لگی تھی۔

طوائف۔۔ ناچنے گانے والی۔۔۔۔ یہ سب تو محض زمانے کے دیے ہوئے نام ہی ہوا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی ان کی آنکھوں میں سے ان کی روح میں جھانکنے کی سعی کرے تو کیا کیا روح پرور کہانیاں ملیں۔

مہر ماہ کا ذہن الگ ہی اڑان بھر رہا تھا اگرچہ دل اس پر مطمئن نہیں تھا۔ مگر اس کے دماغ میں گونجتی آوازیں۔۔۔

"اگر تمہیں اس معاملے پر منصف بنا ہی دیا گیا ہے مہر! تو دوسری طرف کا دکھ بھی سن لینا فیصلہ کرنے سے پہلے۔ ہو سکتا ہے اس کے زخم تم سے زیادہ گہرے ہوں۔"

مہر ماہ نے تھک کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

موحد کا برتھ ڈے ثمرہ چچی بہت اچھی طرح سیلیبریٹ کرنا چاہتی تھیں۔ تو گھر میں ایک بہت خوش گوار سی ہلچل پھیل گئی۔ اب تو ترس ترس کر اس گھر میں خوشیاں آئی تھیں۔

"کوئی بھی موحد کو مت بتائے۔ اسے کبھی بھی یاد نہیں رہتا" انہوں نے مسکراتے ہوئے سب کو تنبیہہ کی

تھی۔اوراب تحفے تحائف خریدنے اور کچن کا مینیو ترتیب دینے کا کام شروع ہو چکا تھا۔
"آپی! تم کیا دے رہی ہو موحد بھائی کو؟" ملاحہ نے مسکرا کر پوچھا۔مہر ماہ نے نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔
"ہر چیز پر تو آتے ہی قابض ہو گیا ہے تمہارا موحد "بھائی" اب اس کی شایان شان کوئی اور چیز ہو سکتی ہے کیا"؟
"آپی۔۔۔۔" ملاحہ نے احتجاجاً کہا۔
"جب اللہ بن مانگے خوشی کے چھوٹے چھوٹے مواقع دے رہا ہو تو اپنی قنوطیت کو چھوڑ کر خوش ہو لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا"۔
"اچھا بھئی۔۔۔۔لے لیں گے تاج محل کا مجسمہ تمہارے موحد بھائی کے لیے۔اب خوش؟" مہر ماہ جس طرح اکتا کر بولی اس پر ملاحہ خوش تو کیا ہوتی' جل بھن کر وہاں سے اٹھ ہی آئی۔
(بھلا مجھے ان خوشیوں سے کیا مطلب) وہ یاسیت زدہ ہو رہی تھی۔
کوریڈور سے گزرتی ملاحہ کے قدم کبیر کو آغا جان کی اسٹڈی سے نکلتے دیکھ کر سست پڑے تو وہ کھل کر مسکرا دیا۔
"کیسی ہیں؟"
"بہت پیاری۔۔۔" ملاحہ نے ذرا سی ناک چڑھائی اور زور دے کر بولی۔"تم سناؤ تم کیسے ہو کبیر خان! اور اتنے کم کم کیوں نظر آتے ہو آج کل"؟ اس کی ادا پر کبیر بے ساختہ ہنسا۔پھر محظوظ ہو کر بولا۔
"آپ کے اول دعوے سے تو قطعاً اختلاف نہیں کروں گا۔"
"اور وہ کم کم نظر آنے والی بات؟" وہ گردن اٹھا کر بات کرتی تھی۔آنکھوں کو مخصوص انداز شاہانہ سے جنبش دے کر۔کبیر کے جی میں آئی کہ دل تھام لے۔
"زیادہ زیادہ دیکھنے کے لیے کچھ جملہ حقوق ہوتے ہیں ملاحہ آفندی! بس وہ کبیر خان کے نام کرنے ہوں گے۔پھر آپ کی یہ شکایت دور ہو جائے گی۔" بے اختیار بولا تو ملاحہ کی تمام طراری اس کے لفظوں کی گہرائی سمجھ کر پہلے تو خجالت میں بدلی پھر چہرے سے نکلتی تپش اور کبیر خان کی شوخ نگاہ پر فی الفور اڑنچھو ہو گئی۔وہ اس کی چپ بھانپ کر کوریڈور کا دروازہ کھولتا باہر نکل گیا تو زیر لب ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔
"اُف۔۔۔" ملاحہ نے قدرے حیران ہو کر تپتے گالوں پر دونوں ہتھیلیاں جمائیں۔
"تو اب میں کبیر خان سے شرمایا کروں گی۔۔۔اللہ اللہ۔۔۔" پھر دھیرے سے ہنس دی۔تائی جان جو دور سے اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کی جھری سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔انہیں کبیر اور ملاحہ کی ایک بھی بات کی سمجھ نہ آئی تھی مگر ان کا بے تکلفانہ انداز اور بے وجہ سرراہ گفتگو۔۔۔۔۔وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بستر پر گر سی گئیں۔رنگت منٹوں میں سفید پڑ گئی تھیں۔
(میرے اللہ۔۔۔ایک بیٹی بے خبری میں برباد ہو گئی اور یہ دوسری جان بوجھ کر کیچڑ میں منہ مارنے والی ہے؟؟)
ان کی سوچ میں وہی پندرہ برس پہلے والی گراوٹ ہی تھی۔انسانوں کو انسان نہ سمجھنا۔مگر یہ اللہ ہی ہے جو بندے کو سارے رنگ دکھایا کرتا ہے۔
وہ ملاحہ کی اچھی طرح کھنچائی کا سوچ رہی تھیں۔
"شاید ان کے درمیان ایسا کچھ نہ ہو مگر جیسے میرا دل ڈر گیا ان کو بے تکلفی سے بات کرتے دیکھ کر ایسے کسی اور کو بھی تو غلط فہمی ہو سکتی ہے۔میں اس ملاحہ کی تو خبر لوں گی ہی۔مگر کبیر کا اندر آنا جانا بھی بند کروانا پڑے گا"۔وہ مضطرب دل کو تاویلیں دے رہی تھیں۔

☆☆☆

آپ کو پتا ہے آپ کا ایک بیٹا بھی ہے؟" مہرماہ چاہتے ہوئے بھی زرنگار سے نفرت نہ کر پائی تھی۔ثمرہ اسے وقار آفندی اور زرنگار کی ساری کہانی سنا چکی تھیں۔اب ایسے میں بھی وہ زرنگار سے نفرت کا رشتہ قائم کر لیتی تو یہ واقعی ظلم ہوتا۔

"ہاں۔۔وہ کہتا تو تھا۔جو مجھ سے ملنے آتا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولیں۔مہرماہ کا دل زور سے دھڑکا۔

"آپ اسے پہچانتی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔جس سے ملیں اس کی پہچان تو ہو ہی جاتی ہے"۔وہی لاپرواہ سا انداز۔

"کیا نام تھا اس کا بھلا۔۔۔؟" مہرماہ کے سوال پر ان کی سیاہ آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔

"وہ بتاتا تو ہے ہر بار آکر۔مگر مجھے یاد نہیں" قدرے سوچ کر وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔مہرماہ مایوس ہوئی۔مگر پھر بھی اس نے آخری کوشش کی۔

"نمیر۔۔۔نمیر آفندی۔یہی نام بتاتا تھا نا وہ؟"

مہرماہ کو کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی مگر وہ پلٹے بنا زرنگار کو منتظر نگاہوں سے دیکھتی رہی۔

"پتا نہیں۔۔۔یاد نہیں مجھے" وہ بولیں پھر دروازے کی طرف نگاہ کی تو بے ساختہ مسکرا دیں۔

"لو۔۔۔آ گیا وہ۔تم اسی کا پوچھ رہی تھیں نا۔"

مہرماہ کا دل پوری قوت سے سکڑ کر پھیلا۔اس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں چہرہ موڑ کر نا صرف مضطربانہ انداز میں۔دروازے میں موجود شخص کو دیکھا بلکہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑی بھی ہو گئی۔

☆☆☆

ملاحہ چائے لے کر آئی تو بہت خوش گوار موڈ میں تھی۔گرم سویٹر پر خوش رنگ شال اوڑھے وہ جلدی میں تھی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" تائی جان نے سنجیدگی سے بیٹی کا چہرہ ٹٹولا۔وہاں وہی معصومیت تھی ہمیشہ والی۔

"میں اور فرزین مارکیٹ تک جا رہے ہیں موحد بھائی کا برتھ ڈے گفٹ لینا ہے"

"کس کے ساتھ۔۔۔؟" انہوں نے بیٹی کا چہرہ نگاہوں میں رکھا۔

"کبیر کے ساتھ امی!اور کون ہے بھلا"؟ وہ مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اترتا نرم سا تاثر تائی جان کی جہاندیدہ نظروں سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔نوجوانی کی سرخی اس کے کشمیری سیب کے سے گالوں پر چھلک رہی تھی۔اور کچھ شاید محبت کا اعجاز ہو۔

"کوئی ضرورت نہیں جوان جہان لڑکیوں کو تنہا جانے کی" انہوں نے سختی سے کہا۔تو ملاحہ حیران ہوئی۔

"امی!کبیر ساتھ ہے ہمارے"۔

"تو وہ بھی تو ڈرائیور ہی ہے نا۔" انہوں نے جانے کیا جتانا یا شاید اسے باور کرانا چاہا۔ملاحہ کا دل مٹھی میں جکڑا گیا۔

"کل میں خود چلوں گی تمہارے ساتھ۔مگر ایسے اکیلے نہیں جانا تم دونوں نے"۔

"کیا ہو گیا ہے امی۔۔۔کبیر کے ساتھ میں اور فرزین ہیں۔تین بندے اور پھر بھی اکیلے؟ یہ اچھی سائنس ہے"۔ملاحہ تو کبیر کے لیے ان کے منہ سے ڈرائیور کا لقب سن کر ہی جز بز ہو رہی تھی۔احتجاج کرنے لگی۔

"ملاحہ۔۔" انہوں نے سنجیدگی سے اسے ٹوک دیا۔"اب کیا یہی بات آغا جان کہیں گے تب مانو گی؟"

ملاحہ دنگ سی انہیں دیکھنے لگی۔جب سے کبیر خان اس گھر میں آیا تھا،ایک فیملی ممبر بن کر رہ رہا تھا۔گھر کے

اندر اس کا آنا جانا گھر کے افراد کی طرح ہی تھا۔ کوئی پردہ نہیں کوئی پابندی نہیں تو آج کیا نیا ہو گیا تھا۔؟ ملاحہ کا ذہن کھٹک سا گیا۔

"میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی امی۔۔ مگر یہ مت کہیے گا کہ کبیر خان قابل اعتبار نہیں ہے"۔ ملاحہ بے اختیار ہو کر بولی تھی۔ انہوں نے تیکھی نگاہ بیٹی پر ڈالی۔ جو کل تک انہیں بچی لگا کرتی تھی۔ مگر اس کی ایک پل کی بے اختیاری نے اس کا سارا اندر کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"وہ بس اتنا ہی قابل اعتبار ہے کہ ایک بار مہرو بھی اسی کے ساتھ گئی تھی اور وہ اپنی اتنی سی ذمہ داری بھی نہ نبھا سکا تھا۔ میری بیٹی کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی۔"

"تو یہ بات آپ کو آج یاد آئی ہے امی!" ملاحہ نے مارے صدمے کے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"تمہیں کس بات پر اعتراض ہے ملاحہ! کبیر کے ساتھ جانے سے منع کرنے پر یا اسے نا قابل اعتماد سمجھنے پر؟" وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ملاحہ کھل کر ان کے سامنے آجائے۔

"مجھے ہر بات پر اعتراض ہے امی! کبیر کو اس گھر میں کبھی ڈرائیور نہیں سمجھا گیا۔ وہ آغا جان کے دوست کا پوتا ہے"۔

"مگر ہمارا ایک ادنیٰ ملازم ہے ملاحہ" تائی جان نے یاد دلایا تو وہ سختی سے لبوں کو بھینچتی بنا کچھ کہے باہر نکل گئی در حقیقت اسے رونا آرہا تھا۔ تو یہ حقیقت تھی گھر والوں کی نظر میں کبیر خان کی۔ اور وہ سنے تو۔۔۔۔۔

* * *

موحد کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر لحہ بھر کے لیے تو مہر ماہ قوت گویائی سے محروم رہ گئی۔ پھر پلٹ کر زرنگار کو دیکھا۔ اور بے یقینی سے بامشکل پوچھ پائی۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

زرنگار گویا پریشان سی ہو کر الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

"نہیں ہے کیا؟"

مہر ماہ نے گہری سانس بھری۔

"تم کیا تفتیش کر کے پریشان کر رہی ہو ان کو" موحد اسے سرزنش کرتا ہوا آگے آیا۔

"تم۔۔۔ تمہیں اپنا بیٹا کہہ رہی ہیں یہ" مہر ماہ الجھی۔

"ہاں تو۔۔۔؟"

"تو یہ کہ۔۔۔۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ نمیر کی شکل تم سے ملتی جلتی ہو گی۔ آخر کو کزنز ہو تم دونوں" وہ قدرے جوش سے بولی۔ موحد زرنگار کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ رسان سے پوچھنے لگا۔

"یعنی تم اس کی اسمارٹنیس کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو؟"

"ہیں۔۔۔؟" مہر ماہ ہونق سی اس کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر مطلب سمجھ کر جزبز سی ہو کر اسی پر الٹ پڑی۔

"شٹ اپ۔۔۔ مجھے کیا لینا دینا اس خبیث شخص کی اسمارٹنیس سے"۔

"اچھا۔۔۔ میں سمجھا کہ۔۔۔"۔ مہر ماہ نے اسے ٹوک دیا۔ "تم کچھ مت کہو اس معاملے میں سمجھے"۔

"یہ کیوں لڑائی کر رہی ہے تم سے؟" زرنگار پریشان سی ہو کر موحد سے پوچھنے لگیں تو مہر ماہ کو غصہ کنٹرول کرنا پڑا۔

"بیوی ہے ماں جی! اسے لڑنے کے لیے کسی وجہ کی کیا ضرورت"۔ موحد نے اس قدر آرام سے توجیہہ پیش کی کہ مہر ماہ تو اچھل ہی پڑی سن کر۔

"کس قدر بکواسی ہوتم موحد!"

"دیکھا۔۔۔زبان دراز بھی ہے۔مگر میں صبر و شکر سے گزارا کر رہا ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا۔تو کچھ کہنے کو بے تاب زبان کو مہرماہ نے دانتوں تلے دبا لیا کہ موحد کی زبان درازی کا مقابلہ کرنا اس کے بس میں واقعی نہیں تھا۔

"وہ ان سے ملتا رہا ہے موحد! اگر وہ ان کے سامنے آئے تو شاید یہ اس کو پہچان لیں" مہرماہ سنجیدہ ہوئی۔

"تو۔۔۔؟ اگر وہ سامنے ہی آ گیا تو ان کی گواہی کی ضرورت ہی کیا رہے گی؟" موحد نے شانے اچکا کر اس کی بات کو کھڈے لائن لگا دیا۔وہ چپ سی ہو گئی۔

"اصل بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی اس سے ملنا چاہتی ہوں موحد!" وہ اتنی مدہم آواز میں بولی کہ موحد کو لگا سننے میں غلطی ہوئی ہو۔

"طلاق لینے سے پہلے ایک بار میں اس کو سننا چاہتی ہوں۔"

وہ ساکت سا مہرماہ کو دیکھ رہا تھا جس کے تاثرات میں کوئی الجھاؤ اور الفاظ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔اور موحد آفندی یوں چپ ہوا جیسے اس کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ بچا ہو۔"

☆☆☆

"میرا خیال ہے کہ ملاحہ کے لیے آئے رشتوں کو اب اور نہ لٹکایا جائے" تائی جان کے تو اندر دوپہر سے کھد بد جاری تھی۔میاں کے آتے ہی ان کو بتانا مناسب نہ لگا تو بات کرنے کے لیے رات سونے سے پہلے کا وقت چنا۔اتنی دیر میں یہ بھی احساس ہو گیا کہ بیٹیوں کی اس طرح کی لغزشوں کو من و عن ان کے باپ کے سامنے پیش نہیں کیا جا سکتا تو پھر بہت لپیٹ کر بات کی۔انہوں نے کتاب کھول کر عینک ناک پر لٹکاتے ہوئے استعجاب سے بیوی کو دیکھا۔

"مگر تمہیں ہی تو اعتراض تھا کہ جب تک ملاحہ پڑھ کر فارغ نہیں ہو جاتی تب تک اس بات کو نہیں چھیڑنا"۔

"ہاں۔۔کہا تھا۔مگر مہر کو دیکھ کر دل بہت ڈر گیا ہے مبین صاحب! اللہ رحم کرے ہماری بچیوں پر۔زمانہ بہت خراب ہے"۔وہ لرز کر بولیں۔

"تو پھر دیکھ لو میں کیا کہوں اب۔مگر خاندان ضرور دھیان میں رکھنا لڑکے کا۔ہر ایرے غیرے کے سامنے بیٹی کو پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں"۔انہوں نے گویا تائی جان کو فری ہینڈ دیا تو انہوں نے طمانیت محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یہ کبیر کب تک یہاں رہے گا؟ میرا مطلب ہے کہ اس کی بہنیں ہیں' کچھ اس کی شادی کا بھی سوچا ہو گا انہوں نے"۔جیسے انہیں دھیان آیا۔

"اوفوہ۔۔۔تم نے کیا رات کے اس وقت میرج بیورو کھول لیا ہے بیگم" وہ بدمزہ سے ہو کر صفحے الٹنے لگے تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ موحد کے لیے کوئی برتھ ڈے گفٹ نہیں لائی تھی۔شام کو ہال کمرے میں بڑا سا کیک اور دعوت کا اچھا خاصا ماحول دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اسے ملاحہ کی بات مان لینی چاہیے تھی۔اچھی خاصی آفر کی تھی کل اس نے تائی جان کے ساتھ مارکیٹ جاتے ہوئے۔اور اب ملاحہ' فرزین اور ثمرہ چچی نے اسے گفٹس دیئے تو وہ ہنس دیا۔

"واؤ۔۔۔سرپرائز!"

"ہمیشہ کی طرح۔۔۔" ثمرہ کی مسکراہٹ پر اداسی کا رنگ غالب تھا۔
"میرا تو سب کچھ تمہارا ہی ہے۔۔۔ مگر پھر بھی۔ جو چاہیے وہ بتادو ابھی کے ابھی مل جائے گا"۔ آغا جان نے اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ جماتے ہوئے اسے بالمقابل کیا تو وہ چند لمحے ان کو دیکھے گیا۔ آغا جان کا دل اس کی محبت سے معمور ہونے لگا۔ یہ شان دار سا پوتا ان کو اپنے تمام زخموں پر مرہم کی طرح لگتا تھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔
"آپ سے سب کچھ تو لے چکا ہوں۔۔۔ مگر یہ تحفہ ادھار رہا آپ پر آغا جان۔ وقت آنے پر مانگوں گا"۔
"وعدہ رہا۔ انکار کا لفظ نہیں سنو گے آغا کی زبان سے"۔ وہ داہنا ہاتھ اٹھا کر بولے ثمرہ نے مسکراتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ یقیناً وہ بہت ذہین تھا۔ وقت کو اپنے قابو میں کرنے کا گُر جانتا تھا۔
موحد نے کیک کی طرف رخ کرتے ہوئے اچٹتی نگاہ مہر ماہ پر ڈالی جو بڑی لاپروائی کا تاثر دیتی ملاحہ سے باتوں میں مصروف تھی۔
"خواتین و حضرات! اب اگر کوئی اور تحفہ دینے والا رہ نہیں گیا تو میں کیک کاٹ لوں۔۔؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مہر ماہ کے چہرے سے تپش کی لپٹیں نکلیں۔ یقیناً اسی کو سنایا جا رہا تھا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے کیک کاٹنے لگا۔ ہنسی مذاق باتیں۔۔۔۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی سی شام آفندی ہاؤس میں اتری تھی۔
"بہت کنجوس ہو۔ کہاں تو جا کر ایک لاکھ لٹا آئیں اور ادھر جہاں چند ہزار کا گفٹ دینا تھا وہاں ڈنڈی مار گئیں" وہ چائے کا مگ لیے لان میں چلی آئی اور ذرا دیر بعد وہ پتا نہیں کسی کام کے لیے جاتے جاتے رک کر اس کی طرف آ گیا۔ جاتے نومبر کی سرد سی شام میں وہ بہت پیاری سی مسکراہٹ لیے کہتا مہر ماہ کو زہر لگا۔ ضروری تو نہیں کہ انسان کی غلطی کو بار بار اس کے منہ پر مارا جائے وہ بھی اس صورت میں کہ آپ کو اس غلطی کا اچھا خاصا احساس بھی ہو چکا ہو۔
"یہ جس جائیداد پر تم قبضہ کیے بیٹھے ہو نا اس میں میرا حصہ بھی ہے۔ تم میری طرف سے کوئی گفٹ خرید سکتے ہو"۔ مہر ماہ نے اپنی طرف سے بہت منہ توڑ جواب دیا۔
"ہاہ۔۔۔" وہ مسکرایا۔
"آغا جان پوتیوں کو جائیداد میں سے حصہ دینے پر بلیو نہیں کرتے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے"۔
"پوتوں کو دینے پر تو بلیو کرتے ہیں نا۔۔۔" وہ چبا کر بولی۔ درحقیقت موحد کی بات اس کے دل میں کھب سی گئی۔ آغا جان نے واقعی پوتے کی چاہ میں پوتیوں کو کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔
"تو پھر یہ مت بھولو کہ تم اکیلے پوتے نہیں ہو آغا جان کے اور تنہا عیاشی نہیں کر سکتے اس پراپرٹی پر۔ نیر آفندی بھی برابر کا حصہ دار ہے" وہ نڈر ہو کر بولی۔ تو موحد کی آنکھوں میں حیرت اتری۔
"واٹ۔۔۔۔؟" اس کے تاثرات نے مہر ماہ کو مزہ دیا۔
"تو کیا غلط کہا ہے میں نے؟ اور تم بھی تو اس حق میں ہو۔ ثمرہ چچی بھی"۔
"ہاں۔۔۔ مگر تم یہ بات کرو گی یہ میں نے نہیں سوچا تھا"۔ وہ صاف گوئی سے بولا۔
"کیوں۔۔۔ ایک تم ہی نرم دل ہو اس گھر میں"۔ وہ چڑ کر کہتی بینچ پر بیٹھ گئی۔
"جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے پیش نظر کہہ رہا ہوں"۔
"جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا بدلہ تو میں اس سے بہت اچھے سے لوں گی۔ لیکن تم یہ یاد رکھو بس کہ جب بھی وہ سامنے آیا اس کا حق اسے دینا پڑے گا"۔ وہ گویا حکم صادر کر رہی تھی۔ موحد بے ساختہ مسکرا دیا۔

"شیور۔۔۔آنے تو دو سامنے جناب کو۔ جن لو اتنی بڑی بڑی فیورز مل رہی ہیں"۔
"شٹ اپ۔۔۔" اس کی بات سمجھ کر وہ جھلا کر بولی تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ سر جھٹک کر مہر ماہ چائے پینے لگی۔ درحقیقت سومیہ کی باتیں اس کے دل میں گڑ گئی تھیں۔ زندگی برباد تو ہو ہی چکی اب وہ سومیہ کے کہے پر عمل کر کے دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ ماضی کو کریدنا آسان نہیں ہوا کرتا۔۔۔ بجھی راکھ میں چھپی چنگاریاں کبھی کبھار دامن کو لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں۔"

☆☆☆

"کبیر۔۔۔" وہ تیز قدموں سے انیکسی کی طرف جا رہا تھا جب ملاحہ کی عجلت بھری آواز آئی تو وہ پورے کا پورا ہی اس کی طرف گھوم گیا۔ جانے کیسے رات کے اس پل وہ شال اوڑھے لان میں نکلی تھی۔
"خیریت۔۔۔؟" وہ تشویش بھرے انداز میں پوچھتا اس کی طرف آیا۔
"تم کب تک یہاں نوکری کرتے رہو گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ کبیر کو جھٹکا لگا۔ پھر ذرا سا غور کرنے پر اسے احساس ہوا کہ ملاحہ کی آواز روئی روئی سی تھی۔
"کیا ہوا۔۔۔ کسی نے کچھ کہا ہے آپ سے؟"
"تم کہیں جاب کیوں نہیں کر لیتے یا اپنا بزنس" وہ اسی بات پر اٹکی ہوئی تھی۔ کبیر کو ہنسی آئی۔
"میں کہاں کا لینڈ لارڈ ہوں جو بزنس شروع کر لوں اور سمپل بی اے کو جاب کہاں ملے گی بھلا؟"
"تو کیا تم ہمیشہ یہاں ڈرائیور ہی رہو گے؟" وہ دکھی ہو کر پوچھ رہی تھی۔
"میں تو پہلے بھی ڈرائیور ہی تھا ملاحہ بی بی۔۔۔ آپ کو آج پتا چلا ہے اس بات کا یا احساس پہلی بار ہوا ہے؟" بہت سنجیدہ ہو کر کبیر نے چبھتا ہوا سوال کیا تو وہ سن سی رہ گئی۔

☆☆☆

نمیر کی کال آتے ہی مہر ماہ نے یوں جلدی سے مطالبہ پیش کیا جیسے لائن کٹ جانے کا اندیشہ ہو۔
"میں تمہاری مظلومیت کی داستان سننا چاہتی ہوں نمیر! بقول تمہارے کہ تم بہت مظلوم ہو"
"ہوں۔۔۔ یعنی کہ اس داستان میں میرا مظلوم ہونا ضروری ہے" وہ ہنسا۔
"انتہائی ضروری۔۔۔ ورنہ تمہیں گولی مارنا میری سب سے بڑی خواہش ہو گی۔" مہر ماہ نے دانت کچکچائے۔
"چلو پھر آج طے کر لو مہر ماہ نمیر آفندی! اگر میں حق پر نکلا تو میری سزا میری خواہش کے مطابق ہو گی۔"
"ہاں۔۔۔ اور وہ سزا میں خود تمہیں دینا پسند کروں گی۔" مہر ماہ اس کی بات کی گہرائی میں گئے بغیر تنفر سے بولی۔ تو اس نے گہری سانس بھری۔
"تو بتاؤ مہر۔۔۔ کہاں سے شروع کروں ظلم و بربریت کی وہ داستان۔۔۔ وقار آفندی کے ترس سے جو انہوں نے میری ماں پر کھایا اور اسے محبت سے عزت دار زندگی کی طرف لانے کی سعی کی یا آفندی ہاؤس والوں کی سنگ دلی سے جن کے پاس میری ماں کو دینے کے لیے عزت کم پڑ گئی اور انہوں نے لاکھوں کی جائیداد کے حصہ دار کو مرنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا؟"
مہر ماہ کی قوت گویائی جیسے کسی نے چھین لی ہو۔
"جب تم اس گھر سے نکلے اس رات سے نمیر۔۔۔ جب تم لوگوں کے بعد فاران چچا بھی چلے گئے تھے۔"
وہ بامشکل بولی تو دوسری طرف نمیر آفندی نے خود کو انتہائی غیر آرام دہ محسوس کرتے ہوئے ذہن میں بکھری یادوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک تاریک اور سیاہ رات تھی جس میں مہیب بادلوں کے سائے تھے اور بجلی کسی جان دار شے کی طرح زبان لہراتی سب چیزوں پر لپکتی تھی۔ بارش کی تیزی اور بادلوں کا گرجنا ہر انسانی آواز پر حاوی تھا۔ مگر پھر وہ انسانی آوازیں موسم کی اس شدّت پر حاوی ہوگئیں۔

"جانے کہاں سے اٹھا کر لے آئی ہو گناہ کی اس پوٹ کو"، صدیقہ بیگم تو نمیر کو آغا جان کے پوتے۔۔۔۔

ان کے خواب کے روپ میں زرنگار کے ساتھ دیکھ کر ہی پاگل ہوگئی تھیں۔

"یہ آپ کا پوتا ہے۔۔۔ وقار آفندی کا خون۔ اللہ کی قسم"۔ وہ آغا جان کے سامنے گڑگڑائی تھیں۔

نمیر اسے بتا رہا تھا اور مہر ماہ نے خود کو نمیر آفندی کے ساتھ اس سرد اور تاریک رات میں ان ظالم لوگوں کے بیچ پایا۔

"بکواس بند کرو۔ اور لے کر دفع ہو جاؤ گناہوں کی اس پوٹلی کو۔ نا جانے کس کا گناہ میرے بیٹے کے سر ڈال رہی ہو"۔ آغا جان تو ازل ہی سے ظالم تھے مگر اس موقع پر اس شقی القلبی کو بڑھاوا دینے والی صدیقہ بیگم تھیں۔ جو چاہتی تھیں کہ زرنگار کو دھکے دے کر وہاں سے نکال دیا جائے تا کہ زرنگار بیٹے کی ماں ہونے کا زعم نہ دکھا سکے۔ تب صرف فاران آفندی اور ثمرہ ان کی حمایت میں اٹھے۔ لیکن آغا جان کا کہا پتھر پر لکیر تھا۔ صدیقہ بیگم کی جلتی پر تیل جیسی باتوں نے ان کا پارہ نیچے آنے ہی نہیں دیا اور ان ماں بیٹے کو بے یار و مددگار باہر نکال دیا گیا۔ وہ روتا ہوا ماں کے ساتھ چل رہا تھا۔ چلتے چلتے اس کی ماں کو ٹھوکر لگی تو وہ کیچڑ آلود سڑک پر منہ کے بل گری۔

"امی۔۔۔" چودہ سالہ ناکافی گرم کپڑوں میں ملبوس سردی اور خوف سے کپکپاتا ہوا نمیر بدقت تمام ماں کو سیدھا کر پایا تو اس کی پیشانی سے بہتا خون نمیر کو حواس کھونے پر مجبور کر گیا۔

اللہ جانے کون نیک فرشتہ تھا جو سڑک پر چیختے چلاّتے نمیر کو دیکھ کر رکا اور از راہ مہربانی ان ماں بیٹے کو سرکاری ہاسپٹل پہنچا دیا۔ جہاں زرنگار کو فوری طبی امداد کے بعد وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔ سردی اور خوف سے کپکپاتے نمیر کے لیے وہ ایک رات ہزار راتوں پر بھری تھی جب اس کو یہی پتا نہیں تھا کہ اس کی بے ہوش پڑی ماں کو ہوش آئے گا بھی یا نہیں۔۔۔ ٹیسٹوں پر ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔۔۔ نمیر کو لگا ڈاکٹر دماغ میں کسی ٹیومر کی بات کر رہے ہوں۔۔۔ مگر اسے سمجھ نہ تھی کہ یہ کیا بیماری تھی۔ اسے بس یہی سن کر لرزہ طاری ہوگیا کہ اس کی ماں کے دماغ کا فوری آپریشن ضروری تھا اور وہ پیسوں کے بغیر ممکن نہ تھا۔ وہ دنیا میں اکیلا رہ جانے والا تھا۔۔۔۔۔

مہر ماہ نے سنتے ہوئے آنکھیں بھینچ لیں۔

آفندی ہاؤس والوں کی بربریت جیسے نگاہوں کے سامنے آگئی ہو۔ "تمہیں اس سے بہت ہمدردی ہے تو جاؤ نکل جاؤ یہاں سے اس کے پیچھے۔۔۔ ایک کو تو اندھا کیا ہی تھا اس بدذات نے دوسرا اپنی مرضی سے ہو رہا ہے"۔ آغا جان نے فاران آفندی کو نخوت سے آرڈر کیا۔ تو انہوں نے ایک پل بھی کچھ سوچے بنا بیوی اور بخار میں پھنکتے بچے کو ساتھ لیا اور آفندی ہاؤس کی دہلیز پار کر گئے۔ "بہت لمبی داستان ہے مہر ماہ آفندی۔۔۔ حوصلے کے ساتھ سننے اور حوصلے کے ساتھ سنانے والی"۔ وہ آزردہ تھا۔ اور مہر ماہ۔۔۔ چپ تھی۔۔۔ بہت چپ۔

اسے لگ رہا تھا کہ اس داستان میں نمیر آفندی مظلوم نکلنے والا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ



ٹیکنیکل آدمی

رضیہ مہدی

"مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے۔ کس نے کہی ہے۔ ارے آپ کو یہ بھی نہیں معلوم؟ خیر بھلا سا نام ہے' بڑے مشہور آدمی ہیں اور پھر نام میں کیا رکھا ہے۔ بات اور اچھی بات چاہے جس نے بھی کہی ہو خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔ جو چار سو چپکے سے پھیلتی چلی جاتی ہے۔ تب پھول کو کون یاد رکھتا ہے اور پھر جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

چلیں چھوڑیں جہاں مسئلے مسائل کی بات آجائے میں کوسوں دور بھاگتی ہوں۔ ارے بھئی اپنے مسائل کچھ کم ہیں جو پھول کے مسئلے کو درد سر بنا ئیں۔

بات ہو رہی تھی بچاؤ کی اور وہ بھی دوستوں سے۔ ذرا کان میں سنیے' مجھے اپنے گنتی کے دو چار دوستوں سے کیا بچنا بچانا' یہ تو میاں صاحب' یہاں ٹھہریے! یہ میں اپنے خدا مجازی کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ سیاست سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں اور حکومت اور حاکم جتنے ہیرے نگینے جمع کریں مینوں کی۔ یہ تو میرے گھر کی بات ہے تو میرے میاں جی (اب ٹھیک ہے نا) زندگی بھرنایاب دوستوں میں گھرے رہے۔ جو سب سے بڑی خصوصیت یہ رکھتے تھے کہ وہ ٹیکنیکل آدمی تھے۔

جب تک میں اکیلی تھی اور بچے چھوٹے تھے معاملات چلتے رہے۔ میرے میاں جی ہمیشہ اپنی تابعداری چاہتے رہے۔ بہتر ہے وہ گھر کے سربراہ اور حاکم ہیں مگر وہ اپنے گرد تمام ٹیکنیکل آدمیوں کے آگے بھی ہم سے تابعداری کے متقاضی رہے۔

اب بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میرے معصوم اور بھولے بھالے بچے' آپ کہیں گی۔ خیر اتنے بھی معصوم نہیں' چلیں۔ مان لیتی ہوں کہ اتنے بھی معصوم نہیں۔ بس چوبیس سال کا عادل جسے ہم عادی پکارتے ہیں اور بائیس سال کا عاقل جس کا نام بگاڑنے کی اس کے بابا نے بالکل اجازت نہیں دی' وہ عاقل سے بہت پیار کرتے ہیں۔

"یہ بالکل مجھ پر پڑا ہے۔ میں نے یہ نام بھی اس لیے رکھا ہے کہ کوئی توماں کی کم عقلی پر نہ جائے۔"

عادی انجینئر ہے اور ایک مشہور کمپنی میں سول انجینئر کی جاب کر رہا ہے۔ چھوٹے میاں میڈیکل کے فائنل میں ہیں۔ بڑا قدرے سنجیدہ مزاج رکھتا ہے اور چھوٹا اس کر جیو پر عمل کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ دونوں پڑھنے لکھنے میں اچھے ہیں بلکہ ماں باپ کے تابعدار بھی ہیں۔ اپنے بابا کی ڈانٹ اور اٹھا ہوا جوتا بھی انہیں کچھ جواب نہیں دینے دیتا۔

لوگ میری تعریف کرتے ہیں اور میرا وزن کچھ اور بڑھ جاتا ہے' بچے باپ کے سامنے منہ بے شک نہ

کھولیں مگر مجھ سے بہت شکوہ کرتے ہیں اور تو اور مجھ پر دبے لفظوں میں یہ بھی الزام عائد ہوتا ہے کہ اگر میں نے تھوڑا بہت بھی اختلاف کیا ہوتا تو آج نوبت انتہا پر نہ پہنچی ہوتی۔

یعنی میرے بچوں کا پڑھنا لکھنا اور یکدم سے بڑے ہو جانا ہی اپنے بابا کے دوستوں سے زیادہ اور بابا کے ساتھ نظریاتی اختلافات کا سبب بن رہا ہے۔ اوفو! آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تعلیم کے خلاف ہوں۔ نہیں نہیں' یہ بات نہیں ہے دراصل میں نے اپنا تعارف تو کرایا نہیں۔ میں ایک سرکاری ادارے میں گریڈ انیس کی افسر ہوں۔ ڈبل ایم اے اور ایم بی اے بھی کرنے کے بعد آپ مجھے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار کر سکتی ہیں' تعلیم کی مخالف بالکل نہیں۔ البتہ گھر کی پرسکون فضا کی حامی ضرور ہوں۔ آپ لوگ میرے لیے دعا کریں کیونکہ بچوں کی ہر خطا' ہر غلطی دراصل ماں کی تربیت کی خامی ہوتی ہے اور اگر معاملہ بڑھ جائے تو ننھیال کی خرابی تک جاتا ہے۔

چلیے آپ لوگوں کو اپنے مسئلے کی طرف لاتی ہوں۔ کہاں سے شروع کروں' دل تو ملکہ ترنم نور جہاں مرحومہ تک جا پہنچا ہے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہی شکوے ہیں کیا کیا بتاؤں

میری شادی کی اگلی صبح میری آنکھ پانی کی بوندوں سے کھلی جو کوئی تواتر سے مجھ پر ڈال رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو اندازہ ہوا۔ اوہو یہ مذاق نہیں ہے' یہ رحمت خداوندی ہے جو برس کر مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ ہڑبڑا کر اٹھی' میاں کو جگایا۔

"کیا ہوا؟" آنکھ کھولتے ہی ان کی سمجھ میں آگیا۔

میری پریشان صورت کے خلاف ان کے چہرے پہ خوشی کے وہ آثار تھے۔ جو میرا گھونگھٹ اٹھا کر بھی نہ دیکھے میں نے۔

"دیکھا رم جھم شروع ہو گئی۔ میری کوئی بھی خوشی رم جھم کے بغیر نہیں ہوتی۔" پھر بستر بھیگتا محسوس کیا تو بولے۔

"ارے تمہیں کوئی برتن معلوم ہے، جو کمرے میں ہو۔"

پھر خود ہی اندازہ ہوا کہ مجھے کیا معلوم ہوگا۔ اتنی دیر میں مجھے یاد آگیا کہ جہیز کی بڑی پیٹی سامنے پڑی ہے اور امی نے سب ہی کچھ تو دیا ہے' جلدی جلدی نکالا اور جگہ جگہ رکھنے لگی۔ میاں جی اس اثناء میں نیچے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آئے' ہنستے ہوئے۔

"بھئی گرم چائے کے بغیر مجھے بارش مزہ نہیں دیتی اور یہ تم کیا منہ بسورے ہو۔ سب اوپر آرہے ہیں۔ سب سمجھیں گے۔ تم شادی سے خوش نہیں ہو ایسا ہی ہے کیا؟ ویسے دن نکل آیا ہے اور میں نے صدیق سے کہہ دیا ہے۔ ارے یہیں پیچھے گلی میں تو رہتا ہے۔ یار ہے اپنا۔ ٹیکنیکل آدمی ہے' دو ایک دن میں آکر چھت کی مرمت کردے گا۔"

جلدی جلدی بتاتے گئے اور میں پہلے جملے ہی میں پھنسی رہی۔ یہ عورت کم بخت حساس کتنی ہوتی ہے۔ ہے ناں۔

یہ میری زندگی کا پہلا ٹیکنیکل آدمی تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ صدیق کوئی مستری وغیرہ نہیں ہے۔ وہ صاحب کے ساتھ کہیں بھی کبھی بھی شکار' ارے مچھلی کا شکار کرنے چلا جاتا ہے اور تمام لوازمات مثلاً" مینڈک وغیرہ پکڑنا وہی کرتا ہے۔ ویسے گھر میں پڑا رہتا ہے اور سات بچوں کا باپ ہے۔

میرے میاں جی کا کہنا ہے کہ وہ بلاوجہ کی ڈگریوں سے' دولت سے مرعوب ہونے والے نہیں۔ وہ انسان کے اندر کی قابلیت کو اہمیت دیتے ہیں اور عورت کے ناقص العقل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے مشورہ کیا لینا بلکہ مرد اس کا پابند نہیں کہ ہر بات عورت سے پوچھ کر بلکہ بتا کر کرے۔

پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں ہزاروں ٹیکنیکل آدمیوں سے سابقہ پڑا ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ایک صاحب ہم سب کی زندگی

میں آئے اور چھا گئے' وہ پہلے ایک انیمی پلمبر کے ساتھ کام کرنے چھوٹے کی حیثیت سے ہمارے گھر آئے۔ چھوٹے نہیں جانتیں آپ! ہر فیلڈ میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ اٹھا کر دو' وہ رکھو' یہ پلمبر صاحب حکم دیتے اور وہ عمل کرتے بلکہ ایسا آدمی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی پھر جانے کب اور کیسے وہ ہمارے صاحب کی نظر میں آ گئے اگرچہ ہمارے صاحب خود بے نظیر ہیں۔ نہیں نہیں سیاست نہ میرا بیک گراؤنڈ ہے نا میاں جی کا مگر ان کی نظر ہمیشہ جوہری کی طرح صرف اور صرف ٹیکنیکل آدمی پر ہی ٹھہرتی ہے۔ پھر کیا تھا' اب وہ ہمارے گھر کے لیے مستری' کلینک' الیکٹریشن اور پلمبر سب ہی کچھ تھے۔ کوئی بھی کام ہوتا وہ نواب کو فون کرتے' وہ آجاتے۔ میرا چھوٹا بیٹا کہتا تھا بابا کا ہر نگینہ بھی شاید گھر میں ہی ہوتا ہے ہر وقت۔

میرے دیور یعنی میرے میاں جی کے برادر خود ابوظہبی میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھیا کو فون کیا کہ ان کے مکان کی چھت ڈلوانی ہے اور اس کو فنش بھی کروانا ہے۔ وہ پیسے ان کے اکاؤنٹ میں بھیج دیں گے' ان کا جو ٹھیکے دار تھا وہ بھاگ گیا ہے اور وہ بہت پریشان ہیں۔

بھیا نے مدد کا وعدہ کر لیا اور ہم سب حیران بلکہ کسی حد تک پریشان ہو گئے کہ نیا ٹھیکے دار نواب تھا۔

نواب ہر فن مولا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

کم میں ٹھیکہ لے رہا ہے اور خود ہی مستری' خود ہی الیکٹریشن اور پلمبرنگ ورک سب کچھ کرے گا۔ حتیٰ کہ اس نے ذمہ داری لی ہے کہ وہ چھت پڑنے کے بعد پانی سے ترائی بھی خود کرے گا۔

"بس چھ لاکھ میں کام بن جائے گا۔"

"چھ لاکھ مگر وہ تو چار لاکھ بھیج رہے ہیں۔"

"اور بھیج دے گا۔ بھائی ہے میرا۔ آپ اپنے چھوٹے سے دماغ کو زحمت نہ دیں۔ میں جانوں میرا بھائی جانے۔ میں نے سمجھ بوجھ کر ٹیکنیکل آدمی کو چنا ہے۔ وہ غضب کا ٹیکنیکل آدمی ہے۔"

خیر اندازے سے کچھ زیادہ ہی میں کام ہو گیا مگر پلاسٹر کے بعد چھت پر بڑا سا شگاف پڑ گیا۔

ہمارے میاں صاحب کا کہنا ہے کہ ایسی خراب جگہ زمین لی ہے۔ زمین ہی خراب ہے وہاں کی۔ اکثر جگہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کم از کم نواب نے جہاں جہاں کام کیا ہے' وہاں تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔"

شامت اعمال میرے بیٹے نے جو خود بھی سول انجینئر ہے اور ایک بڑے ملٹی نیشنل ادارے میں اسی عہدے پر کام بھی کر رہا ہے۔ کہہ دیا۔

"بابا! جب وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ جہاں بھی انہوں نے کام کیا وہاں بھی یہی حال ہوا ہے تو کچھ تو ہے ان کے کام میں۔" بابا کو غصہ آنے لگا۔

بیٹا بھی جیسے سمجھانے پر آج تل گیا تھا۔" میں کل چاچو کا مکان دیکھنے جاؤں گا۔"

"مطلب آپ بہت بڑے انجینئر ہیں۔ ایک تار تک کو صحیح جوڑ نہیں پاتے اور بات کر رہے ہیں اس کا کام دیکھنے جائیں گے۔"

میرا چھوٹا بیٹا گردن جھکا کر مسکرانے لگا۔

"بابا! یہ سول نہیں الیکٹرک ورک ہے۔ میں احتیاط کرتا ہوں۔"

"تو بیٹا جی! وہ سب کام جانتا ہے۔ الیکٹرک ورک ہو پلمبری کا کام ہو سب کام کر سکتا ہے' تم کر سکتے ہو۔"

میرا بیٹا ہکا بکا رہ گیا۔

کم از کم میں اپنے میاں کی قائل ہو گئی۔ عادی تو کیا کوئی بھی نواب جتنا اچھا کام نہیں کرتا۔ اس کی گواہ ہماری ساری الٹی لگی ہوئی فلش ٹنکیاں اور الٹے سوئچ دے رہے ہیں اور پھر ہمارے میاں جی کو اس کا قائل ہی نہیں کرتا تعریف بھی کرواتا کہ آج کل یہی رواج ہو گیا ہے۔

میرا چھوٹا بیٹا بھائی کی درگت پر پہلے سر جھکائے ہنسی ضبط کرتا رہا پھر اٹھ کر بھاگ گیا۔ بہر حال وہ عاقل ہے' باپ کے سامنے نہ سر اٹھا کر جیو نہ سر اٹھا کر ہنسو۔ وہ سمجھ چکا تھا۔

پھر میاں جی کی ملاقات بشیر سے ہو گئی جو بہت بڑا ٹیکنیکل آدمی ہے۔ ایک چھوٹی سی دکان پر کام کرتا ہے اور سلائی مشینیں ٹھیک کرتا ہے۔ ویسے وہ بھی یونہی میرے میاں کی نظروں میں نہیں چڑھا۔ وہ ہر قسم کی مشینیں ٹھیک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا بلکہ مشین پر ہاتھ رکھ کر ہی خرابی اور علاج بتا دیتا ہے۔

ان ہی دنوں میرے میاں بھی اپنے ادارے کی اسی پالیسی کا شکار ہو گئے جسے ڈاؤن سائزنگ کہاں جاتا ہے۔ اس میں یہ کم دیکھا جاتا ہے کون کیا ہے؟ کارکردگی کیا رہی ہے؟ بس حکم حاکم مرگ مفاجات کا معاملہ ہوتا ہے' خیر' جو تھوڑے' بہت پیسے وہ ان ہی بشیر کے کہنے پر مرغی کے کاروبار میں لگائے پہلی کھیپ میں ڈوب گئے جو بچے اس کے لیے بتایا گیا کہ آپ نے جلدی کی۔ رانی کھیت کی بیماری آگئی تھی' خیر آپ لوہے کے کاروبار میں پیسہ لگائیے تو بڑے بڑے پنجرے بنوائے گئے لوہے کے اور رنگ برنگ طوطے' چڑیوں کا کاروبار شروع ہوا۔ سرپرست اعلا میرے میاں اور معتمد خاص میاں بشیر' کاروبار چلا نہیں' وہ پنجرے اونے پونے بکے۔ تمام پیسے ٹھکانے لگے مگر بشیر صاف بچ گئے۔ وہ اپنی خصوصیت کی وجہ سے کہ وہ ٹیکنیکل آدمی ہیں اور کاروبار میں تو منافع بھی ہوتا ہے اور رقم بھی ڈوبتی ہے۔ یہ قسمت کا کھیل تھا اور کچھ نہیں۔ وہ ہر دل عزیز بھی رہے۔ میرے میاں کا اکیلے ہی دل ان کے لیے بہت بڑا تھا پھر انہوں نے ہمارے گھر کی واشنگ مشین' پانی کی موٹر غرض کہ چھوٹی بڑی سب ہی مشینوں کو بے وقت ضرورت دیکھا۔ اب اگر اس کی ارے مشین کی اور کس کی عمر ہی ہو گئی تھی تو وہ مجبور ہو کر بتا دیتے تھے کہ بھائی یہ آج کل کی چیزیں بس دو چار دن کی بہار ہوتی ہیں۔

اور تو اور ان کے بھائی اے سی بھی دیکھ لیتے تھے اور دو مہینے میں جب تیس ہزار روپے لگ چکے تو میرے عادی نے بابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

''بابا! یہ اے سی جواب دے چکا ہے' میرے آفس کی کوئی اسکیم آئی ہے اور میں نیا اے سی لے رہا ہوں وہ لگائیں گے۔''

''لے لو میاں! بس پرانی چیزیں اچھی ہوتی ہیں تم نے سنا نہیں اولڈ از گولڈ۔''

عادی سر جھکائے سنتے رہے اور اے سی کی خریداری بھی ایک اور ٹیکنیکل آدمی کے مشورے سے انجام پائی۔ مارکیٹ سے دس ہزار اوپر کہ یہ پائیدار اور اچھا ہے۔

ماضی کی کہانی رہنے دیں' آج کل جس ٹیکنیکل آدمی کا چرچا ہے ان کا نام نامی یوسف ہے۔ نام سے کیا ہوتا ہے ماں اور باپ کو تو اپنا بیٹا یوسف لگتا ہی ہے۔ وہ یوسف ثانی بن گئے۔ ہاں وہ اپنے آپ کو اسی سیڑھی پر رکھتے ہیں نیچے اترنے پر تو وقت بھی انہیں مجبور نہ کرسکا۔ عمر اب پچاس سے اوپر آگے کی منازل طے کر رہی ہے۔ شادی وادی کے چکر میں پڑے نہیں۔ عورت کا چکر ہی برا ہے۔ یہ ان کا قول ہے جس پر ہمارے میاں سر دھنتے ہیں۔

وہ ایک پان کی دکان کرتے ہیں اور ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ ویسے ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اس کی تو میں بھی قائل ہوں۔ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں اور یہی نہیں دودھ اپنی بائیک پر گھر پہنچا بھی جاتے ہیں۔ لیجیے اس سے اچھی کیا بات ہے۔ انہوں نے سختی سے منع فرمایا ہے کہ پاؤڈر اور ڈبے میں بند دودھ مضر صحت ہیں۔ بچے ان کو نصیحت خان انکل کہتے ہیں کہ وہ وقت بے وقت' جگہ جگہ نصیحت کرنا نہیں بھولتے۔ وہ دنیا کی بھلائی کے لیے ہی ایسا کرتے ہیں مگر دنیا بھلا فلاح کی راہ کو پسند کرتی ہے۔ اور تو اور وہ ہمارے صاحب جی کو بھی نصیحتیں کرنے سے باز نہیں آتے اور لاکھ دوستی بہت سہی' وہ بھی کبھی کبھی تو جھنجلا ہی جاتے ہیں۔

اسی لیے آپ سب سے درخواست ہے کہ ایسا کوئی ٹیکنیکل آدمی نظر میں ہو تو فوراً'' اطلاع دیں کیونکہ ہمارے یہاں ویکنسی جلد ہی خالی ہونے والی ہی ہے۔

☆

ایمل رضا

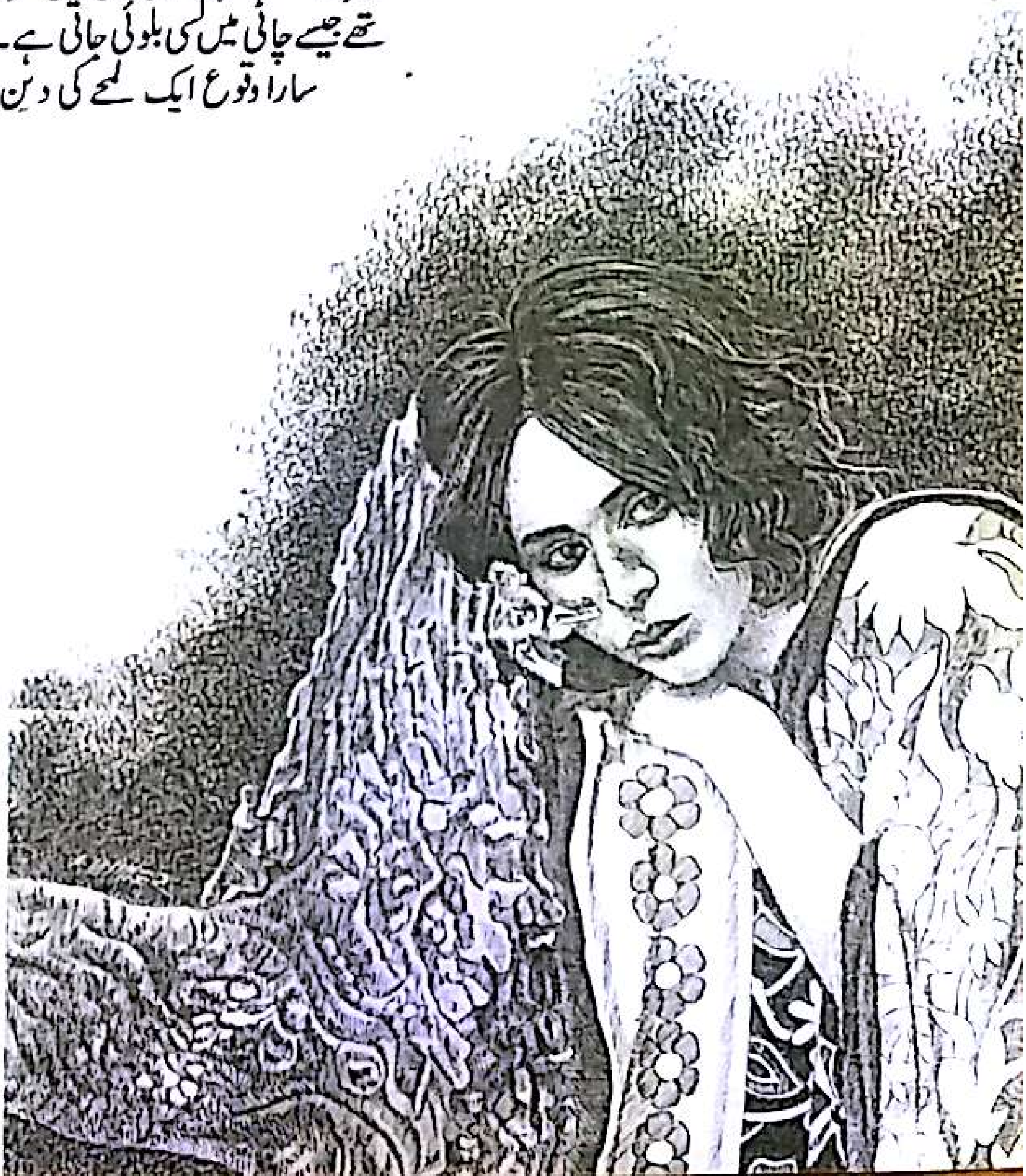
شگنوں والی شال

چاند کے چوبارے پر ایک اور چاند نمودار ہوا تھا۔ روشنی دوچند تھی اور ہوا نشیلی......

سرخ شگنوں والی شال جس کے تار تار پر شیشہ جڑا تھا۔ ٹھنڈی چاندنی میں چمک رہی تھی۔ گرد سے اٹی اس شال پر ہزاروں چاند چمک رہے تھے۔ سفید اور......سرخ چاند......

چاندی کی پازیب، دودھیا چوڑے، کشمیری کڑھائی والی قمیص کا دامن اور گلا......سب خون میں اس طرح سے رنگا ہوا تھا کہ ان کے اصل رنگ کہیں کھو سے گئے تھے۔ ان کے نصیب کی طرح ......نسائیت کے مقسوم کی طرح......لاش لڑکی ......بدی، بدکاری،......گف، گناہ ......غیر محرم اور غیرت......سب آپس میں اس طرح گھلے ہوئے تھے جیسے چاٹی میں لسی بلوئی جاتی ہے۔

سارا وقوع ایک لمحے کی دین تھا۔ جیسے کوئی



انہونی..........نہ کوئی قوت لگائی گئی تھی اور نہ ہی احتجاج کیا گیا تھا۔جیسے گناہ کرنے والوں کو بھی پتہ تھا کہ یہ ہی ان کا مقدر ہے۔ان کے ساتھ اب اکیلے میں ایسا نہ ہوا تو کل سب کے سامنے ہوگا۔

اس سب کے باوجود ایک صدا بلند ہوئی تھی۔ شاید اپنی صفائی میں بولے جانے کے لئے آخری بھیک مانگی گئی تھی۔ جسے بڑی بے رحمی سے رد کر دیا گیا تھا۔اور وہ صدا باہر سے گزرتے......چھت پر سوتے کسی ایک دو نے سن لی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' دور سے کسی نے شبیر سے پوچھا تھا۔

شبیر نے آواز کی سمت دیکھا تھا اور اسے اپنی بندوق اٹھا کر دکھائی تھی۔

''کیا ہوا......؟''

''فتح'' ......ہوئی تھی۔وضاحت کے مقابلے میں غیرت کو، ترس کے مقابلے میں روایت کو، انصاف کے مقابلے میں وحشت کو......

☆☆☆

چاند کے چوبارے پر ایک اور چاند نمودار ہوا تھا۔روشنی دو چند تھی اور ہوا کٹیلی......

سرخ شگنوں والی شال جس کی تار تار پر شیشہ جڑا تھا۔ٹھنڈی چاندنی میں چمک رہی تھی۔اور اس سرخ شال پر ہزاروں چاند چمک رہے تھے۔سفید اور صرف سفید......رانی کی بھرجائی نے شال کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ رکھا تھا۔اس کی ذرا سی جنبش سے شال میں جڑے ان گنت چاند جھلملانے لگتے تھے۔اسے شاید سردی لگ رہی تھی۔جبکہ رانی نے صرف دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔اس پر خنکی کا احساس غالب نہیں تھا۔آج وہ ہر طرح کے احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔چھت پر آجانے کے احساس نے سارے احساسات کو مات دے دی تھی۔

نیچے برآمدے میں لالٹین کی دھیمی لو رات کے اندھیرے میں ٹمٹماتے ستارے جیسی تھی اور اردگرد ان ستاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔اس نے ایک مدت کے بعد ایسا منظر دیکھا تھا۔بچپن میں شاید کبھی دیکھا ہو......لیکن اب وہ معصوم مناظر معصوم بچپن کی طرح کہیں محو ہو چکے تھے۔ان سب پر اندھی سرنگ جیسی سیاہ سیاہی پھر چکی تھی۔سرمہ دانی ٹوٹ کر گری تھی یا شاید ڈھبری کے دھوئیں تلے سب دب دبا گیا تھا......مر مرا گیا تھا۔

کتنی دیر تک وہ ایسے کھڑی رہی جیسے کاٹھ کی سرمہ دانی ہی تو ہو......اور اب ٹوٹ کر اپنے نصیب پر گر جانا چاہتی ہو......یہاں تک کے بھرجائی کو اسے ہلانا پڑا......

''کیا دیکھتی ہے رانی......؟'' بھرجائی کے سوال میں اس بات کا جواب تھا کہ مجھے پتا ہے تو کیا دیکھتی ہے۔کھلی فضا میں سانس لینے کی حسرتیں رانی کے وجود سے کن کھجورے کی طرح برسوں سے چمٹی ہوئی تھیں۔یہ صحرائی علاقوں کی وہ مٹی نہیں تھی جسے جسم سے مانجھ مانجھ کر اتار لیا جاتا ہے۔یہ وہ خواب تھے جو قبر میں بھی ساتھ جاتے ہیں۔

''زمین پر بچھے تارے دیکھتی ہوں بھرجائی......

کیا روز ایسا ہی ہوتا ہے؟'' اس نے اداسی بھرے رشک سے پوچھا۔

''ہاں......'' بھرجائی دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''تجھے کیسے پتا......؟''

''گرمیوں میں' میں اپنے گھر میں چھت پر سویا کرتی تھی۔''

''چھت پر......???'' رانی ایسے حیران ہوئی جیسے بھرجائی نے اس کے سامنے اپنے کافر ہونے کا اعتراف کر لیا ہو۔

''چھت پر کیسے بھرجائی......تیرا ابا تو میرے ابے سے بھی کپتا ہے۔وہ تیری جان نہیں نکال دیتا تھا کیا؟''

''سب گھر والے سوتے تھے۔ سارے مرد باہر ہوتے تھے۔ میں ماں کے ساتھ اندر شہ نشین میں...... وہاں کی ایک چھوٹی سی کھڑکی بڑی سڑک پر کھلا کرتی تھی۔ وہاں سے نظر آتا تھا یہ سب...... یہ زمینی تارے اور عارضی جگنو...... مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں کبھی سوئی بھی ہوں......'' پہلوٹھی والے درد زہ کی طرح بھرجائی کو اپنے ہی غم یاد آ گئے تھے۔

اس وقت بھی وہ دونوں گھر کی چھت پر سڑک کی طرف بیٹھی تھیں۔ ذرا دور کچی پکی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اکا دکا گزرنے والی موٹر سائیکلیں ریت اور ٹیلوں کے اس علاقے میں ان کی نظروں کے لیے ایک چھوٹی سی تفریح تھی۔ جب گھر میں کوئی مرد نہیں ہوتا تھا' وہ اس طرف آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور یہ گھر میں مرد نہ ہونے کا واقعہ دس سالوں میں کوئی ایک بار ہی ہوتا تھا۔ عورتوں کو گھر میں تنہا چھوڑ دینے کا خیال ایسا ہی تھا جیسے باجرے کو اوپر چھت پر ڈال دینا اور رکھوالی کے لیے چڑیوں کو بلا لینا...... علاقے کے مردوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ عورت جب بھی اکیلی ہو کچھ اور نہیں کرتی ...... سوائے گناہ کے، بے وفائی کے، بدکاری کے...... اور بدکار کو کاری کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ چوپالوں میں ہوئے فیصلوں اور چوپالوں میں ہوئے عمل درآمد کو مرد آپس میں اس طرح سے سنا اور سنایا کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے جنگل میں شیر کا شکار کیا ہو۔ وہ بھی اس کی کچھار کے اندر جا کر......

یہاں عورت کے عیب پر مرد شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔ شرمندہ وہ مرد ہوتا تھا جس کی بہن یا بیوی کسی کے ساتھ پکڑی گئی ہو اور وہ اسے جان سے مار نہ سکا ہو...... یہاں عورتیں اسی موت سے ڈرنے کے لئے اپنی ہم عصر' ہم عمر عورتوں سے بھی بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ بھائیوں، باپ کے سامنے ہنسا نہیں کرتی تھیں۔ وہ مردوں کے اس انتظار کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی جو اس آس میں ہوتے تھے کہ اپنی بہن، بیوی — حتیٰ کہ ماں کی بھی کسی عیب کشائی یا محض شک کی بنا پر ہی وہ ان سے جان چھڑا لیں۔

وہ جیسے اکثر پرانے قبیلوں میں ہوتا تھا ناں کہ مرد کو جوان تب ہی مانا جاتا تھا جب وہ کوئی قابل قدر کام کرے۔ تو یہاں اس مرد کو جوان تب مانا جاتا تھا جو کسی جوان کو اس کی جوانی نصیب نہ ہونے دے۔ علاقے کے ''جوان'' اس کام کے انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کب ان کو جوان مانا جائے گا۔

یہاں عورتیں حمل سے ہوتی تھیں تو باقاعدہ وہ ٹونکے کرتی تھیں جن سے لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن سب ٹونکے شاید پرانے ہو گئے تھے یا خدا کو ہی کچھ اور منظور ہوتا تھا کہ وہ جتنے جتن کرتی تھیں اتنی ہی ان کے گھر لڑکیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں۔

پتا نہیں ایسے علاقوں کے تو جھینگر بھی کیوں چپ سادھ لیتے ہیں۔ کوئی باغی' کوئی دیوانہ بھی کوک نہیں دیتا کہ جن کے دل وحشت زدہ ہو جاتے ہیں انہیں کچھ ڈھارس ہی ملے۔ یہاں کوئی رانجھا کیوں نہیں نکل آتا بانسری بجانے...... ساری ہیروں کو اپنے پیچھے لگانے...... ہیریں تڑپ رہی ہیں۔ سوہنی کی طرح ڈوب کے مر بھی جانا چاہتی ہیں لیکن بند بند میں دم گھوٹنا نہیں چاہتیں......

شاید رانجھوں نے بھی بانسریوں کی جگہ خنجر تھام لیے تھے۔ اور انہیں سُروں سے زیادہ اس آواز سے لگاؤ ہو گیا تھا جو گردن پر چھری پھرنے سے اور مرتے ہوئے کی آخری ہچکی کی صورت نکلتی ہے۔ یہاں کے رانجھوں نے بھی وہ وحشت سیکھ لی ہے کہ جلاد بھی کانپ کر رہ جاتا ہے۔

بھیڑ کاٹ کھانے والی جھرجھری لے کر رانی نے گہری سانس لی...... بھرجائی سمجھی اس پر کپکپی طاری ہے۔

''ٹھنڈ لگ رہی ہے؟''

''کھلے آسمان کی ٹھنڈ تہہ خانے کی گرمائش سے اچھی لگتی ہے بھرجائی......'' وہ سکڑ کر بیٹھ گئی۔

اس کا تو دل کر رہا تھا آسمان کو اپنے ہاتھوں میں بھر کر نیچے لے جا کر صندوق میں بند کر دے۔ پھر اپنے جہیز کے کپڑوں کی طرح بار بار نکال کر دیکھے۔

ابا اماں نیچے سو چکے تھے، وہ دونوں نند بھرجائی اُوپر چھت پر آ گئیں۔ اس علاقے میں بجلی تو تھی لیکن اس کے جا کر آنے کی مدت اتنی لمبی تھی کہ وہ لوگ یہ بھول جاتے تھے کہ ان کے گھروں میں بجلی موجود ہے۔ ٹھنڈ سے ان کے جسم تو کپکپا رہے تھے لیکن وہ ابھی نیچے جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ کھلا آسمان اور موٹر سائیکلوں کی گھوں گھوں انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ رانی کو ایسا لگا اس نے جنم ہی آج لیا ہے۔ ماں نے اسے پیدا تو نجانے کب سے کر لیا تھا لیکن کوکھ سے آج آزاد کیا ہے۔

''کیا تمہارے ادھر کی سڑک پر بھی اتنی ہی موٹر سائیکلیں گھوں گھوں کرتی تھیں؟''

''پتا نہیں......ایک گزرتی تھی کہ ہزاروں...... لیکن کانوں میں ساری رات گھوگھو ہوتی رہتی تھی۔''

بھرجائی نے ہنس کر کہا۔ ایسی ہنسی کے رانی کا رونے کو دل کیا۔

''یہ گھوں گھوں بھی کتنی اچھی لگتی ہے نا بھرجائی...... مجھے تو بعض اوقات لگتا ہے یہ ہمیں

اکسا رہی ہیں یا جلا رہی ہیں کہ دیکھو تم سے زیادہ تو ہماری آواز ہے۔'' بھرجائی خاموش رہی...... ''کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں موٹر سائیکل کا پہیہ ہوتی میں روندی جاتی لیکن دیس دیس گھوم لیتی۔''

اس نے اداسی سے کہا۔

''اپنی اس خواہش کا کسی اور سے ذکر نہ کر دینا رانی۔'' بھرجائی نے سہم کر کہا۔ ''تیری خواہش یہاں کے ریت روایتوں سے میل نہیں کھاتی۔''

''میل تو یہ زندگی نہیں کھاتی ......اب یہی دیکھو، شبیر بھائی گھر پر نہیں، ابا جی نیچے سو رہے ہیں، تو ہم چھپ کر چھت پر آئے ہیں۔ ایسے جیسے کوئی گناہ ہو۔''

بھرجائی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ایسے وقت میں اس کی شکل تالا لگے جندرے کی سی ہو جاتی تھی۔ اور رانی کے پاس اس تالے کو کھولنے کی چابی نہیں ہوتی تھی۔

گھر میں ایک ابا تھا ایک بھائی......بس یہ دو افراد تھے۔ دو مرد......اور جو تین عورتیں تھیں، وہ ان دو مردوں کے سایوں سے بھی کم حیثیت تھیں۔ اماں کی حیثیت سے بڑھ کر تو گھر کا مرتبان تھا جس نے اپنے ایک بار ٹوٹنے پر شور کیا تھا۔ اماں ساری زندگی اس شور کا ہزارواں حصہ بھی نہیں کر سکی تھی۔ ایسے تو ہوا میں اڑتی چڑیا بھی تعجب سے دیکھا کرتی تھی کہ یہ کون سی مخلوق ہے جو ان سے بھی زیادہ ڈری سہمی رہتی ہے۔ پھر ان ہی چڑیوں کا جیسے اس سے دوستانہ ہو گیا۔ وہ انہیں دانہ ڈالتی اور پہروں بیٹھ کر دیکھا کرتی...... عرصے بعد اچانک سے ایک دن غضب ہی تو ہو گیا۔ جب رانی نے دیکھا کہ اماں نے ان چڑیوں سے باتیں کرنا بھی شروع کر دی۔

یہ سب ابا کی تیسری شادی کے بعد سے ہوا تھا۔ دوسری بیوی مرنے کے بعد ابا نے تیسری کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ ابا کی تیسری بیوی اتنی چھوٹی عمر کی تھی کہ وہ رانی کو بھی باجی کہہ کر بلاتی تھی۔ لیکن ابا کی قسمت میں بار بار رنڈوا ہونا لکھا تھا شاید...... وہ لڑکی بھی زیادہ دن جی نہ سکی بیچاری۔ پتا نہیں کیوں ڈری ڈری رہتی تھی۔ رات کو سوتے وقت تو اکثر ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ پھر اس پر جن آنے لگے اور کوئی جن اسے اپنے ساتھ کوہ قاف لے گیا۔ شاید اس کی دوستی جن سے ہو گئی تب ہی وہ اس کے ساتھ جاتے جاتے مسکرا رہی تھی۔ شکر ہے کہ وہ جن کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس بیچاری پر بھی بدکار ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا

تھا۔ جیسے بڑی بہن زہرہ پر لگ گیا تھا۔
"تمہیں کائنات یاد ہے بھرجائی...... چھوٹی ماں......ابا کی تیسری بیوی۔"
"یاد ہے۔ خدا جنت نصیب کرے اسے۔"
"مجھے لگتا ہے وہ مری نہیں تھی۔ ماردی گئی تھی۔"
"کس کے ہاتھوں......؟"
"خود اپنے ہی ہاتھوں...... میں نے خود دیکھا تھا اسے زہریلی کھمبیاں اکٹھے کرتے......اس نے وہ کھالی تھیں۔"
"میں نے بھی دیکھا تھا۔" بھرجائی نے اعتراف کیا۔
"کیا......؟؟" رانی حیران ہوئی...... "تو نے پھر اسے روکا کیوں نہیں...... مجھے تو تب پتا ہی نہ تھا کہ یہ اتنی زہریلی بھی ہوتی ہیں کہ جان لے لیں۔"
"ان کھمبیوں پر بڑی جانوں کی نظر تھی۔ تیری ماں کی بھی......ساتھ والی کلثوم کی، خدیجہ کی......میں کس کس کو روکتی......" بھرجائی نے توقف کیا۔ رانی فق چہرے سے بھرجائی کو دیکھنے لگی۔
"اچھا کیا......روز روز مرنے سے بہتر تھا کہ وہ ایک دن میں ہی مرگئی......"
"اور بڑی بہن......کاش وہ بھی زہریلی کھمبیاں ہی کھالیتی...... کیوں جانتے بوجھتے اس نے سانپوں کی کھولی میں ہاتھ ڈالا......سچ بتاؤں تو مجھے چھوٹی ماں کی موت کا دکھ تو ہے لیکن بڑی بہن کا نہیں......عورت کو سب کچھ ہونا چاہئے لیکن بدکار نہیں......"
زہرہ رانی کی بڑی بہن تھی۔ ابا کی پہلی بیوی سے...... جسے ابے نے اپنے دوست کی تنہائی مٹانے کے لئے اس کے ساتھ کردیا تھا۔ جیسے پرانی فائل میں نئے کاغذوں کو کیا جاتا ہے۔ زہرہ کی ماں اور سب کی بڑی ماں نے ابا سے ڈرتے ڈرتے بس اتنا کہا تھا کہ جوڑ کا رشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ تیس سال کا فرق ہے دونوں میں......اور ابے نے وہ مار ماری تھی بڑی اماں کو کہ وقت بھی کیا مارتا ہوگا انسان کو...... بڑی بہن کی شادی ہوگئی۔ پھر سالوں گزر گئے......اور رانی اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترس گئی۔ پھر ایک دن اس کی موت کی اطلاع پہنچی گھر میں......اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ اطلاع پہلے گھر میں پہنچی ہے یا بڑی ماں کی سانس پہلے رُکی ہے۔
بات صرف اتنی ہی پتا چل سکی کہ ایک دن زہرہ خالی کمرے میں کسی سے باتیں کررہی تھی کہ بڈھے نے یہ سمجھ کر ماردیا کہ کسی عاشق سے باتیں کر رہی ہے۔
بڑی ماں مرگئی اور چھوٹی ماں کا چڑیوں سے دوستانہ اور بھی بڑھ گیا۔ وہ بھول گئی کہ اس کے گھر میں ایک مینا بھی ہے۔ جسے اس گھر کے دستور نہ سکھائے تو وہ بھی اس کی طرح چڑیوں سے دوستی کر لے گی۔
"کیا بڑی بہن کا واقعی کسی کے ساتھ چکر ہوگا۔ تمہیں کیا لگتا ہے بھرجائی......کیا اس وقت واقعی اس کے کمرے میں کوئی اور ہوگا؟"
"ہاں۔ اس کے کمرے میں تھا کوئی اور۔"
"اگر کوئی اور تھا تو پھر ملا کیوں نہیں......کہاں چلا گیا وہ ایک دم سے......بڈھے نے اسے کیسے چھوڑ دیا۔"
"کوئی اور تھوڑی تھا۔ وہ تو اپنے شوہر سے ہی باتیں کررہی تھی۔"
"کیا بات کررہی ہو بھرجائی......شوہر تو باہر سے آیا تھا۔" رانی جھنجلائی۔
"ہاں...... لیکن وہ والا شوہر نہیں...... وہ والا جو اس کے ذہن و دماغ میں تھا۔ وہ والا جو اس کی خواہش کے پہاڑ تلے دبا تھا۔"
"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" رانی کچھ نہ سمجھی۔

"یہ ہی حقیقت ہے رانی...... وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی باتیں کر رہی تھی۔ اسے ہی تکھار رہی تھی۔ ہماری آنکھ سے دیکھو گے تو وہ نظر نہیں آئے گا نہ ہی ملے گا۔ لیکن اس کی آنکھ سے دیکھو تو وہ ہی اس کی ساری زندگی تھا۔"

رانی کچھ سمجھی کچھ اس نے فرض کرلیا۔

"چلو مان لیتی ہوں...... لیکن جب کمرے میں کوئی تھا ہی نہیں تو وہ بڈھے کو کیسے نظر آگیا۔ بڈھے نے زہرہ باجی کو کیوں مار دیا پھر......؟"

"شک...... شک بھی پرچھائی بن جاتی ہے رانی...... جیسے دل میں کینہ اور بغض ہو تو مسکراہٹ بھی طعنہ لگنے لگ جاتی ہے۔ ویسے ہی ذہن میں شک ہو تو رسّی بھی سانپ لگتی ہے۔ سانپ بھی عام نہیں...... ارنا سانپ......"

بھرجائی کے منہ پر پھر تالا لگ گیا۔

☆☆☆

کوئی ارنا سانپ پھنکارتا ہوا گزرا تھا اور ہر طرف فوتگی سی پھیل گئی تھی۔

خون کی دھار بہتی بہتی دور جا نکلی تھی۔ باریک سے اب گاڑھی ہو رہی تھی۔ سانسوں کی آروہی امروہی معدوم ہو رہی تھی۔ چاند بھی ذرا سہا کہیں پناہ مانگ رہا تھا۔ لیکن صحراؤں میں نہ کوئی درخت تھا اور نہ کوئی کوکھ...... جہاں وہ چھپ سکتا...... صحرا میں تو شاید گہن بھی نہیں لگا کرتے...... گہن بھی ڈرتے ہیں ایسے خشک علاقوں میں آنے سے جہاں ہر لڑکی ذات کو جنم سے ہی گہن لگ چکا ہوتا ہے۔

جان نکلنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔ موت کا فرشتہ بھی جیسے انتظار میں تھا۔ وقت نے تو اجل کے ہاتھوں ویسے بھی بہت سے زخم اٹھائے ہیں۔ چلو ایک یہ بھی سہی

☆☆☆

"تو کیا بہن صرف شک کی وجہ سے ماری گئی......" رانی نے دکھ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے......

"شک نہیں روایت کی وجہ سے...... اور اچھا ہوا ماری گئی...... وہ لاکھ یقین دلاتی بھی کہ وہ اسے باتیں کر رہی تھی تو اس بڈھے نے تب بھی نہیں یقین کرنا تھا اور پھر اگلے دن مردوں کی پنچایت میں ایک عورت کے خلاف فیصلہ دے دیا جانا تھا۔"

"کبھی میرے والے کو مجھ پر ایسا شک ہو گیا تو......؟"

"ایسی بات نہ کر رانی...... ایک تو ہی تو ہے جس سے باتیں کر کے مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بھی سانس لینے والی مخلوق ہوں۔" بھرجائی نے کہا اور گھٹ کے رانی کو بھی ڈال لی۔ شال کے تارے جھلمل کرنے لگے۔

"ایک بات بتاؤ بھرجائی' جب تم میری طرح کنواری ہو گی' تو تمہارا بھی بڑا دل کرتا ہو گا نا ایسی شگنوں والی شال لینے کو......؟"

"ہاں...... بہت کرتا تھا...... خیالوں ہی خیالوں میں یہ شال اوڑھ کر رکھتی تھی۔ اماں کے جہیز کی شال نکال نکال کر اوڑھتی رہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا میری زندگی بس یہی شال ہی ہے۔"

"اور اب......؟"

"اب بھی لگتا ہے کہ یہ شال ہی میری زندگی ہے۔ یہ ہی غم گسار ہے۔ اسی میں میرے آنسو جذب ہوں گے اور اسی گھر میں میری آخری سانسیں......"

"بھائی بڑا سخت مزاج ہے ناں......؟"

"سبھی مرد ہوتے ہیں۔ میرے ابا بھی ہیں' میرے تینوں بھائی بھی ہیں۔ میرے بھائی نے مجھے گنگناتے سن لیا تھا تو مجھے اتنا مارا تھا کہ چلنے لائق نہیں رہی تھی۔ جھٹ پٹ میری شادی کر دی۔ قسم کھا کھا کر کہتا تھا کہ میرا ضرور کسی کے ساتھ چکر ہے۔ میں چھپ چھپ کر ملتی ہوں اس سے......"

"شبیر بھائی بھی مجھے بڑا گھور گھور کے دیکھتا ہے۔ اپنے دھیان میں تھی' دودھ ابل گیا' ابال کی جھاگ نے ایسی تصویریں بنائیں کہ میری ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا' کس عاشق کو یاد کر کے ہنس

رہی ہو۔''

ایک پرانی موٹر سائیکل بڑا شور کرتی ہوئی گزری۔ دونوں نے اس شور کو اپنے دل کے زخموں پر دوا کی طرح سنا۔ دونوں خاموش بیٹھی اندھیرے میں گھورتی رہیں۔

''بھرجائی...... کیا ایسی زندگی میں اور موت میں کوئی فرق ہے......؟''

''موت کے بعد کیا ہوگا کون جانے......''

''زندگی میں کیا ہوگا میں جانتی ہوں...... اسی لئے تو موت کو سوچتی ہوں۔ سچ بتاؤں تو مرا بڑا دل کرتا ہے مر جانے کو...... سنا ہے عالم برزخ میں بڑے مزے ہیں۔''

''تیری شادی ہونے والی ہے رانی۔ ایسی باتیں نہ سوچ......''

''کیسے نہ سوچوں...... وہ کون سا ابا سے یا شبیر سے الگ ہوگا۔ بادشاہ کی طرح روٹی مانگا کرے گا۔ پھر مزدور کی طرح مارے گا۔''

''وہ دیکھ اتنی رات کو سفید پرندوں کا غول......'' بھرجائی نے دھیان بٹانے کو دور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... بھرجائی......'' رانی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے......

''کیا ہوا......؟'' بھرجائی حیران ہوئی۔

''میں پرندوں کو نہیں دیکھتی بھرجائی...... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''پرندوں سے......؟؟؟''

''ہاں...... مجھے لگتا ہے جو میں نے ان کو دیکھ لیا تو میری اور ان کی دوستی ہو جائے گی۔ ویسی دوستی جو اماں کی ان سے ہے۔''

''کیوں اتنا سوچتی ہے۔'' رندھی ہوئی آواز سے بھرجائی بولی۔

''اماں نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ میں لڑکی ہوں۔ سوچنا میرا حق نہیں۔''

''لڑکیوں کے حق نہیں صرف فرائض ہوتے ہیں۔ مجھ سے سیکھ لے......''

''اب سکھا رہی ہو...... جب زندگی کی سلیٹ پر آزادی لکھی جا چکی ہے۔ حق کی آزادی......''

''تیری شادی ہونے والی ہے رانی...... اور تو حق کی بات کرتی ہے۔ اب تو صرف مقدر رہ گیا ہے۔ جسے بدلا نہیں جا سکتا۔''

''لیکن مقدر کو توڑا جا سکتا ہے بھرجائی...... میں نے اندازہ لگایا ہے۔ مقدر کے ساتھ جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ مقدر کو مات دی جا سکتی ہے۔''

''کیسے......؟؟''

''مقدر کے ساتھ کھیل کر......'' رانی کی آنکھوں میں ناگ منی جیسی جوت جاگنے لگی تھی۔ بھرجائی کو ایک لمحے کے لئے رانی سے خوف سا آیا...... ''لکھے ہوئے مقدر کو ہرایا جا سکتا ہے بھرجائی...... خود کو ختم کر کے......''

''ایسا کیوں سوچتی ہے رانی...... شادی پر تو لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں۔ تو موت کی باتیں کرتی ہے۔ آزادی کی بات کرتی ہے۔''

رانی کوئی جواب نہ دے سکی۔

''اچھا بتا...... ایک طرف شادی ہو رانی اور دوسری طرف حق کی آزادی تو تو کیا لینا پسند کرے گی۔''

''پتا نہیں......'' رانی نے بات ٹالی...... لیکن اندر ہی اندر کوئی فیصلہ کر چکی تھی اور یہ فیصلہ تو اس کے اندر نجانے کب سے ہو چکا تھا۔

''دل کا بڑا اچھا ہے تمہارا بھائی۔ خود گیا ہے شہر جہیز خریدنے......''

''پتا نہیں بھرجائی...... پر مجھے لگتا ہے کہ ایک ایسے وقتوں میں مرد بڑا خوش ہوتے ہیں۔ وہ جیسے قیدی ہیں جو ایک سے دوسری جیل ڈالے جاتے اور جیلر بڑا خوش ہوتا ہے کہ چلو میری جان تو چھوٹی۔ اب یہی دیکھ لو بھائی شبیر کو کیسے چوکیداری کرنی پڑتی ہے تمہاری، کیسے دبے پاؤں آتا ہے گھر، کیسے کان لگا کر میری تمہاری باتیں سنتا

ہے...... بے چارا ہر وقت بو سونگھتا رہتا ہے تمہارے عاشقوں کی۔''

دونوں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگیں۔ ''اچھا ہے' مصیبت میں پڑا رہے۔ مجھے کیا۔''

''تمہاری جان بھی کہاں سکھی ہے۔ مارتا ہے' تو رات بھر روتی ہو۔''

''میں تو ماں کے پیٹ سے رو پیٹ رہی ہوں۔ کون سی نئی بات ہے۔ ویسے کہہ کر گیا ہے کہ میرے لیے بہت ساری چیزیں لائے گا شہر سے......''

''اور جو تم کہہ دیتیں کہ سرخی لے آنا تو......''

''توبہ توبہ...... خود سے کہہ دیتی تو پہلے مارتا' پھر گالی دیتا' پھر پوچھتا'' ''کس یار کو دکھانی ہے؟''

''پھر کہتی ہو' دل کا بڑا اچھا ہے......'' اس نے چھیڑا۔

اس نے بڑی اداس سانس بھری۔ ''سب مرد اچھے ہوتے ہیں رانی' بری تو بس عورت ہوتی ہے۔''

دونوں کتنی ہی دیر تک خاموش رہیں۔ رانی نے ٹھنڈ سے کپکپی لی تو بھرجائی نے اسے اپنی شال میں بھر لیا۔ رانی نے بھی سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور شال کے شیشوں میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

''مجھے بھی یہ شال لینے کا بہت شوق ہے بھرجائی...... شال اوڑھے کسی کے ساتھ لپٹ جانے کی چاہ ہے۔ کیا وہ بھی مجھے اسی طرح اپنے ساتھ لگا لیا کرے گا؟''

''لگا تو لے گا۔ بس دعا کرنا کہ پھر پرے نہ دھکیلے......''

''جیسے ابا نے اماں کو پرے دھکیل دیا ہے۔ دو بچوں اور دو بیویوں کے بعد...... اور تب ہی اماں نے پرندوں سے دوستی کر لی ہے۔...... سنا ہے میرے والا بھی بہت کڑوا ہے۔''

''میٹھا کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا اسے۔ مرد کو اس کی غلطی بتاؤ تو وہ اور زیادہ اکڑتا ہے۔'' بھاوج نے سرگوشی سی کرتے ہوئے راز کی بات بتائی۔

رات اتنی تاریک تھی' اور ان کی سرگوشیاں اتنی مدھر تھیں کہ لگتا تھا جیسے دو پریمی بانسری بجا رہے ہوں۔ ساری دنیا سے چھپ کر راز و نیاز کر رہے ہوں۔

عورت کے دل کے راز ہی کتنے ہوتے ہیں...... وہ محبت کرے تو بھی' محبت نہ کرے تو بھی۔ اس کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو چھپاتی پھرے یا اتراتی پھرے۔ تھر کی ریت' اور دھوپ کی تمازت میں' اتنی حدت ہی کہاں ہوتی ہے کہ آگ بھڑکا سکے۔ عورت عورت کی غم گسار بنی ہوئی تھی۔ وہ جو بھائی کے سامنے ہنس کر بات بھی نہیں کرتی تھی' اس وقت چھپ کر رو رہی تھی' اپنے اپنے نصیب پر...... مقسوم پر......

اور چھت کی سڑک کی طرف کی منڈیر کے پاس بیٹھے' ایک ہی شال میں' ایک دوسرے سے اپنے دل کے راز کہتے' انہوں نے ایک سائے کو اپنے پیچھے آتے دیکھا ہی نہیں......

ان کے پیچھے دبے پاؤں آتے شبیر نے' ان دونوں کو راز و نیاز کرتے دیکھا تو اسے سمجھنے میں وقت نہ لگا کہ اس کی بدکردار بیوی' چھت پر رات کے اس پہر کیا کر رہی ہے۔

☆☆☆

سرخ شگنوں والی شال میں دونوں لاشیں ایک ساتھ اکٹھی پڑی تھیں۔

''کون تھا؟'' کسی نے شبیر سے پوچھا تھا۔

''یار تھا کنجری کا...... میں شہر کیا گیا تو اسے گھر پر ہی بلا لیا......'' شبیرے نے دو فائر داغنے کے بعد دونوں لاشوں پر تھوک پھینکا۔

چاند کی روشنی سمٹ گئی۔ لالٹینیں بجھ گئیں اور سورج نے بھی نہ طلوع ہونے کا تہیہ کر لیا۔

چڑیوں کی سہیلی اماں دو فائر کی گونجتی آواز کا اور ایک آہ کا شور سن کر اوپر آئی تھی۔ خود اسے بھی چھت پر آئے ایک عرصہ ہوا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آسمان کے تاروں کو دیکھے یا لاش پر پڑی شال کے چمکتے شیشوں تلے چھپی اپنی بہو کو......

''کس گاؤں کا ہے...... بلاوا بھجواتے ہیں کہ اپنے نامرد کی لاش لے جاؤ۔''

''ہنجواڑے گاؤں کا لگتا ہے۔ ڈیل ڈول زنانہ ہے۔ وہاں کے مرد ہی کھسرے لگتے ہیں۔''

اور جوں ہی شبیرے نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بیوی کا عاشق کون ہے دوسری لاش سے شال کھسکائی تو اماں کی ایک چیخ اس قدر بلند آواز سے نکلی کہ بعد میں اس گاؤں میں پیدا ہونے والا ہر بچہ بہرہ پیدا ہوا......

شبیر کا غصے سے تپا ہوا چہرہ ساکت ہو گیا۔ دھپ سے وہ زمین پر بیٹھا...... بھرجائی اور رانی کی لاش اوپر تلے ایک دوجے پر گری ہوئی تھیں۔ لاش، لڑکی ...... بدی، بدکاری،...... گف گناہ ...... غیر محرم اور غیرت ...... سب آپس میں اس طرح گھلے ہوئے تھے جیسے چاٹی میں لسی بلوئی جاتی ہے۔

اماں دونوں لاشوں پر بیٹھی حلق پھاڑ کر چلا رہی تھی۔

''بلاوہ بھجواتا ہوں ابھی......'' کوئی پتھر بنے شبیرے سے کہہ رہا تھا۔

بھرجائی نے ٹھیک کہا تھا کہ بڑی بہن روایت اور شک کی وجہ سے ماری گئی۔ دل میں شک ہو تو رسی بھی سانپ لگنے لگتی ہے۔

سوچا تو رانی نے بھی ٹھیک تھا۔ اور بھرجائی کا یہ سوال کہ اسے شادی کرنی ہے یا آزادی...... اس کے جواب میں ''آزادی'' کہہ دیا تھا۔

رانی یہ راز اپنے ساتھ ہی لے گئی کہ جس وقت اس کا بھائی بندوق لیے ان دونوں کا نشانہ باندھ رہا تھا' اس نے شال کے شیشوں میں بھائی کو دیکھ لیا تھا۔ اور پیدائشی حق والی آزادی حاصل کر لی تھی۔

مٹی سے لپی ہوئی چھت' ان کا خون جذب کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ بچی پکی سڑک پر سے اب کوئی موٹر سائیکل گزرنے والی نہیں تھی۔

☆

سنہری ڈور

قرۃ العین ہاشمی

اس نے دائیں طرف مڑتے ہوئے، گاڑی کی ہیڈ لائٹس کو آن کیا تو رات کے اندھیرے میں سارا راستہ روشن ہوگیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔

''میں ایک فرماں بردار بیٹا ہوں۔۔!

''میں ایک ہمدرد اور محبت کرنے والا بھائی ہوں۔۔!

''میں اپنے بچوں کے لیے دنیا کا بہترین باپ (ورلڈ بیسٹ فادر) ہوں۔۔۔!

''میں اپنی بیوی کے بہترین شوہر ہوں (میری ذاتی رائے کے مطابق)!

''میں یاروں کا یار اور اور۔۔۔۔۔۔!!

نہیں شاید مجھے پہلے اپنا تعارف کروانا چاہیے تھا۔

میرا نام ذیشان ملک ہے! اور میں ایک بینک میں اچھی پوسٹ پر تعینات ہوں مگر ٹھہریں۔۔۔! یہ تعارف بھی اضافی ہے۔

''مجھے صرف یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں ایک روایتی ''مرد'' ہوں۔۔۔!

آپ حیران ہو کر سوچ رہے ہوں گے کہ میں اتنے آرام سے کیسے خود کو روایتی مرد کہہ رہا ہوں۔ کیا میری انا مجھے نہیں روکتی! ایسے اعتراف کرنے سے۔۔۔!!

سچ بتاؤں؟

قسم سے روکتی ہے، بہت روکتی ہے، زچ کرتی، تنگ کرتی، طعنے دیتی ہے! مگر میں کیا کروں کہ ضمیر نام کی چبھن دل کو چیرنے لگی ہے!

میں اتنا احساس تو کبھی بھی نہیں رہا ہوں۔۔!



مگر جب سے دل کی زمین پر درد کا نیلا پھول کھلا ہے۔ میرا دل ایسے ہو گیا ہے جیسے لبالب بھرا ہوا پیمانہ۔۔۔! جو ہر وقت چھلکنے کو بے تاب۔۔۔۔ بس موقع کی تلاش میں رہتا ہے!

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔۔!

نہیں میں بتا نہیں رہا۔۔۔! میں اعتراف کر رہا ہوں کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔!

(کیا صرف یہ اعتراف کرنے کے بعد، سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟

کیا آگے کی داستان سنانا ضروری ہے! وہ وہ دراصل انا روک رہی ہے کہ۔۔۔۔!!

اچھا میں بتاتا ہوں۔۔۔! چھپا کر بھی تو اذیت ہی جھیل رہا ہوں۔

ہاں تو یہ بات ہے، آج سے آٹھ سال پہلے کی! جب سرخ لباس میں ملبوس، نازک اور ڈری سہمی سی ماہتاب میری زندگی میں بہار کے اولین جھونکے کی طرح داخل ہوئی تھی۔

☆☆☆

''تم نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا نا! پہلے دن سے ہی بیوی کو اچھی طرح سے یہ باور کروا دینا ضروری ہوتا ہے کہ شوہر کے نزدیک اس کے والدین اور بہن بھائیوں کی کیا اہمیت ہے! اللہ بخشے! تمہاری دادی جان کہا کرتی تھیں کہ۔

''بیٹے کا اچھا یا برا گرم سرد رویہ پہلے دن ہی بہو کو سمجھا دیتا ہے کہ اسے اپنے سسرال والوں سے کس حد تک بنا کر رکھنی ہے! اس لیے سمجھ دار مرد پہلے دن ہی بیوی کے دل میں اپنے گھر والوں کی دھاک بٹھا دیتے ہیں، اس لیے تو پھر ساری زندگی بیوی کی جرات نہیں ہوتی کہ اپنے سسرال والوں کے آگے سر اٹھا کر بات بھی کر جائے!''

ذیشان نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نظر جمائے ہوئے، سر ہلایا تھا۔ جس دن سے اس کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی، وہ ایسے فرمودات کی ایک طویل فہرست سن کر یاد کر چکا تھا۔

''یہ فرمان، فرمودات کی فہرست میں شاید ایک سو ایک نمبر پر تھا۔''

ذیشان نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر سر جھٹک کر گیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس سے پہلے کے سو فرمان، منگنی سے لے کر شادی تک کے دنوں میں سسرال کو نیچا دکھانے اور ان پر اپنا رعب جمانے کے لیے تھے۔

''امی! آپ فکر مت کریں! ماہتاب سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہو گی۔''

ذیشان کا گیم ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس لیے اس نے بغیر سوچے سمجھے، ماں کو تسلی دی تھی۔ مگر جب اسے خود پر گڑی ان کی سخت نظروں کا احساس ہوا، تو گڑبڑا کر رہ گیا۔

''واہ بیٹا جی! ابھی ایک دن ہی ہوا ہے اور تم اپنی بیوی کی گارنٹی بھی دینے لگ گئے ہو! بہت تیز نکلی ہے یہ بھولے بھالے چہرے والی ماہتاب۔۔۔!''

سعیدہ بیگم نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا تو ذیشان نے گیم ادھورا چھوڑا اور فوراً ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔۔

''ارے نہیں امی جان! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا ہے کہ میرے لیے میرے والدین اور بہن بھائیوں سے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔''

ذیشان اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس تخت پر بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔

''چل ہٹ! سب سمجھتی ہوں میں۔۔!''

سعیدہ بیگم نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ اسی وقت چادر میں لپٹی گھبرائی ہوئی سی ماہتاب اور اس کے ساتھ ذیشان کی چھوٹی بہن حرا چلی آئی۔

''امی! بھابھی کو پارلر لے کر جانا ہے۔ ٹائم ہو گیا ہے۔ چلیں بھائی! ہمیں چھوڑ آئیں۔''

حرا نے مصروف سے انداز میں کہا تو ذیشان نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

"میں ابھی فارغ نہیں ہوں! تم ایسا کرو کہ عثمان کے ساتھ چلی جاؤ!"

حرا نے حیرت سے ذیشان اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔

"مگر بھائی!" ماں نے گھورا — تو حرا سر جھٹک عثمان کو بلانے کے لیے اندر کی طرف چلی گئی۔

ماہتاب خاموشی سے کونے میں کھڑی رہی۔ وہ دونوں ماں بیٹا، اسے کوئی بھی اہمیت دیے بغیر باتوں میں مصروف تھے۔ ماہتاب خاموشی سے سر جھکائے اپنے مہندی سے سجے پاؤں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد حرا اور عثمان چلے آئے۔ پھر وہ تینوں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

"چلو تم بھی تیاری کرو۔ شام کو ولیمہ ہے!"

سعیدہ بیگم نے مطمئن ہو کر بیٹے کو اٹھنے کی اجازت دی۔ ذیشان نے پرسکون ہو کر گہری سانس لی۔

"شکر ہے کہ امی کا موڈ بہتر ہو گیا"۔

☆☆☆

"ذیشان! میری بات سنیں! میں مما کو کیا کہوں گی کہ۔۔۔!!"

ولیمہ کے لباس میں بنی سنوری، ماہتاب پریشان چہرہ لیے کھڑی تھی۔ ذیشان نے ٹائی لگاتے ہوئے، اسے شیشے میں سے گھورا تھا۔

"ماہتاب! تمہاری مما کیا کہتی ہیں یا کیا نہیں۔۔! مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میری امی کی خوشی کس میں ہے۔ وہ اگر یہ بات پسند نہیں کرتیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے!"

ذیشان نے مڑ کر اسے گھورا تو ماہتاب کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی، ذیشان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب لوگ شادی ہال میں جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

"مہارانی صاحبہ کی تیاری ختم نہیں ہوئی کیا؟"

سعیدہ بیگم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اسی وقت سر جھکائے ماہتاب بھی کمرے سے نکل آئی تھی۔

ولیمے کی تقریب ختم ہوئی تو ماہتاب کی خوبصورت اور اسمارٹ سی مما نے ان دونوں کو رسم کے مطابق ساتھ چلنے کو کہا تو ماہتاب نے ہچکچاتے ہوئے منع کر دیا۔

"مگر کیوں ماہتاب۔۔! خاندان والے کیا کہیں گے؟" ماہتاب کی مما ارم بیگم نے حیرت سے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"مرضی ہے آپ کی بیٹی کی! ہمارے یہاں ایسی کوئی رسم نہیں ہے۔ اس لیے ذیشان ہمارے ساتھ گھر جا رہا ہے!" سعیدہ بیگم نے سخت لہجے میں کہا۔

"بس وہ مما! ویسے ہم کل آپ سے ملنے آئیں گے۔" ماہتاب نے جلدی سے کہا۔ ارم نے پاس بیٹھی منہ بناتی سعیدہ بیگم اور باادب بیٹھے ذیشان کی طرف دیکھا۔ جو ایسے لاپروا بن کے بیٹھا ہوا تھا، جیسے اس کا اس بات سے کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔ خاور جلدی سے آگے بڑھے اور معاملے کو خوش اسلوبی سے ختم کرتے ہوئے، اپنے مخصوص زندہ دل انداز میں بولے۔

"چھوڑیں بیگم صاحبہ! ان فضول کی رسموں کو! دل جس سے خوش اور مطمئن ہوں، بس وہ ہی رسمیں ٹھیک لگتی ہیں۔ سعیدہ بہن! کل رات کے کھانے پر آپ سب مدعو ہیں! ایک شاندار سی دعوت، میرے شاندار سے بیٹے ذیشان کے لیے۔"

خاور نے ایسے کہا کہ ذیشان مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ارم نے ایک شکایتی نظر شوہر پر ڈالی تو وہ انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کرنے لگے۔

ماہتاب والدین سے مل کر بوجھل قدموں کے ساتھ، ذیشان کے پیچھے چل پڑی۔

"مما! آپی نے ہمارے ساتھ نہیں جانا تھا؟" پری میڈیکل کی طالبہ ردا نے حیرت سے سوال کیا تھا۔

"تو اور کیا! ہم نے تو اتنے سارے پلان بنائے ہوئے تھے۔" میٹرک کی طالبہ کرن نے بھی حیرت سے سوال کیا۔

"بیٹا! آپی کل آئیں گی آپ سے ملنے، چلو

سب گاڑی میں بیٹھو، میں آرہا ہوں۔''
خاور نے نرمی سے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو سمجھایا اور پھرارم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں دلاسا دیا تھا۔
''حوصلہ رکھیں آپ! ہماری بچی کے آگے ابھی بہت لمبا سفر پڑا ہوا ہے۔ اگر ابھی سے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے، تو اس کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی!''
خاور کے سمجھانے پر ارم سر ہلا کر رہ گئیں مگر ان کا دل اندر سے بہت بے چین تھا۔ اللہ نے انھیں کوئی بیٹا نہیں دیا تھا۔ یہ تینوں بیٹیاں انھیں جان سے بڑھ کر پیاری اور عزیز تھیں۔ ماہتاب نے ایم۔ ایس سی فزکس کیا تھا۔ جب اس کے لیے آیا پہلا رشتہ ہی قبول کر لیا گیا اور اسے بہت دھوم دھام سے، بہت ارمانوں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ اب اس کے سسرال کے سرد رویے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔

☆☆☆

''ماہتاب کی ماں کے تیور اور انداز دیکھے تھے؟ ایک تو اپنی عمر کا خیال نہیں اسے۔۔۔! اوپر سے عجیب عجیب فیشن کرتی ہیں محترمہ۔ اس عمر میں سوبر ہونے کے بجائے لڑکی بننے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ ویسے بہت تیز اور چالاک ہے وہ۔۔۔!!''
ولیمے سے واپسی پر ماہتاب کے علاوہ باقی سب سعیدہ بیگم کے کمرے میں جمع تھے۔ ولیمے کے فنکشن پر تفصیل سے تبصرے کیے جا رہے تھے۔ سعیدہ بیگم نے منہ بنا کر ارم کا ذکر کیا تو ذیشان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے دوپہر والی معمولی سی بات کا نتیجہ اچھی طرح یاد تھا۔ اس لیے اسے فی الحال خاموشی ہی بہتر لگی تھی۔
''امی! ایسا تو مت کہیں! ارم آنٹی بہت اسمارٹ اور سوبر عورت ہیں۔ اپنے آپ کو بہت فٹ رکھا ہوا ہے۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ جوان بیٹیوں کی ماں ہیں۔'' حرا نے متاثر کن لہجے میں کہا تو عثمان نے بھی سر ہلا کر تائید کی تھی۔ جس پر سعیدہ بیگم نے غصے سے انھیں گھورا تھا۔
''ایک تو میری اولاد، ہمیشہ میرے الٹ ہی جائے گی۔ لوگوں کے بچے اپنے والدین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور ایک میرے بچے ہیں۔ ہر بات میں نیا نکتہ، ہر بات میں تکرار لے کر بیٹھ جائیں گے۔''
''امی! آپ غصہ مت کریں۔ حرا ابھی بچی ہے۔ اسے کہاں سمجھ ان باتوں کی!'' ذیشان نے فوراً آگے بڑھ کر کہا۔ تو سعیدہ بیگم منہ میں بڑبڑانے لگیں۔
''جاؤ حرا تم اچھی سے چائے بنا کر لاؤ!'' ذیشان نے حرا کو اشارہ کیا تو وہ سمجھ کر اٹھ گئی۔
''میں تو چائے نہیں پیوں گا۔ بہت نیند آرہی ہے۔''
عثمان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اسی وقت ہی افتخار علی ملک کمرے میں داخل ہوئے۔ ذیشان نے باپ کو کمرے میں آتے دیکھا تو احترام سے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔
''جیتے رہو بیٹا! شکر ہے سب کام خوش اسلوبی سے ہو گئے ہیں۔'' افتخار علی عشاء کی نماز ادا کر کے آئے تھے۔ اس لیے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔
دوسرے ہاتھ سے ذیشان کا کندھے پر تھپکی دی اور اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔
''سعیدہ بیگم! مجھے آپ کا رویہ کچھ پسند نہیں آیا۔ آپ کم از کم یہ تو خیال کرتیں کہ نئی نئی رشتہ داری بنی ہے۔'' افتخار علی کے کہنے پر سعیدہ بیگم تپ گئیں۔
''میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟ آپ کے تو شکوے نہیں ختم نہیں ہوتے۔ ہر وقت مجھ پر تنقید کرنا۔ آپ کا پسندیدہ کام ہے۔''
حرا چائے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ماں کا موڈ آف دیکھ کر، اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا اور چائے کے کپ سب کو پکڑا کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ جب افتخار علی نے اسے پکارا۔
''حرا بیٹی! ماہتاب سے پوچھ لینا، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔''
''جی ابو! میں بھابھی کے پاس سے ہو کر آرہی

ہوں۔ انہیں چائے کے ساتھ سر درد کی ٹیبلٹ دی ہے۔ اب آرام کر رہی ہیں۔"

"ماہتاب بیٹی کی طبیعت خراب ہے۔ ذیشان تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو! جا کر دیکھو۔ اگر زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔"

افتخار علی نے کہا تو ذیشان فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور "جی ابو" کہہ کر، حرا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

"اونہہ! سب ڈرامے ہیں یہ، ملکہ عالیہ کے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

سعیدہ بیگم کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ افتخار علی کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ وہ رات کے اس پہر بیوی سے بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سعیدہ بیگم کا تیکھا مزاج ہری مرچ کی طرح تھا۔ وہ کسی سے بہت کم ہی خوش ہو پاتی تھیں۔ اس لیے تو ان کی بہت کم لوگوں سے بنتی تھی۔

☆☆☆

"ماہتاب! تم خوش تو ہو ناں؟ کیسے لوگ ہیں یہ؟ تمہارے ساتھ ان کا رویہ اور ذیشان۔۔۔! وہ کیسے مزاج کا ہے؟ بظاہر تو بہت تمیزدار اور باادب لگتا ہے مگر۔۔۔۔!!"

ذیشان جو موبائل کان سے لگائے، باتیں کرتا ہوا، لاؤنج میں چلا آیا تھا۔ فون بند کر کے وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف مڑا، جب کچن سے آتی ہلکی سی آوازوں پر چونکا۔

"جی مما! سب ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔"

ماہتاب کی مدھم سی آواز ابھری۔ وہ گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا کیونکہ وہ یہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ارم اور ماہتاب آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ حرا کے ساتھ باتیں کرتی ردا اور کرن نے مسکرا کر ماہتاب کو اپنے پاس بیٹھنے کو اشارہ کیا۔

"ماہتاب آپی! آج آپ رک جائیں نا۔ ہم بہت ساری باتیں کریں گے اور۔۔۔۔"

کرن نے پُرجوش انداز میں کہا تو ماہتاب دھیرے سے مسکرا دی۔

"آج نہیں گڑیا! کسی دن ویک اینڈ پر آؤں گی۔ شادی کی مووی اور البم آجائے۔ مل کر دیکھیں گے۔"

ذیشان نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ماہتاب نے اس بار سمجھ داری سے معاملے کو ہینڈل کر لیا تھا۔ ذیشان کو یہ بات اچھی لگی کہ ماہتاب عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے بلکہ بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ جس نے کچھ دنوں میں ہی سسرال کے ماحول کو سمجھ کر قدم اٹھانا سیکھ لیا تھا اور یہ سب اچھی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ذیشان کے دل میں جہاں ماہتاب کے لیے نرم جذبہ پیدا ہوا تھا، وہاں ہی اس کے والدین کے لیے بھی عزت بڑھی تھی۔

☆☆☆

آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ ماہتاب اس کے لیے بہترین انتخاب تھی۔ اس نے جس طرح تیزی اور سمجھ داری سے اپنی جگہ بنائی تھی، وہ حیران کن تھا۔ سعیدہ بیگم کا مزاج جتنا بھی کڑوا تھا، ماہتاب کے بغیر ان کا کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ ماہتاب ان کا رائٹ ہینڈ تھی۔ ہر بات میں، ہر چیز میں مشورہ لینا اور اس پر عمل کرنا ماہتاب کی ذمہ داری تھی۔ ماہتاب کو اللہ نے جڑواں بچوں سے نوازا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ گھر میں رونق اور چہل پہل ہو گئی۔ ان دنوں حرا کے لیے بھی بہت اچھا رشتہ آیا تو جھٹ منگنی، پٹ بیاہ والا معاملہ بن گیا۔ اتفاق سے ردا کا رشتہ بھی خالہ کے خوبرو لائق ڈاکٹر بیٹے سے طے پا گیا۔ جو شادی کے فوراً بعد ردا کو اپنے ساتھ امریکا لے کر جا رہا تھا۔ اس لیے پہلے نکاح ہوا اور جب اس کے پیپرز بن گئے تو شادی کی تاریخ طے پا گئی۔

ذیشان کو لگتا تھا کہ ماہتاب اس موقع پر انصاف نہیں کر پائے گی۔ ایک طرف بہن کی شادی تھی اور دوسری طرف نند کی۔۔۔۔! سعیدہ بیگم بار بار

ذیشان کے سامنے اپنی اس سوچ کا اظہار کرتیں تو ذیشان بھی ماہتاب کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اسے بھی لگتا تھا کہ ماہتاب انصاف نہیں کر سکے گی ---!

مگر یہاں بھی ذیشان حیران رہ گیا، جب اس نے ماہتاب کو حرا کی شادی کی تیاریوں سے لے کر شادی کے ہر فنکشن تک آگے آگے دیکھا۔

روا کی شادی کے فنکشن بھی شروع ہو گئے تھے۔ جب سعیدہ بیگم مکلاوے کے لیے حرا کو اپنے گھر لے کر آئیں تو ماہتاب سے زیادہ ذیشان حیران ہوا تھا۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ امی نے ماہتاب کے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ ذیشان کو سب سے زیادہ شرمندگی کا احساس اپنی بیوی کے سامنے ہو رہا تھا۔ جو سب کچھ بھلائے اچھی بہو ہونے کا فرض ادا کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ماہتاب کے دل میں کیا ہے؟ کیوں کہ اس نے ذیشان کے سامنے کبھی بھی کسی بات کا شکوہ نہیں کیا تھا۔ کبھی کبھی ذیشان کو لگتا تھا کہ جیسے وہ روبوٹ ہے۔ جو اپنے فرائض تو بخوبی سر انجام دے رہی ہے۔ مگر وہ اپنی خواہشات اور خیالات کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

روا کی شادی سے دو دن پہلے افتخار علی نے ماہتاب کو عثمان کے ساتھ میکے بھیج دیا۔ وہ سعیدہ بیگم کے ساتھ ساتھ ذیشان پر بھی بہت غصہ ہوئے تھے کہ جو کسی کی خاموشی اور سعادت مندی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ذیشان کو اپنے غلط رویے کا احساس اکثر شدت سے ہونے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے اور ماہتاب کے درمیان جھجک کی ایک لکیر ہے، جس کے پار دونوں کب سے کھڑے ہیں نہ ماہتاب کبھی اس لکیر سے آگے بڑھی تھی اور نہ ذیشان ---!

یہ وقتی سوچیں ہوتیں جو کبھی کبھی اسے بے چین کرتیں اور وہ سر جھٹک کر پھر سے اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا مگر جب گھر میں عثمان کی شادی کے ہنگامے جاگے تو ذیشان ایک عجیب سی خلش کا شکار رہنے لگا تھا۔ عثمان منہ پھٹ اور بہت بولڈ تھا۔ اتفاق سے کنول بھی ایسا ہی مزاج رکھتی تھی۔ کنول عثمان کی کلاس فیلو تھی۔ یہ لو میرج بہت مشکل سے ارینج میرج میں ڈھلی تھی۔ سعیدہ بیگم اتنی آزاد خیال لڑکی کو بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں مگر یہاں بات ان کی چاہت کی نہیں تھی بلکہ عثمان کی چاہت کی تھی۔ جس نے گھر بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مجبوراً سعیدہ بیگم کو ماننا پڑا۔ عثمان کی شادی روایتی دھوم دھام سے سرانجام پائی۔ کنول اور عثمان کی ذہنی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کے لیے فکر اور محبت دیکھ دیکھ کر ذیشان اکثر سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔

وہ ماہتاب کو دیکھتا ---! کیا فرق تھا ماہتاب اور کنول میں ---!

دونوں آج کے دور کی لڑکیاں تھیں ---!

دونوں پڑھی لکھی اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ویل آف فیملی سے تعلق رکھتی تھیں۔

مگر دونوں کے مزاج اور عادتوں میں اتنا ہی فرق تھا، جتنا ان دونوں کی قسمت میں ---!!

ہاں یہ قسمت ہی تو تھی، جو ماہتاب جیسی ہیرا لڑکی کو، قدر کرنے والا شوہر نہیں دے سکی تھی!

"کیا میں غلط ہوں؟" ذیشان اکثر سوچتا۔

جواب میں ایک لمبی "ہاں" اس کی منتظر ہوتی تھی۔

اور ذیشان اپنے ہی سوال پر شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

☆☆☆

سعیدہ بیگم کو اچانک دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ ایک ہفتہ ہسپتال میں داخل رہیں۔ ان دنوں ذیشان کو لگتا تھا جیسے کائنات میں کچھ اور نہیں ہے۔ وہ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہتا۔ ساری ساری رات ان کے سرہانے جاگ کر گزار دیتا۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر گھر نہیں جاتا تھا کہ جیسے وہ گھر جائے گا تو اس کی ماں کو اجل کا فرشتہ اپنے ساتھ لے جائے گا ---!

وہ ایک خوف زدہ بچے کی طرح ماں کا چہرہ دیکھتا رہتا۔ ڈاکٹرز ان کی حالت سے پُرامید نہیں

تھے۔ سعیدہ بیگم نم آنکھوں کے ساتھ اپنی اولاد کو دیکھتی رہتی تھیں۔ اکثر ان کی نظریں ماہتاب پر جم جاتیں۔ جو بہت خاموشی اور محبت سے ان کے ساتھ ساتھ باقی گھر والوں کا بھی خیال رکھ رہی تھی۔ کبھی افتخار علی کی دوائی اور کھانے کی اسے فکر لگی رہتی۔ کبھی ذیشان کی تھکن اور بھوک کا خیال اسے بے چین کر دیتا۔ کبھی روتی ہوئی حرا کو دلاسا دیتی یا آنسو چھپاتے عثمان کو تسلی دیتی۔ ساتھ ساتھ اپنے تینوں بچوں کی بھی دیکھ بھال کرتی۔ سعیدہ بیگم کی بیماری کے دوران کا وقت ایسا تھا کہ جس میں درد اور دکھ سے ہوتا ہوا، ہمدردی کا ایک سنہرا رشتہ ان دونوں کے درمیان جڑ گیا تھا۔ ذیشان کو شدت سے احساس ہوتا تھا کہ ماہتاب کی سب خوبیوں میں اعلیٰ اس کی محبت اور ہمدردی کی وہ سنہری ڈور ہے، جس نے سب کو ایک دوسرے سے باندھ کر رکھا ہوا ہے اور اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس بات کا اعتراف سعیدہ بیگم نے بھی کیا۔۔!

اس دن ذیشان ماں کو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا رہا تھا، جبکہ پاس کھڑی ماہتاب ہاتھ میں پکڑے رومال سے ان کا منہ بار بار صاف کر رہی تھی۔ سعیدہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انھوں نے کمزور ہاتھوں سے ماہتاب کا ہاتھ تھاما اور ہونٹوں سے لگا لیا۔

"تم میرا بہترین انتخاب ہو ماہتاب! مجھے خوشی ہے کہ میرے گھر کو سنبھالنے اور سب کو جوڑ کر رکھنے کے لیے تم موجود ہو۔ مجھے معاف کر دینا!'

"ارے امی! مائیں بھی کبھی اپنے بچوں سے معافی مانگتی ہیں! آپ پلیز روئیں مت! جلدی سے ٹھیک ہو کر گھر آ جائیں۔ ہم سب بہت اداس ہیں آپ کے بغیر۔۔!!"

ذیشان نے اپنے آنسو چھپانے کے لیے رخ پھیر لیا تھا مگر ماہتاب دیکھ چکی تھی۔ سعیدہ بیگم ماہتاب کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرانے لگی تھیں۔ اگلی صبح عثمان کو ماں کے پاس چھوڑ کر ذیشان کپڑے بدلنے گھر گیا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد عثمان نے روتے ہوئے کال کی کہ سعیدہ بیگم کا انتقال ہو گیا ہے۔

ذیشان کا خدشہ سچ ثابت ہوا تھا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی موت کے فرشتے نے تیزی دکھائی تھی۔ ان دنوں ذیشان کو ایسا لگتا تھا جیسے وقت روئی کے گالوں کی طرح اڑ رہا ہے اور وہ اس وقت کے درمیان کہیں بھی نہیں تھا۔

نجانے کتنا عرصہ لگا اسے سنبھلنے میں۔۔۔۔!!

☆☆☆

وقت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا تھا۔ عثمان اور کنول لندن میں سیٹ ہو گئے۔ حرا اپنے دو نٹ کھٹ بچوں کے ساتھ، ایک خوش گوار زندگی گزار رہی تھی۔

افتخار علی بڑھاپے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، اپنی فراغت کے لمحات میں سے کچھ وقت کتب بینی میں گزارتے تھے۔ باقی دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ واک اور گپ شپ کرتے اور دن کا سب سے خاص حصہ اپنے دونوں شرارتی پوتوں اور معصوم سی پوتی کے ساتھ کہانیاں سنانے اور مختلف کھیل کھیلنے میں گزار دیتے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھے۔

ذیشان کے چہرے کی سنجیدگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ، ایک سنہری رنگ کے فریم کا بھی اضافہ ہوا تھا۔ ماہتاب نے سارے گھر کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے اٹھا رکھی تھی۔ حرا کے ساتھ فون پر گپ شپ رہنے کے ساتھ ساتھ فیشن سے لے کر کھانے پکانے کی نئی نئی تراکیب کا تبادلہ روزانہ کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ حرا کے لیے ماہتاب اس کی بھابھی سے زیادہ بڑی بہن اور دوست تھی۔

زندگی میں سب کچھ بہت اچھا اور خوبصورت تھا۔ ذیشان خوش تھا مگر مطمئن نہیں۔۔! نجانے کیوں؟

اس کیوں کا جواب اسے اس دن ملا، جب بی۔ پی شوٹ کر جانے کی وجہ سے ارم بیگم کو ہاسپٹلائز ہونا پڑا اور ماہتاب دیوانہ وار اپنی ماں کی خبر گیری کرنے میں لگ ہوئی تھی۔ وہ دن بھی ایسا ہی تھا جب۔۔۔۔!!

☆☆☆

"آج علی کا رزلٹ آنا تھا؟ اور حمزہ کی ٹیچر نے

میٹنگ کے لیے بلایا تھا اور نور کی کلاس۔۔۔۔۔!!''

ذیشان کوریڈور میں کھڑا تیزی سے بچوں کے بارے میں بات کررہا تھا۔ جب سامنے بینچ پر بیٹھی تھکی ہاری ماہتاب آہستگی سے کہا۔

''آپ پلیز یہ سب دیکھ لیجیے گا! امی کی وجہ سے میرا دل بہت پریشان ہے!''

''ہوں! ٹھیک ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔ تم اپنے گھر کے مسئلے سلجھاؤ۔۔!''

ذیشان نے تلخ لہجے میں کہا تو ماہتاب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلا ملال کا رنگ، ذیشان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ آفس آکر بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ بہت بے چین اور پریشان رہا۔ بار بار نظروں کے سامنے ماہتاب کا تھکا ہوا، اداس چہرہ گھوم رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے ہی زیادتی کر جاتا تھا۔ جہاں بھی ماہتاب کو اس کے سہارے یا ہمدردی کی ضرورت پڑتی، وہ ایسے ہی انجان بن کر پاس سے گزر جاتا تھا۔

وہ آفس سے نکلا اور سیدھا قبرستان چلا گیا۔ ماں کی قبر پر سرخ، پھولوں کی پتیاں ڈال کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ جب اس کی بند آنکھوں کے سامنے بیمار ماں اور ان کی بے لوث خدمت کرتی ماہتاب کا چہرہ ابھرا تھا۔ اس نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔ ہاتھ چہرے پر پھیرے اور تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

ارم بیگم کو ڈسچارج کردیا گیا تھا۔ ذیشان تازہ پھولوں کے بکے اور پھلوں کے بھرے شاپر لے کر ان کے گھر پہنچا تو دروازہ کھولتی ماہتاب حیران رہ گئی۔ ذیشان مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ جہاں اس کا استقبال ہمیشہ کی طرح گرم جوشی اور محبت سے کیا گیا۔ کافی دیر ارم اور خاور کے پاس بیٹھ کر وہ باتیں کرتا رہا۔ ارم کو خاص خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

تو ارم نے اسے دل سے دعائیں دی تھیں۔

''میرا کوئی بیٹا نہیں ہے مگر جب بھی تمہیں دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ تم میرے بیٹے ہو!''

ارم نے نقاہت زدہ لہجے میں کہا۔

''میں آپ کا بیٹا ہی ہوں مما! آپ آرام کریں۔ میں کل پھر آؤں گا۔''

ذیشان نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا ـــــ پورچ تک پہنچا۔ جب بھاگتی ہوئی ماہتاب آئی اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔

''میں تھوڑی دیر میں گھر آرہی تھی۔ دراصل مما کہہ رہی تھیں کہ میں کچھ دیر ان کے پاس رک جاؤں۔ اس لیے دیر ہوگئی! آپ رکیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔''

ماہتاب نے جلدی سے کہا تو ذیشان مسکرادیا۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے! تم کچھ دن آنٹی کے پاس رہو! ان کا خیال رکھو۔''

ذیشان نے نرمی سے کہا تو ماہتاب حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں! ابو گھر میں اکیلے ہوتے ہیں۔ آپ نے روز آفس جانا ہوتا ہے۔ میں کیسے گھر چھوڑ کر بیٹھ جاؤں یہاں!''

ایک محبت کرنے والی بیوی کی طرح اسے بھی اپنے گھر کی فکر زیادہ تھی۔

''تم سب فکریں چھوڑو! حرا کچھ دنوں کے لیے رہنے آئی ہوئی ہے۔ وہ سب دیکھ لے گی۔ تم بس اپنی ماں کو بہت خیال رکھو ماہتاب! یہ مائیں بہت قیمتی اور پیاری ہوتی ہیں! ان کے ساتھ جتنا بھی وقت گزارا جائے، وہ بہت کم ہوتا ہے!'' ذیشان کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی ـ ماہتاب کا دل تڑپ اٹھا۔

''آپ ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے جھجک کر پوچھا۔ تو ذیشان اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''ہاں شاید۔۔! اب ٹھیک ہو جاؤں!'' ذیشان نے مدھم لہجے میں کہا۔

''اچھا میں چلتا ہوں!'' ذیشان نے گہری

سانس لی اور گاڑی کا لاک کھول کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سرخ گلابوں کا بکے باہر نکالا اور حیران نظروں سے دیکھتی ماہتاب کی طرف بڑھایا۔

''میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری طرح بہت اچھا تو نہیں ہوں مگر میں اتنا اچھا ضرور ہوں کہ تمہاری اچھائی اور محبت کا اعتراف کرسکوں!''

ماہتاب کے چہرے پر حیا کے رنگ پھیل گئے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کے بے تحاشا چمکتے ہوئے جگنوں تھے۔

''آج یہ انقلاب کیسے؟''

ماہتاب نے سرخ پھولوں کی پتیوں کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔ گاڑی سے ٹیک لگائے ذیشان نے مسکرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ جہاں چمکنے والے ستارے آج بھی لاتعداد تھے مگر اس نے نظریں گھما کر ماہتاب کی طرف دیکھا۔

''زمین پر چمکنے والا میرے نصیب کا یہ ستارہ سب سے زیادہ روشن اور چمک دار ہے!''

''بات دراصل بہت معمولی سی ہے ماہتاب! کل میں اپنی تکلیف اور دکھ کے وقت جس جگہ پر کھڑا ہوا تھا، وہاں آج تمہیں کھڑے دیکھا تو مجھے ایک بات کا احساس بہت شدت سے ہوا۔۔۔!'' ذیشان نے توقف کیا۔

''کس بات کا؟'' ماہتاب نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔

''میرے دکھ اور پریشانی میں تم نے بہت محبت اور نرمی سے ہمدردی کی سنہری ڈور ہم سب کے گرد باندھی تھی مگر جب تم پر یہ وقت آیا تو میں اس ہنر سے ناواقف رہا۔۔!

تم آج بھی اپنے دکھ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر، اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں کے نخرے اٹھا رہی تھیں اور میں جو تمہارا ہمسفر، زندگی بھر کا ساتھی ہوں، تم سے یکسر انجان اپنی دنیا میں مست جی رہا ہوں! شاید اس لیے بھی کہ تم نے کبھی مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا؟ مجھے کبھی احساس نہیں دلایا کہ میں تمہارے معاملے میں بہت خود غرض رہا ہوں اور یہ بات ہی مجھے ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھتی رہی ہے جس کا اعتراف میں آج کررہا ہوں!''

ذیشان کے کہنے پر ماہتاب کچھ دیر سر جھکا کر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہوں سنہری ڈور! ایسا لگ رہا ہے جیسے بچوں کی کہانی کی کوئی پری ہو۔۔۔!!''

ذیشان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک انگلی سے سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچ کر بولا۔

''ہاں کل رات ابو بچوں کو ایسی ہی کسی پری کی کہانی سنا رہے تھے! جس کے پاس سنہری ڈور ہوتی ہے! اب روٹھی بیوی کو منانے کے لیے کچھ تو کہنا ہی تھا ناں۔۔!''

ذیشان نے بھی شرارت سے کہا تو ماہتاب نے اسے گھورا۔

''ارے مذاق کررہا ہوں! تم سچ سمجھ بیٹھیں!''

ذیشان نے جلدی سے کہا تو ماہتاب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ویسے آپ نے سچ ہی کہا ہے ذیشان کہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے! مگر ہم رشتوں کو محبت اور ہمدردی کی سنہری ڈور سے باندھ ہی لیتے ہیں!''

ماہتاب کے لہجے میں شرارت مگر آنکھوں میں سچی خوشی تھی۔ ذیشان اطمینان سے مسکرا کر سر ہلانے لگا۔

واپسی کے سفر پر گنگناتے ہوئے اس نے گاڑی کا بیک مرر ٹھیک کرتے ہوئے خود کو دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیا۔

''ہاں تو بات شروع کی تھی کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔۔!

نہیں۔۔! یہ تو پہلے کی بات تھی! جس لمحے میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا اس کے بعد تو میں روایتی مرد نہیں کہلاؤں گا ناں۔۔۔!!

چلیں چھوڑیں! اس قصے کو! آپ بھی ذرا اپنے آس پاس غور سے دیکھیں!

کہیں آپ بھی اپنے گرد بندھی محبت اور ہمدردی کی سنہری ڈور سے بے خبر تو نہیں ہیں۔۔!!''

☆

آسیہ رزاقی

تبدیلی آ گئی ہے



اکلوتی اولاد 'اف' اکلوتی اولاد ہونا بھی سزا ہے۔ سزا؟ نہیں شامت۔ آفت مصیبت۔ اکلوتی اور پھر لاڈلی۔ بھئی واہ۔ اوپر سے خوب صورت بھی۔ لو جی طرّے پر طرہ لگ گیا۔ تو تاج پہنا دو۔ مگر بس لفاظی' خوشامد۔

اور یہ لفاظی ان مہمانوں کی تھی جو۔۔۔ بن بلائے آتے رہتے۔ آتے ہی رہتے۔ یکسانیت نے ذہن کند کر دیا۔ سوائے دعاؤں کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اے اللہ کچھ تبدیلی تو آئے زندگی میں۔ یہاں تو زندگی ایک ہی دائرے میں گھوم رہی تھی۔

اس کو زندگی گزارنا کہتے ہیں؟ یا زندگی ہمیں گزار رہی ہے۔

مہمان' مہمان در مہمان' صبح دیکھیں' نہ شام چلے آرہے ہیں۔ یہ فلاں چچا ہیں۔ یہ خالو ہیں۔ ڈھمکلے ماموں کی تشریف بھی آرہی ہے۔ اگلے پھپھا بھی چلے آتے ہیں کہ بھئی رشتے دار ہیں۔ کوئی قریبی کوئی دور کا۔ کوئی نسبتاً "مزید دور کے۔ اے بھئی اپنی محبت میں آتے ہیں۔ کوئی بلاتا تھوڑی ہے۔ آخر قرب تعلق کا اظہار بھی کیسے ہو؟ مروت و یگانگت بھی کوئی چیز ہے۔ اور خاطرداریاں۔ مہمان نوازیاں۔ ابا جان اور امی جان پر لازم۔

امی تو کسی کے گھر تو اترے جاتی نہ تھیں۔ نہ ہی ابا جان کسی نسبتاً" قریب یا دور کے عزیز کے گھر جاتے دیکھے گئے۔ ان کی تو محلے والوں سے ہی قربت تھی۔ جاتے بھی تھے اور لوگوں کو مسائل حل کرنے کے مشوروں سے بھی نوازتے۔ رات گئے تک مطالعے میں مشغول رہتے۔

دن میں مہمانوں کی مداخلت کے باعث مطالعے کا وقت ہی کم ملتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ٹی وی کا بھی شوق تھا۔ لیکن صرف پسند کا پروگرام۔ یعنی فٹ بال میچ بے حد شوق سے دیکھتے۔ جن دنوں کرکٹ کا سیزن ہوتا۔ پابندی سے دیکھتے۔ مہمانوں کی موجودگی میں بھی۔ ہاکی میچ اور ٹینس بھی' ذوق و شوق سے دیکھا کرتے۔ اور جب یہ ——————

مکمل ناول



سیزن بھی گزر جاتے۔ تو لان میں مالی کے سر پر سوار ہو جاتے۔ (بقول امی جان)

اسے ہدایتیں دیا کرتے۔ طریقے سکھاتے۔ خود بھی پودوں کی دیکھ بھال کرتے۔ لان کے لیے بہت سنجیدگی سے مالی کی شامت بلاتے۔ ثمین کو بھی بلا کر اسے مختلف پودوں کے نام ان کی افزائش اور دیکھ بھال کے طریقے بتاتے۔ پھولوں کے زمانے میں بہت جذباتی ہو کر نہ صرف مالی بلکہ مہمانوں کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگانے کی کوشش کرتے۔ گوڈی ہو رہی ہے۔ سوکھے پتے تلاش کر کے توڑے جا رہے ہیں۔ دوائیں چھڑکی جا رہی ہیں۔

ثمین فارغ وقت میں ان کا ہاتھ بٹاتی۔ امی جان کو باپ بیٹی کی یہ والی مصروفیت ناگوار گزرتی۔ وہ چپکے چپکے ابا جان کی کلاس لیتیں۔

"یہ کیا لڑکی کو لے کر لان میں بیٹھ جاتے ہیں آپ، پودوں پھولوں کی معلومات سے اسے کیا ملے گا۔ یہ عمر اس کی گھر کے کام سیکھنے کی ہے۔ نہ کہ کیاری میں کھرپا چلانے کی' حد ہے۔"

"یہ والی نصیحت۔۔۔ گھر کے کام سیکھنے کی' آپ بیٹی کو کریں۔ ادھر اُدھر خالی پھرتی رہتی ہے تو میں کام میں لگا لیتا ہوں۔ وہ بھی شوق سے کرتی ہے۔ میں نے نہیں سنا کہ کبھی آپ نے گھر کے کام کرنے کے متعلق اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا ہو اور ویسے اسے بہت پڑھنا ہے۔ کیا وہ پڑھ لکھ کر کچن سنبھالے گی؟"

"اچھا تو پڑھ لکھ کر انجینئر یا ڈاکٹر بن کر گھاس کھودے گی؟ جو آپ سکھا رہے ہیں۔ آپ کی ان تفریحات سے اسے فرصت ہو تو میں کچھ سکھاؤں۔"

امی کو قائل کرنا مشکل امر تھا۔

"اچھا خیر' آپ سکھائیں جو سکھانا چاہتی ہیں۔ جھاڑو پوچا' میں بھی اب تھک گیا ہوں مالی سے مغز ماری کر کے۔ نہ صاحبزادی نے کچھ سیکھا نہ مالی نے۔ کمبخت گوڈی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ ہاں جھاڑو لان میں دے لیتا ہے اور منحوس 'لان کے ساتھ میری نئی لگائی ہوئی پنیری بھی سمیٹ لیتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں۔ اسے نکال باہر کروں۔"

"آپ کی بیٹی بھی کچھ نہیں سیکھتی۔ اسے کہاں دھکا دیں گے؟"

"کیا مطلب؟ مالی اور ہماری بیٹی" ایک جیسی سزا کی مستحق ہو سکتی ہے؟" حیرانی سی حیرانی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ پہلے بیٹی کی اصلاح کریں۔ اسے کچھ اخلاقیات بھی سکھائیں۔ اس کے بعد بے چارے مالی کی خبر لیں۔ جاہل مالی کی۔ پڑھی لکھی بیٹی کو مہمانوں سے تپاک سے ملنا ہی سکھا دیں۔"

"وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ ہی اصلاح کر لیں۔" انہوں نے کتاب کھول لی پڑھنے کے لیے۔ امی بیزار ہو کر اٹھ گئیں۔ بیٹی پر برسنے کے ارادے سے کمرے سے نکلیں خراب موڈ کے ساتھ تو چند ہنستے مسکراتے مہمان داخل ہوئے۔ فوراً "موڈ درست کیا۔ مسکرانا لازمی تھا۔ اندر بٹھایا۔ ثمین آئی۔ اسے مہمانوں سے ملایا۔

"یہ تمہارے چچا ہیں یہ چچی۔ اور یہ ان کی بیٹیاں۔ آؤ ان سے ملو۔ کافی عرصے بعد آئے ہیں۔ اچھا ہاں شاباش' چائے بھی بنالو۔ اور ہاں وہ۔۔۔ اچھا ٹھہرو میں آ کر بناتی ہوں۔ تم فی الحال ان سے ملو۔"

چائے کی فرمائش پس پشت چلی گئی۔ وہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ چچا چچی سے ملنے لگی۔ یوں تو وہ اتنی شوقین نہ تھی ملنے ملانے کی۔ لیکن چائے بنانے سے تو آسان تھا یہ کام۔ (ملنا ملانا) وہ ان کی بیٹیوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اور دل جمعی سے سوالات کرنے لگی۔ (جس میں وہ ماہر تھی۔ بقول امی)۔

"ہاں ہم تو پشاور سے آئے ہیں۔ ابو کی جاب ختم ہو گئی تو آ گئے کہ یہاں گھر تو ہے۔ وہ ابو سعودیہ جا رہے ہیں نا جاب کی تلاش کے لیے تو۔۔۔" وہ بھی جواب دینے کی شائق۔

"ہم تو اپنے دادا کے بنائے ہوئے گھر میں رہنے آئے تھے۔" دوسری نے لقمہ دیا۔

"مگر۔۔۔ وہاں پھپھو نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ آدھا گھر

کرائے پر دے دیا۔ آدھے میں خود رہتی ہیں۔"

"اور ہمیں اوپر کے دو کمرے دے دیے۔ نہ وہاں کچن نہ کمرے میں اے سی۔ تندور کی طرح۔۔۔"

وہ نمی کے تابڑتوڑ سوالات کا جواب اسی تیزی سے دے رہی تھیں۔ پھر ابا جان آگئے۔ دونوں بھائی بے حد گرم جوشی سے ملے۔ پھر قہقہے ابلنے لگے۔

شکو چائے لے آئی۔ اب چائے کا دور چلا۔ شکو ان کی ملازمہ تھی۔ امی کی منہ چڑھی۔ "خیر خواہ۔ اور تیز دست۔" یہ امی کی رائے تھی اس کے بارے میں۔ جس سے نمی متفق نہ تھی۔

"چالاکو ماسی' بدتمیز۔" یہ اس کی حتمی رائے تھی۔

"دو کمرے؟ اور سب۔۔۔" وہ حیرت کا اظہار کرنے سے باز نہ آئی۔

"رہنے کے لیے تو ایک ہی کمرہ ملا۔ ایک میں تو ہمارا سامان ہی آگیا ہے۔ پھپھو ناراض کہ ہم پشاور سے آکیوں گئے۔ وہیں جاب تلاش کرتے۔" لہجے میں مجبوری اور اداسی۔

وہ شکو کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگئی۔ کمبخت کو سن گن لینے کی عادت تھی۔ چچا کی بیٹی نے بھی اس کے پیچھے آنے میں دیر نہ لگائی۔ دوسری نے بھی پیچھا کیا۔ نمی اپنے کمرے میں آگئی۔ ارادہ تو شکو کو ڈانٹنے کا تھا مگر شکو ایک کائیاں' ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔ کام کے بہانے۔ کمرہ کباڑ خانے کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ حسب معلوم' ہر سمت کپڑے' میلے اجلے۔ موزے جوتے' سوئٹر' کوٹ کھلونے' ڈیکوریشن کے پیس وہ بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہی تھی کہ کزن بے تکلفی کے ریکارڈ برابر کرتی ہوئی کپڑے ایک طرف سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

دوسری بہن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ وہ صوفے پر بچے کوٹ' سوئٹر اور شالوں کے ڈھیر پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ پچھلے ہفتے امی نے اسے گرم کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے لا کر دیے تھے۔ اسے فرصت نہ ملی۔ اب تینوں کا زبان دانی کا مقابلہ شروع ہوا۔ تینوں نے اپنی گفتار اور رفتار کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

شکو مہمانوں کی واپسی کی خبر لائی۔

"لڑکیوں کو بلا رہے ہیں۔" اس نے آکر کہا۔ وہاں تینوں کسی لطیفے پر ہنس رہی تھیں۔ کون سنتا۔ پھر وہ چیخی۔

"نمی بی بی۔" کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

آخر ڈریسنگ ٹیبل پر مکا مارا۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ صدا بہ صحرا ہوئی وہ آواز بھی۔ تب اس نے ثمین کے بالوں کا برش زمین پر پٹخا عین نمی کے سامنے۔ وہ ٹکڑے' کمرے میں سکوت۔ نمی پر سکتہ۔

"مہمان جا رہے ہیں جی۔ آپ دونوں کو بلایا ہے۔"

کہہ کر نمی کے سکتہ ٹوٹنے سے پہلے باہر لپکی۔ مہمانوں کے ساتھ ہی باہر آگئی۔ گھر جانے کے لیے۔ کل کے ناغے کا بہانہ بھی سوچ لیا۔ پرسوں تک نمی بی بی نیا برش منگوا چکی ہوں گی۔

نمی بی بی جوش میں بھری (غصہ) امی ابا جان کے پاس پہنچیں۔

اندریوں بھی کچھ دوسرے معاملات زیر بحث تھے۔ وہ جو شکو کی شکایت لے کر آئی تھی۔ دم بخود ابا جان کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ پھر جب اس کو اصل معاملے کا علم ہوا۔ تو چیخ اٹھی۔ ابا جان مطمئن۔

"ہاں بیٹا! ساجد تمہارے چچا ہیں۔ میں اپنے بھائی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا اور پھر ہمارا گھر بہت بڑا ہے۔ دل بھی بڑا کرو۔ ہمیں تو دو کمرے ہی کافی ہیں بلکہ گیسٹ روم بھی ہمارے پاس رہے گا۔"

"تو۔۔۔ ابا جان انہیں کیا فرق پڑے گا۔ وہاں بھی تو ان کے پاس دو کمرے ہیں۔"

"وہاں کمرے بے حد چھوٹے ہیں اور ایک باتھ روم ہے۔ ایک کمرہ تو ان کے سامان سے بھر گیا ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ یہاں بڑے کمرے ہیں۔ اسٹور ہے۔ کچن بھی چھوٹا سہی۔ مگر الگ ہے۔ برآمدے میں بھی گنجائش ہے۔ اندر صحن' باہر لان۔ وہ تو بہت خوش ہو گئیں۔ پھر آپا کا مزاج۔ ان کے کچن میں جا کر کام کرنا اتنا آسان نہیں۔ بیٹا! کسی کی پریشانی میں ہمارے ذرا

سے عمل سے اگر کمی ہوتی ہے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ پھر یہ تو ہمارے اپنے ہیں۔" اف ابا جان کی ہمدردی۔

"امی اور ان کی لڑکیاں اُف۔" اب امی سے داد چاہی۔ "توبہ کتنا بولتی ہیں۔ زن زنا زن ٹرین چل پڑی۔ رکتی ہی نہیں اف خدایا۔ میں تو تھک گئی۔ سن سن کر۔"

امی نے خفگی سے اسے گھورا۔ ابا جان اپنی کتاب میں گم ہو گئے۔

"دوستی کر لینا۔" ایک وقفے کے بعد ابا جان نے مشورہ دیا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

"ہمارے ایک گھر میں دو گھر۔ وہ بھی اتنا بولنے والے۔ کان تھک گئے میرے۔" بڑبڑاہٹ اتنی بلند ضرور تھی کہ امی سن سکیں۔

"مجھے تو بولنا آتا بھی نہیں اور ان کے پاس کتنے قصے ہیں یا اللہ۔ ایک گھنٹے میں چار قصے سنا دیے۔"

امی کے پاس جواب موجود تھا۔ "میں سن رہی تھی۔ جب وہ قصے سنا رہی تھیں اور تم ان سے بڑھ کر قصہ سنا رہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، پھپھو نے یہ کہا۔ یہ کیا تم جواب دیتیں۔ شکو نے یہ کہا۔ یہ کیا۔ غضب خدا کا۔ ثمین! تم ان سے کم نہیں ہو۔"

"تو۔ میرے پاس اور تھا بھی کیا شکو کے سوا اور آج اس نے میرا پینٹ برش بھی توڑ ڈالا۔"

"اچھا ہوا۔۔۔ تم کب استعمال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب وہ قصہ سنا رہی تھیں۔ تمہیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے تھی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو جاتیں۔ کم از کم پھپھو کے قصے تو نہ ہوتے۔ بری بات۔ یاد رکھو غیبت کرنے والا گناہ گار ہے تو سننے والا گناہ سے بری نہیں ہو جاتا۔"

"امی وہ تو بس اپنی تکلیفوں کا حال سنا رہی تھی۔" وہ منمنائی اور توبہ توبہ کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر آئے وقت کے لیے (کڑا وقت) تیاری کرنے لگی۔ اف۔

ایک ہفتہ ہوا تھا کہ چچا مع سامان اور فیملی کے آ گئے۔ چچا نے خانساماں کی مدد سے اپنا سامان سیٹ کیا۔ اسٹور سوٹ کیسوں سے بھر گیا۔ کمرے سج گئے۔ برآمدے میں کھانے کی میز کرسی جم گئی۔ کچن آباد ہو گیا۔

ابا کے ہاتھ چومتے۔ شکریہ شکریہ کرتے چچا سعودیہ روانہ ہو گئے۔ ثمین نے کمرہ بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اسے پڑھنا تھا۔ ابا جان کی خواہش کہ وہ بہت سا پڑھ کر عالم فاضل ہو جائے۔ چند دن نسریٰ اور اسریٰ نے اس کا انتظار کیا۔ پھر وہ بھی کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

امی اور ابا جان گھر کی رونق سے بہت خوش تھے۔ رات کا کھانا مل کر ایک جگہ کھایا جاتا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ ہوتی۔ ثمین نے سوالات کا سلسلہ موقوف کیا۔ وہ واقعی پڑھائی میں منہمک ہو گئی تھی۔ لیکن نسریٰ۔ اسریٰ اس موقعے پر بھی ثمین سے چپک کر اپنی معلومات سے آگاہ کیا کرتی تھیں۔ وہ کچھ متاثر ہو ہی گئی۔

ان دونوں کی معلومات وسیع تھیں۔ فیشن، عباس جیولری، کس مارکیٹ میں کون سا اسٹور بہت شان دار ہے۔ کہاں فیشن کے ملبوسات اچھے داموں مل جاتے ہیں۔ آج کل کون سی فلم مقبولیت کے ریکارڈ توڑ رہی ہے۔ ثمین کی خاموشی کی ایک وجہ اس کی لاعلمی بھی تھی۔ لیکن تابہ کے۔ کب تک ان سے الگ رہتی۔ آخر دوستی ہو گئی۔

نسریٰ نخرے والی تھی۔ اسریٰ سادہ مزاج اور ملنسار تھی۔ اسریٰ سے پکی دوستی ہو گئی۔ مگر اس کے پاس وقت کی کمی تھی۔ ابا جان نے بھی مجبور کیا۔

"دیکھو تمہارے طرز عمل سے محسوس نہ ہو کہ تم ان سے بیزار ہو۔ ہم نے خود انہیں بلایا ہے۔ وہ بن بلائے مہمان نہیں ہیں۔ اور تمہیں تو اپنے اکیلے پن کا شکوہ رہتا تھا۔ اب دو بہنیں آ گئیں۔ ان کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

مہمانوں کی آمدورفت جاری و ساری تھی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد سے گو کہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شکو تھی نا۔ وہ کسی جن کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ سارے کام بخوبی اور بہ خوشی انجام دینے کے لیے۔ وہ

گھر کے کونے کونے سے واقف تھی۔ امی نے ڈرائی فروٹ کس غار میں پوشیدہ رکھے ہیں۔ حلوہ جات، نمکو وغیرہ کا خزانہ کس کونے کھدرے میں قیام پذیر ہے۔ امی کے آنکھ کے اشارے پر دوڑ کر جاتی۔ کچھ دیر بعد ٹرالی سجا کر مہمانوں کے سامنے لے آتی۔

ثمین سے امی کو نہ جانے کون سے خطرات لاحق تھے کہ ہر چیز اس سے چھپا کر رکھی جاتی۔ وہ دانت پیس پیس کر اسے گھورتی۔ جو فخریہ نظروں سے اسے دیکھتی گویا جتا رہی ہو کہ یہ میں ہوں گھر کی مختار کل۔ مالکن کے اعتبار کی حق دار۔ ہاں تو اس اسٹور میں جہاں سارا خزانہ پوشیدہ تھا۔ ثمین کی جان نکلتی تھی۔ جھینگر، چیونٹے۔ کبھی کاکروچ بھی۔ کساریاں اڑتی پھرتی تھیں۔ کیا پتا کوئی کیڑا اس پر حملہ کردے۔

اسٹور میں بڑی ترتیب سے مختلف ڈبے قطار میں کھڑے تھے۔ مستعد، کھولو اور پالو۔ من پسند چیز۔ لیکن اسے واقفیت نہ تھی۔ ہر ڈبا کھولنا۔۔۔ دشوار کام۔ شکو مگر ہر راز سے واقف تھی۔ کمبخت کو کچھ تلاش نہ کرنا پڑتا۔ جن کی نسل سے تھی۔ آنکھیں بند کر کے بھی مطلوبہ اشیاء برآمد کر لیتی۔ یقیناً "نڈر" تھی۔ چپل سے کاکروچ کو مار دینا دل پسند کارنامہ تھا۔ اکثر ڈبوں پر کیڑا ڈال کر اسپرے کرتی۔ پھر جھاڑو سے کیڑوں کی لاشیں بھی اٹھاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کام کے اسٹور میں گھسی اور منہ چلاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ ثمین فوراً "ابا جان سے فریاد کرتی۔

"دیکھیں، دیکھیں شکو اسٹور سے آئی ہے۔ پلو سے منہ پونچھتی ہوئی۔ اس سے پوچھیں۔ پوچھیں کیا کھاتی آرہی ہے۔ یقیناً "کاجو بادام۔ اس کا پیٹ کیا اسٹیل کا ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے۔"

"تو؟ گھر کے کام بھی تو وہی کرتی ہے سارا دن۔ آخر اسے بھی توانائی کی ضرورت ہے۔" یہ امی جان کی طرف سے جواب ملا۔

"جی درست۔ مجھے تو توانائی کی ضرورت ہی نہیں۔ امی آپ کبھی انصاف بھی کر لیا کریں۔"

"تو بیٹا جی! آپ بھی اسٹور میں جا کر کچھ کھا لیا کرو۔

مجھے خوشی ہوگی کہ میری بیٹی کو ہل کر کچھ کام کرنے کا خیال تو آیا۔ خواہ کھانے کا ہی سہی۔"

امی کے استدلال ۔۔ اور اس کی جھلاہٹ۔ اسے یقین تھا کہ امی کو بیٹی سے زیادہ شکو عزیز ہے۔ کمبخت کہیں کی۔ چالاکو ماسی۔ میرا حق غصب کرنے والی۔

"بیٹا! آپ نے شاید سنا ہو۔" ابا جان نے بھی دخل دے ہی دیا۔ "آدمی کا کام پیارا ہوتا ہے۔ چام نہیں۔"

اب یہ چام کمبخت کہاں سے آگیا۔ اسے لگا۔ چماٹ کی قسم ہوگی یا چمار کی اولاد کے مترادف۔ اب میں ایسی ہو سکتی ہوں بھلا۔ اپنے پیارے ابا جان امی جان کی نظر میں۔ لیکن ابا جان اسے چام کا مطلب سمجھانے لگے۔ چام یعنی چمڑی۔ یعنی شکل صورت۔ دیکھا چمار کی نسبت نکل آئی۔

"اپنے اپنے نصیب۔" امی جان اسے منہ بناتے دیکھ کر مسکرائیں۔ "صبر بھی کرو۔ نکمی' ناکارہ۔"

"یعنی اکلوتی لاڈلی کی کوئی اہمیت نہیں؟ آخر مجھے شکو جیسا نصیب کیوں نہ ملا۔ میں نکمی۔ ناکارہ' بے صبر' کم ظرف ہوں۔ بد حرام ہوں۔ مگر ہوں تو آپ کی بیٹی۔ مجھے ترجیح کیوں نہیں دے جاتی آخر؟"

"بیٹا جی۔" ابا جان نے لاڈ سے بازو میں لے کر اسے چمکارا۔ "آپ نہ کم ظرف ہو نہ بد حرام۔ ہم دونوں آپ سے محبت کرتے ہیں۔ مگر ہمارا فرض ہے۔ آپ کی بہتری کے لیے نصیحت کریں۔ آپ اس پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ برداشت بھی ہونی چاہیے۔ زندگی میں کام آتی ہے۔"

لو جی ایک اور نیا خطاب بلکہ القاب۔ علاوہ بے صبر نکمی' ناکارہ کے۔ پورا دن اداسی طاری رہی۔ سوچ کے بے شمار در وا ہو گئے۔ ان سارے الزامات خطابات' القابات وغیرہ سے بری ہونے کی صورت نظر نہیں آئی۔ صرف ایک نتیجہ سامنے آیا۔

"میں بہت بری ہوں۔ ابا جان اور امی جان کے معیار کے مطابق نہیں' اسی لیے شکو' نسری' اور اسری' ان کے زیادہ قریب ہیں۔ یعنی کہ۔ زیادہ کام کرنے والی زیادہ مصروف نظر آنے والی شکو (شکیلہ عرف شکو عرف چالاکو ماسی) اور زیادہ بولنے والی۔ بک بک کی شوقین۔ نسری' اور اسری'۔ میں ان کی نظروں میں غیر اہم ہوں۔ اچھا میں غیر اہم بن کر ہی جی لوں گی۔ میرے نصیب۔ رونا آگیا۔ ابا جان کو بھتیجیاں دستیاب ہیں۔ امی کو تیز دست بہن کی اولاد۔ شکو' وہ دونوں اپنی پسندیدہ ہستیوں سے دل لگالیں۔ ہم بھی پڑھ لیتے ہیں۔

دروازہ لاک کر کے پڑھتی رہی۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ دل نہ لگنے کے باوجود وہ کتابوں میں غرق رہی۔ شام کو شکو نے دستک دی۔ چائے کی نوید سنائی۔ وہ کان بند کیے بیٹھی رہی۔ چائے کے بغیر ہم مر تو نہ جائیں گے۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو چائے نہیں پیتے جیسا کہ۔۔ اس کے پھپھا۔ ڈھمکے چچا۔ انہیں شربت مرغوب تھا۔ ہائے مگر شربت بھی تو دستیاب نہیں۔ اس کا علم بھی شکو کو ہے۔ کس کونے یا کس خانے میں پائے جاتے ہیں۔ اسکوائش' شربت فلاں فلاں۔ صبر کی اور برداشت کی عادت ڈالنی ہے۔ پڑھ پڑھ کر دماغ شل' آنکھیں بوجھل' سر بھاری۔

رات ہوئی۔ دروازہ بجا۔ "کھانا کھالیں۔"

بھوک تو تھی۔ مگر صبر و برداشت آزمانے کے لیے کہہ دیا۔

"بھوک نہیں ہے۔ بعد میں کھالوں گی۔"

شکو کی گنگنانے کی آواز معدوم ہوئی۔ از سر نو اپنی ناقدری پر رونا آیا مگر۔۔ ایک بار پھر دستک۔

"صاحب نے بولا ہے۔ کمرے میں کھانا ہے تو لے جاؤ' لے آئی ہوں۔" ہائے رے اطاعت۔

"نہیں کھانا۔ نہ کمرے میں نہ باہر۔ تم ٹھونسو۔"

ابا جان کو خیال ہے میرا۔ امی نے تو پوچھا تک نہیں۔ نہ جانے ممتا کہاں جاسوئی ہے۔ وضو کر کے نماز شروع کر دی۔ اللہ سے فریاد۔۔ دروازہ کھلنے کی آواز۔ وہ لاک تھا۔ مگر چٹخنی تو لگائی نہ تھی۔ ابا جان کے پاس دوسری چابی ہوتی تھی۔ ہوتی تو امی کی رسائی میں بھی۔ مگر انہیں میری پروا نہیں۔

ابا جان اس کی نماز ختم کرنے کے انتظار میں تھے۔ وہی ہوا۔ ان کے ایک پیار بھرے لمس نے ایک محبت

بھرے جملے نے ساری خفگی بھلادی۔

"میرے بچے کو بھوک کیوں نہیں ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ ان سے لگی بیٹھی تھی۔

"میں آپ دونوں سے ناراض تھی۔ چائے بھی نہیں پی۔ ہڑتال یعنی بھوک ہڑتال۔" ناز بھرا لہجہ۔

"ارے ارے بھئی۔ میرا بچہ اتنا سمجھ دار کب سے ہوگیا۔ ناراضی میں بھوک ہڑتال کردی۔ بتادیا ہوتا۔ تمہاری امی سمجھ رہی تھیں تم سو رہی ہو۔ ہائیں ہوا کیا؟" ابا جان سراسیمہ ہوگئے۔ اب سارے شکوے شکایتوں کے پلندے کھل گئے۔

"میں صبح سے خفا ہوں۔ آپ نے خبر لی؟ کھانا کھایا نہ چائے پی۔ کسی نے آکر پوچھا؟ اب تو جو کچھ ہیں نسری' اسری' ہیں آپ کی۔ امی کے لیے شکو کافی ہے۔ میں کون ہوں؟ غیر اہم۔ فالتو پرزہ میرے پاس صبر برداشت کے سوا اور ہے بھی کیا؟ یہی چاہتے ہیں آپ؟"

"آہا۔ میرا بچہ سمجھ دار ہوگیا۔ سنو میں تو دوپہر کو کھانا کھا کر ناظم کی طرف چلا گیا تھا۔ ابھی آیا ہوں۔ وہاں کچھ مسئلہ تھا پچھلے دنوں۔ خیر دوپہر میں تم کب کھانا کھاتی ہو۔ چائے پر نہیں آئیں تو تمہاری امی سمجھیں کہ سوگئی ہو پڑھتے پڑھتے۔ اب شکو نے بتایا کہ تمہیں بھوک نہیں ہے۔ تو میں آگیا۔"

"ناظم چچا کا کیا مسئلہ تھا۔" وہ شرمندہ تھی' بات ٹالنے کو سوال کر بیٹھی۔

"ارے بیٹا۔ اولاد کے مسائل بہت نازک ہوتے ہیں۔"

"ابا۔ آپ کو ان کی اولاد سے کیا لینا ہے۔ ناظم چچا خود ہی مسئلہ حل کریں۔"

"دوستی کا معاملہ ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے تو مجھے بلا لیتا ہے۔ دراصل اس کی بڑی بیٹی کا جب رشتہ آیا تو میں بھی داماد کو دیکھنے گیا تھا۔ اس کے والدین بہت معقول لگے۔ لڑکا بھی مناسب ہی تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ والدین سے الگ ہوگیا اور گھر کی ضروریات کے لیے ناظم سے مطالبہ کرنے لگا۔ اے سی لگوادیں۔ جنریٹر کی ضرورت ہے۔ بچے ہوئے تو اسے کار چاہیے۔ ناظم بیٹی کی خاطر کسی طرح اس کے مطالبات پورے کرتا رہا۔ اس کی حیثیت بھی کچھ نہیں تھی۔ قسطوں پر کار لے کردی۔ اب وہ کہتا ہے کہ کار دے دی تو کیا کمال کیا میں تو ڈرائیور بن گیا ہوں آپ کی بیٹی اور نواسوں کا۔ گھر میں جو شرعی حق بنتا ہے آپ کی بیٹی کا۔ وہ دے دیں رقم کی صورت یا آدھا گھر۔ بے چارہ پریشان تھا۔ دو بیٹیاں ایک بیٹا اور ہیں۔ آدھا گھر کیسے دے۔ پھر اس نے بیوی بچوں کو ناظم کے پاس بھیج دیا۔ بچاری ناظم کی بیٹی بھی پریشان تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ تم اپنی ساس کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ آپ مجھے بیاہ کر لائی تھیں۔ آپ کے بیٹے نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب میرے اور بچوں کے اخراجات آپ کی ذمہ داری ہے۔ اور آپ مجھے اپنی جائیداد سے وہ شرعی حق دینے کی پابند ہیں۔ جو میرے بچوں کا حق بنتا ہے۔ مجھے جائیداد میں سے حصہ چاہیے۔ وہ یقینا" سوال کریں گی تو بتادینا۔ آپ کا بیٹا میرے باپ سے میرے شرعی حق کا دعوے دار ہے۔ تو میں آپ سے اپنے بچوں کا حق مانگتی ہوں۔ کیونکہ بچے آپ کی نسل ہیں۔ تو یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اب وہ اپنے شوہر کے گھر میں آرام سے رہتی ہے۔ آج ناظم نے اس مسئلے کے ڈراپ سین کا قصہ سنانے کے لیے بلایا تھا۔ ناظم کی بیوی تو بہت ڈر گئی تھی کہ میرے مشورے پر بگڑ نہ جائے معاملہ اور داماد مزید کوئی مسئلہ نہ کھڑا کردے۔ کہ بھئی اپنی بیٹی کو رکھو اپنے پاس۔ پھر مشکل ہوگی کہ اتنے اخراجات۔۔۔ بیٹی اور نواسوں کے کیسے پورے کریں گے۔

مگر۔۔۔ ان کی بیٹی کے ساس سسر نے بیٹے کو بہت ڈانٹا۔ اس کی خوب کلاس لی کہ اگر تمہارے تینوں بہنوئی گھر میں سے حصہ مانگ لیں گے۔ تو کیسے پورا کریں گے ہم۔ خیر شرمندہ ہوا۔ اور بیوی بچوں کو لے گیا۔ معافی مانگی ناظم سے' یہ ہوتی ہے مردم شناسی۔ میں نے اس کے والدین کے ظرف کو پہچان کر ہی اس شادی کے لیے اصرار کیا تھا۔ اب دوسری بیٹی کا رشتہ

آیا ہے۔ مجھے ہی لے کر گیا۔ وہ بھی میں نے اوکے کر دیا۔ اس لیے مجھے خاصا وقت لگ گیا۔ اچھا اب آپ پھر سے اپنی شکایات کا ورق کھولیں۔ کیوں ہمیں سزا دی جارہی ہے بھوک ہڑتال کی صورت۔"

وہ بوکھلا گئی۔ "ارے نہیں۔ بس چلیں' کھانا کھانے چلیں۔ اتنی سخت بھوک ہے۔ میں مذاق کر رہی تھی۔"

وہ انہیں دھکیلتی ہوئی کھانے کے کمرے میں لے آئی۔ جہاں چچی' نسری' اسری' موجود مع امی کے۔ ابا جان نے سرگوشی کی۔

"ارے کہیں یہ تمہیں چبا نہ جائیں۔" ان کا اشارہ نسری' اسری کی طرف تھا۔

"میں لوہے کا چنا ہوں ابا جان! دانت ٹوٹ جائیں گے ان کے۔" وہ بھی منمنائی۔

"اوہو! کھانا شروع کرو بھئی۔ رزق کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔" ابا جان نے شور مچایا۔ بعد میں اس کو نصیحت بھی کی۔ "ماں باپ سے زیادہ کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں دوسروں کے لیے دل میں گنجائش ضرور نکالنی چاہیے۔ ہر رشتہ اہم ہوتا ہے۔ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے رات کو امی کے پاس جا کر معافی مانگی۔ وہ حیرانی سے پوچھنے لگیں۔ "کیسی معافی؟"

"امی! میں آپ سے ناراض تھی۔" امی نے لاعلمی ظاہر کی کہ انہیں تو اندازہ نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ امی اداکاری کر رہی ہیں۔ سمجھ تو گئی تھیں۔ امی بھی مگر۔

اب ثمین نے رویہ بدلا۔ گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔ کبھی کوئی دل کی بات یا اپنے محسوسات امی کو بتانے چاہے تو وہ ٹال جاتیں۔

"چلو ہٹو فضول' مجھے بہت کام ہیں۔ تمہاری کہانی سننے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ ذرا کام کرو یہ پالک اور میتھی کے پتے چنو۔ مدد کرو میری۔"

"خانساماں کر لے گا۔ آپ میری بھی سنیں۔" وہ حیران ہوتی۔ خانساماں آخر کس مرض کی دوا ہے۔

"خانساماں کو اور بہت کام ہوتے ہیں۔ ابھی چائے بنا کر لایا تھا۔ مہمان آ گئے تھے۔ اب اسے بھی کچھ سہولت ہو جائے گی۔ بے چارہ سارا دن لگا رہتا ہے۔"

"بے چارہ سارا دن لگا رہتا ہے۔ شکو بچاری سارا دن پھرکی بنی پھرتی ہے۔ ایک میں فالتو ہوں کہ یہ فضول کام۔" مگر فرماں برداری کے ریکارڈ بنانے کے لیے وہ پالک کے پتے چنتی۔ حالانکہ اسے نہ پالک پسند تھا نہ میتھی کی خوشبو۔ وہ یہ گھاس پھوس کھاتی بھی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال میں یہ بکری کا چارہ تھا۔ ابا جان اسے بکری نہیں شیرنی بنانا چاہتے تھے۔ شیر بھلا پالک میتھی کھاتا ہے؟

"کسی کام میں پتہ نہ مارنا۔ یہ پالک اکٹھے کرو۔ ڈنٹھل میں خود کاٹ دوں گی۔ کیا نوچ کھسوٹ کر رہی ہو۔"

امی کو خوش کرنا۔ ناممکنات میں سے تھا۔ وہ بیزار ہو کر اٹھ گئی۔ اور آلو پالک پکا دیکھ کر سخت افسوس۔

"آلو پالک میں خانساماں ذرا سا گوشت ڈال دیتا تو۔" مگر امی کی خوشنودی کے لیے وہ کھانے پر آمادہ ہو گئی۔ آلو میتھی۔ اف۔ میتھی کے بیچ میں سے آلو چننا۔ پتے چننے سے بھی دشوار کام۔ خیر دل بڑا کرنا امی کی خواہش پر۔ ہر چیز اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ ہر سبزی میں بے حد فائدے ہیں۔ سب کچھ کھانا چاہیے۔

اور وہ آلو کے ساتھ میتھی کے اکا دکا پتے بھی چبا جاتی۔

سلیقہ شعار تو بن نہیں سکتی تھی۔ اچھی بچی بننے کے لیے بکری بن کر گھاس پھونس کھانا شروع کر دیا اور مہمانوں سے تپاک سے پیش آنا بھی سیکھ لیا۔ لیکن اف امی کی وسیع تر خواہشات۔

"بہادر بننے کی کوشش کر رہی ہے ہماری بیٹی۔" ابا جان اسے کھانے میں نخرے نہ کرنے پر کہتے۔

"کچھ سلیقہ بھی سیکھ لیتی۔" امی منہ بناتیں۔ "کمرہ بے ڈھنگے پن کا اعلا نمونہ۔ الماری پھوہڑ پن کا اعلا شاہکار۔ بستر میرے خدا۔ اس کی سسرال میں دس نوکر ہوں گے تب شاید۔ سن رہے ہیں آپ۔"

"بیٹی آپ کی ہے۔ سکھا دیں سلیقہ' مجھے کچھ

اعتراض نہیں مگر ابھی اسے پڑھنے دیں۔"
امی کو اس کے پڑھنے پر بھی اعتراض تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن خالہ آگئیں۔ پشاور میں رہتی تھیں۔ مگر ان کا بیٹا امریکہ یا انگلینڈ میں تعلیم کے لیے چکر لگاتا۔ دو بیٹیاں بھی دوسرے ملکوں میں۔ خالہ کا ایک پیر۔ بیٹے کے پاس دوسرا بیٹی کی طرف۔

چچی کی ان سے پشاور سے جان پہچان تھی۔ رات میں تینوں خواتین کی امی سمیت محفل جمی۔ اسے تو نہ چچی اچھی لگتی تھیں نہ خالہ ہی پسند آئیں۔

خالہ نے بتایا۔ "ان کا بیٹا اب امریکہ میں ہے۔ سسرال کی کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں۔ جاتے ہوئے اپنے بیٹے کے لیے ثمین کا رشتہ دے گئیں۔

"جواب لینے آؤں گی وہاں سے فارغ ہو کر۔"

یونیورسٹی کا نام گھر کا پتا بتا گئیں۔ ابا جان نے اپنے دوستوں سے رابطہ کیا امریکہ انہیں تحقیق کا فریضہ سونپا۔ ادھر سے "سب بہترین" کا رزلٹ معلوم ہوا۔ امی فکر مند۔ امریکہ اتنی دور۔۔۔ ابا جان بھی سوچ میں پڑ گئے۔ ایسا ہوا تو؟ یہ نہ ہوا تو۔۔۔ پھر دل کو سمجھا لیا۔ مگر لڑکے کی تعریف، تعلیم، مزاج بہترین۔

خالہ آئیں۔ بہت خوشامد۔ گارنٹی دینے کو تیار۔ آجائے گا یہیں۔ اچھی جاب مل گئی تو وہاں کیوں جانے لگا؟ اور اسے تو جاب چٹکی بجاتے مل گئی۔ وہ کالج سے آئی تو سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ انہوں نے پرس سے انگوٹھی نکال کر پہنا دی۔

"ہمارے ہاں منگنی کا رواج نہیں ہے۔ مگر میں صرف نشانی دے رہی ہوں کہ اب ثمین میری امانت ہے۔ میرے سہیل کی۔۔۔" بہت لجاجت سے کہہ کر اسے گلے لگایا اور چلی گئیں۔

مٹھائی لے آئی تھیں۔ وہ بانٹنی پڑی۔ پھپھو فوراً آگئیں بہت ناراض۔

"ارے میں کہیں مر تو نہیں گئی تھی۔ بندہ بڑوں سے مشورہ ہی کر لیتا ہے۔ میرا بیٹا موجود ہے۔ میری بھتیجی کسی اور سے۔ لو نئی بات مجھے تو تم نے غیر سمجھ لیا۔"

"آپا! آپ کی دو بھتیجیاں اسی گھر میں موجود ہیں۔" امی نے سمجھایا۔

"لو۔ اتنی زبان دراز۔ چالاک مکار۔ توبہ میں تو کبھی نہ کروں اب کیا بتاؤں؟"

"خیر، زبان دراز تو نہیں کہہ سکتے۔" ابا جان فوراً وکیل صفائی کا کردار ادا کرنے لگے۔ "آپ نے انہیں تنگ بھی بہت کیا تھا۔ شاید کچھ بول پڑی ہوں۔ مگر بہت نیک، شریف بچیاں ہیں۔"

"تمہیں کیا پتا۔ میرے گھر میں دو مہینے گزرے۔ ایسے کہ کیا بتاؤں "اف تنگ کر مارا مجھے۔"

"میرے گھر میں تو چھ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے کیوں نہ تنگ کیا اور یوں بھی آپ نے ان کے گھر پر ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ کرایہ بھی وصول کر رہی ہیں اور حق دار کو اوپر کا ایک کمرہ۔ آپا غور کریں۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ میں دستبردار ہوا ہوں اس گھر سے۔ ساجد کا تو حق ہے۔"

"تو اب تم بھی دعوا کرو گے۔ کیا بہن کا حصہ نہیں بنتا۔"

"اصولاً" تو بہن کے حصے میں اوپر کے دو کمرے ہی ہیں۔ قبضہ آپ نے۔۔۔ خیر چھوڑیں۔"

پھپھو منہ پھلائے چچی کی طرف چلی گئیں۔ امی گھبرائیں۔ "تو اب ان سے نہ لڑنے لگیں۔ خواہ مخواہ۔"

"نہیں لڑیں گی۔ وہ بہرحال غاصب ہیں۔ اور سمجھتی بھی ہیں خوب۔"

کچھ دیر بعد پھپھو، چچی کے پاس سے آئیں۔ خوش گوار موڈ کے ساتھ چچی نے بھی خوش دلی سے خدا حافظ کہا۔ ابا جان مسکرا دیے۔ دنیا کتنی عجیب ہے۔ لوگ کیسے بدل جاتے ہیں۔ کینچلی بدلنا شاید اسے ہی کہتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

انسان اپنے مفاد کے لیے بے حس ہو جاتا ہے۔ اسے رشتوں سے تعلق رکھنا بھول جاتا ہے۔ وہ خود غرضی کے بھنور میں چھپ جاتا ہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ دل کی تنہائی ہو یا ذہنی اکیلاپن۔ کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے لیکن۔۔۔ ان کے لیے جو احساس رکھیں۔

آج کی دنیا تنہائی کی دلدادہ تھی۔ اف کاش میں اتنی تنہا نہ ہوتی۔ کوئی میری بہن ہوتی۔ میری اصلی والی بہن۔

ثمین کی سوچ بہت محدود تھی۔ مگر اب اسے صرف اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ اعلا تعلیم اباجان کا ارمان اور شاندار مستقبل خوشحال زندگی۔ اباجان بیٹی کو بیٹا کہتے ہی نہ تھے۔ سمجھتے بھی تھے۔ اور وہ بھی بیٹا بننے پر فخر کرتی۔ (سوچنے میں کیا حرج ہے) آخری پیپر دے کر خوش خوش واپس آرہی تھی۔ تمام پیپر بے حد عمدہ ہوئے۔ اپنی قابلیت پر خود کو داد دینے کا دل چاہا۔ خیر ابا جان سے بڑھ کر اور کون داد دے گا۔ رزلٹ آنے پر تو جشن منانا لازمی۔ امی بھی کیا یاد کریں گی۔

وہ گل سے باتیں کرتی آرہی تھی۔ گل اس کی دوست اور ہم جماعت تھی چند گھر آگے اس کا گھر تھا۔ اپنے گیٹ پر اس نے گل کو خدا حافظ کہا اور پرجوش انداز میں اندر آئی۔ اباجان کی متوقع پرشوق نظروں کے بجائے سناٹا وہ دوڑی چچی کی طرف نسریٰ ملی۔

"وہ' وہ تو ہسپتال 'چچا جان کی طبیعت خراب۔۔۔ اسریٰ چچی کے ساتھ۔"

نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔ ثمین بے قرار ہو کر باہر بھاگی۔ آخری بات نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔

"اسریٰ کا فون آیا تھا چچا جان کو ہارٹ اٹیک۔۔۔"

گل ابھی اپنے گیٹ پر تھی جب ثمین نے اسے جا لیا۔ گل نے بھائی کو ساتھ لیا۔ اپنی امی کو بتا کر حواس باختہ ثمین کو لے کر نسریٰ کے بتائے ہسپتال کے لیے روانہ ہوئی۔ ابا جان کو ہارٹ اٹیک۔۔۔ کیسے کیوں؟ کبھی تو کچھ ہوا نہ تھا۔ بہت محتاط زندگی گزارتے تھے۔ اچھی صحت تھی۔ اچھی صحت؟ پھر گل کے بھائی نے امی کو تلاش کر لیا۔ برآمدے میں ایک بینچ پر فکر مند بیٹھی تھیں۔ اسریٰ پاس تھی۔ وہ کیفیت بتانے لگی۔ وہ امی سے لپٹ گئی۔ امی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"دعا کرو بیٹا! دعا۔" اسریٰ اور گل آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔

ہسپتال کا مخصوص ماحول 'نرسیں 'ٹرالیاں 'دواؤں کے لپکے۔ اف کون سی دوا اباجان کو دیں گے کہ وہ فوراً صحت مند ہو جائیں۔ وہ مسلسل دعا کر رہی تھی۔ پھر ایک ڈاکٹر وہاں آکر کھڑے ہو گئے۔ نہ جانے کیا بول رہے تھے۔ اپنی کاوش کوشش۔ اللہ کی مرضی کچھ اور بھی افسوس۔

امی دم بخود۔ ان کا رنگ یک لخت اڑ گیا۔ ثمین کے منہ سے نکلا۔

"انکل سرفراز؟"

وہ مڑے۔ "ارے باربی ڈول؟"

انکل سرفراز انگلینڈ میں پڑوسی تھے۔ بہت دن ساتھ رہا۔ بے تکلفی پھر وہ۔۔۔ سعودی عرب چلے گئے۔ آج عرصہ بعد دیکھ کر دونوں پہچان گئے۔ مگر ان کا متغیر چہرہ اور الفاظ۔۔۔

"میں پہچان گیا تھا نام اور چہرہ۔ اجنبی نہ تھا میرے لیے۔ لیکن۔۔۔ افسوس میں اپنے دوست کو نہ بچا سکا۔ اللہ 'اللہ نے بس اتنی سانسیں۔۔۔"

نہ جانے اور کیا کچھ کہتے رہے۔ وہ امی سے لپٹ گئی زور سے۔ "یہ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔ بھلا کوئی انکل ایسا ہوتا ہے؟ یہ۔ یقین سے دور۔۔۔ مگر۔"

"میں اس ہسپتال میں دو دن ڈیوٹی دیتا ہوں۔ آج بھی میرا دن تھا۔ کاش میں کچھ کر سکتا۔" وہ بمشکل جذبات پر قابو پا سکے تھے۔

انہوں نے ایمبولینس کا انتظام کیا تھا اور پھر۔۔۔ قافلے کی شکل میں سب واپس آئے۔ لٹے پٹے قافلے کی مانند۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ گھر سنسان ہوا تو وجود میں سناٹے بولنے لگے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ اصل تنہائی تو اب شروع ہوئی۔ نہ امی کے پاس اعتراض کا موقع تھا نہ ثمی کے پاس الفاظ۔ بس ایک خاموش معاہدہ تھا۔ ایک شکوہ تھی جو بولا کرتی۔ اس کی

آواز غنیمت تھی ورنہ تعزیت کے لیے چند دن لوگ آئے۔ محلے والے ہمدردی کے لیے آتے رہے۔

چچا کا فون آیا۔ وہ اب امریکہ بیٹے کے پاس چلے گئے تھے۔ ان کو وہاں جاب مل گئی تھی۔ بیٹا اسکالرشپ پر پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت سالوں سے وہاں تھا۔ اب امریکی ٹھہری۔

پڑوسیوں نے مشورہ دیا۔ "دیورانی سے کہو۔ کرایہ دیا کریں۔ ان کے حالات اچھے ہیں۔ میاں اور بیٹا بھی کما رہا ہے۔ تمہارا اب کمانے والا رہا نہیں۔"

مگر امی مروت میں کچھ نہ کہہ پائیں۔ اپنی مالی حیثیت کا اندازہ کر کے خانساماں کو جواب دے دیا۔ شکو نے جانے سے انکار کر دیا۔

"بے شک آدھی تنخواہ دے دینا۔ کھانا بھی پکاؤں گی۔ پر جانے کا مت کہنا۔ بی بی جی گھر میں کوئی مرد نہیں رہا۔ چور ڈاکو موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ رات کو بھی رہوں گی۔ فکر نہ کرو۔ چوکیداری کا کام بھی کر لوں گی۔"

"تو تم کیا مرد ہو۔" ثمی سے رہا نہ گیا۔ "شیخی خوری بڑی آئی بہادر۔"

"پر گاؤں والی جاتی تو ہوں۔ دو کو آسانی سے ٹھکانے لگا سکتی ہوں۔" سینہ تان کر بولی۔

"اچھا لان میں سانپ نکلا تو کیا ہوا تھا۔ گھگھی بندھ گئی تھی۔ جاتی کی۔"

"تو سانپ تو پھر سانپ ٹھہرا۔ کاٹ لے تو بندہ ٹیں ہو جائے۔" "اف رے حاضر جوابی۔"

"امی! شکو سے کہہ دیں۔ رہنا ہے تو تمیز سے رہے۔ میرے منہ نہ لگے۔"

"بی بی! ثمی بی بی کو بتا دو۔ مجھے تنگ نہ کریں زیادہ یہ شرط ہے میری بس۔" دونوں بحث میں مبتلا تھیں۔ امی سر پر ہاتھ رکھے بے بسی کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بی اے کا رزلٹ آگیا تھا۔ خوشی سے بے حال گل نے آکر بتایا۔ ثمی کی اعلا تر محنت کا صلہ اعلا ترین تھا۔ گل اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ ثمی کے دل کو چوٹ سی لگی۔ ابا جان کو۔۔۔ کتنا انتظار تھا۔ اس کے رزلٹ کا۔ ایسے ہی رزلٹ کا۔ وہ رو رہی تھی۔

"ابا جان ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اب کیا فائدہ؟"

"پاگل ہو۔ وہ جہاں ہیں بہت خوش ہو رہے ہوں گے۔" گل نے ایک لڈو اس کے منہ میں ٹھونسا۔ "یہ مٹھائی امی نے تمہارے اور میرے شاندار رزلٹ پر محلے بھر میں بانٹی ہے۔ ابا جان کی خاطر۔ ان کی روح کی خوشی کے لیے کھا لو۔ آنٹی آپ بھی۔" اس نے ڈبا امی کی طرف بڑھایا۔

امی نے آبدیدہ آنکھوں کو پلو سے خشک کیا۔ اور ڈبا لے لیا۔ شکو بھلا کیوں پیچھے رہتی۔

"بی بی! لاؤ مجھے وہ ڈبا۔ اصل میں تو اس کی حق دار میں ہوں۔ میں نے منٹ منٹ چائے بنا کر۔ کبھی شربت گھول گھول کر پلایا۔ ساری محنت تو میری ہوئی۔ ثمی بی بی کو تو مٹھائی پسند بھی نہیں۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ثمی نے تیزی سے ڈبا امی کے ہاتھ سے چھینا۔ شکو سے کچھ بعید نہ تھا۔ پورا ڈبا کھا جاتی۔

"ہر چیز پر قبضہ۔ اس کا بس چلے تو مجھے بھی کھا جائے کچا چبا کے۔"

"ہٹو۔ کڑوا گوشت کون کھائے؟ ہم برفی کھاتے ہیں۔" اس کا منہ برفی سے بھرا ہوا تھا۔ جو امی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔

"ہاں تم کھاؤ۔۔۔ رزلٹ تمہارا آیا ہے۔ پڑھ پڑھ کر میں آدھی رہ گئی۔ رزلٹ ان کا ہو گیا۔" وہ مٹھائی لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔

گل نے شکو سے کہا۔ "تم واقعی بہت تنگ کرتی ہو ثمین کو۔"

"آپ بھی آزما کر دیکھ لیں۔ وہ اسی طرح ٹھیک رہتی ہیں ورنہ ابھی بیٹھی رو رہی ہوتیں۔"

"مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔" گل قدرے مایوسی سے

بولی۔

"پھر۔ آپ کا رزلٹ بھی میرا ہوا۔" واہ کیا انداز تھا۔ امی ہنس دیں۔

"چلو یہ بھی سہی۔ میرا رزلٹ تمہارا ہوا۔" وہ بھی شکو کی حاضر جوابی کی معترف ہو گئی۔

چچی کے گھر سے آکر وہ ڈبا ڈھانک کر رکھ رہی تھی۔ "یہ آپ کے لیے بچا لائی ہوں۔ کہیں شکو نہ کھا لے۔"

"ہاں۔ آدمی نہ کھائے۔ چیونٹیاں بے شک کھا لیں۔" وہ چڑ گئیں۔ "اب گل کی امی کا شکریہ ادا کرو جا کر۔"

"آپ مٹھائی نہیں بانٹیں گی؟"

"کھالی تم نے اور محلے والوں نے بس کافی ہے۔"

اف امی اتنی بے مروت۔ محلے والیاں لیکن اب بھی مبارک باد دینے میں پیش پیش۔ مٹھائی جن تک نہیں پہنچی وہ بھی۔ اس دن بڑا ٹھنڈا ٹھنڈا موسم تھا۔ خوشی جیسے دستک دے رہی تھی۔ کیا ہونے والا ہے۔ کاش پہلے سے علم ہو جایا کرتا تو کتنا مزا آتا۔ لیکن امی مزا کرکرا کرنے میں ماہر تھیں۔

"سنو۔ اماں آرہی ہیں۔ ان کے سامنے اچھی بچی بن کر رہنا۔ انہیں بحث مباحثہ پسند نہیں۔"

"جی اچھا۔" فرماں برداری سے گردن ہلائی۔ "مگر یہ اماں ہیں کون؟ میں تو جانتی نہیں۔"

"میری اماں ہیں۔ کینیڈا سے آرہی ہیں۔ کیا تم نے اپنی نانی کا نام کبھی نہیں سنا؟"

"نام آپ نے بتایا ہی نہیں۔"

"اب میں کیا ان کا نام بتاتی۔ بے وقوف۔" وہ دانت پیس رہی تھیں۔

"ہیں؟ بے وقوف؟ یہ کیسا نام ہے؟" وہ ششدر رہ گئی۔ اوپر سے امی چپل لے کر جھپٹیں۔ بھاگنے میں تو تیز تھی۔ نکلی تو سیدھا گل کا راستہ لیا۔

"پتا ہے۔ امی کی اماں آرہی ہیں کینیڈا سے' توبہ ہے۔ کینیڈا کے لوگوں کے نام کیسے ہوتے ہیں؟ ان کا نام بے وقوف ہے۔"

گل کو زور کی ہنسی آئی۔ اس کی اماں بھی منہ چھپا کر ہنسیں۔ "اسی لیے وہ خفا ہوتی ہیں۔ بیٹا عقل کو بھی کام میں لایا کرو۔ سمجھ بوجھ کر بات منہ سے نکالنی چاہیے۔"

"اچھا' اسی لیے مجھے چپل سے مارنے دوڑی تھیں۔ کیا غلط نام بتایا تھا انہوں نے؟"

"امی۔ اس کی بات کا اعتبار نہ کیا کریں۔ کالج میں مشہور ہے۔ بے سمجھے کچھ بھی بول دیتی ہے۔" گل نے کہا۔

گل سے خفا ہو کر گھر آئی۔ شکو ادھر ادھر گیسٹ روم کی از سر نو آرائش کر رہی تھی۔ ان بے نام نانی کی متوقع ضروریات کے مطابق۔ گل نے کہا تھا۔ "پاگل یہ نام نہیں ہے۔ بے وقوف تو تم ہو۔"

بہت انتظار کے بعد نانی بے نام کی آمد ہوئی۔ ایئرپورٹ جانا نہیں پڑا۔ جس فیملی کے ساتھ آئی تھیں' وہی پہنچا گئے۔ نانی اور امی کا ملن خاصا دردناک تھا۔ دونوں آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ نانی کے بین بھی چل رہے تھے۔

"ہائے جواں جہان شیر جیسا داماد۔ دنیا سے چلا گیا۔ میں کمبخت بیٹھی رہ گئی۔ بچی کو بیوہ دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی۔"

ثمی کو لپٹا کر اور بھی رونا آیا۔ "لاڈلی بیٹی کو چھوڑ کر جاتے ہوئے دل ہی بند ہو گیا۔ ہائے رے۔"

چچی گلوکوز گھول کر لے آئیں۔ بمشکل نانی کا دل ٹھکانے آیا۔ انہیں ان کی قیام گاہ دکھائی گئی۔ گیسٹ روم۔ انہیں پسند نہ آیا۔

"میں اپنی ننھی کی خاطر آئی ہوں۔ اس سے دور نہیں رہوں گی۔ اس کے کمرے میں سوٹ کیس رکھ دو۔"

امی کے پلنگ پر دھر نا دے دیا۔ سوٹ کیس آیا۔ جو میز پر رکھ دیا گیا۔ نانی کو کبھی بھی کسی چیز کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اور پڑتی رہی۔

"اے ننھی! ذرا بکس کھول کر اس میں دائیں طرف جو نیلی پوٹلی ہے۔ نکالو۔ ہاں اب اس کے اندر

سے کالی صندوقچی نکالو۔ ٹھیک۔ اس میں میری سرمے دانی ہو گی۔ سرمہ لگالوں۔ اچھا اب یہ سرمے دانی صندوقچی میں رکھ کر پوٹلی میں رکھ دو۔ جہاں سے نکالی تھی پوٹلی۔ وہیں رکھ دینا۔"

ان کا سوٹ کیس عمرعیار کی زنبیل سے کم نہ تھا۔ چار دن تک چچی بھی اس زنبیل کے پُراسرار رازوں سے واقف ہو گئی تھیں کیونکہ انہیں بھی اس قسم کی خدمات سے بہرہ ور کیا جاتا۔

صندوقچی میں سرمے کے علاوہ سوئی دھاگا۔ چھوٹی قینچی۔ چھوٹا چاقو۔ ٹشو پیپر۔ بلڈ پریشر کی گولیاں۔ پیلی پوٹلی میں ایک خوب صورت ڈبہ تھا۔ ڈھکن اٹھاؤ میوزک سے لطف لو۔ اس ڈبے میں موزے کئی جوڑے۔ تصویروں کا البم' جوشاندے کے پیکٹ۔ ویسلین۔ ریزگاری رکھنے والا چھوٹا پرس۔ بڑی رقم والا بڑا پرس۔ امی نے تو کہہ بھی دیا۔

"اماں! وہاں سے جو چیزیں لے آئی ہیں۔ وہ سب یہاں ملتی ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ وزن بڑھایا۔"

اماں کو ان کا تجزیہ' اعتراض پسند نہیں آیا۔ بولیں نہیں۔ تیسری خالی پوٹلی جو کپڑوں کے درمیانی حصے میں تھی۔ اس میں پیڈ' لفافے' قلم' ناخن کترنے والی ستر سال پرانی ناخن گیری۔ آج کل کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں۔ گھر والے بھی (ننھی کے سوا) ماموں کی پیدائش پر جو پہلی فراک انہیں پہنائی گئی تھی۔ مع ماموں کے بچپن کی تصویروں کے۔ کروشیے کی بنی چند اشیاء' ٹی کوزی کور' گلے' آستین' شمیص ہم علم۔

شکو کو بڑی ہنسی آئی۔

چاندی کا کٹورہ پانی پینے کے لیے۔ نانی اسی کٹورے میں پانی پیتی تھیں۔ دراصل اس کٹورے کے لیے ہی یہ پوٹلی کھلی تھی۔ کٹورہ باہر نکال لیا گیا۔ میز پر سجا دیا گیا۔ کافی تحائف بھی سوٹ کیس میں سے نکالے گئے۔ سب کا خیال تھا۔ لمبے سفر سے آنے کے بعد نانی آرام کریں گی۔ نیند پوری کریں گی مگر واہ ری نانی۔ بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ لیٹ کر باتیں۔ کروٹ لے کر باتیں۔ غرض باتیں باتیں۔ رات ہوئی امی کے حکم پر وہ نانی کے پیر دبانے لگی۔ انہیں آرام تو آیا۔ نیند نہیں۔

"کچھ دین کے بارے میں بھی جانتی ہو؟" نانی کا نواسی سے سوال۔

"جی۔ نماز روزے کی پابندی کرتی ہوں۔" نواسی مطمئن کرنا جانتی تھی۔

"اچھا۔ شاباش۔ کچھ مسئلے مسائل کے بارے میں بھی پڑھا ہے؟ یا ماں سے کچھ لیا؟"

"ہائیں۔ مسئلے مسائل کیسے لیے جاتے ہیں؟"

حیرت بجا۔ سوال بھی۔

"اے ننھی۔ میں نے کہا تیری بیٹی تو بہت غبی لگتی ہے مجھے۔" نانی مطمئن ہو جائیں۔ ایسا ممکن نہ تھا۔

"نہیں اماں! بہت سمجھ دار ہے۔ بس ذرا دیر سے سمجھتی ہے۔" ننھی نے صفائی دی۔

"تو غبی اور کسے کہتے ہیں؟" نانی شاید کچھ اور بھی کہنے والی تھیں۔ نواسی نے روک دیا۔

"نانی! آپ لمبے سفر سے آئی ہیں۔ آرام کریں' سو جائیں۔ تھکن اتر جائے گی اور اگر نیند نہ آئے تو گولی کھائیں۔ بہت آرام کی نیند آئے گی۔ میں گولی لا دوں؟"

نانی کو جیسے کرنٹ لگا۔ اٹھ بیٹھیں۔ "ہائیں یہ نیند کی گولی کس لیے کھلانا چاہتی ہے۔ جب نیند آئے گی سو جاؤں گی۔ ڈاکٹری دوا کھا کر مجھے مرنا نہیں ہے۔ میں بیماری میں حکیمی دوا کھاتی ہوں۔ سن لیا۔"

"تو آپ کی نیلی پوٹلی میں یا پیلی میں بلڈ پریشر کی جو دوا ہے۔ ڈاکٹری نہیں ہے؟"

نانی منہ دبا کر ہنسیں۔ "ارے یہ تو دو سال سے میرے پاس یوں ہی پڑی ہیں۔ منیر کے اطمینان کے لیے رکھے رہتی ہوں۔ بلڈ پریشر ہو میرے دشمنوں کو۔"

"ہائیں نانی! یہ اتنی پرانی۔" آنکھیں زیادہ ہی کھل گئیں سن کر۔

"سنو لڑکی! یہ کیا نانی نانی جیسے پڑوس کی بڑھیوں کو نانی دادی کہہ دیا۔"

"تو رشتہ جو ایسا ہے۔ نانی کا۔"

"اچھا تو رشتے داروں کو رشتوں سے پکارا جاتا ہے؟ جیسے اے چچازاد بہن آنا ذرا۔ خالہ زاد بھائی بیٹھو' چائے پیو۔ پھوپھی زاد بہن' آیئے تشریف لائیے۔"

نانی سخت ناراض ہوئیں ایکٹنگ مگر زوردار۔ "نانی خاصی ٹیڑھی کھیر ہیں۔" اس نے طے کیا۔

"جو تمہاری ماں کہتی ہے۔ وہی کہا کرو۔"

لو ہم تنی سی بات سمجھانے کے لیے لیکچر کی افادیت کا سہارا لیا۔ ان کی فطرت سمجھنے کے لیے بہت زیادہ دانش کی ضرورت تھی۔ اور وہ دانش ور بالکل نہ تھی اور نانی اسے دانش ور بنانے کے جتن کر رہی تھیں۔ ہر گزرتا دن اس کی حماقت ان پر عیاں کرتا رہا۔ وہ مایوس ہو گئیں۔ چچی کو نانی سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اور نانی ان کو شرمندہ کرنے میں ذرا نہ جھجکتیں۔ وہ کسی کا لحاظ کرنا نہیں جانتی تھیں۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا۔

"اے ننھی! تم نے یہ عقل مندی کی کہ آدھا گھر کرائے پر اٹھا دیا۔ اکبر کے بعد تو تمہاری آمدنی رہی نہیں۔ چلو اچھا ہے۔ دال روٹی کا سہارا ہوا۔"

چچی کی طرف اشارہ کر کے نانی نے اپنی ننھی کو شاباشی دی۔ وہ شرمندہ ہو گئیں مگر نانی شرمندگی کی ش سے واقف نہ تھیں۔

"میں کہتی ہوں یہ گیسٹ روم بھی کرائے پر اٹھا دو۔ کسی نرس یا ڈاکٹر کو جو دوسرے شہر سے نوکری کے لیے آتی ہیں بیچاریاں۔ شریف لوگوں کے گھر تلاش کرتی ہیں۔ ان کے نخرے بھی نہیں ہوتے۔"

"اف نانی کی معلومات مشاہدات تجربات۔ مقالہ جات۔

"اماں! یہ۔۔۔ بھابھی ہیں۔ میری دیورانی۔" امی نے جھینپ کر تعارف کرایا کہ چچی کو برا نہ لگا ہو۔ ان کا تو واقعی رنگ اڑ گیا تھا۔ نانی مطمئن انداز میں گویا ہوئیں۔

"ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تمہارا دیور امریکہ میں ہے۔ خوب کما رہا ہے۔ بیٹے نے بھی نوکری کرلی ہے۔ وہاں فلیٹ بھی خرید لیا ہے۔ انہیں بھی احساس ہے۔ کہ تم دونوں بے سہارا ہو گئی ہو۔ منیر امریکہ میں اس سے ملا تھا۔ اپنے ساجد سے۔ ساجد نے منیر کو بتایا تھا کہ اب بھابھی اور بھتیجی کی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔ بیوی سے کہہ دیا ہے کہ کرایہ دیا کرو اور جو بھی ضروریات ہوں پوری کرو۔ بچی کی تعلیم میں رخنہ نہ ہو۔ آخر میں بیوی بچیوں کو لاکھوں کی رقم بھیجتا ہوں۔ بھتیجی کا بھی پورا حق ہے۔" چچی کا منہ اتر گیا مزید۔

"اے سنو۔ اس نے بتایا کہ میری بیٹیوں کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آج کل کے زمانے میں۔۔۔ کون لڑکی پڑھنا نہیں چاہتی۔ حد ہے۔ میں تو ساجد سے ملی ہوتی تو ڈانٹتی۔۔۔ کہ تمہارا قصور ہے۔ علم حاصل کرنا آج کی ضرورت ہے۔"

اف۔ نانی کی معلومات اور یادداشت۔ لفظ بہ لفظ سنا دیا۔ اور ماموں نے بھی ساری کہانی اپنی اماں کے گوش گزار کردی۔ جنہوں نے فراٹے اور زناٹے سے یہاں سنا دی۔

"اے بھئی بچے بدشوق ہوتے ہیں۔ تب بھی انہیں ماں باپ مار پیٹ کر اسکول بھیجتے ہیں۔ بچوں کی مرضی پر تھوڑی چھوڑتے ہیں۔"

نانی کی داستان بلکہ نصیحت افروز داستان ختم ہونے کے آثار نہ تھے۔ وہ وہاں سے بھاگ آئی۔ چچی کی مجرمانہ خاموشی اور مزید اتری ہوئی صورت دیکھنے کی تاب نہ رہی۔

اگلے دن چچی کچھ رقم لے آئیں۔

"آپ کے دیور کہہ رہے تھے۔ ہم دوسرا گھر لیتے تب بھی تو کرایہ دینا پڑتا۔" امی کے انکار پر انہوں نے کہا۔

مگر امی نے ہرگز نہ لیا۔ شرمندہ ہو رہی تھیں۔

"مجھے ضرورت ہوگی تو آپ سے مانگ لوں گی۔"

امی نے کہہ کر واپس کردی۔

ثمی کو غصہ آ رہا تھا۔ نانی کو جا کر شکایت لگادی۔

"آپ کی ننھی نے چچی کا دیا ہوا کرایہ واپس کردیا۔"

نانی کو اللہ موقع دے۔ خوب خفا ہوئیں۔ "کچھ آگے کا بھی سوچ لینا چاہیے۔ لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ اتنی مہنگائی ہے۔ جہیز کہاں سے جمع کرے گی

نھی۔"
"اماں! آپا کو میرے حالات کا علم ہے۔ وہ رعایت کریں گی۔ بہن ہیں آخر۔ اپنے لوگ تو۔۔۔"
"اس خیال میں نہ رہنا۔ آج کل شادی بھی سودا ہوتا ہے۔ اپنے لوگ سب سے پہلے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتے ہیں۔ رعایت نہ مروت اور عارفہ کا میاں ایک نمبر کا لالچی ہے۔ جہاں فائدہ دیکھا۔ ادھر ہی لڑھکا۔ نانی کیا سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ امی کو مگر بہن کا اعتبار تھا۔

ثمی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ چپکے سے ایک چور نظر انگوٹھی پر ڈالی۔ یہاں کیا فائدہ نظر آیا؟ بے خیالی میں برش بالوں میں الجھ گیا۔ زور لگایا تو بالوں کا گچھا ہاتھوں میں آگیا۔ بال لپیٹ کر برش میں پھنسا دیے۔
"امی! شکوے سے کہیے گا۔ بال نکال کر کچرے میں ڈال دے۔ میں کہوں گی تو باتیں بنائے گی۔ اچھی طرح برش صاف کر دے۔" نانی چونک گئیں۔
"ارے کچرے میں کیوں؟ بال ادھر اُدھر نہیں پھینکنے چاہئیں۔ تمہارے ہاں تو لان ہے۔ اس میں گڑھا کھدوالو۔ اسی میں سب کے بال اور ناخن کاٹ کر ڈالا کرو۔ میں نے تو کینیڈا میں بھی ایک تھیلا بنا رکھا ہے۔ اس میں سب کے بال اور ناخن جمع کرتی ہوں۔ یہاں پاکستان میں بھی میں نے۔۔۔"
"کیوں نانی؟ مطلب اماں کیا کھاد بنانی ہے۔ بالوں ناخنوں کی کھاد۔۔۔ توبہ۔" پھر ہنسی آگئی۔
"چل ہٹ! بھئی قیامت کے دن بے چارے فرشتوں کو ایک جگہ سارے بال اور ناخن مل جائیں گے۔ ان کو جا بجا تلاش نہیں کرنے پڑیں گے۔" نانی کی منطق سمجھ میں نہ آئی۔
"فرشتے بالوں کا کیا کریں گے؟ کیا وہ گنجے ہوں گے۔ اپنی وگ بنا کر لگائیں گے؟"
نانی شدید ناراض ہوئیں۔ "ہائے ماں نے کچھ نہ بتایا۔" اب انہوں نے جو نقشہ کھینچا۔ تو اسے فرشتوں پر رحم آنے لگا۔ اف اتنی محنت۔ جگہ جگہ سے بال اکٹھا کرنا۔
"ہاں نا۔ قیامت کے دن جب سارے مردے زندہ کیے جائیں گے۔ اللہ کی عدالت میں ان کو پیش کیا جائے گا۔ تو اصلی صورت یعنی بالوں ناخنوں کے ساتھ صحیح شکل میں پیش کیا جائے گا۔ ہمارے بال ناخن ان کو لگا کر۔" نانی نقشہ کشی کی ماہر تھیں۔
ثمی نے جھرجھری لی اور نانی کے پاس آبیٹھی۔
"اماں! پھر تو جگہ کم پڑ جائے گی۔ جب سارے مردے اپنے میلوں تک پھیلے بالوں۔ گزوں ناخنوں کے ساتھ چلیں گے۔ انہیں تو جگہ بھی زیادہ چاہیے ہو گی۔ پھر اللہ میاں کو دوسری زمین الاٹ کرنی پڑے گی قیامت کے لیے۔ ایک جگہ میں اتنی گنجائش کہاں ہو گی۔ جب سب کے بال ایک دوسرے میں الجھ رہے ہوں گے۔ ناخن دوسروں کے ناخنوں میں پھنس رہے ہوں گے۔ او خدا توبہ توبہ۔ کتنا خوفناک منظر ہو گا۔ سب مردے ایک دوسرے میں گتھم گتھا۔ یعنی پتا ہی نہیں چلے گا۔ کہ کس کے بال کہاں تک ہیں۔ اور کس کے ناخن کہاں الجھ رہے ہیں۔ یعنی کہ ہر مردہ لشتم پشتم گرتا پڑتا۔ دنگل میں مصروف بال ناخن چھڑوانے کے لیے۔ اف یعنی کہ۔۔۔"
تصور ہی اتنا ہولناک تھا۔ تاڑ کر کے نانی کی چپل اس کی پیٹھ پر۔ وہ بدک گئی۔ ہوش میں آگئی۔ اب سمجھ میں آیا۔ اس تقریر دل پذیر کی ادائیگی کے لیے موقعہ کیوں مل گیا۔ نانی اس دوران اپنی چپل نیچے سے اٹھانے کی تگ و دو میں تھیں۔ وہ بھی امی کی طرح ہنسی چھپانے کے لیے منہ نیچے کیا ہے حالانکہ ہنسی کا نہیں عبرت کا مقام تھا۔ قیامت کا منظر کچھ اتنا ہی دہشت ناک تھا تب ہی تو مولوی لوگ قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔
"یعنی کہ۔۔۔ کمبخت۔۔۔ جانگلوس۔۔۔ بے دین۔ ارے کچھ نہ پڑھا اس نے، کچھ نہ سیکھا۔" نانی کا لیکچر شروع ہو گیا تھا۔ "نھی! بہشتی زیور منگا کر پڑھائی ہوتی۔ تو اتنی بے خبر نہ ہوتی۔"
کمر کی جلن۔ اف۔ سہلا سہلا کر ادھ موئی ہو رہی تھی۔ چلا پڑی۔ "پڑھا ہے۔ سب پڑھا ہے۔ یہ بھی

قیامت کہاں برپا ہوگی۔ میدان عرفات میں۔" نانی اسے دین کا علم سکھائے بغیر چپ ہو جائیں۔ ممکن نہیں۔

"اماں! پتا ہے مجھے۔ مگر۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنے لوگ وہاں ہوں گے۔ کھرب ہا دس کھرب ہا۔ بلکہ سو کھرب ہا۔ ڈھانچے تو خیر آجائیں گے ان کے بال ناخن نہیں آسکتے۔"

نانی شدید ناراض۔ "دفع جاہل' بے دین' ہوش کر لے جاہل۔"

اس کی فریاد کچھ اتنی دردناک تھی کہ چچی معہ بیٹیوں کے حال معلوم کرنے آگئیں۔ نمی کی زبانی ساری کہانی سن کر تو جو قہقہوں کا طوفان برپا ہوا کہ قیامت آتی ہوئی ٹھہر جاتی۔

"سارے ہی بے خبرے ہیں نادان۔ قیامت کو مذاق سمجھ لیا ہے۔" نانی لیٹ گئیں۔ خفا لیکن وہ مایوس نہ ہوئیں۔ اگلے دن سے پھر دین کی تعلیم شروع۔

صحابہ کرام۔ اولیاء کرام۔ درویشوں کے واقعات یوں سناتیں جیسے ان کے سامنے گزرے ہوں۔

"کتابوں میں پڑھا ہے۔" کہہ کر سب کو قائل کرتیں۔ ورنہ نمی کو تو شبہ تھا کہ ممکن ہے وہ کہیں کہ میرے سامنے کے واقعات ہیں۔ کیونکہ یادداشت ان کی غضب کی تھی۔ بچپن کے تمام واقعات تمام جزئیات کے ساتھ۔ اپنے دادا دادی' نانا نانی' والدین کے تمام قصے۔ ان کے آپس کے تعلقات' سارے ان کو ازبر تھے۔ جس سے وہ نواسی کو بھی فیض یاب کرنا چاہتی تھیں۔

اگر وہ نصیحتوں کے پٹارے ذرا دور کر دیں۔ تو پرانے سب واقعات بہت ہی دلچسپ تھے۔ دادا کا غصہ جلال دادی کی 'طنزیہ جگت بازی۔ نانا نانی کی تکا فضیحتی۔ اپنے والدین کے ٹھنڈے مزاج پُرسکون جنگ کے مزاحیہ واقعات۔ واہ!! ویسے نانی کی ذات بابرکات بے حد مجلسی تھی۔ اب تو محلے بھر کی خواتین باری باری آتیں اور نانی کی دلچسپ باتوں اور مسائل کے حل سے فیض یاب ہوتیں۔ گل کی امی تو باقاعدہ ان کی مرید ہو گئی تھیں۔ اب ابا جان کی زندگی میں آنے والے مہمان نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ البتہ محلے والیوں کے جمگھٹے لگتے جیسے درس ہو رہا ہو۔ گھر کی بے رونقی مفقود ہو چکی تھی۔ نانی نے غم غلط کرنے کا ڈھلو مالیا ہوا تھا۔ اب تو نانی کے فرمودات پر غور کرتے ہوئے ہی وقت گزر جاتا۔ ابا جان کی کمی کسی حد تک انہوں نے پوری کر دی۔ اس کا یونیورسٹی میں داخلہ بھی نانی کا مرہون منت تھا۔ بہت سے زخموں کا مداوا بن گئیں۔ امی بھی خاصی مصروف اور مطمئن نظر آتیں۔ لیکن ایک جملہ جو اول دن سے بیٹی کو تاکیداً سناتی تھیں۔ اب بھی وہی ان کے لبوں پر ہوتا۔

"اماں سے بحث نہ کیا کر نمی۔ اماں خفا ہو جائیں گی۔ انہیں بحث پسند نہیں۔" مگر نمی بھلا باز آتی۔

"اچھا تو نانی! پھر قیامت کے بارے میں آپ نے ماموں کے بچوں کو بھی اپنے خیالات سے اسی طرح آگاہ کیا۔ جیسے مجھے۔"

"ہاں تو اور کیا۔"

"اور انہوں نے مان لیا؟"

"کیسے نہ مانتے۔ تمہارے جیسے منکر دین نہیں ہیں وہ۔ مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔" کینیڈین مسلمان بہت ہی معصوم اور پرامن ہیں۔ جب انہوں نے یقین دلایا کہ ماموں منیر بھی ان کی دینی معلومات پر ایمان لے آئے۔ "تمہارے جیسا کٹ حجتی نہیں ہے میرا بیٹا۔"

ویسے اس میں شک نہیں۔ نانی سے بحث میں مزا بہت آتا۔ بسا اوقات بحث بہت بھاری پڑ جاتی۔ امی کے دھموکے کے بعد۔ شکو کی مذاق اڑاتی ہنسی اور بھی جی جلاتی۔

☆ ☆ ☆

ایک دن تو دھماکا ہو گیا۔ ماموں جان منیر بغیر اطلاع کے آگئے۔ اپنی بہن بھانجی کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ یوں لگا جیسے حفاظتی سائبان تن گیا۔ نانی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے۔ نانی کی تو عید ہو گئی۔ وہ ابھی سفر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اکیلی تو بالکل

نہیں بلکہ وہ اب کینیڈا جانا چاہتی ہی نہ تھیں۔ یہاں دل لگ گیا تھا۔ نواسی کے ساتھ (واہ رے) اور اتنے محبت کرنے والے موجود تھے۔ (محلے والیاں) اپنا وطن، اپنی زبان۔ وہاں کیا دھرا ہے۔ کمبخت ماریاں انگلش میں گٹ پٹ کرتی تھیں۔ آتے ہوئے، جاتے ہوئے بھی انگریزی میں سلام۔ منحوس ماریاں۔ اردو تو جیسے گناہ تھی۔ رنگ دار پاکستانی، انگریز سمجھتی ہیں خود کو۔

ماموں نے چند دن ملنے ملانے میں لگا دیے پھر سب کو لے کر مری، نتھیا گلی، ایبٹ آباد کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ ایبٹ آباد میں ان کی سالی صاحبہ رہتی تھیں۔ وہاں خوب سیریں ہوئیں۔ پہاڑوں پر اوپر سے نیچے باقاعدہ آبادی تھی۔ رات کو لائٹیں روشن ہوتیں تو لگتا چراغاں ہو رہا ہے۔ نانی بہت خوش تھیں۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوائیں۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی قدرتی صناعی کے بے مثل مناظر۔ کسی کا دل واپسی کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر واپس آنا تو تھا۔

واپس آ کر ماموں نے واپسی کی ٹھانی۔ نانی واپسی کے لیے تیار نہ تھیں۔ روز بہانہ بناتیں۔

"رات سر میں اتنی کھجلی ہوئی۔ دو بجے ننھی کو جگایا۔ اس نے کنگھی کی۔ تیل لگایا۔ پھر صبح سوئی میں بتاؤ وہاں جہاز میں کھجلی ہوئی تو۔۔۔ مسافر تو چھوڑو۔ ایئر ہوسٹس کیا کہے گی کہ بڑی بی کی عمر دیکھو اور جوؤں کی یلغار۔ لو بھلا۔ بدنامی سی بدنامی۔"

کبھی آنکھوں کا توازن بگڑ جاتا۔ "ایک کے دو دو نظر آ رہے ہیں۔ یہ مہینہ ہے ہی منحوس۔ ایئر ہوسٹس آئے گی۔ مجھے دو نظر آئیں گی۔ تو کون سی سے چائے کا کہوں گی۔ پاگل سمجھے گی مجھے۔"

ماموں بھی جانتے تھے۔ ٹالتے رہے۔

ثمین نے پوچھ لیا۔ "ماموں! آپ نانی کی ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں۔"

ماموں مسکرائے۔ "بے شک ماں کو جھٹلانے کا گناہ کر کے جہنم تو نہیں خریدوں گا۔"

"خواہ۔۔۔ کچھ بھی یعنی قیامت کے جو مناظر دکھائے انہوں نے۔" اس نے پورا نقشہ کھینچا۔

ماموں کھل کر ہنسے۔ "اچھا، مجھے تو کبھی نہیں بتایا۔ اصل میں وہ سوچتی بہت ہیں۔ کہانیاں بناتی ہیں۔ اور اپنی سوچ پر انہیں یقین ہوتا ہے۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ مشاہدات و تجربات سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ ان کی مثبت سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی بہو اور پوتوں کے ساتھ مثالی سلوک اور تعلق ہے۔ گھر امن امان کا گہوارہ ہے۔ اماں کے یہاں آ جانے سے یقین کرو بہت ویرانی ہے ہمارے گھر میں، بے رونقی سی ہے۔"

اسے یقین تھا۔ ایسے ہی ہو گا۔ ساری رونق تو یہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں پہلا باقاعدہ آغاز، تعارف در تعارف اچھا لگ رہا تھا۔ مگر گھر آ کر اندوہناک خبر ملی۔ نانی صبح دیر تک نہیں اٹھیں تو۔ ماموں سمجھے رات کو کچھ بے چینی رہی ہو گی۔ لیکن وہ خاموش ہو چکی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے۔ ڈاکٹر نے آ کر تصدیق کی۔ ان کا سانس دو گھنٹے پہلے ہی رک گیا تھا۔ دل خاموش۔ وہ نانی جو گھر میں بلبل کی طرح چہکتی تھیں۔ اب وہ بلبل خاموش تھی۔ امی نے بتایا رات کو کہہ رہی تھیں۔

"مجھے کینیڈا میں ڈبے میں بند ہو کر دفن نہیں ہونا اور ڈبہ بھی کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ مردہ لیٹنا چاہتا ہے تو۔ بھئی کھڑے کھڑے تو زندہ بھی تھک جاتا ہے۔"

ماموں انتہائی رنجیدہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ امی بمشکل ضبط کر رہی تھیں۔ ثمی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اچھی بھلی سوئی تھیں۔ کیسے یک دم انسان دائمی سفر کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ ابا جان بری طرح یاد آئے۔ نانی نے کس طرح سب کو بہلائے رکھا تھا۔ غم گساری یوں بھی ہوتی ہے۔ آتے ہی مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ گھر آناً "فاناً" لوگوں سے بھر گیا۔ محلے والے۔ پڑوسی۔ دور نزدیک کے رشتے دار۔ ماموں بے حد مصروف ہو گئے۔ وہ جو بیٹی اور نواسی کا غم سمیٹنے آئی تھیں۔ اپنا کام کر کے منزل کی طرف روانہ

ہو گئیں۔

جنازہ اٹھا تو غم سے امی کی ہچکیاں لگ گئیں۔ غم بٹانے والی۔ اپنا غم دے گئیں۔ ابا جان کے بعد ایک اور چاہنے والی ہستی جدا ہو گئی۔ خالہ کا فون آسٹریلیا سے آیا۔ چچا کا تعزیت کا۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ کئی دن بہت سے لوگ آئے۔ مگر رونق مفقود۔ امی صدمے سے چُور، ماموں افسردگی کی تصویر۔

"کیا قدرت اسی لیے مجھے لائی تھی۔" بار بار یہی کہتے۔ پھر چونک گئے۔ "شکر ہے میں آگیا تھا۔ تم کس طرح سارے کام کرتیں اور میں پچھتاوے میں زندگی گزارتا۔"

امی کو بھی احساس تھا۔ وہ اکیلی یہ فریضہ کیسے ادا کرتیں۔ کیا محلے والوں سے مدد لیتیں۔ مجبوراً"۔ آج بھائی کی موجودگی غنیمت لگ رہی تھی۔ اللہ نے مدد کی بھائی کو بھیج دیا اور اماں کا ارمان۔ وطن کی مٹی نصیب ہوئی۔ جا کر قبر میں لیٹ گئیں۔

امی کو پچھتاوا۔ "میری وجہ سے آئی تھیں۔ میرے گھر سے جنازہ اٹھا۔" جہاں ماں کی محبت شفقت سے محرومی کا دکھ تھا۔ وہیں اپنے گھر سے جدائی کا قلق۔

"گھر میں کیسی بہار سی تھی ان کے دم سے۔ رونق اور برکتیں ساتھ لے گئیں۔" محلے بھر کی خواتین کو بھی بے حد افسوس اور قلق تھا۔

"کس طرح سب سے گھل مل جاتی تھیں۔ مسائل کا حل بتاتیں۔ کسی کو کفایت کے گُر سکھاتیں۔ کسی کو بہو سے بنا کر رکھنے کی تدبیر، کسی کو ساس نندوں کو خوش کرنے کی کار آمد تدابیر۔

خواتین جب آتیں ان کی صلاحیتوں کے گن گاتیں۔

"میں نے ان سے کہا اماں! میرے میاں بہت غصے والے ہیں۔ میری لڑائی ہوتی ہے روز۔" تو کہنے لگیں۔ برداشت کی عادت ڈالو۔ زبان قابو میں ہو تو معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ زبان ہی فتنہ ہے۔ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا تو یقین کرو، میاں کا مزاج بھی اعتدال پر آگیا۔"

سب کی زبانیں اماں کی تعریف توصیف اور قابلیت کو سراہ رہی ہوتیں۔ ثمین کو بھی قلق تھا کہ اس نے خود ان سے کچھ نہ حاصل کیا۔ خود کو عقل کل سمجھ کر بحث کرتی رہی۔ واقعی آدمی کے گزر جانے کے بعد اس کی قدر ہوتی ہے۔

ماموں بھی چند دن بعد چلے گئے۔ بجھی بجھی بہار رخصت ہوئی۔ البتہ ثمی کا اکاؤنٹ کھلوا کر کافی رقم جمع کروادی۔

"اماں نے کہا تھا، ثمی کی تعلیم کا بار اٹھالو۔ ان کی خواہش پوری کرنا۔ میرا آخری فرض ٹھہرا۔ میں بوقت ضرورت اور رقم اکاؤنٹ میں بھیجا کروں گا۔ جب تمہیں ضرورت ہو۔ تو بلا تکلف فون کر دینا۔"

خالہ بھلا کیوں نہیں آئیں۔ ایسے وقت پر بھائی بہن کو بڑے۔ بہن بھائی کی موجودگی سے تقویت ہوتی ہے۔ غیروں کی طرح فون پر افسوس۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

اور وہ صاحب زادے سہیل نہ جانے کس دنیا کے باسی تھے۔ خالہ سے بات کرتے نہ منگیتر سے، پتا نہیں خالہ نے ان کی کس طرح پرورش کی ہے۔ یوں تو ابا جان نے کئی بار موصوف سے بات کی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر اسے یہ بے نیازی کھٹک رہی تھی۔ امی کو بھی کوئی پروا نہ تھی۔ انہیں اپنی آپا پر بہت بھروسا تھا۔ ہونا بھی چاہیے۔

✡ ✡ ✡

پھر گھر میں ایک تغیر آیا۔ خوشگوار ہوا کا جھونکا۔ چچی کے ایک چچا کی معرفت نسرین کا رشتہ آیا تھا۔ چچی نے آ کر بتایا کہ چچا کے ہاں جا کر ہی بات ہو گی۔ دونوں بیٹیوں کو لے کر فوراً" چلی گئیں۔

شگو نے بھنویں تان کر خیال آرائی کی۔

"بی بی! مجھے تو دال میں کالا کالا دکھتا ہے۔ بھلا دوسروں کے گھر بیٹیوں کے رشتے طے کیے جاتے ہیں؟"

امی کو تو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کالا نہ سفید۔ یہ

محترمہ خوامخواہ فکر میں مبتلا ہو گئیں۔ ہر معاملے میں دخل اندازی۔ اب گھر میں کوئی مرد نہیں تو چچی کو اپنے چچا کا سہارا لینا پڑا۔ یہ استدلال بھی شگو نے رد کر دیا۔

"لڑکی کے باپ کو خود دیکھ بھال کرنی چاہیے۔ بوڑھے چچا کو تو نہ دکھائی دیتا ہو گا۔ نہ سنائی دیتا ہو گا۔ بچارے کیا طے کریں گے۔"

وہ تو باپ کی ذمہ داری پر لیکچر دینے کو تیار تھی مگر ثمین نے امی سے شادی میں پہننے کے کپڑوں کا تقاضا کر دیا۔ مہندی، شادی، ولیمہ۔

چچی آئیں تو وہ دوڑی۔ نسرین سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ بات طے ہو گئی ہے۔"

نسرین شرما گئی۔ "ہوں!" مختصر جواب۔

چچی کمرے میں کپڑے پھیلائے از حد مصروف۔ کسی سوال کا جواب خاطر خواہ نہ دیا، اپنی الجھنوں کا ذکر کرتی رہیں۔ واقعی چچا آخر کیوں نہیں آجاتے بیٹی کو رخصت کرنے۔ لیکن ابھی امی سے بھی جواب سوال نہ ہوئے تھے کہ کچھ سامان لے کر وہ پھر چلی گئیں۔ اسریٰ تو آتی ہی نہ تھی ورنہ ضرور سب کچھ بتا دیتی۔

ثمی یونیورسٹی میں مصروف تھی۔ امی کو اتنا علم ہو گیا کہ چچی کے چچا ہی شادی کا انتظام کریں گے۔ ان ہی کی معرفت رشتہ ہوا ہے۔ امی خاصی پریشان ہو گئیں۔ سوچ میں ڈوب گئیں۔

"بھابھی کی بیٹی کی شادی کا انتظام ان کے چچا کر رہے ہیں۔ میرے تو کوئی چچا بھی نہیں اور میری بیٹی کے چچا تو۔۔۔ اپنی بیٹی کی شادی میں نہیں آ رہے۔ سنا ہے کہ سادگی مدنظر ہے۔ مہندی مایوں سب خرافات رسمیں ہیں۔ اصراف بے جا اور لغو۔ اسلام میں لغویات کی ممانعت ہے۔" کون اعتراض کرتا۔

✡ ✡ ✡

شادی ہال میں خوب رونق تھی۔ بے حد آرائش، غیر ضروری چکا چوند۔ پھولوں کے گلدستوں کی قطاریں۔ اس سلسلے میں اصراف بے جا کا خیال نہیں آیا۔ اسریٰ تو مہمانوں کی خاطر میں از حد مصروف تھی۔

مہمان زیادہ تر تو چچی کے عزیز ہی تھے۔ کچھ وہ بھی تھے۔ جو ابا جان کی زندگی میں خوب آیا کرتے تھے۔ امی کی خاطر داریوں کا لطف لینے۔ ظاہر ہے ابا جان کے رشتے دار چچا کے بھی ہوئے۔ سب امی سے مل رہے تھے۔ تعجب تو یہ تھا کہ محلے والوں میں سے کوئی نہ تھا۔ حالانکہ چچی کے سب سے اچھے تعلقات تھے۔ وہاں اسے اپنی ایک کلاس فیلو مل گئی۔ دونوں پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر مہمانوں پر تبصرہ کرنے لگیں۔

"ہائے اللہ گل ہی آجاتی۔ بڑا مزا آتا۔"

"لو محلے والوں کو کون بلاتا ہے۔" ماہ رخ نے کہا۔ "رشتے دار ہی اتنے ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی گنجائش بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ نہیں ہو سکا ہو گا زیادہ انتظام۔ حالانکہ یہ جو فضول نمائش کی ہے لائٹوں اور پھولوں کی بھرمار۔ لاکھوں میں ہو گی۔"

ماہ رخ زیادہ سمجھ دار تھی۔ مگر وہ بتا نہ سکی کہ چچا اور ان کا بیٹا تو امریکن ڈالروں میں کھیلتے ہیں۔ کمی تو نہیں ہے۔ بلکہ گنجائش سے بہت زیادہ کما رہے ہیں۔

وہ چپ رہی۔ پھر بارات کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ کیمرے ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ سب سے آگے دولھا میاں دوستوں کے جلو میں داخل ہوئے۔ ڈھول ڈھماکوں کے ساتھ۔ پھر ان کا مردانہ جلوس ساتھ والے پورشن میں چلا گیا۔ مردانہ، زنانہ الگ رکھا گیا تھا۔ مردوں کے قافلے گزر گئے۔

اب خواتین کا جلوس نمودار ہوا۔ ثمی نے امی کو چچی اور اسریٰ کے ساتھ پھولوں کے ہار لیے گیٹ کے پاس کھڑا دیکھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے آگے کو ہوئی۔ پھر اس نے امی کی آواز سنی۔

"ارے آپا! آپ، آپ کب آئیں قطر سے؟"

حیرت اور تاسف سے لبریز ان کی آواز۔ اس نے بھی خالہ کو سب سے آگے دیکھ لیا تھا جو کچھ بوکھلائی ہوئی تھیں۔

"ہاں وہ، ارے ماہا! بچی کو دیکھ۔" کہتے ہوئے چچی کے ہاتھوں سے مسکرا کر ہار پہنتی ہوئی وہ آگے بڑھ

گئیں۔ ثمی کو پہچانے بغیر۔ (شاید) سامنے سے گزر گئیں۔ زنانہ اسٹیج کی جانب۔

چچی کے جلو میں خالہ اور ماہا ان کی بیٹی، یہ یہاں کیا کر رہی تھیں۔ پھر چچی انہیں سمدھنوں والے صوفوں کی طرف لے گئیں۔ عزت و احترام کے ساتھ۔ ماہا نے تو اسے پہچانا بھی نہیں۔ اسریٰ بھی۔۔۔ صاف لگا کہ منہ چھپا رہی ہے۔ پھر اسٹیج پر خالہ اور ماہا چند خواتین کے ساتھ بیٹھی نظر آئیں۔

خالہ مسلسل محو گفتگو تھیں، پتا نہیں کس کے ساتھ۔ شاید وہ کچھ پریشان تھیں یا مصروف نظر آنے کی فضول کوشش۔ خالہ کا رویہ۔۔۔ اسے عجیب لگا۔ کچھ چبھن سی ہوئی۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ نانی کی وفات پر تو آنہیں سکیں۔ نسریٰ کی بارات میں بیٹی سمیت۔۔۔ یہ ماہا کی سسرالی تقریب تو نہیں؟

پھر شور ہوا۔ اب دلہن چند لڑکیوں کے گھیرے میں اندر آ رہی تھی۔ اسریٰ؟ ہاں ساتھ ساتھ، سب سے آگے۔ حیرانی، کسی نے کہا ہی نہیں کہ چلو ثمی دلہن کو لے آئیں۔ اسریٰ نے بھی۔۔۔ اجنبیت کا نقاب چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ یقیناً "ہونق" نظر آ رہی ہو گی۔

دلہن کو اسٹیج پر بٹھا دیا گیا تھا۔ قہقہے لگ رہے تھے اور ثمی بچاری دم بخود بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ پھر مائیک کھل گئے۔ نکاح کا خطبہ۔ پھر ایجاب و قبول۔۔۔ دولہا کا نام صاف طور پر سماعت سے ٹکرایا۔

ثمی بوکھلا گئی۔ مہ رخ کا شانہ دبوچ لیا۔

"امی، امی کہاں ہیں؟"

اسے امی کی مدد کی ضرورت تھی۔ امی اس سے بھی پچھلی رو میں شروع میں ہی بیٹھی تھیں۔ شاید وہ بھی خالہ سے مل کر آگے جانے کے بجائے قریبی سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔ شاید نقاہت کے سبب۔ وہ ثمی کی طرح کسی بھول بھلیوں کے اسرار میں نہیں گم ہوئیں۔ انہیں شک ہو گیا تھا بلکہ یقین تب ہی وہ جو قریبی سیٹ نظر آئی، اس پر جم گئیں۔

ثمی نے تیزی سے آ کر ان کو تھام لیا۔ ان کا چہرہ زرد تھا۔ ہلکی ہلکی کپکپاہٹ سے ہونٹ کھل گئے تھے۔ ثمی کو نہیں، دراصل امی کو مدد کی ضرورت تھی۔ سہارے کی۔ کسی اپنے کی قربت کی خواہش۔ ان کے اپنے اسٹیج پر مبارکبادیں وصول کر رہے تھے۔

ثمی نے امی کو پکڑ لیا۔ ان کی اپنی بیٹی مدد کے لیے آ گئی تھی۔ انہیں سہلا رہی تھی۔ ہمت بڑھا رہی تھی۔ وہ جو خود کمزور تنکا تھی، ماں کے سہارے کی محتاج۔ آج مضبوط سہارا بن گئی۔

مہ رخ بھی آ گئی۔ اس نے ان کی کیفیت دیکھ کر بیرے سے ایک گلاس پانی منگا کر انہیں پلایا۔ پھر امی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگیں۔ عجب نقاہت تھی۔ سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہال میں تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔

"آنٹی کو کیا ہو رہا ہے ثمین؟ میرا خیال ہے انہیں گھر لے جاؤ۔ میں ابو سے کہتی ہوں، وہ پہنچا دیں گے۔"

"نہیں مہ رخ! ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ چچی کو مبارک باد دے کر پھر چلے جائیں گے۔ امی سنبھالیے خود کو۔ کیا ہو گیا ہے۔ چلیں ہمت کریں۔ چچی اور خالہ کو مبارک باد دیں۔"

وہ ڈر گئی تھی۔ ہمت ہار کر امی کچھ ایسا نہ کریں کہ سب کے سامنے شرمندگی ہو۔

اف۔ خالہ کی بے نیازی۔ مصنوعی بے رخی۔ انگوٹھی کسی کو۔ نکاح کسی سے۔ پلکوں میں چبھن ہونے لگی۔ وہ اپنی کیفیت سے خود بھی لاعلم تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے سہیل کو تو کبھی بچپن میں دیکھا تھا۔ پھر اب۔۔۔ اندر سناٹا کیوں پھیل رہا تھا۔ لیکن اس پر ماں کی ذمے داری تھی۔ انہیں بہلانا تھا۔ حوصلہ بڑھانا تھا۔ اب نانی تو نہیں آئیں گی ہمیں سنبھالنے۔ ہمیں خود ہی سنبھلنا ہو گا۔ اپنی مدد آپ۔

مہ رخ امی سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ آنٹی اور ثمی کو بے چین کر چکا ہے۔ وہ ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کرا رہی تھی۔ مہ رخ، چچی کی چچی کی

بھتیجی تھی۔ یعنی جن چچا کے گھر رشتہ طے ہوا تھا۔ ان چچا کے تو عزیز مدعو تھے ہی کہ چچی کے بھی عزیز تھے۔ مگر چچی کی چچی کے میکے والے بھی بلائے گئے تھے۔ تبھی تو اس قدر ہجوم تھا۔ اچھا پھپھو نظر نہیں آئیں۔ کیا انہیں بھی پُراسرار طور پر ہماری طرح بے خبر رکھا گیا تھا۔

کھانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ مہ رخ چلی گئی۔ امی نے ثمی سے کہا بھی کہ جا کر کھالے۔ لیکن وہ دیکھ رہی تھی۔ امی کو نقاہت ہو رہی ہے۔ وہ ہمت بحال کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھیں۔ ثمی کا رویہ دیکھ کر انہیں کچھ تقویت ہوئی۔ مہ رخ ایک بیرے کے ساتھ کھانا لیے آ رہی تھی۔ میز پر کھانا رکھ کر بیرا چلا گیا۔ مہ رخ بہلا پھسلا کر امی کو کھانا کھلانے میں کامیاب ہو گئی۔

ثمی کے حلق میں لقمہ چبھ رہا تھا۔ کانٹے کی طرح۔ پتا نہیں کیوں؟ وہ خود اپنی کیفیت سے لاعلم تھی۔ چچی لپکی ہوئی آئیں۔

"بھابھی! کیسی طبیعت ہے؟ مجھے تو اس بچی مہ رخ نے بتایا۔ تو میں نے کھانا بھیج دیا۔ میں ذرا ادھر مہمانوں کو ذرا..."

امی ان کی بوکھلاہٹ پر خود جیسے قوت بحال کر چکی تھیں۔ کھڑی ہو گئیں۔ چچی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ "بس بھابھی پیرسن ہو گئے تھے تو یہیں بیٹھ گئی۔"

وہ چچی کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئیں یا نہیں چچی نے ان کی معذرت قبول کی یا نہیں۔ مگر ثمی سے کہا۔

"آؤ ثمی۔ نسریٰ کے ساتھ کھانا کھالو۔ وہ پوچھ بھی رہی تھی کہ... اس کی سہیلیاں اسے کھلا رہی ہیں کھانا۔ وہ بچی کب کچھ کھا رہی ہے۔ نکاح کے وقت اتنا روئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب بھی... رخصتی کے خیال سے روئے جا رہی ہے۔ آنسو نہیں تھمتے اس کے۔ اچھا بھابھی میں چلوں۔ وہ مہمان 'کھانا ذرا'"

وہ چلی گئیں۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا۔ جس بچی کے آنسو نہ تھمے تھے۔ وہ اسٹیج پر سہیلیوں کے جمگھٹے میں دور سے ہی دانت چمکا رہی تھی۔ اس کے دانت واقعی خاصے لمبے تھے۔ آج بطور خاص دیکھے۔ شاید خوشی میں یوں ہی ہوتا ہوگا۔ دانت لمبے ہو جاتے ہوں گے اور یہ سہیلیاں کہاں سے دستیاب ہو گئیں اچانک۔ کبھی تو کسی کا نام نہ سنا تھا۔ نہ رخ پرنور کبھی نظر آیا۔ ہاہ۔

دولہا اپنے دوستوں کے ہمراہ زنانے حصے میں داخل ہو رہا تھا۔ نسریٰ ' ماما ساتھ تھیں۔ ان لوگوں کے سامنے سے گزر گیا تو خالہ بھی آ گئیں۔ بیٹے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ رہی تھیں پھر اسٹیج پر دلہن کے ساتھ بٹھا کر خود بھی پہلو میں براجمان ہو گئیں۔ تصویریں کھٹا کھٹ لی جا رہی تھیں۔

اسٹیج پر سلامی کی رسم ہو رہی تھی۔ (اصراف بے جا ارے دولہا اتنی قیمتی چیز لے کر جا رہا ہے۔ دلہن۔ کسی کی انمول متاع ' ماں باپ کا درِنایاب۔ سلامی کیوں؟)

"امی! اٹھیں۔ سلامی ہو رہی ہے۔ آپ جو لفافہ لائی ہیں ' دے دیں جا کر۔"

چچی بھی آ گئیں بطور خاص مدعو کرنے۔ "بھابھی آئیے ' سلامی ہو رہی ہے۔"

ثمی نے معذرتی لہجے میں کہا۔ "چچی! ہم آ ہی رہے تھے ادھر۔ امی کو کمزوری محسوس ہو رہی ہے اس لیے آہستہ آہستہ آتے ہیں۔"

چچی نے بغور ثمی کو دیکھا۔ ثمی نے فوراً" خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ "چچی! نسریٰ کا میک اپ کہاں سے کروایا ہے۔ بہت پیاری لگ رہی ہے۔"

چچی نہال ہو گئیں۔ وہ روغن قاز ملنے پر خود کو داد دینے لگی۔ مہ رخ نے اسے کہنی ماری۔

"واہ ' میک اپ ' فضول لگ رہی ہے۔ دانت دیکھو ' کتنے لمبے ہیں۔ کسی نے کہا نہیں۔ ہنسو مت۔"

ثمی نے مہ رخ کو گھورا۔ "تمہیں کیا ' اس کی ساس کو اس کے لمبے دانت ہی پسند آئے تھے۔"

"جب کاٹے گی ان ہی دانتوں سے تو چیخیں ماریں گی ساس اماں۔"

ثمی کو ہنسی آگئی۔ امی کو لڑکیوں کی مزاحیہ باتوں نے حوصلہ دیا۔ وہ اسٹیج پر چڑھ گئیں۔ وہاں بے ہنگم شور تھا۔ چچی خوشی سے نہال تعارف کروا رہی تھیں۔ جیسے سہیل اجنبی ہو۔

"یہ نسریٰ کی بڑی تائی ہیں۔ تم جانتے تو ہو۔" واضح طور پر ہنسیں۔ خوش مزاجی کا مظاہرہ کامیاب رہا۔ دولھا سٹپٹا کر کھڑا ہوا۔

"میں شاید تمہاری خالہ ہوں اگر تم پہچانتے ہو تو۔"

دولھا بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں بہن کی کمک درکار تھی۔ چچی نے پکارا۔

"ارے یہ ثمی کدھر ہے۔ آؤ نا ثمینہ بیٹی! بہنوئی سے ملو۔ تم وہاں منہ چھپائے کیوں کھڑی ہو۔" ثمینہ بیٹی پہلی بار اس کا پورا نام انہوں نے لیا تھا۔

وہ اچک کر اسٹیج پر چڑھی۔ "منہ کیوں چھپاؤں گی چچی! سامنے تو کھڑی تھی، آپ کے بلانے کا انتظار کر رہی تھی۔"

امی دولھا کو سلامی کا لفافہ دیتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھیں۔

"نسریٰ کے دولھا کے لیے سلامی لائی تھی۔ اگر معلوم ہوتا تو بھانجے کے خیال سے زیادہ لاتی۔ پتا نہیں رازداری میں کیا مصلحت تھی۔ آپا اتنی غیریت برتیں گی۔ امید نہ تھی۔"

دولھا پر شرمندگی کا بوجھ آگرا۔ سر جھکا لیا۔ چچی بلند آواز میں کہنے لگیں۔

"اور بیٹا سہیل! یہ ثمینہ! نسریٰ کی دوسری بہن۔ تمہاری سالی نمبر دو۔ سوچا تعارف کرا دوں۔" چچی خوشی میں سرشار تھیں۔

ثمی کا چہرہ تپ گیا۔ اس نے انگلی سے انگوٹھی نوچ کر نکالی۔ چچی کو دکھا کر دولھا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

"چچی! اس وقت بہنوئی نمبر ون کو دینے کے لیے اس تحفے کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں۔"

چچی کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ دولھا کی آنکھیں اس پر ٹک گئیں۔ سرسراتی آواز میں بولا۔

"تم ثمی۔۔؟"

اسے ہنسی آگئی۔ "ٹھیک پہچانا۔ مزید خالہ سے پوچھ لیں۔ اگر انہیں یاد ہو۔"

وہ فوراً" ہی مڑ کر امی کا بازو تھام کر نیچے اتر آئی۔ چچی نے پکارا۔

"گروپ فوٹو کے لیے آپ کو آنا ہوگا بھابھی۔" مگر امی میں ضبط کی تاب بھی نہ رہی۔ خالہ کو مبارک باد دینے کی حسرت ہی رہ گئی۔ امی نے کمزور آواز میں کہا۔

"اب بیٹھا نہیں جائے گا۔ گھر چلو۔"

نہ جانے خالہ کس مسئلے میں الجھی ہوئی۔ نظر آ رہی تھیں۔ خواتین کے جمگھٹے میں۔ شاید بہن، بھانجی سے منہ چھپانا مقصود تھا۔

مہ رخ نے کہا۔ "میں ابو کو لے کر آتی ہوں۔ جب تک وہ گاڑی گیٹ پر لائیں گے۔ تم آنٹی کو باہر لے آؤ۔ آرام سے۔"

تکلفاً" بھی وہ مہ رخ کو منع نہ کر سکی۔ امی بہت تکلیف میں تھیں۔ آہستہ آہستہ انہیں باہر لائی۔ مہ رخ گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ مہ رخ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر راستے سے میڈیکل اسٹور سے مہ رخ کے والد نے کوئی دوا خریدی اور ثمی کو دے کر تاکید کی۔

"گھر جاتے ہی کھلا دینا۔ مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ دوا سے سکون ملے گا۔"

اف غیروں کو بھی احساس ہے لیکن اپنے لوگ طرح طرح سے اذیتیں دینے کے ماہر۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ کیسی دنیا ہے۔ رات امی دوا کے اثر سے سو گئیں۔ لیکن صبح ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے چھٹی کر لی۔ شکو آئی تو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ حال چال پوچھا۔ (جو کام کبھی نہیں کیا تھا)

"کیا ہو گیا بی بی! ثمی بی بی کا مغز الٹ گیا کیا؟ نسریٰ بی بی کی شادی میں کسی نے منتر تو نہیں پھونک دیا۔ یہ ایک رات میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔"

شکو پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ ثمی کا

خوشگوار موڈ برداشت نہ ہوا۔ مگر شکو کے جملے نے امی کے ضبط کے بندھن توڑ دیے۔ نہ جانے امی کے پاس آنسوؤں کا کتنا ذخیرہ تھا۔ کل سے آج تک جمع ہوتے ہوتے دریا بن گیا۔

ثمی اور شکو ان کی ہر طرح دل جوئی میں لگ گئیں۔ نہ جانے کیسا گہرا زخم تھا۔ درد کی شدت' اپنوں کی بے وفائی۔ دغابازی بے رخی۔ بے نیازی۔ تغافل۔ بیگانگی۔ غیریت کی حد نہ تھی۔ نہ جانے زخموں سے کیسی فریاد بلند ہو رہی تھی۔ بے بسی۔ بے سہارا پن۔ (فریاد) فکروں کے درد۔ کس سے انصاف مانگیں۔ منصف خود ہی قاتل بن گئے۔

شکو شادی کا حال سننے کے لیے بے چین تھی۔ سن کر اس کی چیخ نکل گئی۔

رات کو گل بھی آئی۔ اسے یونیورسٹی میں مہ رخ نے بتایا تھا۔ امی کی نقاہت کا۔ معاملے سے تو لاعلم تھی وہ۔ گل دنگ رہ گئی۔

"ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ یہ تھی رازداری کی وجہ؟"

چچی کئی دن تک اپنے چچا کے گھر سے نہ آئیں۔ محلے والیاں البتہ تواتر سے آتی رہیں۔ افسوس اور غصہ۔ لگتا تھا نسریٰ کی شادی نہیں جنازہ اٹھا ہے۔

ثمی سب سے کہہ کہہ کر تھک گئی۔

"کوئی بات نہیں خالہ۔ اللہ ہے ہمارے ساتھ۔ آپ لوگ امی کو سمجھائیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے لیے بہتری ہو اس میں۔ اللہ کی مصلحتیں وہی سمجھتا ہے۔"

مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہتری نظر تو نہیں آ رہی تھی۔ یتیم لڑکی' بے سہارا بیوہ۔ خالہ اور چچا کا فریب۔ بیوہ بیمار ہو گئی۔ یتیم لڑکی پاگل۔ ہنس ہنس کر سب کا استقبال کرتی۔ (جو پہلی بار دیکھا) اطمینان سے نصیحتیں کرتی۔ (وہ بھی پہلی بار)

"امی کو سمجھائیں۔ میں تو خوش ہوں۔ میری کزن کی شادی ہوئی ہے۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ اصل میں امی کو اس بات سے تکلیف پہنچی کہ چچی نے یہاں سے شادی کیوں نہیں کی۔ اپنے چچا کے گھر جا کر کیوں کی؟" دراصل اسے تو انگوٹھی سے لگاؤ تھا نہ انگوٹھی والے سے۔ لیکن امی کی فکر پریشانی سمجھ سکتی تھی پھر بھی وہ حتی الامکان انہیں اطمینان دلاتی رہتی تھی۔

نانی والی بات اب سچ ہوئی۔ خالو صاحب کو نسریٰ کے ابا کے امریکن ڈالر زیادہ عزیز ہو گئے۔ مگر خالہ' وہ بری الذمہ ٹھہرائی جائیں۔ یہ مشکل تھا۔

☆ ☆ ☆

شادی کے کئی دن بعد چچی آئیں تو وہ دوڑی گئی۔ نسریٰ کا حال چال پوچھا۔ "گھر کب آئے گی۔ امریکہ جائے گی یا؟"

چچی نے سرسری جواب دیا۔ پھر تھکن کا بہانہ کر کے لیٹ گئیں۔ وہ اسریٰ کو برآمدے میں لے آئی۔

"اتنے دن وہاں کیا کرتی رہیں۔" کا جواب اسریٰ نے دیا۔

"کیا منہ دکھاتے سب کو۔" اسریٰ شدید ناراض تھی۔ **ثمی** گھبرا گئی۔

"اچھا ہاں وہ تم کو جو انگوٹھی پہنا گئی تھیں نسریٰ کی ساس اماں نے کہاں ہے اب؟" اسریٰ بھی بس۔

"ارے' میں نے تمہارے بہنوئی کو سلامی میں دے دی۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ اسریٰ کا غصہ کم ہوا۔

"اچھا کیا۔" اسریٰ نے اسے شاباش دی۔ "حق بہ حق دار رسید۔ تم نہ دیتیں تو میں تم سے لے کر ان کے منہ پر مار آتی۔ خالہ بنی ہیں بڑی۔" منہ پھلا لیا۔ **ثمی** کو ہنسی آگئی۔

"ارے۔ کیا ہو گیا بھئی۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے جو تم خفا ہو۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ سب چلتا ہے یہاں۔"

"حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ جس پر احسان کر چکے ہو۔ اس کے شر سے بچو۔ تم لوگوں کے ساتھ۔۔۔"

ثمی نے بات پوری نہ کرنے دی۔ بہلا دیا۔ مگر وہ بڑبڑاتی رہی۔

"تم کیوں خفا ہو اسریٰ۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں۔

ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔" ثمی اسے ٹھنڈا کرنے میں لگی رہی۔

"تم نے... چچی نے تو حیران کر دیا۔ مگر وہ جو نانا تھے' امی کے چچا اور نانی' امی کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ نانی نے تو آج کہہ دیا۔ ایک غلط کام کے لیے میرا گھر استعمال کیا تم نے۔ اب اپنے گھر جاؤ یا وہ تمہیں نکال دیں تو کوئی اور ٹھکانہ کر لینا۔ یہاں نہ آنا۔ امی کو ان کے سب خاندان والے شرمندہ کر رہے ہیں۔ روز بے عزتی۔ میں زبردستی امی کو لائی ہوں۔ ورنہ وہ تو اب بھی نہ آتیں۔"

"مگر تمہارے چچا یعنی نانا کی معرفت تو رشتہ ہوا تھا۔" ثمی کو عجیب لگ رہا تھا۔

"لو انہیں تو اب پتا چلا ہے۔ ساری چالاکی تمہاری خالہ کی ہے۔ کہا کہ اس بات کا چرچا نہ کرنا۔"

"اچھا اچھا ختم کرو یہ بتاؤ نسریٰ خوش تو ہے۔ کب آئے گی یہاں۔" کسی طرح اسے اس موضوع سے ہٹائے۔

"خاک۔" وہ جھلا گئی۔ "وہاں ہر وقت... وہ ماما بیگم اپنی اماں سے شکایت کرتی رہتی ہیں کہ کیا دیکھا۔ سانولا رنگ' لمبے دانت۔ موٹے ہونٹ اور ان کے بھائی چپ سنتے رہتے ہیں۔"

ثمی نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور وہاں سے اٹھ کر آ گئی۔ پتا نہیں کیا معاملہ تھا۔ شاید خالو نے ہی یا خالہ نے۔ نہیں تو پھر کس نے یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ الجھ گئی۔ پھر سوچا۔ انجان رہنا بہتر ہے۔ نسریٰ سے ہمدردی ہو رہی تھی۔ اتنی بری بھی نہ تھی بے چاری۔

وہ کمرہ بند کر کے پڑھنے بیٹھ گئی۔ لیکن ذہن میں الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ معمہ تھا۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

شام کو چائے کی تلاش میں آئی۔ خانساماں تو تھا نہیں۔ شکو کی مرضی پر کھانا پینا تھا۔ شکو امی سے شکوہ کر رہی تھی۔

"بی بی! آپ خاموش کیوں رہیں۔ وہ آپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ آپ کہتیں' مجھ سے نہیں اللہ سے معافی مانگو۔ راز کی بات تو نہیں تھی۔ اب سب کو خبر ہو گئی کہ نہیں۔ دل میں کھوٹ تھا۔ اور اب معصوم بن کر۔"

امی نے ڈانٹا۔ "اچھا بس کرو۔ کچن کو دھو لو' بہت چکنا ہو رہا ہے۔" وہ ثمی کو دیکھ کر موضوع سے ہٹ گئیں شاید۔

"اصل میں نا۔ بی بی جی' غم کے مارے مجھ سے کوئی کام نہیں ہو رہا۔ دیکھ لو چائے تک نہیں بنائی۔" منہ بنا رہی تھی۔

"ہائیں شکو! تمہیں کاہے کا غم ہے۔" حیرت تو لازمی تھی۔ شکو ڈھیٹ ہڈی اور غم؟

"لو جی' غم تو آدمی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اب دیکھ لو۔ یہ کیا کم غم ہے۔ نسریٰ بی بی کا بیاہ چوروں کی طرح۔"

"شکو چپ رہو۔ فضول بولتی ہو۔ خوشی کا موقع ہے۔ اٹھو چائے بناؤ جا کر۔ انسان کو سوچ کر بات کرنی چاہیے۔"

امی اسے ڈانٹ رہی تھیں تو ثمی کو ہنسی آ گئی۔ بولی "تو امی انسان کو نا۔ یہاں تو ایسا نہیں ہے۔"

شکو منہ پھلا کر کھڑی ہو گئی۔ "بھلائی کا تو ویلا ہی نہیں ہے۔"

وہ چلی گئی تو امی نے بتایا۔ "تمہاری چچی آئی تھیں۔ معافی مانگ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں آپا نے کہا تھا۔ یہ راز ہی رہنا چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

وقت گزر رہا تھا۔ وہ بھی یونیورسٹی میں مصروف تھی۔ امی نے مشین نکال لی تھی۔ نہ جانے کیا کیا سیتی رہتی تھیں۔ دل بہلانے' مصروف رہنے کے لیے۔ چچی پھر نہیں آئیں۔ نسریٰ آئی یا نہیں۔ نہ اس نے پوچھا نہ کسی نے بتایا۔

"یونیورسٹی میں تقریری مقابلے۔ پھر اسپورٹس۔ وہ تو گھن چکر بن گئی۔ امی نے کہا بھی۔

"ہر چیز میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔"

مگر وہ مشغلے کی تلاش میں رہتی تھی۔ اور اب امتحان

بھی نزدیک آرہے تھے۔ کبھی گل آجاتی تو مل کر پڑھتیں۔

گل کا رشتہ طے تھا۔ امتحانات کے بعد شادی تھی۔ امی بے حد فکر مند رہنے لگیں۔

پھپھو بہت دن بعد آئیں۔ نسریٰ کی شادی کے زمانے میں یہاں نہ تھیں۔ کراچی گئی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کس کی شادی میں۔

کچھ دن چچی سے ناراض رہیں۔ پھر۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ نئے نئے قصے سنا کر امی کو ہولا دیتی تھیں۔

"عمر گزر جائے تو اچھے رشتے نہیں آتے۔ ابھی سے تلاش کرو۔ نہیں تو بیٹھی رہ جائے گی۔ آخر نسریٰ کی وقت پر ہو گئی کہ نہیں۔ کوشش کرو گی تو مرضی کا رشتہ ملے گا۔"

ثمی نے سن کر دل سے کہا۔" چچی جیسی کوشش۔۔۔ امی کے بس کی بات نہیں۔" پھپھو کو اس پر بھی حیرت نہ ہوئی کہ۔۔۔ بیٹی کی شادی میں باپ شریک نہ ہوا۔ بھائی بھی وہیں جما رہا۔

"اے بھائی ہو گئی شادی ان کے بغیر کہ نہیں' خوامخواہ کا خرچا کرتے۔ بچت کرنی چاہیے۔"

ایک دن کہنے لگیں۔ "میں ہی لے جاتی بہو بنا کر مگر آج کل کی اولاد فتنہ ہے۔"

عقدہ نہ کھلا۔ مطلب کیا تھا۔ فتنہ کہاں تھا۔ شکو البتہ خفا۔

"یہ وہی ہیں نا۔ جو صاحب سے لڑی تھیں کہ میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے خالہ کے بیٹے سے منگنی کیوں کی؟؟"

مگر پھپھو کی چچی سے خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ شکو کو شک تھا کہ چچا اور ان کے بیٹے کی کمائی کے ڈالر پھپھو کو کھینچ رہے ہیں۔ دیکھ لینا۔ اسریٰ بی بی کو لے جائیں گی بیاہ کر۔ وہیں ڈیرہ جما رکھا ہے۔"

اف اس کی خیال آرائیاں۔۔۔ چالاکو۔

وہ آرام سے لیٹی تھی۔ تھک گئی تھی۔ گل کا انتظار تھا۔ اس کے گھر آئے دن سسرال والے آجاتے' ان کی خاطر مدارات' پاس بیٹھ کر اخلاق برتنا۔ کبھی ہونے والی نند کے۔۔۔ جھمکوں کی تعریف کرنی' کبھی سوٹ کی یا میچنگ سینڈل کی۔ اوہو ہو۔ وہ تو کبھی ایسی مصنوعی اخلاق کی قائل نہ تھی۔ مگر ٹھنڈا سانس لے کر گل کہتی۔

"مجھے بھی پسند نہیں۔ زبردستی طاری کرتی ہوں کیفیت۔ آج کل بہت فیشن ہے۔ کرنا پڑتا ہے ثمی۔ ورنہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کبھی کبھی رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔"

"اور تمہیں بہت شوق ہے۔ ایسے لوگوں سے شادی کا۔ جو بناوٹی اخلاق کو فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ توبہ۔"

"اماں ابا کی وجہ سے سب کرنا پڑتا ہے۔ رشتہ جڑا رہے۔ ورنہ ان کو اس عمر میں کہاں کوئی نیا رشتہ ملے گا۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"ارے' ارے رشتہ تمہارے ابا کا ہو رہا ہے کیا۔ اس عمر میں۔" اچھل پڑی سن کر۔

"ماروں گی اب۔" گل ہنس دی۔ جھینپی ہوئی ہنسی۔" میرا مطلب ہے۔ اس عمر میں ابا کہاں ڈھونڈیں گے نیا رشتہ۔ میرے لیے' پاگل! میرے لیے۔"

"ہیں؟ تمہارے لیے پاگل؟ یہ' یہ والے کیا پاگل ہیں؟ بالکل۔۔۔"

☼ ☼ ☼

اس دن جو خفا ہو کر گئی تو آئی نہیں۔ مگر آخر یونیورسٹی میں تو سابقہ پڑتا تھا۔ ہارے من گئی۔ آج آنے کا کہا تھا۔ شکو نے آکر سرگوشی کی۔

"مہمان آئے ہیں۔ بی بی بلا رہی ہیں۔" وہ الجھ گئی۔

"مہمان آئے ہیں تو میرا کیا کام ہے۔"

"نسریٰ بی بی آئی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہیں۔"

وہ سرعت سے کھڑی ہو گئی۔ "اللہ! شادی کے بعد پہلی بار ہمارے ہاں آئی ہے۔ چلو بھئی مل لیتے ہیں۔"

وہ بال برابر کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل

ہوئی۔ توقع تھی چچی اور اسریٰ کی مگر یہاں تو دولہا میاں ٹھسے سے بیٹھے ملے۔ ماہا بھی ساتھ تھی۔

اس نے سراپے پر نظر ڈالی۔ شکر ہے ابھی نہا کر کپڑے بدل کر ہی لیٹی تھی۔ بال البتہ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سوکھے کچھ گیلے۔ سلام کر کے۔ (مصنوعی سا سلام۔ جو سمجھتی تھی وہ بناوٹی اخلاق کی قائل نہیں۔ آج وہی کرنا پڑا۔)

نسریٰ سے لپٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی بیٹھی رہی۔ اور اخلاقاً" باتیں بھی ضروری تھیں۔ (وہی بناوٹی اخلاق)

"روز یاد کرتی تھی' اسریٰ سے پوچھتی تھی کہ نسریٰ کب آئے گی۔"

"ہاں وہ بس دعوتیں پھر ہم ہنی مون پر چلے گئے تھے نا۔" نسریٰ بہت بن بن کر جواب دے رہی تھی۔

نسریٰ اور ثمین۔۔۔ ساتھ ساتھ۔ امی کے دل کو کچھ ہوا۔ ثمین اس قدر حسین لگ رہی تھی۔ نسریٰ بچاری۔ مقابلتاً" بہت ہی دبلی ہوئی سی۔ معمولی خدوخال مزید بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ہاں بھئی ثمین۔" ماہا اس سے مخاطب ہوئی۔

"پڑھنے وڑھنے جاتی ہو؟"

"جی۔" عجیب سوال تھا۔

"اچھا۔ کس کلاس میں ہو؟" اور بھی عجیب' کیا وہ بچہ تھی۔ "کس کلاس میں ہو۔"

"ماسٹرز کر رہی ہوں۔ اف' دو مہینے رہ گئے ہیں امتحان میں۔"

ماہا نے چہرے پر امڈتی حیرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ "اچھا؟ کبھی سنا نہیں۔"

"جی تو پوچھ لیا ہوتا نسریٰ سے۔" وہ بددلی سے بولی۔

عجیب مہمان ہیں عجیب تر رویہ۔

امی ماہا کو بتانے لگیں۔

"اس کے ابا جان کی خواہش تھی کہ اعلا تعلیم حاصل کرے اور اس نے ہر بار اعلا پوزیشن بھی لی۔ اب۔۔۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا ہے مگر اسے بھیجنے کے لیے تیار نہیں' میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے۔"

دولہا اور ماہا دونوں جیسے کشمکش میں تھے' نہ جانے کیوں' پھر میاں سہیل کھڑے ہو گئے۔

"چلو ماہا! امی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

ماہا بھی کھڑی ہو گئی۔ نسریٰ سب سے پہلے کمرے سے باہر نکلی۔ بعد میں شگو نے بتایا۔

"نسریٰ بی بی آج یہیں رہیں گی۔ دولہا اور ان کی بہن چلے گئے۔"

گل دیر میں آئی۔ بتا رہی تھی کہ اصل میں دیر یوں ہوئی کہ میں نکلی تو نسریٰ کے میاں اور نند مل گئے۔ نند مجھ سے پوچھنے لگی۔

"ثمین کو جانتی ہو۔" میں نے کہا" ہم کلاس فیلو ہیں۔" پھر وہ سوالات کرتی رہی۔ میں نے بھی خوب بڑھ چڑھ کر تمہاری قابلیت کے بیان داغے۔ حیرت ہے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی۔ تمہارے تو کزن بھی ہوتے ہیں۔"

ثمی ٹال گئی۔ ماہا کی حیرت بناوٹی نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

ثمی نے امتحان کا بھوت ایسا سوار کر لیا تھا ذہن پر کہ آس پاس کی خبر نہ تھی۔ اسریٰ بھی عرصے سے نظر نہ آئی۔ ادھر گل کی شادی کی تیاریاں۔ گل کی شامت' اکثر بد مزاج رہتی۔ مہمانوں سے عاجز۔ امی بھی اکثر گل کے گھر جاتیں۔ اس کے جہیز کی ساڑیاں' دوپٹے لے آئیں۔ کسی میں بیل لگانی ہے تو ساڑھی میں ستارے ٹانکنے ہیں۔ جال بنانا ہے' نہ جانے اور کیا کیا۔ یہ سلمہ ستارے والے بھڑک دار کپڑے گل پہنے گی۔ توبہ۔ عجیب اول جلول سی' بغلول لگے گی۔ وہ دل کھول کر ہنستی۔ گل بھی جھینپ جاتی۔ امی گھورتیں۔

"ثمی! فضول نہ بولا کرو۔ شادی کے بعد پہننے پڑتے ہیں۔ ہمیشہ اسٹوڈنٹ تو نہیں رہنا ہوتا۔ اور یہ کپڑے مطلب کام بنے ہوئے' کئی برس تک کام آتے ہیں۔"

"کئی برس تک۔۔۔ اف۔۔۔ میں تو تنگ آ جاؤں پہن پہن

کر۔ یعنی کہ بس پہنے جاؤ، حد ہے۔"

"ثمی جاؤ یہاں سے۔ پٹ جاؤ گی میرے ہاتھ سے۔ روز پہننے کو کون کہہ رہا ہے۔ کبھی کبھی کسی بھی موقع پر۔۔۔" امی کی باتیں بھی عجیب ہوتیں۔ وہ سمجھے بغیر بول پڑتی تو ڈانٹ پڑتی۔

"بی بی! دال میں کالا کالا ہے۔ جی۔" شکو بھلا باز آتی۔ اُدھر اِدھر کے قصے سنا کر بور ہی کرتی تھی۔

"نسری بی بی خوش نہیں ہیں۔ ساس نند کی برائیاں کرتی رہتی ہیں۔ جی۔" چونکا دیا آخر۔

امی خفا ہونے لگیں۔ "خبردار شکو! آگے کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ کہیں بھی کچھ ہو، اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ آئندہ نہ سنوں میں ادھر ادھر کی۔"

امی سے ڈر کر ثمی کے پاس آ گئی سرگوشیاں کرنے۔

"آپ کا نام بھی لے رہی تھیں۔ میں نے خود سنا۔ روٹی کا کپڑا دھو کر پھیلانے گئی تھی ڈوری پر تو۔"

ثمی نے اسے دھکا دیا۔ "بکواس کس قدر کرتی ہے۔"

وہ ٹیڑھی آنکھوں سے دیکھتی چلی گئی۔ "بھلائی کا تو ویلا ہی نہیں ہے۔"

وہ امی کو جوش و خروش سے گل کی شادی کی تیاریاں کرتے دیکھ کر انہیں لقب دے چکی تھی۔ خدمت خلق کی کوئین۔ گل بہت ہنسی۔

"فکر نہ کرو۔ تمہاری باری بھی آئے گی تب آنٹی کی خوشی دیکھنا۔ جال بنائیں گی۔ گوٹے اور۔۔۔" اس نے منہ بند کر دیا ہاتھ رکھ کر۔

"چپ، پڑھنے آئی ہو یا پیشن گوئیاں کرنے۔"

☆ ☆ ☆

پھر امتحانات بخیر و خوبی ختم ہوئے۔ ایک بوجھ تھا۔ اب فراغت یکدم وہ رک گئی۔ گل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"گل! میرے ساتھ ذرا چلو۔ پھر تھوڑی دیر میں چلی جانا۔"

گل نے اس کی ڈری ہوئی آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ آج۔۔۔ وہ سمجھ گئی۔ پچھلی بار ابا جان ہی۔۔۔ آخری پیپر۔۔۔ وہ دوست تھی۔ تسلی دیتی ہوئی اس کے ساتھ آ گئی۔ سامنے امی بیٹھی تھیں۔ شکر ہے، گل ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"آنٹی! آخری کانٹا بھی نکل گیا آخر۔ شہزادی آزاد ہو گئی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ثمی نے فوراً "بات کاٹی۔

"کانٹا نہیں سوئی شہزادی کے جسم کی آخری سوئی نکلی تو وہ آزاد یعنی زندہ ہوئی۔"

گل نے ثمی کو دیکھا۔ ثمی نے امی کو۔ گل کا اشارہ امی کی طرف تھا۔ چہرہ بجھا بجھا، لبوں پر خاموشی۔ پُراسرار۔ شکو کو بولنے کی بیماری تھی۔ دونوں کو امی کی طرف متوجہ دیکھ کر بولی۔

"وہ جی اصل میں بی بی جی پریشان ہیں۔"

گل نے کہا۔ "آنٹی کیا بات ہے۔" وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ثمی بھی امی کو نڈھال دیکھ کر فکرمند تھی۔

"وہ جی اصل میں نسری بی بی گھر آ گئی ہیں۔" شکو ہی جواب دے رہی تھی۔ اس کا لہجہ بھی پُراسرار سا تھا۔

"تو پھر کیا ہوا؟"

"نہیں ہوا تو کچھ نہیں بس ذرا طلاق لے کر آ گئی ہیں۔" دھماکا کر دیا کمبخت نے۔ دونوں چونک گئیں۔

"اصل میں ابھی آپ کی چچی یہاں سے گئی ہیں۔ بول بول کر۔ بی بی جی سے کہہ رہی تھیں۔ آپ کی بددعاؤں سے میری بیٹی کا گھر اجڑ گیا۔ بہت خراب باتیں کر کے گئی ہیں۔ بس جب سے بی بی کا یہ حال۔۔۔"

شکو چپ ہو گئی۔ گل نے امی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آنٹی! آپ کیوں اثر لیتی ہیں۔ جو کچھ ہوا۔ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے۔ کسی پر تو الزام لگانا تھا۔ ہم تو بہت دن سے سن رہے تھے۔ نسری کی ساس نند سے نہیں بنتی۔ اب اور کیا ہوا پتا نہیں۔"

وہ چپ ہوئی تو ثمی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"امی بہت اچھے پیپر ہوئے ہیں۔ سارا کچھ بہترین،

سن رہی ہیں۔"

امی یک لخت چونک گئیں۔ جیسے گہری نیند سے جاگی ہوں۔ پلکیں جھپک کر بولیں۔ "اچھا آ گئیں تم!"

"جی۔ آپ کو شاید نیند آ رہی ہے۔ زیادہ فکر نہ کیا کریں۔"

وہ کسی اور دنیا میں تھیں۔ حال سے بے خبر۔ "اچھا چلو پھر کھانا کھالو۔ شکو! گل بھی کھائے گی۔ یہیں لے آؤ۔"

گل کھڑی ہو گئی اور اپنی اماں کے انتظار کا بہانہ کر کے چلی گئی۔ ثمی کو اشاروں میں سمجھا کر کہ امی کا دل بہلاؤ۔

ثمی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح امی کو بہلائے۔ یہ خبر اگر صرف شکو کی دماغ کی اختراع ہوتی تو وہ پروا نہ کرتی۔ مگر چچی خود آکر... تو کچھ تو سچائی تھی۔
گل نے پہلے بھی نسری کی بد مزاجی اور زبان درازی کے بارے میں دبی زبان سے بتایا تھا۔ اسے تعجب ہوا کہ گل کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ جبکہ نسری کی ماں، بہن تو اسی گھر میں ہیں۔ سسرال دور ہے پھر اسے خبر نہ ہو گل کو خبر ہو جائے۔
گل نے کہا۔ "میں اسی دنیا میں رہتی ہوں۔ تم کسی اور جہاں کی باشندہ ہو۔"

اب وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی اسے دنیا کی خبر نہیں۔ کہاں کیا ہو رہا ہے اور یہ کوئی غیروں کا معاملہ بھی نہیں، نہایت افسوس کی خبر ہے۔ مگر چچی کے امی کے ساتھ رویے نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہاں جا کر افسوس کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔
"چلو شکو! کھانا لے آؤ۔" امی کو اس کی فکر تھی۔
"آپ نے کھالیا؟ ابھی ساتھ آٹھ ماہ ہوئے ہوں گے۔ اتنی جلد طلاق اور خالہ؟" ذہن ادھر ہی تھا۔
"ارے کدھر۔" شکو بیچ میں ٹپکنے کی عادی۔ سوال امی سے کیا، جواب شکو کے پاس تھا۔ "میں تو کہہ رہی تھی بی بی گرم روٹی بنا کر لاتی ہوں۔ کھالیں مگر ادھر تو محاذ گرم تھا وہ حملے وہ حملے۔"

افوہ۔ اس کو تو صحافی ہونا چاہیے تھا۔ محاذ گرم۔ حملے پہ حملہ، کمبخت کی زبان تھی کہ تلوار کی دھار۔ اور پھر ہر گزرتا دن محاذ گرم سے گرم تر ہوتا گیا۔ بیٹی کی طلاق خالہ اور امی کی بد دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ بھول گئیں جب رازداری سے شادی کی تھی۔ امی کو خبر تک نہ ہوئی۔ اور اب...

"ہائے اس دن میری کمبختی کہ میں نے کہا سہیل، جا بیٹا خالہ سے مل آ۔ جانتی نہ تھی کہ خالہ کب خوش ہوں گی اور اوپر سے تمہاری بیٹی نے اپنے حسن کا اداؤں کا ایسا جال ڈالا کیا جادو کیا کہ بس وہ تو اسی دن سے بدل گیا۔ ہائے میری نسری! یہ تعلیم دی ہے بیٹی کو۔ لوگوں کے ہنستے بستے گھر اجاڑے۔ بہن کے نصیب پھوڑے۔"

چچی کی زبان تھی کہ دو دھاری تلوار۔ ادھر ادھر گزرتے ہوئے غصہ نکالا کرتیں۔ ثمی گھر میں رہنے کی وجہ سے سب کچھ سننے پر مجبور۔ امی بچاری کے حواس گم ہو جاتے۔ بولنا چاہتیں مگر زبان ساتھ نہ دیتی۔

ایک دن پھپھو آئیں۔ تو پہلے چچی کی طرف گئیں۔ افسوس کے لیے پھر بڑبڑاتی ہوئی آئیں۔
"کہہ آئی ہوں، خبردار آئندہ ثمی یا اس کی ماں کا نام بھی لیا تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔ بیٹی کی زبان درازی کی کیا خبر نہ تھی اور جب دھوکے سے شادی کی تھی۔ تب نہ سوچا کہ کیا انجام ہو گا۔ غضب خدا کا نہ باپ آیا نہ بھائی۔ میں کراچی گئی اور یہاں بارات بلالی۔ ایک گھر میں رہتے ہوئے۔ جٹھانی سے خفیہ معاملات طے کیے۔ عارفہ کو اندر اندر بہکایا کہ ثمی تو نیم پاگل ہے، عقل سے عاری ہے۔ پڑھنا پڑھانا ڈھونگ ہے۔ ارے مجھے عارفہ نے سب بتایا ہے۔ وہ تو شرم سے منہ نہیں دکھا رہی۔ ابھی سب سنا آئی ہوں۔ میرے سامنے معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔"
پھپھو بولے جا رہی تھیں۔ امی بے چاری سننے پر مجبور۔ پھپھو بھی رنگ بدلنے کی ماہر نکلیں۔ مگر دیر سے سہی۔ کچھ سچ بھی بول دیا۔

اس دن سے چچی کے گھر سناٹا تھا۔ زبان پر قفل لگنا اسی کو کہتے ہیں۔ ثمی نے یونیورسٹی میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ وہاں سے لائبریری انچارج کے لیے آفر آئی۔ فی الحال یہ بھی غنیمت سمجھا۔ مگر گل کی شادی بھی آگئی۔ امی کو کمزوری ہو رہی تھی۔

وہ گل کی امی کے ساتھ شادی ہال چلی گئی۔ گل اپنی کزن کے ہمراہ بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی۔ شادی خوب رونق والی تھی۔ یونیورسٹی کے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب سے مل کر بہت لطف آیا۔

رخصتی کے بعد وہ امی کی طبیعت کا بتا کر ایک پڑوسی فیملی کے ساتھ واپس آئی تو امی کو مزید نڈھال پایا۔ وہ شادی کا حال پوچھنے لگیں۔

اگلے دن ولیمے پر نہیں گئی۔ صبح ناشتے کا انتظار۔ ارے شکو غائب' وہ تو اکثر رات کو بھی رہتی تھی۔ امی سے پوچھا۔ انہوں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"شکو نہیں آئے گی۔ بھابھی نے اسے نکال دیا ہے۔" کس قدر عجیب۔

"مگر کیوں امی' ہمارے نوکر کو گھر سے نکالنے کا انہیں کیا حق ہے۔ بھروسے کی تھی۔"

"حق ہے بیٹا انہیں۔" امی عجیب لہجے میں کہہ کر چپ ہوئیں تو وہ چونکی۔ "کوئی بات ہے۔"

"اب یہ گھر ہمارا نہیں رہا۔ ان کا ہو گیا ہے۔"

شاید بم گرتا تو اتنا دھماکہ نہ ہوتا۔ تفصیل یہ تھی کہ چچا نے امریکہ میں رہتے ہوئے۔ یہاں کے وکیلوں سے گٹھ جوڑ کر کے عدالت سے یہ گھر اپنے نام کروا لیا ہے۔ جواز یہ کہ اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب گھر قانوناً" بھائی کا ہوتا ہے۔ بلکہ جتنی بھی پراپرٹی ہو۔ ہماری پراپرٹی۔ صرف یہ گھر تھا۔ جو اب ہمارا نہیں رہا۔ بیٹی کے شرعی حق میں۔ ایک کمرہ ہے۔ جو وہ تا زندگی استعمال کر سکتی ہے۔ بجلی گری تھی یا...

کتنی دیر تک تو سمجھ میں ہی نہ آیا۔ یہ ہوا کیا۔ کیسے' وہ سمجھی نہیں مگر امی سب سمجھ گئی تھیں۔ کیسا ناشتہ۔ کہاں کا کھانا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ گھر کے کاغذات لاکر میں تھے۔ لاکر دونوں کے نام پر تھا۔ مگر... ان کاغذات کا... کوئی فائدہ نہ تھا۔ یا چونکہ کوئی ان کا اپنا نہ تھا جو ان کاغذات کی بدولت کارروائی کرتا۔ نہ جانے وہ سارے رشتے دار کہاں تھے جو ابا جان کی زندگی میں روز آیا کرتے تھے۔ کس سے مدد مانگیں۔ ماموں' ماموں کچھ مشورہ... امی نے مخالفت کر دی۔

"وہ خود وہاں پریشان ہیں۔ ان کا بیٹا بیمار ہے۔ اتنی دور بیٹھے وہ کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔"

"شاید کوئی وکیل یا جج ماموں کے واقف..."

"بیٹا صبر کرو۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہمیں ہی مقابلہ کرنا ہے۔ ہمت کرو' اللہ آسانیاں دینے والا ہے۔"

بھوک مر چکی تھی۔ چائے بنالی۔ بسکٹ کھائے اور نڈھال ہوتی ماں کو تسلی دینے لگی۔ دوپہر کو کھانا پکانے کے لیے کچن میں گئی۔ تو وہاں مزدور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ وہ چیخی۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔"

چچی شاید منتظر ہی تھیں۔ فوراً" آگئیں۔ "تمہاری ماں نے بتایا نہیں؟"

ترچھی نظروں سے تلخ لہجے میں بولیں۔ اف ان کا انداز' زبان بھی بدل گئی۔ تمہاری ماں؟ یہ اس ہستی کے لیے الفاظ تھے جو ابھی کل تک اس چھ کنال کے بنگلے کی مالک تھی۔

"اب یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم جو چاہے کریں۔ چاہیں تو پورا گھر توڑ کر نیا بنائیں۔ اب اپنی مرضی کا کچن بنائیں گے۔ تم اپنے کھانے پینے کا خود انتظام کر لو۔"

اف' سنگدلی کی یہ مثال کب دیکھی تھی۔ امی نے سن کر کہا۔

"ہاں بھابھی صبح بتا گئی تھیں کہ وہ مزدور لگا رہی ہیں۔ میں تمہارے جاگنے سے پہلے آملیٹ بنالائی تھی رکھا ہے۔ روٹی بھی بنالی تھی۔ آٹا تھا فریج میں۔ شکو کل سالن بنا گئی تھی۔ وہ بھی فریج میں ہو گا۔"

امی کا اطمینان۔ وہ دنگ رہ گئی۔

کھانے کا کچھ انتظام امی نے کر لیا تھا۔ شام کو مزدوروں کی چھٹی کے بعد اس نے فریج سے گوشت نکال کر پھرتی سے کوکر میں ڈال کر ابالنے رکھا۔ تیزی

سے دوسرے چولہے پر مسالا بنایا۔ بارے سالن تیار ہو گیا۔ غنیمت کہ چولھا ابھی سلامت تھا' نہ جانے کل کیا ہو گا۔ کیا کچھ ٹوٹے گا۔ کیا سلامت رہے گا۔ نئے مالک مکان کی جو مرضی' فریج اگر کمرے میں لا کر رکھ لیں۔ تو کچھ بہترین ہو۔ لیکن ابھی تو کچھ عقل میں نہ آ رہا تھا۔ نہ جانے خالہ کہاں ہیں۔ کب تک شرمائیں گی۔

پھپھو کو امی نے کل ہی فون کر دیا تھا۔ ان کی ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہو گئی تھی۔ آنے جانے سے لاچار۔ شام گہری ہوئی تو چوروں کی طرح اسریٰ آئی۔ بجلی کی کیتلی اور چائے کی پتی' چینی دے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

دوپہر کو پھر چوروں کی مانند کھانا لائی۔ ثمن نے کچن سے کچھ برتن لا کر رکھ لیے تھے۔ مزدور آ گئے تھے۔ گل کی امی آئیں۔ کمرے میں برتن' کھانا' شکو غائب۔ سر تھام کر رہ گئیں۔ محلے والوں کی ہمدردیاں اور تعاون۔ وہ دونوں شرمندہ بھی ہوتیں' اللہ کی شکر گزار بھی۔

جاب کی خواہش ترک کر کے امی کی تنہائی کا مداوا بن گئی۔ ماموں کا فون آیا۔ رقم مزید بھیجی تھی۔ شکر ہے کوئی تو ہے۔ ثمی اپنے پرانے وقت کو یاد کرتی۔ تبدیلی کی دعا کی تھی۔ ایسی تبدیلی؟ ابا جان کے نہ ہونے سے کیسا انقلاب آیا۔ کبھی کوئی تصور نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح بھی ہوتا ہے۔ عروج' زوال تو اب اور کتنا زوال ہو گا۔ وہ خوف زدہ رہنے لگی۔

✲ ✲ ✲

اس کا خوف سچ نکلا۔ ایک دن غلغلہ اٹھا۔ شہزادے صاحب کی تشریف آئی ہے۔

مالک مکان چچا حضرت کے ولی عہد حضور امریکہ سے برسوں برس کے بعد آ گئے تھے۔ طنز و تضحیک کا نیا سلسلہ۔ ان کو یہی باور کرایا گیا تھا کہ ثمین نے اپنے حسن کا جادو چلا کر سہیل کو اپنے جال میں پھنسا لیا اس لیے نسریٰ کی طلاق ہوئی۔ شرجیل آئے۔ چچی کو سلام کرنے۔ طنز کے تیر برسانے۔

"ہاں تو پھر سہیل آیا نہیں آپ کی بیٹی کو بیاہنے۔ آپ کو بھی رخصتی کی تیاری کر لینی چاہیے۔ ارے بھئی بیٹی کی رخصتی پھر آپ کے لیے تو اسٹور بھی کافی ہو گا۔ ہاں تو کب ہو رہی ہے تقریب رخصتی؟"

اسی قسم کی فضول بکواس کر کے امی کو عاجز' ثمی کو خوف زدہ کرتا۔ بے چاری ماں بیٹی۔ زبان کھولتے ہوئے ڈرتیں۔

گل سسرال سے میکے آئی تو اپنی امی کے ساتھ آئی۔ گھر اور گھر والوں کی کسمپرسی دیکھ کر تاسف کرتی رہیں۔ موقع غنیمت جان کر گل کو امی کے پاس چھوڑ کر وہ بینک چلی گئی۔ امی کو تنہا چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

ماموں کی مہربانی سے بینک میں خاصی رقم تھی۔ کچھ ابا جان کے زمانے کا اثاثہ بھی تھا۔ اس نے احتیاطاً" رقم زیادہ نکالی۔ نہ جانے اب موقع کب ملے۔ وقت کا کچھ پتا نہ تھا۔

گھر آئی تو گل کو پریشان پایا۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ شہزادے صاحب آ کر نہ جانے کیا فضول بکواس کر کے گئے۔ وہ تاب نہ لا سکیں۔ بے ہوش ہو گئیں۔ گل کی موجودگی غنیمت تھی۔ دونوں نے ٹیکسی کی اور ہاسپٹل لے گئیں۔ دعا کرتی رہی کہ آج ڈاکٹر سرفراز مل جائیں۔ فرشتہ رحمت کی طرح۔ ایمرجنسی میں جو ڈاکٹر تھے۔ وہ معائنہ کر رہے تھے۔ انکل مل گئے۔ شکر ہے۔ اس کی تو غم اور فکر سے آواز بند تھی۔ گل نے انہیں مختصر حال تیزی سے بتایا۔

شام تک امی کو ہوش نہ آیا۔ جب ہوش میں آئیں تو ثمی کو دیکھ کر مسکرا دیں۔ اشارے سے طبیعت ٹھیک ہے' کہا۔ آنسو مشکل سے ضبط کیے۔ امی ان حالات میں بھی مسکرا سکتی ہیں۔ گل بھی ان کی ہمت اور حوصلے کی قائل ہو گئی۔

رات کو انکل سرفراز انہیں اپنے ذاتی کلینک میں لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ گھبرائی "کلینک کے اخراجات۔" اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ وہ افسردہ ہو گئے۔

"بیٹا! اس حال میں دیکھ کر میں کیا سنگ دل سے سنگ دل آدمی بھی رو پڑتا۔ آج ایمرجنسی میں اس قدر نقاہت کا عالم دیکھ کر میرے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں۔ تم چاہتی ہو میں بھابھی کو یہاں کسمپرسی میں چھوڑ کر لہولہان ہوتا رہوں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب بھابھی دونوں ہاتھوں سے خیرات کیا کرتی تھیں۔ مجھ پر تف ہے اگر میں آج پرانی دوستی کا لحاظ نہ کروں۔"

ثمی مجبور ہو گئی۔ گل کے ساتھ امی کو کلینک لے گئی۔ ڈاکٹر فون کر چکے تھے۔ فوراً ہی دیکھ بھال شروع ہو گئی۔ کلینک کافی بڑا اور جدید مشینری کے علاوہ بہترین ڈاکٹر کام کرتے تھے۔ احاطے میں نرسوں کے کوارٹر تھے۔ یہاں اسے ہر قسم کی سہولت دی گئی۔ انکل کی مہربانی، گل مطمئن ہو کر چلی گئی۔

انکل بہت متاسف ہو کر کہتے۔ "حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمانا کس قدر معنی رکھتا ہے۔ اب حقیقت کا علم ہو رہا ہے۔ "جس پر احسان کرو۔ اس کے شر سے بچو۔" یہ وہی شر ہے مگر انسان نہیں سمجھتا اس کا انجام کیا ہو گا۔"

"انجام کی فکر ہو تو انسان ایسے فعل سے گریز نہ کرے۔"

تین دن بعد سسرال جانے سے پہلے گل آئی۔ امی کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ مگر کمزوری برقرار۔ **ثمی** نے گل کو اپنے کمرے کی چابی دے کر کہا کہ وہ اس کے دو چار کپڑے نکال کر بھائی کے ہاتھ بھیج دے۔ وہ خود اکیلی گھر جانے سے ڈر رہی تھی۔ گل نے سمجھ داری سے کہا۔

"میں نے کمرہ کھولا۔ تو شرجیل کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کمرے میں چوری یا توڑ پھوڑ بھی کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ خطرہ مول نہ لو۔ برا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔"

وہ بات سن کر وہ چپ ہو گئی۔ واقعی کچھ نہ ہو جائے۔ کم ہے گل نے کچھ کپڑے اسے بھجوا دیے اپنی شادی سے پہلے کے۔ اس کی امی خود بیگ لے کر آئیں۔ وہ ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ بے بسی، مجبوری، وقت کتنا ظالم ہے۔ کیسے آنکھیں بدل لیتا ہے۔ ایسے دوست اور پڑوسی بھی غنیمت ہوتے ہیں۔ شکر ادا کیا۔

امی کو چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتی تھی۔ ورنہ گل کی امی کے ساتھ جا سکتی تھی۔ اور پھر... امی کی حالت دگرگوں ہوتی گئی۔ انہوں نے **ثمی** کا ہاتھ پکڑ کر بمشکل بات کی۔

"دیکھو، ہمت نہ ہارنا، اللہ پر یقین رکھو۔ مجھے کچھ ہو جائے۔ تم آپا کے پاس چلی جانا۔ وہ کہیں بھی ہوں اور اپنے گھر کو بھول جاؤ۔"

کتنی دقت سے انہوں نے یہ الفاظ رک رک کر کہے۔ وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔ "اف زندگی اور مشکل فیصلے، کس جرم کی سزا ہے۔ میرے اللہ۔" انکل نے سمجھایا۔ "آزمائش سے گھبراؤ نہیں۔ اللہ صبر کا اجر بھی ضرور دے گا۔"

کب تک صبر کرے۔ مگر اب صبر اس کی آزمائش بن گیا۔

☆ ☆ ☆

رات میں کسی وقت امی کی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ امی تو ہمت و حوصلے کا پہاڑ تھیں پھر وہ حالات سے ہار گئیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے مگر سب کچھ ممکن ہے۔ ایک اور صدمہ۔

ڈاکٹر سرفراز کے گھر سے امی کا جنازہ اٹھا۔ آہ اپنے گھر غسل کا پانی نہ نصیب ہوا۔ مگر وہ اب اپنا گھر نہ تھا۔ **ثمی** اب تھک گئی تھی۔ کتنا روتی اور کب تک صبر کرتی۔ انکل نے اس سے رشتے داروں کے فون نمبر مانگے تھے۔ اور لوگ۔ وہی لوگ جو امی کی ابا جان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جمع ہو گئے۔ پھپھو بھی آ گئیں۔ محلے والے بے شمار۔ کسی رشتے دار نے نہیں کہا۔

"جنازہ ہمارے گھر سے جائے گا ڈاکٹر، تم تو غیر ہو۔" کسی عزیز یہاں تک کہ پھپھو کے منہ سے بھی نہ نکلا کہ "ثمین تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں غیروں میں کیسے رہو گی۔" کسی نے بھی اس کی ذمے داری لینے کا اشارہ

نہ کیا۔ اپنے سب غیر بن گئے۔ یہ دنیا کتنی بے وفا ہے۔
محلے والیاں البتہ اس کے پاس آکر اس سے پوچھتی رہیں۔ "کیا سوچا۔ کیا کروں گی۔" بیگم سرفراز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آج سے یہ ہماری بیٹی ہے۔" اور سب بے فکر ہو گئے۔ وہ کڑا وقت جو زخم دے گیا۔ اس کا مرہم کہاں سے لاتی۔ دنیا میں تو نہ تھا۔ اس نے انکل سے دو دن بعد ہی کہہ دیا۔

"مجھے جاب کرنی ہے۔"

اور وہ مہربان انکل جیسے منتظر ہی تھے۔ کلینک میں آفس جاب موجود تھی۔ اس کے لیے ہی خالی تھی۔ اس نے کوارٹر میں رہنے پر اصرار کیا۔ انہوں نے بخوشی اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

اب وہ کلینک میں انچارج کی حیثیت سے عہدہ سنبھال کر کوارٹر کی مکین تھی۔ ڈاکٹر بھی مطمئن ہو گئے اور وہ خود بھی۔ کسی پر بوجھ بننا گوارا نہ تھا۔ کلینک کے فون سے انکل کی اجازت لے کر ماموں سے بات کر لی۔

ماموں خود بیمار تھے۔ انہوں نے اپنے اطمینان کے لیے ڈاکٹر سے بات کی۔

ماموں نے خالہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہہ دیا۔ "معلوم نہیں۔"

انہوں نے بتایا۔ "وہ بھی عرصے سے لاعلم ہیں۔"

ایک کمرے کے کوارٹر میں کتنا سکون تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت پر حیران تھی۔ کیا کبھی سوچا تھا۔ امی کے بغیر اس تنگ کمرے میں سو سکے گی۔ مگر اسے شاید صبر آگیا تھا۔ وہ سکون سے سو جاتی۔ انکل آنٹی کی شفقت، دیگر ڈاکٹروں اور اسٹاف کا تعاون اور ہمدردی۔ دونوں وقت کھانا آنٹی بھیج دیتی تھیں۔

چھوٹے سے کوارٹر میں ضرورت کی ہر سہولت تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔ زندگی کسی بھی سانحے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ گو کہ وقت بدل جاتا ہے۔ لیکن آنٹی سمجھاتی تھیں۔

"نصیب بدلتے دیر نہیں لگتی۔ زندگی میں غم ہے اور خوشی بھی امید اور یقین کے ساتھ زندگی گزارنے میں لطف ملتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جو قوت ہے۔ وہ ہے برداشت۔ آپ کے پاس برداشت ہے تو آپ سب سے زیادہ بہادر ہیں۔ وہ بہادر بننے کی مشق کر رہی تھی۔ مگر یادداشت۔۔۔ کمزور کر دیتی، کیا کیا بھلائے؟

اباجان کی خون پسینے کی کمائی سے بنایا ہوا وہ خوب صورت گھر۔ جس کا سرسبز لان پھولوں سے مہکتا تھا۔ اور جس کے ایک گوشے میں پھلوں کے درخت تھے۔ اباجان کی اپنے لان کے لیے کاوش اور جذباتیت۔ آم، آلو بخارہ، خوبانی، نیبو، آڑو کے پیڑ اپنے اپنے سیزن پر پھلوں سے لد جاتے۔ اباجان خود سب کی دیکھ بھال کرتے اور پہلا پھل اپنے ہاتھ سے توڑ کر چنگیر میں رکھ کر لاتے۔

"لو بیگم سیزن کا پہلا پھل۔"

وہ منہ پھلالیتی۔ "اور بیٹی کے لیے اباجان؟"

"اباجان کی جان۔ یہ سب بیٹی کے لیے ہے۔ ظاہر ہے آپ تو دھونے کی مشقت کریں گی نہیں۔"

جب بہت یاد آتی۔ وہ آنٹی کے پاس چلی جاتی۔ اباجان سے ملتی جلتی شفقت انکل سے وصول کرتی۔

"ہاہ، نہ جانے کس مقام پر آگئی تھی زندگی، تنہائی اور محرومی۔

☆ ☆ ☆

کلینک میں ایک لڑکا جواد تھا۔ بہت نیک، مستعد، چاق چوبند بہت سے کام سپرد کیے جاتے جن کو خوش اسلوبی سے کر کے دادپاتا۔ سرفراز انکل کو اس پر اعتماد تھا۔ دراصل وہ کمپاؤنڈر تھا۔ لیکن ہر کام میں پیش پیش۔ کلینک سے تعلق ہو نہ ہو۔ اسٹاف کے کام کر کے خوش ہوتا۔

نعمی کو اعتراض تھا۔ جس کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ جس کی تنخواہ وہ لیتا تھا۔ اس سے زیادہ، اس کے سوا کیوں کرتا ہے۔ اس کے اعتراض پر جواد نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ میں سب

کے کام فرض سمجھ کر کرتا ہوں۔"

"تمہاری عزت نفس مجروح نہیں ہوتی؟ جب۔۔۔ ذاتی کام لیے جائیں۔ وہ تم پر فرض تو نہیں۔"

"مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں کسی کا کام آسان کر رہا ہوں۔ میری عزت کم تو نہیں ہوتی۔ سب میری قدر کرتے ہیں۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔"

(عجیب آدمی ہے۔ اسے عزت نفس عزیز نہیں۔)

اس دن وہ چھٹی کے بعد گیٹ سے باہر کسی کام سے جا رہی تھی۔ لپکتا ہوا آیا۔ "کوئی کام تھا تو مجھے بتا دیتیں میں کر دیتا۔" "اُفوہ۔ کس قدر ڈھیٹ ہے۔

"کیوں بھئی؟ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں اپنا کام خود کر سکتی ہوں۔" وہ تنک کر بولی۔

"پھر بھی باہر اکیلی۔۔۔ مطلب میں باہر جاتا ہوں تو آپ کا کام بھی کر دیتا۔ مجھے خوشی ہوتی۔"

"ہاں میں دیکھتی ہوں۔ تم سب کام کر کے کتنا خوش ہوتے ہو۔ سمجھ لو میں تمہیں خوشی نہیں دینا چاہتی۔"

"کیوں جی۔ مجھ سے کوئی غلطی۔ کوئی قصور۔ سب تو ایسا نہیں کرتے۔"

"سب تمہیں ادنیٰ سے ادنیٰ کام دے دیتے ہیں۔ تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھ لو میں ان میں سے نہیں ہوں۔"

وہ واپس آئی تو گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اندر آ گئی۔

"وہ جی مس ثمین باہر گئی تھیں۔ تو میں کھڑا تھا کہ شاید انہیں میری مدد کی ضرورت ہو۔" وہ کسی نرس کے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ ثمی چڑ گئی۔ اُفوہ میری نگرانی بھی اپنے فرائض میں شامل کر لی۔

ثمین پابندی سے آفس کے کاموں کے علاوہ مریضوں کے کمروں میں جا کر ان کی خیریت پوچھنے لگی۔ کوئی کام یا ضرورت ہوتی انہیں تو وہ کر دیتی۔ مریضوں کے لواحقین سے مل کر انہیں تسلی دینا، دلجوئی کرنا بھی آ گیا تھا۔ اب تو وہ نصیحتیں بھی کرنے لگی تھی نانی بن کر، سب خوش ہوتے۔ بعض لوگ تو چھوٹا موٹا تحفہ بھی لے آتے وہ شرمندہ ہو کر واپس کرتی۔ تو وہ یقین دلاتے کہ خلوص اور محبت کا تحفہ ہے۔ جو آپ کی طرف سے ہمارے مریض کو ملتا ہے۔ واہ میں اپنا وقت گزار رہی ہوں۔ یہ لوگ محبت بانٹ رہے ہیں۔

ایک دن چند نرسوں کے ہمراہ وہ مارکیٹ گئی تھی۔ وہ بھی مریضوں کے لیے محبت بھرا تحفہ دینا چاہتی تھی۔ کچھ اپنی ضروریات کی چیزیں بھی تھیں۔ نہ جانے شرجیل کیسے آ گیا۔ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بازو تھام کر شکوے کرنے لگا۔ وہ ہر چند ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ ضد پر آمادہ تھا۔

"جب سے گئی ہو۔ شکل نہیں دکھائی' غائب ہو گئیں۔ محلے والوں سے چچی کی خبر ملی۔ تم اتنی لاتعلق کیسے ہو سکتی ہو؟"

نرسیں اس کی ناگواری دیکھ کر آ گئیں اور شرجیل سے ہاتھ چھڑوایا اور دبنگ آواز میں کہا۔

"کون ہو جی تم۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟"

وہ بھی اکڑ گیا۔ "تم کون ہو؟ کیا لگتی ہو' میری کزن ہے' میں بات کر رہا ہوں۔"

"اوئے' بہت دیکھے ہیں ایسے غنڈے بدمعاش' کزن بن کر تڑی دکھانے والے۔ پولیس کو فون کرو نائلہ۔ ہماری باس کو چھیڑ رہا ہے۔ میڈم! آپ چلیں۔ ہم نبٹ لیں گے۔ کرنل فراز کو فون کرو۔"

"جواد! تم میڈم کو لے کر چلو۔ ہم آ جائیں گے۔ غنڈوں سے نبٹنا آتا ہے ہمیں۔" دوسری نرس بھی کم نہ تھی۔

جواد نے شرجیل کا گریبان پکڑ لیا۔ اب وہ جواب طلبی کرنے لگا۔ ثمی کو پریشانی ہو رہی تھی۔ آخر یہ جواد یہاں کیا کر رہا تھا۔ دکان دار بھی آ کر کھڑے ہو گئے۔ شرجیل کو بھاگتے بن پڑی۔ وہ بہت ڈر گئی۔

پتا چلا کہ جواد کا تو گھر ہی اس بازار کی ایک گلی میں ہے۔ اس کا یہی راستہ ہے۔ ورنہ وہ سمجھتی کہ وہ واقعی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت اپنے ابا کے لیے حکیمی دوا لینے آیا تھا۔

"لو چراغ تلے اندھیرا۔" نرس زرجبیں نے مذاق

اُڑایا۔" خود کلینک میں کام کرتے ہیں۔ ابا کو حکیم کا علاج۔۔۔ واہ جی۔"

جواد نے بتایا۔ "ابا کو حکیم کی دوا سوٹ کرتی ہے۔" وہ دوا کی تلاش میں چلا گیا۔

نرس نے ثمی کو سمجھایا۔ "ڈرنے کی بات نہیں ہے مس۔ بے فکر ہو کر تڑی دے کر ایسے غنڈوں سے بات کرنا چاہیے۔ کمزور بندے کی تو پھر شامت آتی ہے۔" مگر وہ واقعی ڈر گئی تھی۔

٭ ٭ ٭

ایک دن شام کو نرس مارتھا اور زرجبیں کو کہیں جانے پر تیار دیکھ کر اس نے پوچھ لیا۔

"تم دونوں کہاں جا رہی ہو؟"

یہ دونوں اس کے ساتھ والے کوارٹروں میں رہتی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جواد کے والد بیمار ہیں۔ جواد چھٹی پر ہے۔ بچارا اکیلا ہے، کمانے والا۔ بڑی معلومات تھیں انہیں۔

"میں بھی چلوں؟" ثمی نے پوچھا۔

تینوں مل کر جواد کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ مارکیٹ سے گزر کر گلی میں داخل ہوئیں۔ زرجبیں نے یاد دلایا۔ "یہ وہی جگہ ہے مس۔ جہاں آپ کا کزن ملا تھا۔"

جواد کا گھر چھوٹا سا تھا۔ تین کمروں کا مختصر صحن والا ابا کے کمرے میں کرسی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ تینوں اماں کے ساتھ دوسرے پلنگ پر بیٹھ گئیں۔ ابا سے خیریت پوچھی۔ نرس مارتھا نے جو پہلے بھی آتی رہی تھی۔ ثمی کا تعارف کرایا۔ ثمی نے ابا کو تسلی دی، نصیحتیں بھی کیں۔ جن کی وہ عادی ہوتی جا رہی تھی۔

(نانی کی روح خوش ہو جاتی ہو گی) اماں کی دل جوئی کی۔ جواد کی دو بہنیں تھیں۔ چائے بنا لائیں۔ ثمی نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ چلتے ہوئے اس نے ابا سے کہا۔

"میں پھر آؤں گی۔ آپ کو صحت یاب دیکھنے کے لیے۔"

وہ خوش ہو کر بیوی سے بولے۔ "دیکھو کتنی نیک بچی ہے۔ مجھے دعا دے رہی ہے۔" اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیں۔

"اللہ اپنی امان میں رکھے۔ ہمیشہ خوشیوں کے جھولے جھولو۔"

کئی دن بعد جواد سے ابا کی خیریت پوچھی۔ شرما گیا۔ (لو جی۔ میں نے ایسی کیا بات کر دی کہ موصوف شرما گئے)

"وہ مس۔ ابا بہت خوش تھے آپ سے مل کر۔ اب بہتر ہیں۔"

"ارے واہ۔ میں کوئی جادو کرنے گئی تھی۔" ہنسی آ گئی۔

جواد بھی ہنس دیا۔ بڑی بے ریا ہنسی۔ خوش کرنے والی۔ ہنستے ہوئے اس کا چہرہ بھی کھل گیا۔

٭ ٭ ٭

ایک دن گل کی اماں آ گئیں۔ سب محلے والوں اور گل کا حال بتانے کے بعد رازداری سے بولیں۔

"تمہاری چچی تمہارا اتا پتا پوچھ رہی تھیں۔ آئیں گی کسی دن۔ انہیں ان کے بیٹے نے بتایا ہے کہ تم کہیں افسر لگ گئی ہو۔ جستجو ہو رہی تھی۔ میں نے تو لاعلمی ظاہر کی ہے مگر کہیں سے بھی معلوم کر لیں گی۔ ان کے چکر میں نہ آنا۔ گھیریں گی بہت۔"

وہ بھلا چچی کے چکر میں کیا آتی۔ کچھ بھولی نہ تھی۔ لیکن عجب العجائب چچی نہیں خالہ آ گئیں۔ لپٹا کر دھواں دھار رونا شروع کر دیا مگر اسے رونا نہ آیا۔ آنسو خشک ہو گئے تھے۔ نہ ہی خالہ کے آنسو متاثر کر سکے۔ حالانکہ چند دن پہلے گل کی امی سے لپٹ کر بھل بھل روئی تھی۔

خالہ افسوس کرنے لگیں۔ یہ کوارٹر۔ اتنی عریض و وسیع کوٹھی کی رہنے والی۔ ایک کمرے کے مختصر گھر میں کیسے رہتی ہے۔ چچا کی فریب کاری پر غصہ کرنے لگیں۔ (اپنا بھول گئیں۔ شاید)

خالہ، چچی کی مکاری بتانے لگیں۔ کیسے انہوں نے

ثمی کو پاگل جاہل بتایا۔ اپنی بیٹیوں کے سلیقے اور تعلیم و تربیت کے جال بچھائے۔ پتا نہیں کون سا منتر مجھ کمبخت پر کیا کہ بہن بھانجی کو بھول کر ان کے چکر میں آ گئی۔ آج بہن یاد آئیں۔ ان کی بے وقت موت' بھانجی کی کسمپرسی۔

وہ بے دلی سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ ان کی سرد آہیں بھی اس کے دل کو موم نہ کر سکیں۔ لیکن وہ بعد میں بے چین رہی۔ سب کچھ بھلایا تو نہیں جاتا۔ کچھ اچھے وقت کی یاد آ ہی جاتی ہے۔ وہ بدل گئی تھی۔ مگر اس قدر بھی نہیں۔

اور جب از سر نو بھلانے کی تگ و دو میں تھی۔ تو چچی تشریف لے آئیں۔ وہ آفس میں مصروف تھی۔ شروع مہینے کی مصروفیات۔ تنخواہوں کا حساب' دواؤں کی دریافت' کیا کچھ موجود ہے کیا نہیں ہے۔ نت نئے آرڈر۔ نرس' ڈاکٹروں کا آنا جانا آرڈر وصول کرنا۔ مریضوں کے لواحقین رشتے دار آ کر شکریہ۔ معلومات مطلوبہ اشیاء کی فہرست۔ عزت و احترام' سب کے انداز سے ہویدا تھا۔ چپ چاپ دیکھتی رہیں۔ لنچ ٹائم پر ان کی بات سننے کا موقع ملا۔

"تمہاری خالہ سنا ہے تمہارا پتا پوچھتی پھر رہی ہیں۔" نہ امی کی تعزیت نہ افسوس تحقیق البتہ.... "دیکھو ان کے بہکائے میں نہ آنا۔ چالاک اور مطلب پرست ہیں۔ میں تو بھگت چکی ہوں۔ ہائے آئی تھیں کیا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"دیکھا۔ میں سمجھ گئی تھی۔ اب وہ تمہیں گھیریں گی۔ ان کے چکر میں نہ آنا۔"

ڈاکٹر سرفراز دستک دے کر اندر آئے۔ "ارے تم لنچ کے لیے نہیں آئیں۔ وقت ختم ہو گیا تو پھر شام تک مہلت نہیں ملے گی۔ چلو اٹھو۔"

"جی۔ وہ چچی آئی تھیں تو اس لیے...." وہ منمنائی ان کی محبتوں' شفقتوں کی اسیر تھی۔

وہ چونک گئے۔ "اچھا؟ وہی جنہوں نے بھائی کی روح سے دغا بازی کر کے تمہیں گھر سے دربدر کیا؟ انہیں بتا دو۔ اب تم اس طرح کے دس گھر خرید سکتی ہو۔ تمہارے پاس وہ جادو ہے جو ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ وہ ہے علم کا جادو۔ علم کی بے بہا دولت۔ تمہارے ماں باپ کی دعائیں۔ ان کی اعلا تربیت اور تمہاری صلاحیت۔"

چچی کا رنگ پیلا ہو کر سفید پڑ گیا تھا۔

"اپنی مہمان کو رخصت کرو اور ہمارے ساتھ لنچ کرو۔ پھر ڈیوٹی۔ رات کو تمہاری آنٹی تمہیں لینے آئیں گی۔ پی سی میں ڈنر پر جانے کے لیے تیار رہنا۔" کہہ کر چچی پر کڑی نظر ڈال کر اپنے ساتھ آئے ڈاکٹروں کے جلو میں واپس چلے گئے۔

ایک تو انکل کی شاندار شخصیت پھر ان کے دائیں بائیں مودب ڈاکٹروں کا اور پیچھے نرسوں کا لشکر۔ چچی نروس ہو رہی تھیں۔

"یہ... ڈاکٹر سرفراز ہیں۔" وہ چچی کو بتانے لگی۔ "ابا جان کے پرانے دوست' یہ ہاسپٹل ان ہی کا ہے۔ مجھے یہاں کا انچارج بنایا ہے انہوں نے.... انہوں نے ہی ابا جان اور امی کا بھی آخری وقت دیکھا۔ پھر امی کے جنازے کو اپنے گھر لے گئے' وہیں سے...."

بات نامکمل چھوڑ کر قابو کرنے لگی خود کو کہ کمزوری ظاہر نہ ہو۔

"آپ کے گھر سے نکل کر پھر ہم دونوں ان کے گھر گئے۔ وہ مردہ' میں بھی نیم مردہ...."

چچی اٹھیں اور باہر نکل گئیں۔ وہ واش روم میں گھس کر منہ دھوتی رہی۔ آنسو نظر نہ آ جائیں۔ کئی دن اس بے کیف ملاقات کے حصار میں رہی۔

☆ ☆ ☆

ایک دن جواد کے گھر چلی گئی۔ وہاں اماں سخت پریشان نظر آئیں۔ بتایا کہ "گھر کرائے کا ہے۔ دو ماہ سے کرایہ نہیں دے سکے۔ جواد کسی اچھی سی نوکری کے لیے ہاتھ پیر مار رہا ہے مگر.... سفارش نہیں ہے۔ اب نئی مشکل' قرض کے لیے ادھر ادھر چکر لگا رہا ہے۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے۔"

بہن نے آکر بتایا۔ ''اماں بھائی آگئے ہیں۔''
اماں نے اشارے سے پوچھا ''کیا ہوا؟''
بہن نے مایوسی سے گردن ہلائی۔
''اچھا بھائی کو چائے دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔''
اماں کے جاتے ہی ثمی نے پرس سے مطلوبہ رقم نکالی اور ابا کے تکیے کے پاس رکھ دی۔ آبدیدہ ہو گئے بزرگ۔ انکار کرنا چاہتے تھے تو اس نے کہا۔
''ابا! میں اکیلی ذات ہوں۔ مجھے خاصی بڑی تنخواہ ملتی ہے۔ یوں ہی رقم بینک میں پڑی رہے۔ کیا فائدہ' یہ بہتر نہیں کہ کسی کا کام آسان ہو جائے۔''
ابا کی مشکور و ممنون آنکھوں کا تاثر بے حد اثر انگیز تھا۔ اماں بولتی ہوئی آئیں۔
''نہ کوئی رشتے دار نہ اپنا کام آتا ہے نہ دوست۔ بھلا بتاؤ بچے کو شرمندہ کر دیا۔ اب نہ کوئی ٹھور نہ ٹھکانہ مالک مکان گھر خالی کرنے کو کہہ رہا ہے۔''
ابا نے تکیے کے نیچے سے رقم نکال کر کہا۔ ''جواد سے کہو۔ دنیا میں فرشتے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں مدد کے لیے دنیا میں بھیجتا ہے ہم جیسوں کے لیے۔'' اماں کا چہرہ دمک اٹھا۔ پھر مشکوک نظروں سے ثمی کو دیکھا۔
''اماں! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ اب کچھ نہیں کہیں گی۔ کیا میں ماں باپ کو پریشان دیکھ سکتی ہوں۔''
اماں پھر بھی بحث کے موڈ میں تھیں۔ آخر کہنا پڑا۔
''اچھا اسے قرض سمجھیں۔ جواد کی تنخواہ سے کاٹ لیا کروں گی قسط۔ خوش؟''
ابا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ''لو جی میں تو ٹھیک ہو گیا۔ لاؤ کھانا کھالوں فکر سے نیند بھوک سب غائب تھی۔''
''ابا! آپ بالکل صحت یاب ہو جائیں۔ ہم پارٹی کریں گے ہوٹل میں۔'' وہ بشاش لہجے میں بولی۔ پھر وہ رکی نہیں۔ جواد کا سامنا ہونے سے پہلے گھر سے نکل آئی۔
اگلے دن جواد آیا۔ تنہائی ملتے ہی بولنے لگا۔ رقم واپس لینے پر اصرار' وہ چڑ گئی۔
''افوہ۔ دیکھو جواد! نہ میں نے احسان کیا ہے نہ میں اس ارادے سے وہاں گئی تھی نہ ہی مجھے علم غیب ہوا۔ یہ امداد غیبی سمجھ کر کام میں لاؤ۔ دیکھو میں بے ارادہ تمہارے گھر چلی گئی۔ وہاں پریشانی تھی۔ عام حالات میں بلکہ محتاط طبیعت سمجھ لو۔ کبھی میں پرس میں زیادہ رقم رکھتی ہی نہیں۔ اور مجھے کچھ لینا بھی نہ تھا۔ قدرت نے مجھے وہاں پہنچایا۔ زیادہ رقم قدرت کے اشارے پر ہی میرے پرس میں تھی۔ اب اماں ابا کو پریشان دیکھ کر میں بے نیازی سے آجاتی۔ تو اللہ کو کیا منہ دکھاتی اور ہاں۔ دوسرا مکان تلاش کریں' یہ والا مالک مکان تو بہت بے مروت ہے۔ خود غرض' لالچی' حد ہو گئی۔ اسے احساس نہیں کہ گھر خالی کر کے تم لوگ جاؤ گے کہاں؟''
''وہ تو اس کی بھی مجبوری ہے۔ اس نے گھر بنایا ہی آمدنی کے لیے ہے۔ وہ نقصان کیوں اٹھائے گا؟''
''ہاں تو سنا ہے اس کے دو مکان ہیں۔ بھئی انتظار کر لے۔ ایک کے کرائے سے کام چلائے۔''
جواد اس کی بات سن کر حیران ہو گیا۔ بھول گیا کہ رقم واپس کرنے آیا تھا۔ سمجھ گیا کہ وہ واپس نہیں لے گی۔
''اور اسے کبھی مجھ سے بھی ملانا۔ میں اس کی اچھی خبر لوں گی اور اخلاق اور انسانیت پر ایسا لیکچر دوں گی کہ اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔ پھر کبھی تقاضا نہیں کرے گا۔''

✲ ✲ ✲

آفس میں داخل ہوئی تو حیرت کا جھٹکا لگا خالہ مع صاحبزادے کے براجمان۔ مسلسل بولتی رہیں۔ ہمدردی۔ افسوس اپنی بے خبری' پیش کش۔
''میں تو کہتی ہوں تم آج ہی ہمارے گھر آجاؤ۔ اس کوارٹر میں تھوڑی دیر میں ہی میرا تو دم گھٹنے لگا۔ تم کیسے رہتی ہو۔ سہیل تو سن کر ہی اتنا پریشان ہوا کہ امی ابھی جا کر لائیں ثمی کو۔''
اس نے بے رخی اور بد اخلاقی کے تمام تسلیم شدہ

ریکارڈ توڑتے ہوئے اعلان کیا۔

"خالہ! اس آفس میں کام کرنے کی مجھے تنخواہ ملتی ہے۔ میں اپنی اوقات اور حیثیت پہچان گئی ہوں۔ ان کوارٹروں میں بھی انسان ہی رہتے ہیں اور یہاں آفس میں کام کے اوقات میں مہمانوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ شام کو میرے کوارٹر آکر مل سکتی ہیں اور کسی کو بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں مطمئن اور خوش ہوں۔ یہاں میری عزت اور قدر ہے۔ پلیز مجھے کام کرنا ہے۔ آپ شام کو آسکتی ہیں۔"

مصروفیت ظاہر کرنے کے لیے رجسٹر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔ ابھی جو اخلاق اور انسانیت کا پرچار کرکے جواد کو مطمئن کرکے آئی تھی۔ خود بے چین ہوگئی۔ خالہ سے ایسا سلوک۔ بری بات، مگر کیا کرے۔ اسے کہاں کوئی پناہ ملی۔ کس نے آسرا دیا؟ ہمدردی؟ اب دنیا میں اتنی جلد انقلاب بھی آسکتا ہے۔ مگر اس کے اندر بھی انقلاب برپا تھا۔

وہ کیا تھی۔ کیا ہوگئی۔ وہ لاابالی، بےفکر، بےخبر، خوش مزاج، لاڈلی بیٹی۔ اتنی تلخ۔ برگشتہ۔ بدمزاج۔ کیسے؟ حالات۔ کیا کچھ نہ گزر گیا تھا اس پر۔ وہ بھی تیزی سے بدل رہی تھی۔

انکل نے بتایا۔ "تمہاری خالہ آئی تھیں۔ بیٹا ساتھ تھا۔ انہیں تم پر گزرنے والی قیامت کا علم دیر سے ہوا۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے چچا سے قانوناً تمہارا گھر واپس لے لیا جائے۔ تم اپنے گھر کے کاغذات لا کر دے دو۔ میرا خیال ہے وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ جو نکتہ انہوں نے بیان کیا کہ تمہارے والد اپنے موروثی گھر کے حصے سے بھائی کے حق میں دست بردار ہوگئے تھے۔ وہ گھر تمہارے چچا کا ہوا۔ تمہارا گھر تمہارے نام سے بنایا گیا تھا۔ بلاشرکت غیرے۔ اس پر قانوناً "یا شرعاً" کسی اور کا حق نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے۔ تم کاغذات انہیں دے دو۔ لڑکا بیرسٹر ہے۔ ہوشیار ہے۔ اگر کامیابی ہوئی تو۔"

مجھے ان کاغذات کا کرنا بھی کیا ہے۔ اس نے سوچا اور لاکر سے لاکر انکل کو دے دیے کہ کرلیں کوشش۔

امید کم ہی تھی۔ لیکن۔ انکل نے بتایا انہیں اس کام کا معاوضہ نہیں لینا۔ محض اپنے پن اور ہمدردی میں یہ کام کریں گے۔

اچھا بھئی دیکھ لیتے ہیں ہمدردی۔ ویسے اپنے پن کو تو پرکھا جاچکا۔ اگر چچی نے کچھ غلط بیانی کی بھی تھی تو امی سے تصدیق کی جاسکتی تھی۔ اگر ان سے نہیں تو محلے والوں سے یا اس کے کالج کے ٹیچرز وغیرہ سے۔ لیکن نانی کی بات۔ خالو لالچی ہیں۔ جہاں دولت دیکھی ادھر ڈٹ گئے۔ ممکن ہے خالہ نے ان سے مشورہ کیے بغیر اپنی محبت میں انگوٹھی پہنا دی ہو۔ بعد میں شوہر کی مرضی پر فیصلہ بدل دیا۔ اس نے دل میں خالہ کے لیے نرم گوشہ ابھرتا محسوس کیا۔

"کیسے عجیب لوگ ہیں دنیا میں۔ رنگ بدلتے دیر لگے نہ شرم آئے۔ جب آنٹی نے اسے وہ نئی خبر سنائی۔ وہ دنگ رہ گئی۔

"تمہاری چچی مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ (تو انہوں نے تلاش کر ہی لیا منبع) اپنے بیٹے سے تمہارا رشتہ لے کر۔ کہتی ہیں یہ موقع بہترین ہے۔ اپنے باپ کے گھر مالک بن کر رہنے کا۔"

اوہ۔ کچھ سن گن مل گئی ہوگی۔ قانونی کارروائی کی۔ گویا مسٹر سہیل نے کام شروع کردیا۔ "آپ نے کیا کہا ان سے؟"

میں نے کہا۔ "ثمین کے تو بہت رشتے آتے ہیں۔ دولت مند اور اعلا تعلیم یافتہ اونچی پوزیشن والوں کے۔ زمین جائیداد والے۔"

کہنے لگیں۔ "ہم بھی جائیداد والے ہیں۔ پیسہ بھی بہت ہے۔ رشتے دار ہیں۔ اپنا خون ہے اس لیے یہ چاہا۔"

میں نے کہا "اچھا اسی خونی رشتے کی وجہ سے آپ نے اسے دربدر کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اپنی ماں کو جس حالت میں ہاسپٹل لائی۔ اس وقت خونی رشتے دار کہاں تھے۔ بس بیٹی۔ میں نے انہیں واپسی کا راستہ بتادیا۔"

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔

☆ ☆ ☆

سہیل نے کارروائی کی ابتدا کر دی تھی۔ ثمی کو بھی کئی بار عدالت جانا پڑا۔ مگر اسے امید نہ تھی۔

چھ ماہ کا عرصہ۔ انکل نے اسے کاغذات دیتے ہوئے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ "چلو بیٹا۔ یہ کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ سہیل کی کاوش اور قابلیت نے معرکہ جیت لیا۔ اب تم اپنے گھر کی مالک ہو۔ کل عدالت کے کارندے گھر کا قبضہ لے کر... آج سہیل مجھے چابی دینے آیا تھا۔ بہت مبارک باد دے رہا تھا۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔"

وہ سن ہو گئی۔ اعصاب سو گئے۔ کیسے؟ ناامیدی بے یقینی اور فتح کی خبر۔ گھر۔ پیارا گھر' اباجان کی حلال کمائی کا بنایا ہوا۔ ان کی محبتوں کی نشانی' امی کے سلیقے کا سجایا ہوا۔ اس وقت اجڑے دیار کا نقشہ نظر آرہا تھا۔ اسے بہت رونا آرہا تھا۔

محلے والے جمع ہو گئے۔ خواتین مبارک باد کے لیے آگئیں۔ خوش بہ خوش۔ گل کی امی نے گلے لگا لیا۔

"کل بڑا عبرت انگیز منظر تھا۔ جب عدالت کے کارندے اندر سے سامان باہر پھینک رہے تھے۔ تمہاری چچی رو رو کر فریاد کر رہی تھیں۔ ان کا بیٹا دور کھڑا تھا۔ محلے والے بھی چچی کی امداد کیسے کرتے۔ اور یہ فرنیچر جو یہاں بچ گیا ہے۔ زیدی صاحب کی بیوی بیٹی کی بدولت۔ وہ نشان دہی کر رہی تھیں کہ یہ سامان مالکوں کا ہے۔ ملکہ نے برتنوں کو ان کے ہاتھ سے چھین چھین کر جگہ پر رکھا کہ یہ یہاں کا پرانا سامان ہے۔ یہ صوفہ' بیڈ' الماریاں کسی کو لے جانے نہیں دیا۔ کون بھول سکتا ہے تمہارے ماں باپ کے حسن سلوک کو۔ دیکھا یہ ہے قدرت کا انتظام۔"

"اور... خالہ وہ نسری' اسری؟" اسے یاد آیا۔ ہمدرد اور محبت والی اسری' نہ جانے کہاں ہو گی۔

"بیٹا وہ تو سپاہیوں کے آتے ہی چلی گئیں۔ سنا ہے تمہارے چچا کے دو گھر اور ہیں۔ کرائے پر تھے' اب وہیں گئی ہیں ماں بیٹیاں یا پتا نہیں' پھوپھی نے تو پناہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ غاصب تو وہ بھی ہیں۔"

محلے کے لوگوں کو گھر کی صفائی کی ذمہ داری سونپ کر کے لوگ آرہے تھے تو ثمی نے افتاں و خیزاں اندر آتی شکو کو دیکھا۔ کچھ بھاری بدن ہو گیا تھا۔ لپٹ گئی۔ روتی رہی' شادی ہو گئی تھی بچہ بھی تھا۔ نہ جانے کس طرح خبر ملی کہ فوراً" آئی۔

وہ آنٹی' انکل کے ساتھ ان کے گھر آگئی۔ گم صم تھی۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہو۔ لیکن رات کو واپس کلینک آگئی۔ کوارٹر کے تنگ ماحول میں۔ پناہ گاہ یہ اس کے لیے آغوش مادر سے کم نہ تھا۔ جب وہ مایوس' دل گرفتہ بے آسرا تھی۔ اس جگہ نے سہارا دیا' اعتماد دیا۔

صبح ہوتے ہی مٹھائی اور فروٹ منگا کر تمام اسٹاف کو کھلایا۔ مریضوں کے لیے فروٹ لے گئی۔ ہر طرف مبارک باد کا شور تھا۔ جواد بہت مسکرا رہا تھا۔ اس کے سوال پر شرما گیا۔

"وہ تو مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ اس لیے۔"

کمال ہے۔ یہ آدمی ہر ایک کے معاملے میں دخل اندازی یوں کرتا ہے جیسے اس کا اپنا معاملہ ہو۔ شاید اسی لیے اتنا مقبول بھی تھا۔

شام کو مٹھائی اور فروٹ لے کر جواد کے گھر جا پہنچی۔ انہیں جواد بتا چکا تھا۔ سب نے مبارک باد کے ساتھ دعائیں دیں۔ ابا کو فروٹ دیے تو بولے۔

"میں تو مٹھائی کھاؤں گا۔ خوشخبری کی مٹھائی سے نقصان نہیں ہوتا۔"

ان کی منطق ہی الگ تھی۔ جواد انہیں بہت پرہیز کرواتا تھا۔ اس لیے بڑے میاں کوئی موقع جانے نہ دیتے۔

وہ آرہی تھی تو اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا جتنا شکر ادا کرو کم ہے۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ نہ جانے تمہارے ماں باپ کی نیکی تھی یا ان کی دعائیں۔ جو آج بھی تمہارے کام آرہی ہیں۔ یا دونوں ہی۔ ان کے لیے بھی دعائے مغفرت کیا کرو۔"

جب بھی کوئی اباجان اور امی کا اچھے الفاظ میں ذکر

کرتا اس کا دل خوشی اور طمانیت سے بھر جاتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آنکھیں پلو سے خشک کرتی وہ گلی سے باہر نکل کر ٹیکسی کا انتظار کرنے لگی۔ کسی کے ہاتھ نے اس کا ہاتھ دبوچا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"چپ رہو اور میرے ساتھ چلو ورنہ۔۔۔" شرجیل تھا۔ زخمی شیر۔

وہ پھر چیخی۔ "چھوڑو۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔" مگر وہ کھینچے لیے جا رہا تھا۔

وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ دکاندار سب مصروف۔ خریداروں کا اژدحام۔ وہ زور لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور زور زور سے اللہ کو پکارنے لگی۔

"دیکھو۔ ابھی آرام سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ کسی کو بلایا تو نقصان کی تم ذمے دار ہو گی۔"

وہ تو اللہ کو پکار رہی تھی۔ زمین پر بسنے والے بندگان خدا تو محض تماشائی تھے۔ لاتعلق' بے نیاز۔ اب وہ اسے گھسیٹ رہا تھا۔ زمین پر۔ سڑک پر' وہ ہاتھ پیر چلا رہی تھی' حلق کو بھی کام میں لا رہی تھی۔ مگر بے سود' اچانک گرفت کمزور ہوئی اور ہاتھ آزاد' وہ بہ آسانی کھڑی ہو گئی۔ چھلے ہوئے گھٹنوں کے باوجود۔

تب اس نے جواد کو دیکھا۔ جو شرجیل کا ہاتھ پکڑ کر نمی کو بچانے کی تگ و دو میں تھا۔ پھر چند راہ گیر بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ شرجیل' جواد کو مار رہا تھا۔ گھونسے لاتیں۔ مگر جواد صرف چیخ رہا تھا۔

"جائیں میڈم! آپ چلی جائیں۔"

وہ کیسے چلی جاتی۔ اس معرکے سے الگ ہونا اس کے بس میں نہ تھا۔ پھر یکایک شرجیل نے جیب سے پستول نکالا۔ نمی کو نشانہ بنایا۔ جواد چیخا اور شرجیل کو دھکا دیا۔

"چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے کہا اور پستول سے گولی نکلی۔ مگر نمی سکتے کی کیفیت میں تھی' ہل نہ سکی۔ نہ جانے کیسے۔ جواد اس کی ڈھال بن گیا۔

گولی جواد کو لگی۔ وہ لڑکھڑایا۔ مڑ کر نمی کو دیکھا۔ پھر گر پڑا۔ لوگوں نے شرجیل کو قابو میں کر لیا تھا۔ پستول چھین لی تھی۔ "پولیس" کوئی چیخا۔ جواد کا خون سڑک پر۔ سڑک لال ہو رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے دیکھا۔

پولیس وین میں وہ کلینک پہنچے' بے ہوش جواد۔ حواس باختہ نمی۔ ڈاکٹر سرفراز تو خود پریشان ہو گئے۔ فوراً" آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ سوالات۔۔۔ کس نے مارا۔ گولی کہاں لگی۔ کیسے ہوا۔ وہ تو ایسا آدمی نہ تھا۔ ہاں وہ تو ایسا نہ تھا۔ مگر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زخمی کرنے والے۔ وہ بنچ پر بیٹھی کانپ رہی تھی۔

"میری وجہ سے۔۔۔ میرے لیے اس اکیلے گھر کے کفیل نے۔"

ڈاکٹر سرفراز پولیس سے بات کر رہے تھے۔ نرسیں اس کو تسلی دینے لگیں۔ "دعا کرو مس دعا کرو۔" سب مل کر دعا کرنے لگیں۔ مارتھا کھڑے ہو کر انجیل سے کچھ سنانے لگی۔ دعائیں۔ میں اس کے ماں باپ کو کیا جواب دوں گی۔ بس یہی سوال بے چین کر رہا تھا۔ دو گھنٹے یوں گزرے جیسے دو صدیاں۔

"گولی نکال دی گئی ہے۔ اڑتالیس گھنٹے اہم ہیں۔ دعا کریں۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے کمزوری بہت ہے۔"

"اڑتالیس گھنٹے۔ اس کی اپنی زندگی میں اتنے اہم ہوں گے۔ سوچا بھی نہ تھا۔ سب اپنے کاموں میں لگ گئے۔ وہ اسی جگہ جمی رہی۔ پھر انکل آ کر زبردستی کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ آنٹی اس کی حالت دیکھ کر گھبرا گئیں۔ وہ جیسے حواسوں میں نہ تھی۔ اڑتالیس گھنٹے۔ یہی الفاظ منہ سے نکل رہے تھے۔ پھر وہ پاگلوں کی طرح' نہ نظر آنے والا نقطہ تلاش کرتی۔ آسمان تکتی کبھی زمین۔ اماں ابا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ کیا کہوں گی ان سے۔ اگر جواد کو کچھ ہو گیا۔ میں۔۔۔ میں ان کی کفیل بن جاؤں گی۔ ہاں لیکن ان کا بیٹا۔ اصلی بیٹا تو بن نہیں سکتی۔ ان کے وہ ارمان تو پورے نہیں کر سکتی۔ بیٹے کا سہرا۔ اس کے بچے۔ ان کی اپنی نسل۔

"پولیس کو میں نے بیان دیا ہے۔ شرجیل نے جنون کے عالم میں گولی چلا دی تھی۔ خدا کرے جواد صحت مند ہو جائے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

بہرحال تمہارا نام اس میں نہیں آئے گا۔" انہوں نے تسلی دی۔ بہت معاملہ فہم تھے ڈاکٹر۔
رات تھی کہ سیاہ رات۔ جاگتے سوتے ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ بھاگنے کے موڈ میں تھی۔ انکل نے روکا۔
"چھوڑ دوں گا تمہیں۔ میری بات ہوئی ہے ڈاکٹر اولیس سے۔ خطرے سے باہر ہے۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ اگر وہاں پولیس ہو۔ تمہیں کوئی بیان نہیں دینا۔ سمجھ لو تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ جرم شرجیل نے کیا ہے اور بس۔ بعد میں دیکھیں گے۔ آرام سے چلیں گے۔"
پتا نہیں اب انکل کیا کریں گے۔ میرا نام آئے بغیر مقدمہ کیا بنے گا۔ اندر جا کر اس نے حلیہ درست کیا۔ ناشتہ سب کے ساتھ کر کے انکل کے ساتھ نکلی۔ کلینک میں جواد کے والد تھے۔ وہ ان کے گلے لگ کر دھواں دھار روئی۔ انہوں نے پیار سے سمجھایا۔
"بیٹا تمہارا قصور نہیں ہے۔ ایک حادثہ تھا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ کبھی بھی کسی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ تم نہ ہوتیں تو کوئی اور سبب بن جاتا۔ یہ جواد کے نصیب میں تھا سو ہوا۔ شکر ہے مولا کا۔ جان بچ گئی۔" بہت ہی صابر تھے۔
"وہ للہ نے ہمیں بہت دعاؤں کے بعد عطا کیا تھا۔ اللہ ہی اس کی حفاظت کرتا ہے۔"
ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔ قانع صابر شاکر۔ آزمائش کو صبر شکر کے ساتھ گزارنے والے۔ وہ ابھی آئی سی یو میں تھا۔ باہر شیشے سے جھانک کر دیکھا۔ اف! رنگ زرد، نقاہت چہرے سے ظاہر تھی۔ دیکھا نہ گیا۔ پٹیوں میں جکڑا ہوا۔ خاموش، بے ہوش۔ وہ جو ہر کام میں پیش پیش رہتا تھا۔ اسے ساکت لیٹے دیکھنا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اسے ہوش آ ہی گیا۔ پھر کئی دن بلکہ کئی ہفتے لگے سنبھلنے میں۔ ڈسچارج ہو کر گھر چلا گیا۔
انکل کی کوشش سے جواد کو بہت اچھی جاب مل گئی۔ اس نے ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ جب عرصے تک جاب نہ ملی تو انکل کی پیش کش قبول کر لی۔ ابا بھی جب تک سروس کر رہے تھے پھر ریٹائر ہو کر بیٹھ گئے۔
خالہ پھر آ گئیں۔ وہی 'اپنا گھر ہوتے ہوئے یہاں کیوں پڑی ہو۔ سہیل نے تمہاری خاطر اتنی محنت اور کوشش سے گھر حاصل کیا ہے۔ اس مقدمے کے لیے رکا ہوا تھا۔ امریکہ سے بلاوے آ رہے ہیں۔' یہی رونا تھا ان کا۔
"خالہ! آپ کا شکریہ۔ اپنے بیٹے تک بھی میرا شکریہ پہنچا دیں۔ لیکن مجھے اب گھر کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تو صبر کر لیا تھا۔ اب اس لیے یہاں ہوں کہ یہاں میری جاب ہے۔ مجھے آسانی ہے۔"
شرجیل جیل میں تھا۔ چچا امریکہ سے آ گئے تھے۔ بیٹے کی رہائی کے لیے اپنی کمائی بے دردی سے لٹا رہے تھے۔ کئی بار ممی سے ملنے کی کوشش کی۔ سرفراز انکل کی تاکید تھی کہ چچا کلینک میں داخل نہ ہوں اور وہ ہر بار مایوس گئے۔
وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اب وہ کسی تبدیلی کی خواہاں نہ تھی۔ قناعت پسند ہو گئی تھی۔ جواد اپنی نئی نوکری پر مطمئن تھا۔ کبھی کبھی اس کی کمی محسوس ہوتی۔ یہاں کا ہر فرد اس کا عادی تھا۔ سب ذکر کرتے۔ آنٹی نے آ کر نئی خبر دی۔ "خالہ اسے بہو بنانا چاہتی ہیں۔" "تمہاری خاطر امریکہ کی جاب چھوڑ کر آیا۔ کامیابی کے بعد اتنا تو ان کا حق ہے۔ سوچ کر جواب دینا۔ مجھے تو کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ اپنے آخر اپنے ہوتے ہیں۔"
اور وہ اس آخری جملے سے متفق نہ تھی۔ صاف انکار کر دیا۔
"ان کی محنت کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ آنٹی! میں ایک بار رد کیے جانے کے بعد مزید ذلت نہیں سہہ سکتی۔ امی کی وہ ذہنی اذیت، ان کا دلی صدمہ۔ یہی صدمہ ان کا دشمن بنا۔ میری شادی نہ ہو سکنے سے زیادہ خالہ کا رازداری سے میری کزن سے رشتہ جوڑنا۔ اپنے کیا اس طرح دغا فریب کرتے ہیں۔ وہ بتا دیتیں۔ امی

برداشت کر لیں۔ لیکن ۔۔۔ امی نے زیادہ چچی کا اعتبار کیا تھا۔ ان کا دل ٹوٹ گیا آنٹی۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" آنٹی ملائم لہجے میں بولیں۔

"میں تمہاری امی کی جذباتی کیفیت سے بھی آگاہ ہوں۔ لیکن ۔۔۔ شاید وہ اس غلطی کا کفارہ دینا چاہتی ہوں۔ تلافی کرنا مقصود ہو۔"

"میں اب کسی کا اعتبار نہیں کر سکتی آنٹی۔ خصوصاً" کسی اپنے کا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ خالہ کے گھر رشتہ نہ ہونا میری بہتری میں ہوا۔ امی نے یہی باور کرایا تھا تاکہ میں اثر نہ لوں۔ مگر خود امی کی ذلت کیسے گوارا کروں۔ میں زندگی بھر امی کی ذلت کے احساس سے اس رشتے سے نباہ کر سکوں گی؟ میں مرنا قبول کروں گی۔ مگر۔۔۔"

"اچھا چلو ۔۔۔ زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں وہ آئی تو تمہیں رشتہ لے کر، ہم نے انکار کر دیا۔ تمہارے انکل نے تمہارا رشتہ طے کر دیا اپنی مرضی سے۔" مسکرا رہی تھیں۔

"اوہو۔ آنٹی ڈرامہ باز۔"

"جواد ایک اعلا شریف گھرانے کا آزمایا ہوا معقول اور نیک لڑکا ہے۔ اس کی عادات اور اطوار سے متاثر ہو کر تمہارے ڈاکٹر انکل نے اسے تمہارے لیے نامزد کر دیا تھا۔ تمہیں یا اسے لاعلم رکھ کر اور اب جبکہ کافی گتھیاں سلجھ گئی ہیں جواد کو اس کے لائق جاب مل گئی ہے۔ ان کے والدین تک اپنی خواہش پہنچا چکے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ آج ہم تاریخ طے کرنے جا رہے ہیں۔"

سب سنا کر اسے ہکا بکا چھوڑ کر آنٹی شاپنگ کے لیے نرس کو لے کر چلی گئیں۔

اس کی شادی کی ذمہ داری۔ اور کلینک میں شور برپا ہو گیا۔ مبارک سلامت۔ کوارٹر میں رات کو کمرہ بند کر کے گانا بجانا بھی روا تھا اف۔ ہنگامہ ہی ہنگامہ۔ مسلسل ہنگامہ، جملے، مذاق اور وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ بارات نکاح رخصتی سب کچھ ڈاکٹر انکل کی مرضی اور ذمہ داری پر لیکن حیرت کا ایک اور جھٹکا۔ ماموں، ماموں آ گئے تھے۔ اس کے سرپرست۔۔۔

اسے خبر نہ ہوئی۔ شادی کے دن دلہن بن کر اسے بہت شرم آ رہی تھی۔ ہائے اللہ، جواد کیا سوچتا ہو گا۔ میں نے کتنا ڈانٹا۔ اب ۔۔۔ کیا ہو گا۔ رخصتی نے بھی ایک سرپرائز دیا۔ جب وہ رخصت ہو کر خود اپنے گھر پہنچائی گئی۔

سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ وہ امی والے کمرے میں لے جائی گئی تھی۔ کمرہ باقاعدہ حجلہ عروسی بنا ہوا تھا اور تب شکو سلام کرتی مسخرے پن سے آ کر لپٹ گئی۔

"نمی بی بی! آپ کو مبارک ہو۔ میں اتنا خوش ہوں اتنا خوش کہ بتا نہیں سکتی۔ آپ اپنے گھر آ گئیں۔ میری بی بی جی بھی بہت خوش ہو رہی ہوں گی اور صاحب جی بھی۔" کمرے میں ابا بھی تھے اور اماں اور جواد بھی۔۔۔ وہ شرما گئی۔

"تم۔ یہاں کب سے، کس نے بلایا تمہیں؟" بوکھلا کر اتنا ہی پوچھ سکی۔

"میں تو اسی دن سے یہاں ہوں۔ جب آپ مل کر گئیں۔ میرا میاں بھی یہیں ہے۔ ہم نے خود سارے گھر کی صفائی کی۔ میرے میاں نے سفیدی کی، دیکھو کیسا لشکارے مار رہا ہے سارا گھر۔ ہم تو اسی دن سے صفائی ستھرائی میں لگ گئے۔ یہیں رہتے۔ یہیں پکاتے آپ کی چچی والا پورشن ہمارے قبضے میں تھا۔"

وہ بول رہی تھی اور اس کی آواز اسے پچھلے دور میں لے گئی۔ جب امی تھیں۔ ابا جان اور وہ شکو سے ناراض۔ مگر آج اس وقت اسے شکو کی موجودگی سے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ کتنا اپنا پن تھا اس کے ۔۔۔ بےساختہ انداز میں۔

"اب تو جی ہم یہیں رہیں گے۔ میرا میاں کھانا پکائے گا۔ میں صفائی کروں گی۔ آپ کے ساس سسر کی خدمت کروں گی۔ میرا میاں مالی کا کام کرے گا۔ میرا بیٹا ۔۔۔ برآمدے میں کھیلتا رہے گا۔ بس جی فیصلہ ہو گیا۔" شکو کے فیصلے۔

اس نے اب دیکھا۔ جواد، اس کی بہنیں، اماں سب ہنس رہے ہیں شکو کی باتوں پر۔

"اور تم رہو گی کہاں؟" وہ گھبرائی۔ ایک نیا قبضہ گروپ۔ چچی والے پورشن پر قبضہ۔

"سرونٹ کوارٹر میں رہے گی۔" ماموں اندر آ گئے تھے۔ "میں نے بنوا دیا ہے ادھر۔"

واہ۔ ایک انکل۔ ایک ماموں اور وہ "اپنوں" کے لیے ترستی رہی۔ جواد نے اپنا خون بہا کر اپنے پن کا ثبوت دے دیا تھا۔ (غیر کے لیے؟) اس کا نذرانہ محبت۔

"جواد بہت نیک اور غیرت مند نوجوان ہے۔" ماموں اس کے پاس آ بیٹھے۔ "مجھے ڈاکٹر کے انتخاب پر بہت خوشی ہوئی۔ اطمینان ہو گیا۔ سب فکریں ختم۔ تم بھی اپنے مہربان انکل کے فیصلے کو سراہنا۔ جواد کے ساتھ ہم آہنگی، محبت اور رفاقت کا بھرپور ثبوت دے کر۔ اس کے والدین کی اطاعت اور خدمت کرنا۔ اپنے ماں باپ سمجھ کر۔ سنا ہے تمہیں بہنوں کی خواہش تھی۔ وہ از خود تمہیں مل گئیں۔ تمہیں اللہ نے پورا خاندان عطا کر دیا۔ دیکھا اللہ کتنا مہربان ہے۔ (بے شک)"

"اور اس گھر میں تمہارے خاندان کو لانے کے لیے میں نے تم سے رازداری رکھی۔ جواد کو اعتراض تھا۔ مجھے امید ہے اس کا جواب تم خود اسے دے سکو گی۔ منا سکو گی۔"

ماموں کی بے پایاں محبت اور رازداری۔ وہ ان کے بازو سے لپٹ گئی۔ جیسے ابا جان سے لپٹتی تھی۔ انہوں نے بھی ابا جان کی طرح اسے پیار کیا۔

"دیکھو بیٹا! زندگی میں کچھ حادثے، کچھ وارداتیں ہوتی ہیں۔ سب کا بہادری سے مقابلہ کرنا ہی زندگی کا اصول ہے۔ صبر برداشت اور دکھ دینے والوں کو معاف کرنا سب سے بڑی دلیری ہے اور خوش باش زندگی کی علامت۔ میں پچھلے دو ہفتے سے آپا کے پاس تھا۔ ڈاکٹر کی اطلاع پر فوراً" آ گیا تھا۔ آپا بہت پچھتاتی ہیں۔ روتی ہیں۔ تم انہیں معاف کر کے اپنا دل صاف کر لو۔ وہ شادی میں نہیں آئیں۔ تمہیں شاید تکلیف ہوتی۔ مگر اب آئیں تو ان سے خوش دلی سے ملنا۔"

نصیحتیں، شفقت اور ہدایت۔

رات بھر جواد کی لن ترانی، شکوے، اعتراض سنتی رہی۔ سسرال کے گھر میں رہنا اس جیسے آدمی کے لیے بے غیرتی کا طعنہ تھا۔ لیکن۔ اس دوران اپنی محبت کا راگ بھی الاپتا رہا۔ اس محبت نے ہی تو۔ اسے بچانے کے لیے گولی کھائی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر جو کہ شکو کی تیز دستی کا ثبوت تھا۔ حلوہ پوری، آلو چھولے کی ترکاری۔ آملیٹ۔ امی کی بات درست تھی۔ وہ واقعی تیز دست تھی۔ سویرے سے اٹھ کر میاں کے ساتھ لگ گئی۔

اس کے لیے ماموں نے سرونٹ کوارٹر بنوا دیا تھا۔ کچن کے ساتھ۔ اف ماموں۔ رازداری۔ ثمی کی زندگی میں رازداری کا بہت دخل تھا۔ (کسی واردات کی طرح۔ بقول ماموں)

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ بیگم کے آنکھ کے اشارے نہ دیکھنے کے لیے۔ جو منع کر رہی تھیں حلوہ کھانے سے۔ نظر جھکائے کھا رہے تھے۔ بے پروا۔ ثمی نے چمچہ، پلیٹ پر مار کر متوجہ کیا۔

"ابا، اماں! سن لیں۔ یہ گھر میں نے آپ کے بیٹے کو کرائے پر دیا ہے۔ کرایہ کچھ زیادہ ہے۔ مگر یہ کل مولوی صاحب کے سامنے اقرار نامے پر دستخط کر چکے ہیں 'قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے' کے الفاظ کے ساتھ۔ اپنے بیٹے سے کہیے۔ یہ مجھے ہر ماہ کرایہ دینے کے پابند ہیں۔ یقین کریں۔ ایسی مالک مکان ثابت ہوں گی۔ کبھی گھر خالی کرنے کا نوٹس نہیں دوں گی۔ کرایہ ملے یا نہ ملے۔"

اماں، ابا تو محض سن کر مسکرا دیے۔ مگر بہنوں کے حلق سے قہقہے پھوٹ پڑے۔ جواد اس چالاکی پر حیران ابا کو دیکھ رہا تھا جو اقرار میں گردن ہلا رہے تھے۔ نظریں مگر اب بھی حلوے پر مرکوز تھیں۔

اس کی زندگی میں تبدیلی آ گئی تھی۔ خوشگوار تبدیلی۔

اسے پورا خاندان مل گیا تھا۔ انکل آنٹی جیسے مہربان بے لوث رشتے دار۔ اپنا گھر۔ شکو جیسی تیز دست خیر خواہ نوکر۔ اس کا شوہر بے مثال باورچی۔ مالی۔ وقت پر بجلی کا فیوز بھی ٹھیک کرتا۔ گیس کے معاملات بھی درست کرتا۔ ابا کے پیروں کی مالش پابندی سے کرتا۔ ان سے پوچھ کر ان کی پسند کے کھانے بناتا۔ اماں کو گو کہ اختلاف ہوتا مگر ابا اور خانساماں کا گٹھ جوڑ کافی

مضبوط تھا۔ بہنوں نے الگ الگ کمرے سجا لیے۔ نہ جانے ماموں نے کتنا وقت گھر کی درستی پر صرف کیا۔ وقت اور پیسہ۔

وہ ماموں کی ممنون تھی۔ ساتھ ہی ابا' اماں کی بے انداز محبت شفقت اسے اپنا اسیر بنا چکی تھی۔ وہ جواد کے ساتھ سیر تفریح کر کے خوش باش واپس آئی۔ جواد کی مزید خوبیاں اجاگر ہوئیں۔ وہ جتنا شکر کرتی کم تھا۔ ہم دم۔ ہم راز۔ دمساز۔ آئیڈیل شریک حیات۔

خالہ آئیں۔ کچھ رکی رکی سی۔ وہ ان سے اسی طرح لپٹ گئی جیسے امی سے۔ بے تکلف ہو کر۔ دل صاف تھا شیشے کی طرح۔ خالہ بے چاری مگر اب بھی متاسف سی تھیں۔ شکو نے گھر کے لان میں لگے آڑو توڑ کر پیش کیے۔ شکو اور اس کے میاں کی بدولت لان پہلے جیسا ہرا بھرا۔ پھلوں کے پیڑ بھی سرسبز ملے۔ ابا کی فرمائش پر لان میں رنگین جھولا لگا دیکھا۔ پتا چلا ابا کی فرمائش تھی۔ وہ جھولا جھولتے تھے۔ اماں بڑبڑاتیں۔

"بڈھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ کچھ نہیں سوچتے تمہارے ابا۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔"

ابا سے زیادہ ان کی بیٹیاں اور اب بہو اور بیٹا بھی دلچسپی لینے لگے۔ باری لگتی تھی جھولنے کی۔ رات کو شکو بیٹے کو گود میں چڑھا کر پینگیں لیتی۔ ثمی تو بہت خوش تھی۔

اماں نے کہا۔ "اے بیٹا! تم اپنے گھر میں یہ سرکس کے تماشے دیکھ کر کچھ کہتی کیوں نہیں۔ تم گئی ہوئی تھیں مری اور تمہارے ابا ایک خرگوش کا جوڑا لے آئے۔ میں نے چپکے سے پھنکوایا۔ سارا لان چر جاتے تو۔"

ثمی چیخ پڑی۔ "خرگوش' ہائے اماں کیوں پھنکوائے۔"

ابا نے کہا۔ "شکو نے اپنے کوارٹر میں چھپائے ہوئے ہیں۔" وہ دوڑی کوارٹر کی طرف۔ اماں تاسف سے بڑبڑائیں۔

"یہ لڑکی بھی دیوانی ہو گئی ان سب کے ساتھ۔" اور اندر چلی گئیں۔ ثمی کو خرگوش پسند تھے۔ جواد نے ان کے لیے بڑا سا پنجرہ بنوا دیا۔ اماں کو یقین ہو گیا۔ بیٹا بھی پگلا گیا اور جب ابا کے ساتھ بہو بیٹا لوڈو کھیلتے۔ انہیں بہت غصہ آتا۔ ابا جھگڑا کرتے۔ ہارنا تو چاہتے نہ تھے۔ بہو ان سے بے محابا مقابلہ کرتی۔ یا اللہ کون کہے گا یہ سسر بہو ہیں۔ ہمجولی لگتے ہیں۔

ثمی نے کئی بار محسوس کیا۔ اماں اس کی اٹھکیلیاں پسند نہیں کرتیں۔ بہت معصوم صورت بنا کر ایک دن کہہ ہی دیا۔

"اماں مجھے اندازہ ہے' آپ مجھے ابا سے لڑتا دیکھ کر پسند نہیں کرتیں مگر ابا کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ ان کی توجہ بٹانا' دل بہلانا' مصروف رکھنا۔ بوڑھوں کو بھی تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے لان میں بیٹھے رہنے اور جھولے کا مزا لینے سے بھی صحت پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ آپ کو پسند نہیں تو میں کل سے۔"

اماں بے قرار ہو گئیں۔ اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں لے کر بولیں۔ "میرے بچے! میرے آنگن کی چاندنی' میں کیوں ناپسند کروں گی۔ تم تو ہمارے گھر کے لیے ایک فرشتہ ہو۔ اب نہیں' شادی سے پہلے سے قائل ہوں تمہاری نیکی اور پاکیزگی اور نرم دلی کی۔ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ کبھی ایسے شاندار گھر میں رہیں گے۔ اتنا عیش کریں گے۔ اتنے خدمت گزار نوکروں کی توقع بھی نہ تھی۔ تم سے بھی رشتہ جوڑ سکیں گے' یہ خواب میں بھی نہ تھا۔ تم نے تو ہماری کایا پلٹ دی۔ ہمارے لیے تم ہیرے کی کان ثابت ہوئی ہو۔ تمہارا ہر فعل سر آنکھوں پر۔ مجھے تو تمہارے بڈھے سسر پر غصہ آتا ہے۔ تم سے برابری کرتے ہیں۔ بھلا بتاؤ۔ یوں لڑتے ہیں جیسے۔۔۔"

"اپنے بیٹے کی بھی خبر لے لیا کریں۔" وہ اماں کی تعریفوں پر شرمندہ ہو کر خجل مٹانے کو بولی۔ "اس مہینے کا کرایہ بھی نہیں دیا۔ اب کس سے کہوں میں۔" موضوع سے ہٹنے کا بہانہ۔

اماں کو ہنسی آ گئی۔ بہنیں بھی قہقہے لگانے لگیں۔ ابا جھومنے لگے۔ جواد دروازے پر کھڑا ٹھینگا دکھا رہا تھا۔

ثمی کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ بھی سب کے ساتھ ہنسنے لگی۔ تبدیلی آ گئی تھی۔

☆

میمونہ صدف

جندر

دریا کے بہاؤ پر لگی یہ جندر نہ جانے کتنے عرصے سے اس دریا پر موجود ہے۔ پانی کا تیز بہاؤ اس کے چکی کے پہیے کو گھمار رہا تھا ہر چکر پورا ہونے پر چکی کے دونوں پاٹ گول گھومتے اور ان کے بیچ موجود مکئی، یا گندم کے دانے پس کر آٹا بن جاتے۔ یہ آٹا ایک بڑے تھال میں گرتا۔ عبدالشکور اس آٹے کو اکٹھا کرتا اور پاس رکھے تھیلوں میں بھرتا جاتا۔ جندر کا چلنا اور دانوں کی پسائی ایک عجیب سی آواز پیدا کرتی۔ گاؤں کے لوگوں کی صبح اس آواز کے ساتھ ہی ہو جایا کرتی۔ اس خاندان کی روٹی روزی کا دارومدار نسل در نسل سے اسی جندر پر تھا۔ نہ جانے یہ جندر اس خاندان کے کس شخص نے یہاں لگائی تھی۔ اس کے باپ دادا اسی جندر سے منسلک رہے تھے۔ انھوں نے بھی اپنی تمام زندگی اسی جندر سے روٹی کماتے گزاری تھی اور آنے والے کل میں عبدالشکور کی نسلوں نے بھی اپنی روٹی اسی جندر سے کمانی تھی۔ اس جندر پر لوگ اپنی گندم پسواتے، بعض اوقات گندم کے بدلے اور کچھ پیسوں کے عوض آٹا لے جاتے۔



اس کا نام بھاگاں والی تھا۔ نہ جانے کیسی بھاگاں والی تھی، پیدا ہوئی تو ماں مرگئی، باپ دوسری عورت کا ہوگیا۔ پالنے والی عورت اس کے خاندان تک کی نہ تھی، بس بے اولاد تھی سو اسے لے آئی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جہاں سے کچھ خریدتی تو اس شخص کا کاروبار چمک اٹھتا تھا۔ وہ بھاگ جگا سکتی تھی لیکن اپنے نہیں۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ بھاگاں والی نہیں۔ اس کا نصیب کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا یا اسے محسوس ہوتا تھا کہ اچھا نہیں۔

''آٹے کا بھاؤ کیوں بڑھاتے ہو؟''
عبدالشکور نے آٹا تھیلی میں ڈال کر اس سے پیسے طلب کیے تو وہ تڑخ کے بولی۔

''بی بی! گندم مہنگی ہو چلی ہے۔ گندم کی قیمت سے آٹے کی قیمت بڑھتی ہے۔'' عبدالشکور نے کہا۔ وہ والدین کی اکلوتی اور قدرے اکڑو اولاد تھا۔ ہر بات پر اکڑنا اس کی ذات کا خاصہ تھا۔

''بی بی نہیں، بھاگاں والی نام ہے میرا۔'' اس نے بھی تند لہجے میں کہا۔ عبدالشکور نے گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ قدرے معصوم سا چہرہ، سانولا رنگ، عام سا لباس، چھوٹا قد اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ لیکن اس کے انداز میں ایک خاص کشش تھی۔ اس نے بھاگاں والی کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

بھاگاں والی کیسا عجیب نام تھا۔

''بھاگاں والی...'' وہ ہنس پڑا۔ ''بھاگاں والی اور اتنی غریب نئے کپڑے بھی نہیں۔''

''ہاں، ہوں بھاگاں والی۔ تمھیں کیا پتا؟'' اس نے لڑنے والے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں اپنی

ذات کے لیے فخر تھا۔

"تو میں نے کب کہا کہ نہیں ہو بھاگاں والی؟" عبدالشکور نے مسکراتے یوں کہا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

بھاگاں والی نے آٹے کی تھیلی پکڑی اور پاؤں پٹختی چل دی۔ عبدالشکور اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس دن اس نے جتنی گندم پیسی وہ تمام بک گئی۔ وہ جب بستر پر لیٹا تو اسے بھاگاں والی اس کے سامنے چھپاک کر کے آ گئی۔ بھاگاں والی کیا سچ میں بھاگاں والی تھی؟ آج اس کی خوب کمائی ہوئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ کمائی کس کو بری لگتی ہے، اس نے بچپن میں سنا تھا کہ کچھ لوگ خوش قدم ہوتے ہیں اور کچھ سبز قدم۔ کیا بھاگاں والی اس کے لیے خوش قدم تھی؟ وہ اس کو سوچے گیا۔ شاید اس کا لہجہ اسے متاثر کر گیا تھا۔

وہ کئی روز تک اس کی جندر پر نہیں آئی تھی۔ وہ بھی بھاگاں والی کو بھول گیا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ قریباً دو ہفتوں کے بعد اس روز وہ پھر سے جندر پر چلی آئی تھی۔ اس نے اسے آتے دیکھا تو پچھلی ملاقات اور اس میں ہونے والی جھڑپ یاد آ گئی۔ وہ پھر سے مسکرانے لگا۔

"عبدالشکور نام ہے میرا۔ سب مجھے شکورا کہتے ہیں۔" عبدالشکور نے اسے دیکھتے ہی دو سیر آٹا پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔

"تیرا نام عبدالشکور ہے تو میں کیا کروں؟ کتنے پیسے ہوئے؟" اپنے ہاتھ میں پکڑے گندم کے ایک سیر دانے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ اپنی عادت کے مطابق تنک کر بولی۔

"ساٹھ روپے۔" عبدالشکور ابھی تک خوش اخلاقی سے کہہ رہا تھا۔

"ساٹھ تو بہت زیادہ ہیں۔ چل کوئی نہیں، بھاگاں والی کا صدقہ۔" اس نے قدرے غرور سے کہا۔

"جا بی بی! بڑی آئی بھاگاں والی۔ صدقہ ودقہ بھی کوئی نہیں۔ گندم بے، پسائی کے پیسے تو لگتے ہیں۔" عبدالشکور کو اس کے الفاظ نے تپا دیا۔

"تو میں کون سا مفت لیے جا رہی ہوں؟ پیسے دیے ہیں۔" بھاگاں والی نے۔ اس سے تڑخ کر کہا۔

"اے بی بی اگر تو اتنی ہی بھاگاں والی ہوتی تو کیا ان پرانے کپڑوں میں اور یوں اکیلی جندر پر آتی؟" عبدالشکور کچھ غصے میں تھا، کچھ اسے بھاگاں والی کی بات نے غصہ دلا دیا تھا۔

"ہوں تو بھاگاں والی تم کیا جانو......" بھاگاں والی نے اکڑ کر کہا اور چل دی۔ وہ جب بھی آتی تھی اس سے لڑ کر جاتی۔

اس دن بھی عبدالشکور کا سارا آٹا، ساری گندم بک گئی۔ وہ خوش تھا آج بھی خوب کمائی ہوئی تھی۔ بھاگاں والی شاید صحیح ہی کہتی ہے، وہ ہے ہی بھاگاں والی۔ چھوٹی سی گڑیا۔ عبدالشکور کا دل بے اختیار اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیسی عجیب سی لڑکی تھی، باقیوں سے کتنی مختلف۔ وہ نہایت عام ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا وہ اس کے پاس، اس کی دسترس میں ہو، وہ اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لے۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ جب بھی بھاگاں والی اس کی جندر پر آتی، وہ آٹے کی قیمت کم کر دیتا کیونکہ اسے علم تھا کہ اس دن اس کی تمام گندم بک جائے گی۔ اب ان کے درمیان ہلکی پھلکی بات بھی ہو جاتی تھی۔ عبدالشکور کو محسوس ہو چلا تھا کہ اب وہ بھاگاں والی کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ جب اس کو جندر پر آئے ہوئے چند دن گزر جاتے تھے، وہ بے چین ہونے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی بات چیت میں اضافہ ہونے لگا۔ بھاگاں والی اس کی جندر پر آتی تو وہ اس کا حال پوچھتا اور بھاگاں والی اس کا۔

عبدالشکور بھاگاں والی کا خیال کرنے لگا تھا اور بھاگاں والی نے اب اس سے لڑنا چھوڑ دیا تھا۔

الفاظ ایک ایسا پل ہیں جو انجان لوگوں کے درمیاں ربط اور تعلق پیدا کرتے ہیں، جب تک یہ ربط قائم رہتا ہے دو انسانوں کے بیچ ایک رشتہ استوار رہتا ہے چاہے اس رشتے کا کوئی نام ہو یا نہ ہو۔ الفاظ کے پل جب ٹوٹتے ہیں تو رشتے کمزور ہو جاتے ہیں۔

الفاظ ان کے درمیان بھی ایک بے نام اور ان دیکھا رشتہ استوار کرتے جا رہے تھے۔

وہ اب اکثر جندر پر آنے لگی تھی۔ عبدالشکور بنا کہے آٹے کے دام کم کرنے لگا تھا۔ اس دن حبس تھا۔ وہ جب جندر پر آئی تو پسینے میں بھیگی ہوئی سانس پھولی ہوئی۔ عبدالشکور نے اسے دور سے آتے دیکھ کر آٹا الگ کر کے رکھ دیا۔ وہ آتے ہی جندر کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گئی۔ عبدالشکور اسے دیکھنے لگا۔

''ایک بات کہوں بھاگی؟'' عبدالشکور نے پیار سے کہا۔

''ہاں کہو......'' بھاگاں والی کی ساری توجہ اس کے پسینے سے بھرے چہرے پر تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بھاگی! کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ میں تجھے تیری خالہ سے چرالوں۔'' عبدالشکور نے کہا۔

''چرالوں......!!'' بھاگاں والی مسکرائی۔

''ہاں تو......اور کبھی واپس نہ دوں۔'' عبدالشکور نے کہا۔

''کسی نے روکا ہے کیا؟'' بھاگاں والی نے شرماتے ہوئے کہا۔

''میں کسی کو روکنے دوں گا بھی نہیں۔ آئی سمجھ۔'' عبدالشکور نے اکڑ کر کہا۔

بھاگاں والی نے دھیرے سے اپنی پلکیں اٹھائیں اور پھر نیچی کرلیں۔ عبدالشکور نے اس کا ایسا روپ پہلی بار دیکھا تھا۔

''کوئی روکے گا بھی نہیں۔'' اس نے کہا اور کھکھلا کر ہنس دی۔ اس کے ساتھ ہی وہ فوراً اٹھی، آٹے کا تھیلا اٹھایا اور تقریباً بھاگنے کے سے انداز میں گھر کی جانب چل دی۔ اس کا انگ انگ خوشی کا پتا دے رہا تھا۔ عبدالشکور کی روح تک سرشار ہوگئی۔ اس دن دونوں کو احساس ہوا کہ شاید ان کے بیچ پنپنے والا رشتہ محبت کا ہے۔

اس کے بعد بھاگاں والی جب بھی جندر پر آتی، اس کی نگاہیں جھکی ہوتیں، الفاظ خود بخود ختم ہو جاتے، وہ یکسر بدلتی جا رہی تھی۔ عبدالشکور اسے دیکھتا رہتا اور دل ہی دل میں اسے اپنی ذات کا حصہ سمجھنے لگا۔

☆☆☆

اس دن سرمئی موسم تھا۔ ٹھنڈی ہوا نے ماحول کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ جب بھاگاں والی اس کی جندر پر آئی تو اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔

''ایک سیر آٹا۔'' اس نے آتے ہی پیسے عبدالشکور کی جانب بڑھائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔

''خیر تو ہے بھاگی......؟ نہ سلام نہ دعا۔'' عبدالشکور نے فکرمندی سے کہا۔ اب وہ اسے بھاگی کہنے لگا تھا۔ خوابوں خیالوں میں بھاگاں والی کو اپنے گھر میں کام کاج کرتے دیکھنے لگا تھا۔

''ہو سکتی ہے خیر؟'' بھاگاں والی نے الٹا سوال داغا۔

عورت کو خدا نے ایک خاص حس سے نوازا ہے۔ وہ مرد کے بات کرنے کے انداز سے اس کے دل کا حال جان لیتی ہے۔ بھاگاں والی کو بھی شکورے کے دل کا حال معلوم ہو چلا تھا۔ وہ بھی خیالوں ہی خیالوں میں عبدالشکور کے گھر کی چار دیواری میں ملکہ بنی گھومتی رہتی تھی عبدالشکور اس کے ہاتھوں کو چوما کرتا تھا۔ لیکن یہ سب خیالوں تک ہی محدود تھا۔ جب بالے کا رشتہ اس کے لیے آیا تو اس کا دل مچل اٹھا۔ بالا کوچوان کا بیٹا تھا، کوچوان ہی تھا۔ اچھی خاصی کمائی کر لیتا تھا۔ لیکن اسے اس کوئی غرض نہ تھی۔

''اگر بھاگی شکورے کو سلام دعا بھی نہ کرے تو خیر نہیں ہو سکتی۔'' عبدالشکور نے مان سے کہا۔

''شکورے، تو یہاں اپنی جندر پر بیٹھا رہ، خالہ میرا رشتہ بالے سے طے کر رہی ہے۔'' وہ باقاعدہ رو پڑی۔

''کیا کہہ رہی ہے تو؟'' عبدالشکور کو ایک دھچکا لگا۔

''میری سگائی ہو جانی ہے۔ تو آرام کر۔'' وہ جلے کٹے لہجے میں بول رہی تھی۔

''بھاگی! کون ہے وہ؟'' عبدالشکور نے پوچھا۔

"وہ کوئی بھی ہو؟ کچھ فرق نہیں پڑتا۔کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے سر جھکا کر کہا۔

"فرق تو پڑتا ہے ناں۔کچھ تو پتا ہو؟" عبدالشکور نے کہا۔

عبدالشکور! تو خالہ کے پاس آجا۔سگائی سے پہلے میں خالہ کو منالوں گی۔" بھاگاں والی نے کہا اُس کی آنکھیں تھیں کہ ساون کی طرح برستی جاتی تھیں۔

"بھاگاں والی میں کیسے آؤں؟ نہ کپڑا نہ لتا۔اور نہ ہی کوئی دوست یار میرے ساتھ چلے گا۔" عبدالشکور نے کہا۔

"آنا ہے تو آجا یوں ہی بنا کسی زیور، کپڑے کے۔" بھاگاں والی نے کہا اور اس کی بات سنے بغیر جندر سے پلٹ گئی۔

"میں آؤں گا۔۔ہاں ضرور آؤں گا۔" عبدالشکور نے کہا۔

جندر کی آواز گونجنے لگی، چکی کے پاٹ گھومنے لگے، گیہوں پسنے لگا۔عبدالشکور اسی سوچ میں گم بیٹھا رہا۔کرے تو کرے کیا؟ اسے انتظام تو کرنا ہی تھا۔ یوں خالی ہاتھ کیسے جاتا؟ لوگ کیا کہتے؟ خالہ کیا سوچتی؟ اور وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

بھاگاں والی انتظار کرتی رہی۔لیکن جس نے آنا تھا وہ نہ آیا۔اس کی آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔دیکھنے والوں کو لگتا تھا جیسے اسے خالہ سے بچھڑنے کا دکھ تھا۔کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ایک مان، ایک یقین تھا کہ عبدالشکور آئے گا۔اس یقین کے خاتمے نے بھاگاں والی کی ذات کے درودیوار ہلا کر رکھ دیے تھے۔وہ بس روئے جاتی تھی روئے جاتی تھی۔دل میں کئی بار اس نے عبدالشکور کو پکارا لیکن اس کی پکار عبدالشکور کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

اس وقت اس کا آنا اہم تھا۔اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔

☆☆☆

بھاگاں والی کی آج سگائی تھی۔اس کی منہ بولی خالہ کا گھر لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔لوگوں کو بٹھانے کے لیے صحن میں سرخ رنگ کی کرسیاں رکھوائی گئی تھیں۔جو کہ سب کی سب بھری پڑی تھیں۔ان پر بیٹھے لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔کچھ خالہ اور بھاگاں والی کی برائیاں کر رہے تھے، کچھ انہیں سراہ رہی تھیں۔گاؤں کی لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے تتلیوں کی طرح اڑتیں، ہنستیں اور کھلکھلاتیں۔ڈھولک کی تھاپ پر گانے گائے جارہے تھے۔گانوں کے ساتھ ساتھ لڑکیاں باری باری لڈی ڈالنے لگیں۔خالہ خوشی سے ہنستی پھر رہی تھیں۔خالہ ہر ایک کے پاس جا جا کر شربت پیش کر رہی تھیں۔کئی کئی بار گاؤں کی عورتوں سے حال چال پوچھ رہی تھیں۔

بھاگاں والی کو سرخ جوڑا پہنایا گیا تھا۔وہ پنڈال میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔اس تمام ہنگامے میں بھاگاں والی کا دل خاموش تھا۔اس کے ارمان مر چکے تھے۔وہ چاہتی تھی کہ خوش ہو سکے لیکن نہیں ہو پا رہی تھی۔اس کی سہیلیاں اسے بار بار چھیڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔کبھی کبھی کی ایک زبردستی کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آجاتی۔دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے ہے۔اس کے برابر میں بالا بیٹھا تھا۔مولوی صاحب کا انتظار تھا۔عبدالشکور بھاگ کر اس کی خالہ کے پاس پہنچا۔

"خالہ!" اس نے پکارا۔

"خالہ بھاگاں والی۔۔۔۔" اس سے الفاظ ادا ہی نہ ہو پا رہے تھے۔مہمانوں کے بیچ خالہ سنتی بھی تو کیا؟

"عبدالشکور۔یہ لے بہن کی سگائی کے لڈو کھا۔اللہ نے بڑا نیک بر دیا ہے۔" خالہ نے عبدالشکور کے ہاتھ میں لڈو تھماتے ہوئے کہا۔

"خالہ اس طرح نہ کرو۔خالہ۔۔۔۔" عبدالشکور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔خالہ سنی ان سنی کر کے چل دی۔

"خالہ میری بات تو سنو۔۔۔۔" عبدالشکور نے کہا۔

"خالہ۔۔۔۔!" وہ خالہ کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا لیکن خالہ تو اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔

☆

سلویٰ سیف اللہ بٹ

سنہری دھوپ

دعا کی والدہ کا اچانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں' ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کہنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک بگڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد ہتھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسیڈنٹ میں معذور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مر جاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول



انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کرواتا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے' احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازیٹو آتی ہیں' وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کمی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بھتیجے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکاتا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بہن بھائی دعا کو اس کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بہن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی' وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔

الیاس احمد' عمر کے کہنے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں' جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمر ان سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر ہمیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بناتا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں' کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہو گئی تو باپ' بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد' عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں' مگر رابعہ' دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتاتی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمر کھٹک جاتا ہے۔

رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آجاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ وہ عمر کو اسلام آباد برانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممانی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے' مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانا نہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا' عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے' وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔ ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں' جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی' اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصوروار نہیں مانتا۔

الیاس احمد' مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور نوال کے کہنے پر عمیر' دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلا بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھر فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کرتوت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصف خود کشی کر لیتا ہے۔

انعم' دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینیڈا سے ملنے آتی ہیں۔ انہیں یہ بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم اور دعا کا موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیر قاتلانہ حملے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمد' عمیر اور نوال کی بے رخی' رابعہ احمد کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عمر نشے کی حالت میں ماں سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور الیاس احمد سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا سچ مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمر' الیاس احمد پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیر' الیاس احمد کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریم' عمیر کو عمر اور الیاس احمد کے گٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمر کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھانے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیر اور ریاض احمد تھانے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمر انہیں سچ سچ بتا دیتا ہے۔

ساتویں قسط

بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد مریم سارا دن اپنے کمرے میں منہ پر تکیہ رکھے پڑی رہی۔ بچے اتنے بے خبر نہیں تھے جتنا وہ انہیں سمجھ رہی تھی۔ آج انہوں نے پولیس کی بات نوٹ کی، شاید وہ اس سے زیادہ بھی کچھ جانتے ہوں۔ آخر انہیں اپنے باپ کے متعلق تجسس تو تھا کہ وہ اچانک غائب کہاں ہو گیا۔ مریم کے پاس ان کے کسی سوال کا مناسب یا تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں بہت اکیلی تھی۔ تبریز ملک نے اسے بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ ان سے کچھ کہہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی سزا وہ بھگت رہی تھی۔ جو ذلت اور رسوائی اس کے حصے میں آ رہی تھی' وہ اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ سب اس سے دور تھے کوئی غمگسار نہیں تھا۔ اس کا ریاض احمد سے کوئی رابطہ نہیں تھا' خود سے حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ انہیں کال کرے۔ اس نے تکیہ منہ سے ہٹا کے، وال کلاک کی طرف دیکھا۔ جو دو بجا رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ بچے ڈیڑھ بجے اسکول سے آ جاتے تھے۔ وہ لاؤنج سے ہی اسے پکارتے، آوازیں لگاتے ہوئے آتے تھے۔ آج وہ اس کے پاس نہیں آئے تھے۔

وہ چپل پیروں میں اڑس کے ان کے بیڈروم کی طرف دوڑی۔ وہ دونوں یونیفارم تبدیل کیے بغیر کھڑکی میں کھڑے لان کا منظر دیکھ رہے تھے۔

مریم بغیر آہٹ پیدا کیے ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ گھنے درخت کے نیچے مالی' اس کی بیوی اور چار سالہ بیٹا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بچے کے منہ میں ایک نوالہ ماں تو دوسرا باپ ڈالتا، وہ آپس میں باتیں کرتے اور ہنستے تھے۔ یہ منظر ان کے لیے اداسی کا سبب تھا۔ مریم کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس نے ان کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ دھرے تو وہ چونک گئے۔

''ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔'' وہ ان کے گرد بازو حمائل کر کے، انہیں بیڈ تک لے آئی۔

''ناراض ہو مجھ سے۔'' اس نے ان کی آنکھوں میں حسرت پڑھی۔ ان کے نرم نرم گال پھولے ہوئے اور آنکھوں میں واضح خفگی تھی۔ جواب خاموشی تھا۔

''آپ تو ماما کی جان ہو، اگر ماما نے پہلی بار تھوڑا سا زیادہ ڈانٹ دیا تو میں سوری کر لیتی ہوں، آئم رئیلی سوری۔'' اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ عروہ نے جھٹ سے ماں کا دایاں اور زین نے بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔

''ماما ہم آپ سے ناراض نہیں ہیں۔'' عروہ نے ماں کا ہاتھ چوما۔

''پلیز ماما جان، ہمیں پاپا جان کے پاس جانا ہے۔ آپ اپنے گھر چلیں۔'' زین روہانسا ہوگیا۔ وہ باپ کا لاڈلا تھا۔ اپنی فرمائشیں اور ضدیں سر چڑھ کے پوری کروالیتا تھا۔

''میری جان، تمہارے ابو علاج کے لیے باہر گئے ہیں، جیسے ہی لوٹیں گے، ہمیں لینے آئیں گے۔ پھر ہم اپنے گھر جائیں گے۔ تم دعا کرو بابا جان جلدی سے ٹھیک ہوجائیں۔'' ''میں دعا کروں گی کہ ہمارے پاپا جان جلدی ٹھیک ہوجائیں۔'' عروہ نے نم لہجے میں آہستگی سے کہا۔

اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے اس نے دونوں بچوں کو خود میں چھپالیا۔

☆☆☆

وہ عشاء کی نماز ادا کرکے، وظیفہ پڑھ کے کمرے میں آئی تھیں۔ ریاض احمد سو رہے تھے۔ زیرو پاور کا بلب، کمرے کا اندھیرا کم کرنے میں کافی مددگار تھا۔ وہ بیڈ کی پائنتی پہ ان کے پیروں میں بیٹھ گئیں۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھ ان کے پاؤں کی طرف بڑھائے۔ مگر پھر پیچھے کھینچ لیے، پھر سے ہمت مجتمع کرکے پیروں پر انگلیاں پھیریں اور غیر محسوس طریقے سے دونوں پیر اٹھا کے گود میں دھر لیے۔ ریاض احمد نے اس لمس کو نیند میں محسوس کرکے ، ئیں، بائیں چہرہ ہلایا، کسی کے قرب کے احساس کو پا کے آنکھیں کھول دیں۔

رابعہ احمد کی توجہ ان کے چہرے پر ہی مرکوز رہی۔ ریاض احمد نے ان کا ارتکاز نہ توڑا۔ چند لمحوں بعد انہیں سسکی سنائی دی۔ انہوں نے تھوڑا سا اوپر کو اٹھ کے بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے لمبا سانس کھینچ کے پھر سے لیٹ گئے۔ ان کے آنسوؤں کے قطرے پیروں پر گرنے لگے۔

ایک، دو، تین، چار...

وہ یک دم اٹھ بیٹھے۔ ٹانگیں کھینچ کے سینے سے لگالیں۔ رابعہ احمد بھی سمٹ گئیں۔

''رابعہ......'' انہوں نے ان کے کندھے پر ہاتھ دھرا۔ رابعہ احمد کو لگا ان کا دل بند ہوجائے گا۔ بہت دنوں بعد ان کی زبان سے اپنے نام کی پکار سنی تھی۔

''ریا...... ریاض صاحب! پلیز مجھے معاف کردیں۔ پلیز معاف کردیں، میرا گناہ بخش دیں ورنہ میں مرجاؤں گی۔ میری سانسیں رک جائیں گی۔ بس کردیں۔ اس خاموشی کو توڑ دیں یا اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دیں۔ لیکن مجھ سے دور مت جائیں ریاض صاحب۔'' وہ ان کے کھڑے گھٹنوں پر سر رکھے روئے جارہی تھیں۔

ان سے مزید برداشت نہیں ہورہا تھا۔ وہ حالات سے لڑتے اور مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ سب سے زیادہ بے سکونی مجازی خدا کی خاموش ناراضی کی تھی۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکرائی پھرتیں۔

وہ آفس سے آکے اسٹڈی روم میں بند ہوجاتے۔ چائے وہیں منگوالی جاتی۔ رات کے کھانے پہ عمیر اور نوال کی خاطر ٹیبل تک آتے، نوالے گن گن کر منہ میں ڈالتے، چند منٹوں میں ٹشو سے انگلیاں صاف کرتے اٹھ جاتے۔ عمیر اور نوال انہیں روکتے رہ جاتے، ان کی ''نو تھینکس، نو تھینکس'' کی تکرار ڈائننگ روم سے باہر نکلنے تک نہ رکتی۔ رابعہ احمد کا بھی وہ آخری نوالہ ہوتا۔ انہوں نے ان کے ہاتھ کا بنا پرہیزی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ عمیر ان کے آگے ڈونگا رکھتا مگر وہ اس سالن کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔

''پلیز رابعہ، ایسا مت کرو۔'' انہوں نے رابعہ بیگم کو سیدھا کیا۔ ''میں تمہارا مجازی خدا ہوں، خدا نہیں، مجھ سے بھی بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں جن کا مجھے احساس ہوچکا ہے لیکن میرا دل، میرا دل جیسے اندر سے ختم ہوگیا ہے۔ مردہ ہوگیا ہے، اس میں خوشی

اور امید کی کوئی رمق نہیں جاگتی۔ میرا دل کسی سے بولنے کو نہیں چاہتا۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ نہ تم سے نہ عمر سے، شاید یہ ذلت میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔"

ریاض احمد کے دل کا غبار بھی نکاسی کا رستہ پاتے ہی نکل پڑا۔

"پلیز ریاض! میں چاہتی ہوں کہ آپ پھر پہلے کی طرح ہو جائیں۔ مجھے معاف کر کے، اپنا دل صاف کر کے مل جل کے رہیں۔ میں اپنی غلطی پر بہت نادم ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میرے لیے نہیں تو نوال اور عمیر کی خاطر...... پلیز ریاض۔"

رابعہ احمد نے ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ریاض احمد نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ان کے چہرے پر بہت سی پرسوچ لکیریں ابھریں۔ رابعہ احمد کے دل میں یک گونہ سکون سرایت کر گیا۔

☆☆☆

دل آرا نے فیملی ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ دعا کی نبض تقریباً نارمل چل رہی تھی لیکن اسے کافی سخت شاک لگا تھا۔ جس سے وہ چکرا کے گر گئی۔ اس کے حواس مختل ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشنز لگائے تھے۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی تصدیق کر دی تھی پر اس کے حواس ابھی بھی مختل تھے۔ انعم کے لب اس پر کچھ نہ کچھ پڑھ کے پھونکے جاتے، اس کا خوف اور پریشانی سے برا حال تھا۔

تین گھنٹے بعد اس کی آنکھوں کے پپوٹے حرکت میں آئے انعم نے اس کا گال تھپکا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"تھینکس گاڈ، تمہیں ہوش تو آیا۔" انعم نے ہاتھ اوپر کر کے خدا کا شکر ادا کیا۔ تو دعا کو بے ہوشی سے قبل کا منظر یاد آ گیا۔

"انعم پلیز، لیو می الون۔" دعا کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

انعم کا کھلتا منہ بند ہو گیا۔ وہ اس کے ذہنی اتار چڑھاؤ سے آگاہ تھی۔ خاموشی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔

دعا نے رخ پھیر کے منہ پر تکیہ رکھ لیا اور زارو زار رونے لگی۔ کمرے سے باہر جاتی انعم اس کے رونے پر پلٹی۔ اسے گہرا دکھ ہوا، لیکن وہ اسے چپ کروانے کے لیے اپنا کاندھا نہیں دے سکتی تھی۔

دل آرا کا حکم تھا کہ اگر وہ برا بھلا کہے تو اسے روکا نہ جائے کہنے دیا جائے، اس کے چیخنے چلّانے کا برا نہ ماننا، اسے شاک لگا ہے۔ وہ برا ماننے کی، غصہ کر کے دل کی بھڑاس نکالے گی، تم خاموش رہنا' وہ آہستہ آہستہ خود ہی مان جائے گی کیونکہ ان کا مقصد تو اس تک پہنچ ہی چکا تھا۔

"پلیز اللہ میاں جی، یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔" وہ اٹھ کے بیٹھ گئی، اس کی حالت قابل دید تھی۔

"میں کہاں جاؤں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں، تیری اتنی بڑی زمین ہے، اتنی مخلوق ہے تیری، لیکن تیری اس بندی کے پاس، ایک بھی مخلص رشتہ نہیں جو بہن یا بیٹی سمجھ کے پناہ دے سکے۔ میں کہاں جاؤں، جہاں یہ خود غرض رشتے نہ ہوں۔ جہاں مطلبی لوگ نہ ہوں، کوئی تو ہوگا، میرا بھی، وہ مجھے کہاں ملے گا؟ تو میری، کب سنے گا، کب سنے گا، پروردگار۔" وہ تڑپ تڑپ کے رو رہی تھی۔ اس کی زبان پہلی بار اپنے رب سے شکوہ کناں تھی۔

* * *

وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا جسم اور چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے بہت برا خواب دیکھا تھا۔

وہ ننگے پیر اٹھا اور ٹیبل پر دھرے جگ سے پانی کا گلاس بھر کے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ گلاس واپس ٹیبل پر پٹخ کے بھی اس کے اندر کی گھٹن ذرا کم نہ ہوئی۔ اسے لگا کہ کمرے میں حبس بڑھ گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ درمیانی دروازہ کھول کے ٹیرس پر آ گیا تاکہ تازہ ہوا اس کے اندر کی کثافتوں کو زائل

کر سکے۔ اس نے خواب میں دعا کو دیکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ کسی ویران سنسان جگہ پر پڑی، بے سائبان، کسی کو مدد کے لیے پکارتی، وہ بہت ڈری سہمی لگ رہی تھی۔ اس کا دل جیسے مٹھی میں جکڑ گیا تھا۔

''دعا...... تم کہاں ہو دعا، میں نہیں جانتا۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے، تم کہاں جا چھپی ہو۔ تم مجھے کال کر سکتی ہو، مجھے بلا سکتی ہو...... یہ کیسی ضد ہے دعا، کیوں تم نے میرے اور اپنے بیچ انا کی دیوار اٹھائی ہے۔ کیوں؟ میں بکھر رہا ہوں، ٹوٹ رہا ہوں دعا، پلیز صرف ایک بار...... ایک بار مجھے پکارو......''

اس کی آنکھوں میں نمی جمع ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کے جذبات پگھل رہے تھے۔

☆☆☆

مریم نے خود کو بچوں کے ساتھ بہت زیادہ مصروف کر لیا تھا۔ وہ ان کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھتی، کچن میں کھڑی ہو کے ان کے لیے فرمائشی کھانا بناتی۔ انہیں خود پڑھانے لگی تھی۔ شام کو لان میں ان کے ساتھ کرکٹ کھیلنا اور رات کو گھنٹہ بھر کارٹون دیکھنا اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ بچے بھی پہلے سے کافی سنبھل گئے تھے۔ وہ ماں کی کمپنی کو انجوائے کرتے۔ اگر وہ باپ کو بھولے نہیں تھے تو ماں کو تنگ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

عروہ سمجھ دار تھی۔ اس کا جب دل اداس ہوتا تو وہ لان میں جا بیٹھتی۔ ابھی بھی گھنٹہ بھر سے گھٹنوں میں سر دیے سوچوں میں غرق تھی۔ تبریز ملک کی مرسڈیز گیٹ سے داخل ہوئی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے تبریز ملک کی نظروں کی زد میں عروہ آ گئی۔ وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے، اس کی طرف بڑھے، جو اپنے اردگرد سے بے گانہ تھی۔

''چندا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ اس کے برابر آ بیٹھے۔ عروہ نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں نم تھیں۔

''عروہ بیٹی! تم رو رہی ہو۔'' انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عروہ کے رونے میں تیزی آ گئی، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بٹ وائے بیٹا جانی! کسی نے مارا ہے یا کچھ چاہیے۔'' انہوں نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے دریافت کیا۔

''کسی نے کچھ نہیں کہا، مجھے پاپا جان یاد آ رہے ہیں اور اپنا گھر بھی۔'' اس نے پھر سے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

''بیٹی! یہ بھی تو آپ کا اپنا گھر ہے، یہاں کوئی آپ کو ڈانٹتا ہے یا کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔'' انہوں نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔

''کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن مجھے بابا جان کی فکر ہے۔ مجھے پتا ہے میرے پاپا جان کدھر ہیں۔ ماما جان ہم سب سے چھپاتی ہیں مگر ہم چھوٹے بچے نہیں ہیں۔''

وہ اپنے دل کی بھڑاس اپنے شفیق سے ماموں جان کے سامنے باہر نکالنے لگی۔ وہ اسے مسیحا لگ رہے تھے۔

''کہاں ہیں تمہارے پاپا جان؟'' تبریز ملک کا دماغ اس جملے میں اٹک گیا تھا۔

''میرے پاپا کو پولیس اریسٹ کر کے جیل لے گئی ہے۔'' عروہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ انہیں اپنے کان اور بچی کے منہ سے نکلے الفاظ جھوٹ لگے۔

''تمہیں یہ کس نے بتایا؟'' ان کا دل نہیں مانتا تھا کہ مریم یہ سب اس کے ذہن میں ڈال سکتی ہے۔

''میں نے اپنے گھر کے سرونٹس کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ماموں جی! کیا پولیس میرے پاپا کو مارتی ہو گی، وہ روتے ہوں گے۔ انہیں تو اپنے بیڈ روم کے علاوہ کہیں اور نیند بھی نہیں آتی۔''

عروہ پھر سے زار و زار رونے لگی۔ تبریز ملک کی نگاہیں اس معصوم چہرے پر گڑ کے رہ گئیں۔ ان کے سامنے لاتعداد سوالیہ نشان کھڑے تھے۔

☆☆☆

نوال صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے' بائیں ہاتھ بالوں میں الجھائے بیٹھی تھی۔ رابعہ احمد اس کے لیے فریش جوس کا گلاس لیے آئیں۔

''نوال! یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' وہ بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہی بھانپ گئیں۔ جوس کا گلاس ٹیبل پر دھر دیا۔

''کیا مطلب، آئی تھنک بیٹھنے کا یہ ہی درست طریقہ ہے۔'' نوال جھنجلائی ہوئی تھی۔

''تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ کوئی ٹینشن ہے کیا؟'' وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ ان سے بیٹی کی اتری صورت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے ماما جان، آپ کو میری ٹینشن کی پروا کیوں ہونے لگی۔'' اس کا موڈ سخت خراب تھا۔

''میں تمہاری ماں ہوں، میں پروا نہیں کروں گی تو کون کرے گا میری گڑیا۔'' ان کا لہجہ محبت سے چُور تھا۔

''صرف مائیں ہی خیال کرتی ہیں' سگی مائیں، منہ بولی مائیں نہیں۔ کیا منہ بولا رشتہ جھوٹ ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے دعا کو دھوکے میں الجھائے رکھا۔''

وہ موضوع کو گھما کے کسی اور طرف لے گئی۔

''مم...... ماں...... تو ماں ہوتی ہے۔ اس کے دل میں اولاد کے لیے صرف شفقت اور ممتا بھری ہوتی ہے۔ سگے اور سوتیلے رشتے تو کم ظرف لوگ بناتے ہیں۔''

وہ اس بار جواب گول نہیں کر سکی تھیں۔ انہیں اب صرف سچ بولنا تھا۔ ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے کی سعی۔

''آپ کم ظرف تو نہ تھیں ماما، جو دعا کے لیے دل بڑا نہ کر سکیں۔ اسے بھی تو بیٹی کہتے آپ کی زبان نہیں سوکھتی تھی۔ اس کے لیے آپ کی ممتا کہاں جا سوئی۔'' نوال روہانسی ہو گئی۔ اس نے اب تک ان کے ساتھ یہ موضوع نہیں چھیڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔

''تم بھی اپنی ماں کو مجرم سمجھتی ہو۔ جو ہوا' اس سب کی میں اکیلی قصوروار ہوں۔'' بیٹی کی تفتیش انہیں تکلیف سے دوچار کر رہی تھی۔ وہ ان سے کس قدر بدگمان تھی۔

''آپ نے اس کا خیال کیوں نہیں رکھا، ماں کہلوانے کے حوالے سے آپ اس کا بہت بڑا آسرا تھیں۔ آپ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتی تھیں۔ بیٹی نہ سہی یتیم و مسکین لڑکی سہی، ثواب حاصل کرنے کے چکر میں ہی آپ سچائی کا ساتھ دے سکتی تھیں۔''

وہ تلخی سے بولتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر بھانبڑ جل رہے تھے۔ باپ کی انتہائی سنجیدہ خاموشی، عمیر کا بجھا بجھا چہرہ، گھر کی ویرانی' سب اسے بہت چبھتا تھا۔ یہ تمام عناصر مل کے اس کی میڈیکل کی مشکل پڑھائی کو متاثر کرتے تھے۔

''سچ بتائیں ماما! کیا آپ نے عمر کو بچانے کے لیے......'' اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا۔

دعا اس کی واحد کزن، سہیلی اور بہن تھی۔ جب کبھی وہ ناراض ہوتی وہ نوال کی غلطی کے باوجود ہمیشہ اسے منا لیتی۔ وہ ہر مسئلے میں اسے مفید مشورہ دیتی۔

''پلیز نوال! میرے لیے اپنے دل میں اتنا کینہ مت پالو۔ میں ماں ہوں، اس گھر کی بڑی ہوں۔ مجھے بہت سے رشتے دیکھنے پڑتے ہیں۔ نباہنے ہوتے ہیں۔ تم سب لوگ مجھے غلط اور قصوروار کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے اسے یہاں پلاننگ کے تحت رکھا تھا؟ میں نے اس پر ظلم ڈھائے؟ عمر کو میں نے فورس کیا؟ میں بری ہوں۔ سب مجھے مجرم ٹھہرا کے میرا سکون برباد کرو۔''

وہ زور، زور سے اونچا بولتی ہوئی اٹھ گئیں۔ نوال ذہنی تکلیف سے دوچار ماں کو جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

دعا لان کے جھولے میں سر ٹیکے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ انعم اور دل آرا پورچ سے لان میں آئیں تو، دور تنہا بیٹھی دعا پر نظر پڑتے ہی رک گئیں۔

''ماما جی! اب پلیز کچھ کریں۔ مجھے سامنے پاتے ہی وہ گم صم ہو جاتی ہے۔ ایسی یاسیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔''

اس کا لٹکا ہوا چہرہ اور روئی صورت انعم دل کو کچوکے لگاتی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس کی مجرم ٹھہراتی۔

''بے وقوف لڑکی! حالات سے لڑنا اور ڈٹ جانا سیکھو۔'' دل آرا نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا۔

دعا ان کی آمد سے بے خبر تھی۔ وہ دونوں سے چھپتی پھرتی، الگ تھلگ گھر کے کسی خالی کونے میں دبکی رہتی۔

''دعا!'' دل آرا اس سے ذرا فاصلے پر جا بیٹھیں۔ انہیں ہی اپنی عقل کا استعمال کرنا تھا۔ انعم ابھی ذہنی طور پر کچی تھی۔ بہت سے مراحل پر ڈگمگا جاتی تھی۔

''جی......'' دعا نے نم آنکھیں کھول کے انہیں دیکھا اور جھکا لیں۔ انعم نے کھڑے رہنے پر اکتفا کیا۔

''تم ہم سے ناراض ہو۔'' انہوں نے بڑے دلار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

دعا کا سر نفی میں ہلا۔ حلق میں پانی کا گولا اٹکا تھا۔

''شاید ہم نے تمہارے ظرف سے بڑھ کر مانگ لیا ہے۔'' انہوں نے دعا کے اندر کا پریشر چیک کیا۔

''آپ نے خود سے، اتنا کچھ میرے بارے میں پلان کر لیا۔'' دعا رو دی۔ الفاظ حلق میں اٹک گئے۔

''تمہارے بارے میں نہیں، شاید اپنے لیے، اسے تم ہماری خود غرضی سمجھ لو، لیکن یہ ہماری خود غرضی نہیں، مجبوری ہے، ہمارے پاس اتنا پیسہ ہے دعا کہ ہم اپنے بیٹے کے لیے سینکڑوں لڑکیاں کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔ جسے تم پلان کہہ رہی ہو نا......''

انہوں نے زور دے کے ''پلان'' کا لفظ ادا کیا۔

''یہ پلان میں نے تب سے سوچ رکھا تھا جب مجھے پتا چلا تھا کہ انعم ماں نہیں بن سکتی۔ لیکن مجھے اپنے خاندانی شان و شوکت، وقار کے مطابق لڑکی کی تلاش تھی۔ جو خاندانی اور نیک ماں، باپ کی اولاد ہو۔ جس کے خاندان کی سات پشتوں کے دامن پر بھی کوئی داغ نہ ہو۔ مجھے ایسا خاندان مل نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر تمہاری صورت میں، میرے پروردگار نے سبب بنا دیا۔

تمہارا یہاں آنا معجزہ ہے دعا، ورنہ تمہارے وہ ماموں جو تم سے اتنی محبت کرتے تھے، جنہیں تم باپ کہتی تھیں، تمہارے کزن جو تمہارے دوست تھے۔ ممانی جان تمہاری ماں کے برابر تھیں، اتنے برسوں سے تمہارا کردار ان کے سامنے بے داغ تھا، پھر یہ سب، یہ کایا پلٹ کیسے گئی، کوئی ایک بھی تمہارے لیے اسٹینڈ کیوں نہ لے سکا۔ ان کے دل میں تمہارے لیے ڈھیروں پیار و شفقت تھا۔ پھر اتنے بڑے وسیع گھر کے کسی کونے کھدرے میں تمہارے لیے جگہ کیوں نہ نکل سکی۔ صرف اس لیے...... اس لیے کہ تمہیں یہاں تک لانا مقصود تھا۔ یہی گھر تمہارا مقدر تھا۔ اسی لیے اتنے گمبھیر مسائل بنتے گئے۔ معاملات اس قدر الجھے، در در کی ٹھوکریں کھاتی تم یہاں تک آ پہنچیں۔ تاکہ اس گھر کی ویرانی کو تمہارا وجود ختم کر سکے۔

ہمارے دل جو اس خوشی کے بنا مرجھا گئے ہیں، مردہ ہو گئے ہیں، انہیں تم اپنے دم سے پھر سے آباد کر دو، یہ سب یوں ہی ہونا اول دن سے طے تھا۔ ہم سب کو یوں ہی انجام تک پہنچنا تھا۔ تم ہماری ساری جائیداد، حتیٰ کہ سانسیں تک گروی رکھ لو مگر پلیز انکار مت کرو، ہم سے ہماری خوشی مت چھینو۔ تمہیں بھی

ٹھوکریں لگی ہیں۔ تم اس تکلیف ۔ سے دوچار ہو تو خدا کے لیے میری بیٹی انعم کو اس تکلیف میں مبتلا ہونے سے بچالو۔ وہ دو برسوں سے اس اذیت کو جھیل رہی ہے۔ گھر کیسے ٹوٹتے ہیں۔ یہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میری بیٹی کا گھر ٹوٹنے سے بچالو۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' دل آرا نے سچ مچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

دعا ہکا بکا رہ گئی۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کے ان پر اپنا ماتھا رکھ دیا۔ اس کے پاس انکار کے لیے ایک لفظ نہیں تھا۔

☆☆☆

جیل میں سب قیدی سو رہے تھے۔ الیاس احمد ایک کونے میں صاف کپڑا بچھائے رات کے آخری پہر نوافل ادا کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

انہیں بیوی، بچے بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔ کل عروہ کی سالگرہ تھی۔ وہ پورے دس برس کی ہو جاتی اور ہر سال الیاس احمد اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔

اس کال کوٹھڑی میں اپنی ان خوشیوں کا یاد کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تو ہچکی بندھ گئی۔ ''اے میرے پروردگار، تو نے مجھے بہت نوازا۔ تو میری ناشکری کے باوجود دیتا ہی گیا۔ میں گناہ گار، تیری اس بڑائی اور رحیمی پر شکر ادا کرنے کے بجائے اسے اپنی عقل مندی گردانے لگا۔ اس دنیا کے مال و اسباب میں اس قدر غرق ہو گیا کہ اچھے اور برے میں فرق ہی نہ کر پایا۔

میں اس مال کے لالچ میں اس قدر اندھا ہو گیا کہ ایک یتیم و بے سہارا لڑکی کی عزت و آبرو کو دنیا کے سامنے تار تار کر دیا۔ اس کو دربدر کیا۔ سب کی نظروں میں گرا دیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری خطائیں بلکہ گناہ ناقابل معافی ہیں۔ تو بہت غفور الرحیم ہے۔ مجھے ایک بار خود کو سدھارنے اور نیک اعمال کرنے کا موقع دے، میں اپنی اصلاح ضرور کروں گا، میں ان سب لوگوں سے معافی مانگ لوں گا، جن کو میں نے نقصان پہنچایا۔

تو میرے جھکے سر کا مان رکھ لے۔ مجھے خالی ہاتھ، خالی دامن نہ لوٹانا، ان میں اپنے رحم کی خیرات ڈال دے، مجھے معاف کر دے، ایک موقع دے دے۔'' وہ چہرہ کھڑے گھٹنوں میں دے کے گڑگڑانے لگے۔

ان سے بظاہر دور بے حس و حرکت لیٹا عمر، جو بظاہر سو رہا تھا۔ اس مجبور باپ کی اپنی اولاد سے ملن کی التجائیں سنتا ہوا دل میں خود بھی رو رہا تھا۔

دعا لان میں رکھی کرسیوں میں، ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ورنہ اس وقت وہ کچن میں شام کی چائے کے ساتھ فرمائشی لوازمات تیار کرنے میں مصروف ہوتی، ساتھ ہی ڈنر کی تیاری بھی کی جاتی، لیکن اس نے کچن میں جانا ترک کر دیا تھا۔ اب بھی وہ دل آرا کے کہنے پر باہر آئی تھی، دل آرا اسکائپ پر جنید آفندی کے ساتھ باتیں کرتیں، اٹھ کے اس سے کافی فاصلے پر بینچ پر جا بیٹھیں۔ انعم کچن میں چکن سینڈوچ کے ساتھ نبرد آزما تھی۔

احسن کی گاڑی روش پر دوڑتی پورچ میں آ رکی۔ گاڑی سے اتر کر وہ کافی دن بعد لان میں بیٹھی گم صم سی دعا کی طرف آ گیا۔ اسے دعا کی غیر حاضری پہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ چونکہ وہ اس کی موجودگی میں کمرے سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی۔ اس لیے اسے دعا کی خیر، خیریت پوچھنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔

''ہیلو اداس لڑکی۔'' اس کے ہونٹوں پر نرم سے مسکراہٹ تھی۔ دعا بری طرح گڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔ اس آواز اور شخص نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

''آ……آپ۔'' اس نے سر سینے تک جھکا لیا۔

''تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ چہرے سے تو تم مجھے بہت کمزور اور مرجھائی ہوئی لگ رہی ہو۔''

اس نے کافی باریک بینی سے اس کا جائزہ لے ڈالا۔
انعم احسن کی گاڑی کا ہارن سن کر حسب معمول دوڑی آئی تھی۔ اسے لان میں دعا کے پاس کھڑا دیکھ کے وہ بھی وہیں چلی آئی۔
''نہیں...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' اس کی موجودگی سے اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ تیزی سے اندر بھاگ جائے۔ اس کے کسی سوال کا جواب نہ دے، لیکن یہ حرکت سراسر بدتمیزی کے زمرے میں آتی کیونکہ احسن اپنی ماں اور بیوی کی منصوبہ بندی سے بے خبر تھا۔
''ٹھیک کہاں ہو؟ نہ تو نیل تک آتی ہو نہ ہی تمہارے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھانے کو ملتا ہے۔''
تب ہی انعم اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ احسن نے جملے کا آخری حصہ بیوی کو دیکھ کے مسکرا کے ادا کیا۔
دعا نے ذرا سا سر اٹھا کے ایک نگاہ دوست پر ڈالی۔ ''وہ بس...... یوں ہی۔'' دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ خاصی الجھی ہوئی تھی۔
''دیکھ لو دعا، احسن بھی تمہارے ہاتھ کے ذائقے کے فین ہیں، انہیں تو شیف تک کا کھانا پسند نہیں آرہا اور تم ہو کہ چھپتی پھر رہی ہو۔'' انعم نے مسکراتے اسے ذومعنی لہجے میں چھیڑا۔
''اچھا یار! میں فریش ہو کے آتا ہوں، تم چائے یہیں لان میں لگاؤ۔ ماما بھی فری ہو جائیں گی اور دعا! تم کہیں مت جانا، ہم سب اکٹھے چائے پئیں گے۔'' اس نے انگلی اٹھا کے روہانسی کھڑی دعا کو تنبیہ کی۔
''خوشیاں خریدی نہیں، تلاش کی جاتی ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسکرانا سیکھ لو، دل اعتدال پر دھڑکنا سیکھ جائے گا۔''
احسن نے اسے مشورہ سے نوازتے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔ اس کے حلق سے سسکی نکلی، جو گلے میں ہی گھٹ گئی۔ یہ چپت سیدھی اس کے دل پر جا لگی تھی۔ کسی کا وجود تصور میں آ ٹھہرا تھا۔

''تم اور احسن ساتھ کھڑے اچھے لگ رہے تھے، بلکہ بہت اچھے۔'' انعم نے جاتے شوہر کی پشت کو تکتے سچائی سے اعتراف کیا۔ وہ ان دونوں کو کسی اور ہی نگاہ سے جانچ رہی تھی۔
''واٹ ربش انو، میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' دعا روہانسی ہو کے چیخ پڑی۔ اتنے روز کی چپ کا روزہ ٹوٹ گیا تھا۔ اتنے برس کی دوستی میں وہ پہلی بار انعم پر چیخی تھی۔
''اوئے، تمہیں تو غصہ بھی آتا ہے۔'' وہ زور سے ہنسی۔ ''ڈرنا پڑے گا بھئی۔'' اب وہ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔
''پلیز ڈونٹ اسمائل انو۔'' وہ روہانسی ہو کے دوبارہ چیخی۔
''مجھے ہنسی تم پر نہیں، اپنی بے بسی پر آرہی ہے۔'' انعم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روکی۔ اندر کی کثافتوں کو باہر نکالنے کا یہ منفرد طریقہ تھا۔
''تم کیوں بے بسی کی حد تک آگئی ہو، کیوں دوسروں کے بہکاوے میں آگئی ہو۔ مجھے بخش دو اور اپنی لائف میں احسن کے ساتھ خوش رہو۔'' دعا نے اسے گلوگیر لہجے میں مشورہ دیا۔
''اگر میں تمہاری پوزیشن میں ہوتی تو شاید، اس طرح کے کئی نادر مشورے میں بھی دیتی، تم لوگوں کو میری تکلیف کا اندازہ جو نہیں، اس لیے سب مزے سے اپنی ہانک دیتے ہو۔ ماما اپنے بیٹے کی دوسری شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں، تم نہ سہی۔ کوئی اور سہی، فرق تو میری ذات اور زندگی کو پڑے گا، آئی سویٹ دعا' مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں تھا، ماما کا دھیان تم پر گیا۔ اسے میری خود غرضی کہہ لو، مجھے لگا کہ واقعی تم بیسٹ چوائس ہو۔ میری دوست، ہم دم، رازدار، غمگسار، ہم ایک دوسرے کے دکھ اور تکلیفوں کو اچھے سے ہینڈل کر سکتی ہیں۔ شاید تم اپنے مابین اس جڑنے والے نئے رشتے کو بہت طریقے سے نبھالیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے جھولی پھیلائی ہے۔ بڑے مان اور آس سے، مجھے

خالی دامن مت لوٹانا، پلیز دعا...... تم میری آخری امید ہو۔"

انعم زندگی میں دوسری بار اس کے سامنے رو رہی تھی۔ جو ہمیشہ اسے کاندھا دیتی آئی تھی، آج اسے دعا کے کمزور کاندھے کی ضرورت تھی۔

"اور میری محبت۔" بے اختیار دعا کی زبان سرگوشی میں پھسل گئی۔

انعم کے آنسو تھم گئے۔ وہ گنگ رہ گئی۔ یہ اس کی ذہنی رو کس طرف بہہ گئی تھی۔

انعم نے مڑ کر دل آرا کو دیکھا۔ جو شوہر کی کسی چھیڑخانی پر قہقہہ لگا رہی تھیں۔ ہر غم و فکر سے بے گانہ روشن چہرہ۔ دعا کی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اس کے دل میں یہ پھانس ابھی بھی اٹکی ہوئی تھی۔

"اگر میں اپنے محبوب شوہر کو سیو کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہوں تو تم بھی ہمت پکڑو، عمیر کو کال کرو، اسے کہو کہ وہ اپنا نام تمہیں دے کے پوری عزت کے ساتھ تمہیں یہاں سے لے جائے، میں اور میری ماں اتنی بھی ظالم نہیں، تم ہماری مہمان، ہماری پناہ گاہ میں، ہم پر اعتماد کر کے ٹھہری ہو۔ ہم اپنی زبان سے پھرنے والے نہیں۔" انعم نے کہہ کر موبائل والا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔

دعا حق دق رہ گئی۔ اس میں اتنا حوصلہ کہاں، وہ بہت ڈرپوک اور بزدل لڑکی تھی۔ وہ کبھی بھی عمیر کو کال کر کے، محبت اور عزت کی بھیک نہیں مانگ سکتی تھی۔ یہ اس کی خودداری تھی جو اس کی ماں نے اسے سکھائی تھی۔

اس گھر سے اس کے حصے میں جتنی ذلت اور نفرت آئی تھی' وہاں خود سے پلٹ کر جانے کا تصور بھی سوہان روح تھا۔

"نن...... نہیں...... میں یہ نہیں کر سکتی۔" اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرلو، عمیر کا خیال دل سے نکال دو۔ اسے اگر واقعی تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہیں کوئی محفوظ پناہ گاہ دیتا۔ یوں بیچ راہ میں بے آسرا چھوڑ کے نہ بھاگتا، اسے تم سے بالکل ویسی ہی محبت تھی، جیسی اس کی ماں کو۔ دکھاوا، ڈھونگ، وہ تمہارے لیے بہ آسانی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن نہیں، وہ تمہیں چھوڑ کے فرار ہو گیا۔" انعم بہت تلخ بول رہی تھی۔ دعا کے چہرے کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

"زندگی رسک کا دوسرا نام ہے، میں اپنے محبوب شوہر کے لیے رسک لے رہی ہوں، تم اپنی محبت کے لیے رسک لو، تاکہ تمہارے دل میں کوئی پھانس نہ رہے۔ اسے کال کرو۔ وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ البتہ اس کی اصلیت ضرور عیاں ہو جائے گی۔ اگر اس نے تمہیں اپنا لیا تو میں تمہیں اس گھر سے، بہن بن کر رخصت کروں گی، اگر نہیں تو پھر تمہیں احسن سے ہی شادی کرنا ہو گی۔"

انعم نے اس کے سامنے کسوٹی رکھ دی تھی۔ دعا نفی میں سر ہلاتی روتی ہوئی' اندر بھاگ گئی۔ اس کی عقل بالکل ماؤف ہو چکی تھی۔

☆☆☆

تبریز ملک شام کو گھر لوٹے تو عروہ اور زین پزل جوڑ رہے تھے۔

"ادھر آؤ عروہ میرے پاس۔" وہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ عروہ سب چھوڑ چھاڑ کے فوراً ماموں کے پاس آئی۔

"آج تمہارا برتھ ڈے ہے۔" انہوں نے اس کی پونی کھینچی۔

"جی ماموں جان، لیکن میں نے ڈیسائڈ کیا ہے کہ جب میرے پاپا جان لوٹیں گے، تب ہم سب مل کے سیلیبریٹ کریں گے۔" اس نے اپنی سوچ سے انہیں بھی آگاہ کیا۔

"اگر ماموں جان کہیں گے، تب بھی کیک نہیں کاٹو گی؟ باقی ساری پارٹیز تو تم لوگوں نے اپنے گھر پر کی تھیں' اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ تم لوگوں کے

آنے سے رونق ہوئی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ آج ہم سب تھوڑی سی مستی کرلیں۔" انہوں نے خاصا معصوم منہ بنا کے اسے ورغلانا چاہا۔

"ٹھیک ہے، آپ کسی کو بلائیے گا مت، میں آپ کے لیے کاٹ لوں گی۔" عروہ ماموں کے احترام میں نیم رضامند ہوگئی۔ زین بھی گیم چھوڑ چھاڑ بغور ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

"مریم...... مریم۔" انہوں نے زور سے آواز دی۔

بچوں کے یونیفارم پریس کرتے اس کے ہاتھ اسی پکار پر رک گئے۔ وہ جلدی سے استری کا پلگ نکالتی باہر کو دوڑی، کتنے روز بعد بھائی صاحب نے اس کا نام پکارا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"جی بھائی صاحب۔" وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

"عروہ کے برتھ ڈے کی تم نے تیاری نہیں کی۔" ان کا موڈ قدرے نارمل تھا۔ اس نے ہونقوں کی طرح نفی میں سر ہلایا۔

"گھر میں بنانے کا اب ٹائم نہیں ہے، تم ان کے فیورٹ ریسٹورنٹ سے سب آرڈر کردو۔" وہ مریم کے ہونق چہرے کا زیادہ نوٹس نہیں لے رہے تھے۔ وہ بھائی صاحب کو انکار نہیں کرسکتی تھی۔

"ماموں جان، پاپا مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں گے نا کہ میں نے ان کے بغیر ہی......" عروہ نے انگلیاں مروڑتے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بالکل نہیں ہوں گے، میں نے آپ کے لیے بہت بڑا گفٹ لیا ہے۔" تبریز ملک نے اس کا ذہن ہلکا پھلکا کیا۔

"سچ میں ماموں جان! بہت بڑا گفٹ۔" زین کا بھی اشتیاق بڑھا، وہ سب چھوڑ چھاڑ کے ان کے نزدیک ہوا۔

"صرف عروہ کے لیے نہیں، تمہارے لیے بھی بہت بڑا سرپرائز ہے، تم دونوں خوش ہو جاؤ گے۔"

زین اچک کے ان کی گود میں چڑھ گیا، اسے اب اگلا ایک گھنٹہ ان کا دماغ چاٹنا تھا، جبکہ عروہ کا ذہن پاپا جان میں اٹک کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

دعا رات کے کھانے پر باہر نہیں آئی تھی۔ انعم کا خیال تھا کہ چند دن اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انعم کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، وہ چاہتی کہ اب دعا شادی کرلے، احسن سے نہیں عمیر سے ہی، تاکہ اس کا مستقل ٹھکانا تو ہو۔ دل آرا بھی دل کی اتنی بری نہیں تھی، دعا کی خوشی کے لیے راضی ہو جاتیں۔ اس کے چار سو اندھیرا تھا۔ وہ کارپٹ پر بیڈ سے کمر ٹیکے بیٹھی تھی۔

"اگر عمیر کو بھی واقعی تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہیں کوئی محفوظ پناہ گاہ دیتا۔ یوں بیچ راہ میں بے آسرا چھوڑ کے نہ بھاگتا۔" اس کے دماغ میں بار بار اسی جملے کی بازگشت ہو رہی تھی۔ انعم کی بات اس کے ذہن میں کھب گئی تھی۔

"شاید وہ سچ کہتی ہے۔ وہ میرے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا۔ لیکن وہ کیوں کرتا، اپنی ماں کا فرماں بردار تھا اور پھر میرے مقابل اس کا بھائی تھا۔ وہ کیونکر میری طرف داری کرتا۔"

وہ خود سے سوال کرتی، الجھتی، بڑبڑا رہی تھی۔

وہ تو عمیر کی احسان مند تھی کہ اس نے اسے الیاس احمد اور عمر کے چنگل سے چھڑانے میں مدد فراہم کی۔ آج یہ تشکر بھی چکنا چور ہوگیا تھا۔ اس نے دوسرے رخ سے سوچنا شروع کردیا تھا۔ وہ واقعی اس کے لیے بہت کچھ کرسکتا تھا۔

"بٹ...... مجھے ایک دفعہ کال کرکے، سب کلیئر کرلینا چاہیے، شاید ابھی بھی کوئی گنجائش نکل آئے۔" اس نے اپنی سوچ کو اس سمت دوڑایا۔

"مگر میں کہوں گی کیا؟" بہت بڑا سوالیہ نشان۔

"تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں یا ڈائریکلی یہ کہ مجھ سے شادی کرلو۔" اس

نے مکالمہ دہرایا۔
''اگر میں خود کال کرکے، اپنی زبان سے یہ سب کہوں گی تو میری عزت نفس بہت ہلکی پڑ جائے گی، شاید وہ یہ سمجھے کہ میں واقعی کردار کی بہت......''
اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔
''رابعہ مامی کی آنکھوں سے چھلکتی نفرت، عمر کے گھٹیا جملے بازی اور ہوس، مریم مامی کی مجھ پر بے اعتباری، کیا عمیر کے ساتھ رشتہ جوڑنے سے، باقی رشتے مخلص ہوجائیں گے؟ میں ان سب کا اعتماد جیت پاؤں گی؟ شاید عمیر کے حوالے سے اس گھر میں میری گنجائش نکل آئے، لیکن دل میں نہیں، میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔'' وہ ہر طرح سے سوچتی اور انکار کے کھاتے میں ڈالتی جارہی تھی۔
''عمیر کو واقعی مجھ سے محبت تھی تو وہ مجھے سہارا دیتا، بیچ سڑک میں اپنی محبت کو چھوڑ کے کون جاتا ہے۔''
وہ سوچتی جاتی، الجھتی جاتی۔ اس کا ذہن کسی ایک سوچ پہ نہیں ٹھہر رہا تھا۔
''میں کس گرداب میں پھنس گئی ہوں، اے اللہ! میری مدد فرما۔''
اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کے اپنے رب کو مدد کے لیے پکار لیا۔

☆☆☆

اس نے گاڑی ویران سڑک کے سائیڈ پر روک دی۔ سر اسٹیئرنگ پہ گرادیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی غنودگی اترنے لگی۔ وہ شاید سو جاتا، لیکن اس کے موبائل کی بپ نے اس کا سارا سکون برباد کردیا۔ اس نے بمشکل بھاری ہوتا سر اوپر اٹھایا۔ ریاض احمد کی کال آرہی تھی۔ اس نے موبائل آف کرکے، ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔ اسے تو خوابوں نے پریشان کررکھا تھا۔ جس میں دعا اسے روتی دھوتی، مدد کے لیے پکارتی ملتی تھی۔
وہ روز نئے سرے سے اس کی تلاش شروع کرتا، سڑکیں ناپتا یا بے سبب کئی کئی میل پیدل چلتا رہتا۔ اس کا ذہن کسی ایک نقطے پر نہ جمتا۔ وہ اچانک سے مڑ کے دیکھنے لگا تھا۔ شاید کسی نے اسے پکارا ہو۔ وہ غیر ارادی کسی مارکیٹ میں جا ٹھہرتا اور عورتوں کے چہروں کو غور غور سے دیکھتا رہتا۔ شاید ان میں سے کوئی ایک چہرہ وہ ہو، اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ ان دنوں اس کی بے اطمینانی بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی چھٹی حس کہتی تھی کہ وہ ضرور کسی مصیبت میں ہے۔ یہ خیال اس کی دیوانگی میں مزید اضافہ کردیتا۔

☆☆☆

مریم نے بڑی خوب صورتی سے میز پر سب سیٹ کردیا تھا۔ زین اور عروہ نئے کپڑے پہنے میز کے گرد کھڑے تھے۔ زین کا جوش قابل دید تھا۔ عروہ بھی ان ساری تیاریوں پر خوش تھی، لیکن اس کے دل میں اٹکی پھانس اسے کھل کے مسکرانے نہیں دے رہی تھی۔
''چلو بھئی! کیک کاٹو، مجھ سے مزید صبر نہیں ہورہا۔'' تبریز ملک ضروری کال اٹینڈ کرکے بڑے بشاش موڈ میں لوٹے تھے۔
''یہ لو عروہ، کیک کاٹو۔'' مریم نے چھری اٹھا کے اسے تھمائی۔ عروہ نے ہچکچاتے ہوئے چھری تھامی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔
''جسٹ آ منٹ، آئی تھنک مجھے پہلے ان دونوں کو سرپرائز گفٹ دینا چاہیے۔ اتنی بری شکل کے ساتھ کیک کھانے کا خاک مزہ آئے گا۔'' انہوں نے عروہ کا کیک کی طرف بڑھتا ہاتھ روک دیا۔
''ماموں جان گفٹ تو کیک کاٹنے کے بعد دیا جاتا ہے۔'' زین نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔
''اپنی عروہ بیٹی کی خوشیاں بھی تو دیکھنی ہیں۔'' انہوں نے آنکھ دبا کے زین کے کندھے پر زور ڈالا۔
''ایک منٹ صبر کرو، میں تمہارا گفٹ لے کر آتا ہوں۔'' وہ ان سب کو منتظر چھوڑ کے باہر چلے گئے۔
ان تینوں کی نظریں دروازے پر ہی جمی تھیں۔
تبریز ملک جس شخصیت کو لیے داخل ہوئے۔ مریم، زین اور عروہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

الیاس احمد بھی اپنی جگہ پر جم گئے۔ ان تینوں کو دیکھنے کے لیے وہ بہت تڑپے تھے، روئے تھے۔

''پاپا جانی......'' سب سے پہلے عروہ باپ کی طرف دوڑی، زین کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے عروہ سے بھی تیز دوڑ لگائی۔ الیاس احمد نے دونوں بازو وا کر کے دونوں کو سینے میں سمو لیا۔ عروہ دائیں اور زین باپ کا بائیں گال چوم رہا تھا۔ الیاس احمد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ مریم کی آنکھیں نم اور دل انجانی خوشی سے بھر گیا۔ وہ بچوں کو باپ سے لاڈ کرتے دیکھتی، تبریز ملک کے سینے سے جا لگی۔ تبریز ملک کی محویت ٹوٹ گئی، انہوں نے خود سے لپٹی سگی بہن کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بازو اس کے گرد لپیٹ دیے۔

''میری بیٹی مریم۔'' انہوں نے زیر لب کہہ کے اپنی ناراضی ختم کردی۔

''تھینک یو بھائی جان۔'' مریم نے ہولے سے سرگوشی کی۔

بہت سے تشکر کے آنسو بھائی کے سینے میں سما گئے۔

☆☆☆

وہ کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ کھڑکی کھلنے سے باہر کی روشنی ہلکی لکیر کی صورت گہرے اندھیرے کو چیرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے اپنے نم گال ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کیے۔

''میں کیوں روؤں' میں کیوں شرمندہ ہوں۔ میرا ضمیر بالکل مطمئن ہے، میں نے کچھ نہیں کیا، مجھ پر ہی ظلم ہوا ہے اگر میں خود اپنے آپ پر اعتبار نہیں کروں گی تو دوسرے کیسے مجھے جینے دیں گے۔ میں زندگی اس پشیمانی کے ساتھ نہیں گزار سکتی کہ میں نے آخری کوشش نہیں کی میں اسے کال کروں گی' ضرور کروں گی محبت یا اعتبار نہ سہی یہ جانچنے کے لیے کہ میں اس کی نظروں میں پاک دامن ہوں یا داغدار۔'' دعا ارادہ کر کے ایک عزم سے اٹھی۔ اس کے انداز میں چستی تھی۔

☆☆☆

تبریز ملک نے بہن کی ننھیں بچوں کی خاطر الیاس احمد کو بخش دیا تھا۔ کیونکہ وہ خود کو خدا نہیں سمجھتے تھے۔ سزا و جزا دینے پر وہی قادر ہے۔

''جاؤ بچو! گاڑی میں جا کے اپنے گفٹس اور ٹوائز رکھو ماما، پاپا بھی آ رہے ہیں۔'' تبریز ملک نے بچوں کو وہاں سے ہٹایا۔ وہ دونوں گھر واپسی کا سن کر خوشی سے باہر کو دوڑے۔

''تم لوگوں نے جو کچھ کیا' وہ بالکل قابل معافی نہیں تھا' میں نے عروہ اور زین کی خاطر معاف کر دیا ہے۔ میرا ارادہ ابھی تمہیں بہت لمبی سزا دینے کا تھا۔ مریم سے بھی میرا دل بہت بدظن ہے کہ اس نے میری تربیت کو یکسر بھلا دیا۔ وہ شوہر کو راہ راست پر لانے کے بجائے خود اس کی راہ پر چل نکلی۔ ایسی راہ جس کا اختتام ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم نے اپنی بھانجی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے' میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر واپس لوٹ جاؤ' اپنے بڑے بھائی اور بھابھی سے بھی معافی مانگو دعا کے سامنے بھی اپنے گناہ کا اعتراف کر لینا' اس بچی کا کردار دھل جائے گا۔

اپنی اولاد کے مستقبل کا بھی سوچا کرو۔ اگر یہی سب کچھ تمہاری بیٹی کے ساتھ۔۔۔''

''پلیز بھائی صاحب' مجھے اس سے زیادہ شرمندہ مت کریں' مجھے پوری طرح اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ شاید میں زندگی بھر اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر سکوں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کے اعتبار کو، مان کو بھی ٹھیس پہنچائی ہے۔''

الیاس احمد نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کا سر ندامت سے جھکا تھا۔

''معافی مانگنی ہے تو اپنے بھابھی' بھائی اور مریم سے مانگو' جن کے ساتھ تم نے جھوٹ بولا' ورغلایا اور دھوکے میں رکھا۔''

الیاس احمد کے چہرے پر چھائی خفت انہیں

بہت کچھ باور کروا گئی تھی۔

☆☆☆

ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دل آرا کا دھیان اسکرین کی طرف تھا۔ درمیانی صوفے پر انعم اور احسن دونوں بیٹھے تھے۔

"میں نے نوٹ کیا ہے انو' دعا کافی خاموش اور ڈپریس سی ہے۔ کیا سیریسلی کوئی پرابلم ہے' جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔" اسے ڈنر پر نہ پا کے اس کا ذہن کھٹکا تھا۔

انعم اس اچانک اور صحیح اندازے پر گڑبڑا گئی۔

"نن۔۔ نہیں تو۔۔ آپ اتنے غور سے دعا کو کب سے نوٹ کرنے لگے۔" سوال سے زیادہ اس کا لہجہ چبھتا ہوا تھا۔ دل آرا انعم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"وہ جب ہمارے گھر آئی تھی تب بھی ایسا ہی فیس بنا کے' کسی نہ کسی کونے میں پڑی رہتی تھی۔ اب پھر اسکی وہی روٹین ہے۔" احسن نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

"کیسا فیس بنا کے؟" اس کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔

وہ واقعی ٹھیک سوچتی تھی۔ وہ اور لڑکیوں کے چہرے بہت غور سے دیکھتا' نوٹ کرتا تھا۔ پہلے تو اسے بیوی کے علاوہ بھی کچھ نظر ہی نہیں آیا تھا۔

"وہ آج لان میں' میں نے دیکھا' وہ بہت اداس تھی۔" احسن انعم کی تفتیش سے الجھ رہا تھا۔

انعم کے دل پر زور کا تھپڑ لگا یعنی وہ اس کے چہرے کی کیفیت اور اس پر ٹھہرے موسم اور آتے جاتے رنگوں کو بھی شناخت کر لیتا تھا۔

انعم کی برداشت یہیں تک تھی۔

"مجھ سے انکوائری کرنے کے بجائے' خود اس سے جا کے پوچھ لو۔" اس کی گود میں قریب رکھا کشن پھینکا' کپ زور سے میز پر پٹخا اور اٹھ گئی۔

"اسے کیا ہوا؟" اس نے حیرانی اور تاسف سے اس کی یہ حرکت دیکھی۔

"آئی ڈونٹ نو۔" دل آرا نے کندھے اچکائے۔

انہیں بھی انعم کی یہ بے بنیاد جھنجلاہٹ بہت بری لگی تھی۔

"آپ لوگوں کی حرکتیں' مجھے بہت مشکوک لگ رہی ہیں۔" احسن جھنجلاتا ہوا کپ رکھ کے اٹھ گیا۔

دل آرا پھر سے اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆☆☆

آج بہت عرصہ بعد ریاض احمد کا دل ڈنر کے بعد کافی پینے کو چاہا تھا۔ انہوں نے رابعہ احمد سے کریم کافی کی فرمائش کی۔ عمیر نے احتیاطاً پہلے انہیں میڈیسن کھلائی۔

رابعہ اور ریاض احمد کافی' عمیر اور نوال دودھ پی رہے تھے۔

نوال اور رابعہ احمد ان کی گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھیں تب ہی مریم اور الیاس احمد نے لاؤنج میں قدم دھرے۔ ان پر سب سے پہلی نظر نوال کی پڑی۔

"ماما جان۔"

اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔

رابعہ احمد نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور ساکت رہ گئیں۔ وہ جھکے سر لیے' ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ریاض احمد اور عمیر بھی کھڑے ہو گئے' ریاض احمد کے اعصاب تن گئے۔ جبڑے بھینچ گئے۔

"تم۔۔" برداشت کرتے ہوئے بھی چیخ نکل گئی۔

"بدبخت' گناہگار انسان' اپنے منحوس قدم یہیں سے موڑ لو۔ اس گھر کو اجاڑ دیا' ہمارا سکون برباد کر دیا' اب یہ کالا منہ لے کر کیوں آئے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آئی اس طرف کا رخ کرتے۔" غصے سے بولتے ہوئے ان کا سانس پھول گیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔

"پاپا جان پلیز' کنٹرول یور سیلف۔" عمیر نے باپ کو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ نوال پانی لینے بھاگی۔

''تم کتنی دیدہ دلیری سے ہمارے سامنے آگئے ہو' آخر تم چاہتے کیا ہو' ریاض احمد کی جان لے کر ٹلو گے۔''

رابعہ احمد نے نوال سے پانی لے کر ان کے منہ سے لگایا۔

انہیں الیاس احمد اور مریم سخت برے لگ رہے تھے۔ وہ ان کی پڑھائی گئی پٹیوں پر عمل کرنے کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں غیر بن کے رہ گئی تھیں۔

''بھائی جان۔۔'' الیاس احمد نے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو کے' ہاتھ ان کے آگے باندھ دیے۔

''بھائی جان مجھے معاف کردیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا گناہ معافی کے قابل نہیں ہے' میں نے اپنے گھر کی عزت کو ذلیل و رسوا کیا۔ میں نے اللہ سے بھی معافی مانگی ہے جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے' اللہ بھی نہیں کرے گا' میں دعا کے قدموں میں بھی گر کے معافی مانگ لوں گا۔''

وہ بھائی کے گھٹنوں پر سر رکھے زار و زار رو رہے تھے۔ رابعہ احمد کا دل پسیجنے لگا۔ ریاض احمد کے آنسو آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔

''صرف ایک بار' صرف ایک بار اور آخری بار بھائی جان!'' وہ منت وسماجت کرتے روتے جا رہے تھے۔

تب ہی عمیر کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ باپ کو دیکھا جو کشمکش و پیچ میں گھرے تھے اور یس کا بٹن دبا دیا۔

''ہیلو۔۔ ہیلو کون۔۔ کون۔۔ کون۔۔؟''

دوسری طرف سکوت تھا۔

''پلیز پاپا جان! چاچو کو معاف کر دیں۔ ہم سب پھر سے ایک ہو جائیں گے۔'' نوال نے آگے بڑھ کر سفارش کی۔ عمیر نے موبائل کان سے ہٹا کے دیکھا۔ مریم اور رابعہ احمد بھی ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ عمیر نے ماں کو دیکھا' ان کی آنکھوں میں خاموش التجا تھی۔

ماں کے بندھے ہاتھ اور آنکھیں اس کے کلیجے میں انی کی صورت گڑ گئے۔ وہ موبائل آف کیے بغیر میکانکی انداز میں چلتا باپ کے پاس آیا۔ اس سب میں اسے بھی اپنا حصہ ڈالنا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر۔

''پاپا جان! ہمارا گھر اور رشتے ٹوٹ چکے ہیں' آپ کی ایک معافی' سب کچھ پہلے کی طرح جوڑ دے گی دعا کی قسمت میں شاید یہی سب ہونا لکھا گیا تھا۔ جو رشتے موجود ہیں' آپ انہیں خود سے دور مت کریں' بڑے گھر اور رشتوں کو جوڑتے ہیں۔ سب ایک ہو جائیں شاید اسی سے ہمارے دلوں کو سکون نصیب ہو۔'' اس کا لہجہ مصلحت آمیز تھا۔

وہ اس سب کے بیچ ایک پل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ فون پر دوسری طرف کوئی سانس روکے اسے سن رہا ہے۔ اس کے ہمدردی میں ڈوبے الفاظ اس کے دل کو کسی تیز دھار سے چیر رہے ہیں۔

☆☆☆

اس کے رونے میں اس قدر شدت تھی کہ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کے منہ سے ابلنے والی چیخوں کو روک رہی تھی۔ وہ اس زندگی کی کشمکش سے آزادی چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر پٹخ پٹخ کے لہولہان کرے۔

اس نے انعم کی باتوں میں آکے عمیر سے بات کرنے کا ارادہ باندھا۔

وہ کوریڈور میں نکلی وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے یہاں کے لینڈ لائن نمبر سے عمیر کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کال ملائی' اس بار تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

''ہیلو۔۔ ہیلو کون۔۔ کون؟''

اسے لگا کہ وہ صدیوں بعد اس آواز کا رس اپنے کانوں میں اتار رہی ہے۔ زندگی نے اسے جس دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہاں سے عمیر ہی اسے بچانے کی آخری امید تھا۔ اسے اور کوئی یاد نہیں آرہا تھا

سوائے عمیر کے' وہ اس سے ہر بات بلا جھجک شیئر کرلیا کرتی تھی۔ آج اس کی زبان جھجک گئی' اٹک گئی تھی۔ اس کی زبان بولنے سے قاصر تھی۔ وہ پھر سے کئی لمحے اس سوچ میں غرق ہوگئی کہ وہ کس طرح سے ری ایکٹ کرے گا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی جب عمیر کے الفاظ اسے بے یقینی کی موت مار گئے۔

اس کا ذہن تو بس ان ہی الفاظ میں اٹک گیا تھا۔

''دعا کی قسمت میں شاید یہی سب ہونا لکھا گیا تھا۔ جو رشتے موجود ہیں' انہیں خود سے دور مت کریں۔ سب کو معاف کردیں۔'' یہ الفاظ تھے یا نشتر۔

اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کے گرا۔ پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

''سب کو معاف کردیں۔۔'' یہ الفاظ اس کے دماغ میں کسی ہتھوڑے کی مانند لگ رہے تھے۔

نفی میں سر ہلاتی ——— ریزہ ریزہ وجود میں ہمت مجتمع کرکے وہ وہاں سے بھاگ لی۔

کوریڈور کے آخری سرے پر سینے پر بازو لپیٹے انعم کھڑی تھی۔ دعا اس کے قریب سے روتی ہوئی نکل گئی۔

''عمیر نے میرے مجرموں کو معافی دلوادی' سفارش بن گیا اور قسمت میں یہی ہونا لکھا تھا۔ میری ہی قسمت خراب تھی۔ میں نے ایسا کون سا گناہ کردیا ہے جس کی سزا ختم نہیں ہورہی۔ وہ سب لوگ اتنا سب کچھ کر کے آزاد' پرسکون اور خوش و خرم زندگی گزاریں' میں ان کے لیے قصہ پارینہ' ماضی کی ایک تلخ جھلک' وہ تو ان سب رشتوں کے ساتھ مل جل کے رہنے کی اسکیم بتا رہا ہے۔ میں تو شاید کہیں بھی نہیں ہوں۔ میری محبت۔۔ جو مجھے لگتا ہے کہ وہ مجھ سے کرتا تھا' وہ کہاں گئی؟ کیا وہ سب میری نظر اور کم عقلی کا دھوکا تھا' وہ اب بھی میری تکلیف اور دربدری کے بجائے مل جل کے رہنے کو فوقیت دے رہا ہے۔'' وہ رو رو کے تھک چکی تھی۔

☆☆☆

بہت عرصے بعد ریاض احمد صبح کی سیر کے لیے عمیر کے ساتھ نزدیکی پارک تک آئے تھے ورنہ وہ گھر کے ہی لان میں نماز فجر ادا کر کے چہل قدمی کر لیتے۔

عمیر نے ان کا ہاتھ تھام کے انہیں فٹ پاتھ سے نیچے گھاس پر اتارا۔ وہ دونوں بینچ کی طرف بڑھ گئے۔

''عمیر! میرا دل رات سے بہت عجیب ہو رہا ہے۔ کیا میں نے دعا کے مجرموں کو معاف کر کے ٹھیک کیا۔''

وہ دونوں بینچ پر بیٹھ چکے تھے۔ عمیر کا اپنا دل بھی ڈانواڈول تھا۔

''میرا رب سب دیکھ رہا ہے۔ وہ ضرور انصاف کرے گا۔ ظالموں کو ان کے ظلم کا بدلہ دے گا۔ میری بچی کے زخموں کو بھی ٹھنڈ پڑے گی' جب ان سب کو ان کے کیے کی سزا ملے گی۔''

ان کا دل بالکل صاف نہیں ہوا تھا۔

''اللہ تعالیٰ کو وہی لوگ پسند ہیں جو صلہ رحمی سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے نہ چاہنے کے باوجود بھی سب کو معاف کیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ ہم کون ہوتے ہیں سزا و جزا مقرر کرنے والے۔''

عمیر نے بہت نرمی سے انہیں دینی حوالہ دے کے مطمئن کیا اور واقعی ان کے دل میں یک گونہ سکون سرایت کر گیا۔

''میرا دل دعا کے لیے بہت دکھتا ہے عمیر' پتا نہیں وہ وہاں خوش ہوگی یا نہیں۔''

وہ بہت معصوم سے تھے۔ وہ صرف عمیر سے اس کی باتیں کر کے دل بہلا لیتے۔

''آپ اس کے لیے دعا مانگا کریں کہ اللہ اسے جہاں بھی رکھے' اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

عمیر نے نرم مسکراہٹ سے ان کے بوڑھے دل کو حوصلہ دیا۔

''میں اسی لیے تم سے دل کی بات کہہ' سن لیتا ہوں کیونکہ تم بہت خوب ڈھارس دیتے ہو۔''

ان کا دل کافی ہلکا ہوچکا تھا۔ انہوں نے عمیر کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

اس لاڈ پر ان کا دل قربان ہوگیا' وہ ان کے گرد

بازو لپیٹے تھا۔

☆☆☆

''عمر یاد آرہا ہے۔'' آملیٹ والا پراٹھا اسکا فیورٹ تھا۔ بچھڑے بیٹے کی یاد آنا فطری تھا۔

''نن۔۔نہیں وہ بھلا مجھے کیوں یاد آئے گا۔''

آنکھوں میں تیرتی نمی چھپانے کو وہ نظریں چرا رہی تھیں۔

''ادھر میری طرف دیکھیں۔'' اس نے ان کا رخ موڑا۔ وہ نظریں نہ اٹھا پائیں۔

''اسے یاد کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، وہ آپ کا بیٹا آپ کا لخت جگر ہے' مجھے یا پاپا جان کو کوئی حق نہیں کہ آپ پر روک ٹوک لگائیں۔''

اسے ماں کی حالت پر ترس آیا۔

''میں اپنے اور ریاض صاحب کے مابین پھر سے کوئی بدمزگی نہیں چاہتی۔'' انہیں یہی خدشہ تھا۔

''تھوڑا وقت لگے گا' سب کچھ اعتدال پر آنے میں' آپ اپنی ہر ٹینشن فری کر کے' اچھے موڈ کے ساتھ ناشتہ بنائیں' حاجی صاحب نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی ہے۔''

☆☆☆

دعا ایک عزم کے ساتھ' بہت مضبوط قدموں سے انعم کے بیڈروم میں آئی تھی' الماری کھلی تھی۔ انعم ریڈ کلر کا سوٹ اپنے ساتھ لگائے تھی۔

''ماما جی یہ ڈریس' احسن میرے لیے حیدرآباد سے لائے تھے' انہیں ہمیشہ سے لگتا ہے کہ سرخ رنگ مجھ پر جچتا ہے۔ نائس ہے ناں۔'' وہ ڈریس خود سے لگائے گھوم گئی۔

تب ہی اس کی نگاہ دہلیز پر کھڑی دعا پر پڑی۔

''تم پر ہر رنگ جچتا ہے۔'' دل آرا نے تعریف کرتے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

''آؤ نا دعا' ایسے کیوں کھڑی ہو' ادھر میرے پاس آکے بیٹھو۔'' انہوں نے کپڑے اٹھا کے انعم کو تھمائے اور دعا کے بیٹھنے کی جگہ اپنے قریب ہی بنالی۔

انعم ٹھٹکی۔ اتنے روز بعد وہ یوں ہی منہ اٹھائے نہیں چلی آئی تھی۔

''ہم نے اپنی خواہش کیا ظاہر کی' تم تو بالکل ہی ہم سے دور ہوگئی ہو۔ گپ چپ سی' اپنے کمرے تک محدود۔'' دل آرا نے شکوہ کر ہی دیا۔

''مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' اس نے تمہید نہیں باندھی تھی۔

''ہاں ہاں کہو۔'' دل آرا اور انعم نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا، انعم کی سانس سینے میں اٹک گئی۔

''میں۔۔۔احسن سے شادی کے لیے راضی ہوں۔''

اس پتھر کی مورت میں کوئی جذبہ' کوئی احساس باقی نہیں تھا۔ انعم کی ذات کے پرخچے اس ''ہاں'' سے اڑ گئے۔ اس کے چہرے پر کرب کے واضح نشان ابھرے تھے۔

''تم سن رہی ہو انعم' دعا بیٹی شادی کیلئے راضی ہے۔'' دل آرا خوشی جھوم اٹھیں۔ اور اپنی جگہ سے اٹھیں' دعا کو کھڑا کیا اور زبردستی خود سے لگالیا۔

''تھینک یو۔۔ تھینک یو میری بچی' تم جیسی ہوتی ہیں، جو دوستی کا بھرم رکھتی ہیں۔ میں نہ کہتی تھی انو کہ دعا جیسی معصوم اور فرشتہ صفت لڑکی ہمیں انکار کر ہی نہیں سکتی۔'' وہ خود ہی بولے جا رہی تھیں۔ ان کی خوشی قابل دید تھی۔

انعم اپنے چہرے کی ٹوٹ پھوٹ چھپانے کو الماری بند کرنے کو مڑ گئی۔ دعا کی آنکھیں' چہرہ اور دل ساکت تھا۔ سب آنسوؤں کے سمندر میں کب کا بہہ چکا تھا۔

☆☆☆

دل آرا اور انعم' احسن کے بیڈروم کے باہر کھڑی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔

''احسن کو منانا' آپ کی رسپانسبلیٹی ہے۔ میں اس پھڈے میں نہیں پڑنے والی۔'' انعم نے آہستگی سے انہیں یاد دلایا۔

''میں ہی ٹاپک چھیڑوں گی، تم میرے ساتھ کھڑی رہنا' اس طرح مجھے سپورٹ ملے گی' ہم

دونوں نے مل کر اسے راضی کرنا ہے بے وقوف۔'' دل آرا نے اسے بازو سے پکڑ کر اندر دھکیلا۔

''ناشتہ لگا دیا ہے انو۔'' احسن گھڑی باندھ رہا تھا۔

''تھوڑی دیر رک جاؤ احسن! مجھے تم سے کچھ ڈسکس کرنا ہے۔'' دل آرا بھی انعم کے پیچھے داخل ہوئیں۔

''ابھی کرنا ضروری ہے' آئی مین آفس سے لوٹ کے کرلیں گے۔'' اس نے پرفیوم اٹھا کے خود پر اسپرے کیا اور وال کلاک دیکھا۔

''میں تمہارا زیادہ ٹائم نہیں لوں گی۔ مختصر سی بات ہے۔'' ان کا لہجہ سرسری سا ہو گیا۔

''جی کہیے۔'' اس نے موبائل اور چابی اٹھالی۔

''تم جانتے ہو نا کہ تمہارے بابا جان کا اتنا وسیع بزنس، فارن کنٹریز تک پھیلا ہوا۔ گاؤں میں بھی زمین ہے، بنگلوز، شوروم، پیٹرول......''

''پلیز ماما جان' یہ سب میں بچپن سے جانتا ہوں۔ کچھ نیا بتائیں۔'' احسن نے بے چارگی سے ماں کو ٹوکا۔

دل آرا نے گلا صاف کیا۔ ''تم میرے اکلوتے وارث ہو۔ تمہارا کوئی وارث نہیں' ہمیں اپنی نسل کو آگے بڑھانا ہے' ہم اپنی نسل کو ختم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔'' ان کا انداز اطمینان بھرا تھا۔

اس نے ناسمجھی سے سر ہلاتے انعم کو دیکھا۔ جو ماں کے برابر کھڑی' سب چپ چاپ سن رہی تھی۔

''یو نو ویل ماما جان' انعم ماں نہیں بن سکتی' پھر آپ کیوں اس خواہش کو دہرا رہی ہیں۔'' اسے حیرت ہوئی۔

''انعم ماں نہیں بن سکتی' لیکن تم تو باپ بن سکتے ہو ناں۔'' انہوں نے بیٹے کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کک... کیا مطلب...'' اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

''میں تمہاری دوسری شادی کروا رہی ہوں۔'' دل آرا نے بغور جوان خوبرو بیٹے کو دیکھا۔

''واٹ' آپ کتنا کومپلی کیٹڈ سین کری ایٹ کر رہی ہیں، میری عقل سے آپ لوگ بالاتر ہیں۔'' اس کے منہ سے الفاظ بمشکل نکل پا رہے تھے۔

''بہت آسان الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ تمہاری دوسری شادی کے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں' جو ہمیں وارث دے سکتی ہو' تم اپنا مائنڈ میک اپ کرلو۔''

دل آرا بھی اکھڑ سی گئیں۔ احسن اتنا سیدھی کھیر نہیں تھا۔

''اگر آپ لوگ میری آزمائش کر رہی ہیں تو بہت ہی چیپ حرکت ہے۔ فضول میں میرا ٹائم ویسٹ مت کریں۔'' وہ انعم کے جھکے سر پر غصیلی نگاہ ڈالتا باہر بڑھا۔

''میں تمہیں کوئی جوک نہیں سنا رہی۔ تم اچھی طرح غور وفکر کرلو' شام کو ڈیٹیل میں ڈسکس کریں گے۔'' دل آرا کی آواز نے اس کے جاتے قدم جکڑ لیے۔

وہ دونوں اس کے پاس سے گزر کے باہر نکل گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے انہیں جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

دل آرا اپنے موبائل پر مصروف تھیں۔ انعم نوڈلز کا بڑا پیالہ چمچ بھر بھر کے منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ دل آرا نے موبائل سے نظر اٹھائی تو دعا پر جا پڑی۔ دل آرا نے موبائل بند کر دیا۔

''ادھر آؤ دعا... میرے پاس۔''

انہوں خاموش کھڑی دعا کو پکارا۔ وہ بغیر جواب دیے ان کے قریب آ گئی۔

''میرا خیال ہے انو' ہمیں شادی کی شاپنگ شروع کر دینی چاہیے۔ انہوں نے اچانک سے پروگرام بنا ڈالا۔

انعم کا پیالہ بھی اختتام پذیر تھا۔

دعا کا دل انگلیوں میں دھڑک گیا، انعم کا منہ کی طرف جاتا چمچہ واپس پیالے میں گر گیا۔

''ات... اتنی جلدی...'' اس نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

''مجھے واپس بھی جانا ہے' میری تاخیر جنید آفندی کو شک میں مبتلا نہ کر دے، وہ مجھے واپس بلا

رہے ہیں۔'' انہوں نے وجہ بتائی۔

''ابھی تو احسن بھی نہیں مانا' آئی تھنک وہ ٹائم لے گا۔''

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا، بلا وجہ احسن کا جواز پیش کر دیا۔

''تمہیں اس کی فرماں برداری پر کوئی شک ہے۔ وہ بالکل وہی کرے گا جو میں اور تم اسے کہیں گے۔'' انہوں نے سنجیدگی سے اسے گھر کا۔

''دعا راضی ہے' ہم اس کی شاپنگ اسٹارٹ کرتے ہیں' وہ اپنی خود سے کرے گا' چلو تم دونوں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔'' انہوں نے حکم جاری کر دیا۔

''مم۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔'' دعا بدکی۔

''کیوں؟'' دل آرا کا ''کیوں'' چبھتا ہوا تھا۔

''میں نے خود سے کبھی شاپنگ نہیں کی' مجھے کوئی تجربہ نہیں' آپ جو لا دیں گی' میں وہی پہن لوں گی۔''

اس نے سچ بتایا۔

دل آرا کا دل اس کی اس قدر نا اہلی پر اش اش کر اٹھا۔ انہوں نے بڑے فخر سے گردن اکڑا کے انعم کو دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کے رہ گئی۔

''دعا ایسی ہی ہے۔ جو اس کی امی اور ممانی جان دیتی تھیں' وہی یہ پہن لیتی تھی۔'' انعم اس کے سچ کی گواہ تھی۔

''او کے فائن' تم ریسٹ کرو۔ کچن میں نہیں جانا' صرف چند روز ہیں شادی میں۔''

دل آرا کا کہنا تھا کہ وہ اتھل پتھل ہوئے جذبات کو سنبھالتی اٹھ کر بھاگ نکلی۔ انہوں نے اس کی پشت کو مسکرا کے دیکھا۔

☆☆☆

بہت زیادہ دھول اڑ رہی تھی۔ نہ آندھی آ رہی تھی نہ طوفان' چاروں اور مٹی کا غبار تھا' دھول جھاڑو سے اڑائی جا رہی تھی۔ گرد مٹی اس قدر تھی کہ میں جھاڑو لگانے والے کا دھندلا سا عکس دکھائی دیتا تھا۔

اس نے سارا کوڑا ایک جگہ ڈھیر کیا۔ دھول کا غبار بھی آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تو واضح ہوا کہ جھاڑو لگانے والا مرد ہے۔ اس کا چہرہ گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ تین نقش ابھر نہیں رہے تھے۔ وہ جھاڑو پھینک کے وہیں کوڑے کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ بڑے سے شاپر میں مٹھی بھر بھر کوڑا ڈالنے لگا۔

''اے میرے خدا' مجھے معاف کر دے، میری التجا سن لے' میری رہائی کا بھی سبب بنا دے' میرے باپ کو بھی مجھ پر رحم آ جائے'' اس کی زبان بل کھا گئی۔ دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

''رحم۔۔۔ رحم۔۔۔ میرا باپ۔۔۔ میرا باپ کون ہے' کیا نام ہے اس کا؟ ریاض۔۔۔ ریاض احمد۔۔۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔ وہ تو نوال اور عمیر کا باپ ہے۔ میں کیا بن باپ کے ہوں۔'' اس کا ذہن غیر حاضر تھا۔ آنکھیں انجان سی' وہ شاپر پھینک چکا تھا۔

''وہ کہاں گئے۔ مجھے چھڑوانے کیوں نہیں آ رہے' میری ماں' میرا باپ۔۔۔ میری ماں۔۔۔ ہاں میری ماں۔'' انہیں آواز دیں دیتا ہوا وہ زور زور سے رونے لگا۔

☆☆☆

دل آرا اور انعم ڈیزائنرز بوتیک میں بڑے تنقیدی انداز میں کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل آرا اس کے لیے سب کچھ مہنگا اور خوبصورت خریدنا چاہتی تھیں۔

انعم نے بے بی پنک کلر کا سوٹ اپنے ساتھ لگا کے' دیوار پر لگے شیشے میں دائیں بائیں گھوم کے دیکھا' دل آرا نے ذرا پیچھے ہٹ کے تنقیدی جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ انعم نے وہ سوٹ دکان دار کو پکڑا دیا۔

انہوں نے بلیک کلر کا سوٹ اتارا اور انعم کو پکڑایا تا کہ وہ اپنے ساتھ لگائے۔ وہ بھی بہترین تھا۔

دل آرا آگے بڑھ گئیں۔ انعم مزید ہینگرز کو آگے پیچھے کھسکاتی فان کلر ڈھونڈ رہی تھی۔

اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے ہینڈ بیگ میں سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر ''احسن کالنگ'' چمک رہا تھا۔

وہ ماں کی طرف دوڑی۔
"ماما۔ احسن کی کال ہے۔" اس نے موبائل آگے کیا۔
"تو ریسیو کرو ناں۔" وہ اپنے ساتھ سوٹ لگا رہی تھیں۔
"میں نہیں کروں گی' پلیز آپ یہ پکڑیں۔" اس نے زبردستی فون انہیں پکڑا دیا۔
"ہیلو۔۔" دل آرا نے اسے گھورا۔
"انعم کو فون دیں۔" اس نے مطلب کی بات کی۔ یہ اس کی ناراضی کا انداز تھا۔
"وہ دوسرے حصے میں ہے' اس کا بیگ میرے پاس ہے۔" انہوں نے جھوٹ گھڑا۔
"کہاں ہیں آپ لوگ؟" وہ سخت بدمزا ہوا۔
"ہم تمہاری دلہن کیلئے شاپنگ کرنے نکلے ہیں' پلیز ہمیں ڈسٹرب مت کرو' آرام سے سب پر چیز کرنے دو۔" انہوں نے اپنی کہہ کے' اس کی سنے بغیر کال کاٹ دی۔ احسن نے بند موبائل کان سے ہٹا کے گھورا۔
"شادی کی شاپنگ' اوہ مائی گاڈ۔۔"
اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسائیں۔ اس کے ماتھے پر بل تھے۔

☆☆☆

احسن آفس ٹائم سے ایک گھنٹہ قبل گھر پہنچ گیا۔ دعا لاؤنج میں بیٹھی گاجریں چھیل رہی تھی۔ اس نے مرکزی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا۔
دعا کا گاجر چھیلتا ہاتھ رک گیا' اس نے مڑ کے آنے والے کو دیکھا اور سب چھوڑ چھاڑ کے اندر کو بھاگی۔
"بے وقوف لڑکی۔ وہ دانت کچکچا کے رہ گیا۔
"انعم۔ انعم۔۔" اس نے بہ آواز بلند پکارا۔
انعم سے پہلے دل آرا نکل آئیں۔ انعم کے کمرے کا دروازہ کھلا۔
"جج۔۔جی۔۔" وہ نیند سے ہڑبڑا کے جاگی تھی۔
"تم بازار گئی تھیں' میری شادی کی شاپنگ کرنے۔"
وہ ماں کو نظر انداز کر کے اس پر برسا۔
اس نے محض اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ اس کا یہ روپ وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔
"واٹ ربش' میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے' کس کی پرمیشن سے تم اپنی من مانی کرتی پھر رہی ہو۔ میری لائف کا۔۔"
"بی کوائٹ احسن۔۔" دل آرا کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کا ردعمل بالکل درست تھا۔ وہ آگے بڑھیں۔
"تم نے مزید ایک لفظ بھی انعم سے کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا اور تم مجھ سے پوچھو' مجھ پر چلاؤ' کیونکہ تمہاری دوسری شادی کا فیصلہ میں نے کیا ہے اس نے نہیں۔۔" وہ اس کے سامنے تن گئیں۔
"کیا اس اچانک فیصلے کی وجہ دریافت کرنے کا حق رکھتا ہوں۔" اس کے لہجے کی تلخی ذرا کم ہوئی۔
"وجہ تمہیں معلوم ہے۔ انعم تمہیں وارث نہیں دے سکتی' ہمیں تمہاری اولاد چاہیے۔" انہوں نے دوٹوک بتایا۔
انعم کے دل پر زبردست گھونسا پڑا۔
"مجھے وارث نہیں چاہیے ماما' ہم اولاد کے بغیر بھی بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔" وہ بے بس کھڑا تھا۔
"کب تک؟ ایک وقت آئے گا' جب تم سوچو گے کہ کاش میرا کوئی بازو' کوئی سہارا ہوتا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔" دل آرا نے اسے احساس دلایا۔
"یہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ آپ اس ٹاپک کو کلوز۔۔"
"پلیز احسن' تمہیں مجھ پر ٹرسٹ نہیں ہے۔ میں تمہاری اور انعم دونوں کی ماں ہوں۔ میں نے کبھی اپنی مرضی تم لوگوں پر نہیں تھوپی' کبھی اپنا کوئی فیصلہ لاگو نہیں کیا۔ تم لوگوں کو کیا کھانا پینا ہے' کہیں آنا جانا

ہے‘ کس سبجیکٹ کو لینا ہے‘ حتیٰ کہ تم دونوں نے کہا کہ ماما ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں‘ اب ہماری اسٹڈیز کمپلیٹ ہے‘ شادی کروا دیں‘ میں تب بھی تم لوگوں کی رضا میں خوش رہی۔ میں تم لوگوں کے کبھی کسی ایک معاملے میں بھی روایتی ماں یا دیوار نہیں بنی‘ تم لوگوں کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کی‘ اور اگر آج میں نے اپنی ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کے ایک خواہش کا اظہار کر دیا تو تم مجھ پر چلاؤ گے‘ مجھے غلط قرار دو گے‘ میرے کون سے دو‘ چار بیٹے اور ہیں‘ یا بیٹیاں ہیں جو میں دوسرے پوتی‘ پوتوں یا نواسوں سے دل بہلا لوں ٹھیک ہے تمہاری زندگی‘ تم جیسے چاہو جیو‘ میں بھلا کون ہوتی ہوں‘ پلیز میری سیٹ کنفرم کروا دینا۔‘‘ دل آرا کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔

احسن کا دل مٹھی میں آ گیا۔ اس نے کبھی بھی ماں کو روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں۔ انعم نے تاسف سے شوہر کو دیکھا اسے بھی ماں کا دل ٹوٹنے کا دکھ تھا۔

☆☆☆

وہ دیوار سے پشت ٹیکے‘ آنکھیں دیوار کی اونچائی پر جمائے‘ جسم ڈھیلا چھوڑ‘ ٹانگیں زمین پر سیدھی پھیلائے ہوئے تھا‘ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے‘ رنگت زرد‘ شیو خاصی بڑھی تھی۔ اس پر کسی نشئی یا نیم پاگل کا گمان گزرتا تھا۔ لیکن ایسا ظاہری حالت کی وجہ سے تھا۔ ورنہ وہ بالکل ٹھیک ٹھاک حاضر دماغ تھا۔

☆☆☆

دل آرا انعم کو اس کے کمرے تک چھوڑنے آئی تھیں۔ احسن شام سے کمرہ بند تھا۔ اب انعم اندر جانے سے گھبرا رہی تھی‘ دل آرا نے اسے سمجھا بجھا کے اندر بھیجا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ وہ اپنے دل اور اعصاب کو مضبوط کرتی خود کو حوصلے کا درس دیتی‘ بیڈ پر اپنی سائیڈ پر آ کے اوپر کو ہو کے بیٹھ گئی۔

’’احسن۔۔‘‘ اس نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

’’ہاتھ مت لگانا‘ دور رہو مجھ سے۔‘‘ وہ یکدم چیخ پڑا۔

انعم نے کبھی اس کی ناراضی یا غصہ برداشت نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ میانہ روی سے پیش آتا تھا۔

’’میں نے کیا کیا ہے‘ آپ بھلا میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔‘‘ اس سے مزید برداشت نہیں ہوا تو وہ رو دی۔

’’تم اور ماما‘ میرے ساتھ اتنا بڑا گیم کھیل رہی ہو اور ابھی بھی پوچھتی ہو کہ میں نے کیا کیا ہے۔‘‘ وہ اٹھ بیٹھا۔

’’وہ سب ماما نے آپ سے کہا ہے۔‘‘ اس نے اپنا دفاع کیا۔

’’تمہاری خاموشی اور شکل بتاتی ہے کہ تم ماما کی سپورٹر ہو میں ذرا سا اونچا بولوں تو رونا دھونا شروع اور جو اتنا بڑا دل کر کے‘ اپنی محبت اور شوہر کا بٹوارہ کرنے جا رہی ہو۔‘‘

احسن نے اس کے منہ پر زور کا تازیانہ لگایا۔

لفظ ’’بٹوارہ‘‘ کتنا تکلیف دہ تھا۔

وہ پھر سے ہچکیاں لینے لگی۔

’’پلیز احسن‘ مجھ سے بدگمان نہ ہوں‘ یہ سب ماما جی کی پلاننگ ہے۔‘‘ اس نے سچ اگلا۔

’’ہم دونوں کو برباد کرنے کی۔‘‘ وہ تلخ ہوا۔

’’آپ ماما اور ان کی محبت پر شک کر رہے ہیں۔‘‘ انعم کو اس کا کہنا سخت برا لگا۔ ’’میری وہ سگی ماں نہیں لیکن آپ کی تو ہیں۔ انہوں نے مجھ پر سوت لانے کی بات کی‘ مجھے بڑے مان سے سمجھایا اور میں بلاچوں چرا راضی ہو گئی۔ آپ نے سب سنے اور جانے بغیر ہی ان پر الزام تراشی شروع کر دی۔‘‘

اسے سخت حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اتنا جلد باز نہیں تھا۔

’’آخر تم دونوں چاہتی کیا ہو؟‘‘

’’اگر آپ سب ٹھنڈے دل و دماغ سے سنیں گے تو سمجھ میں آئے گا۔ کیا وہ ہم دونوں کا برا چاہ سکتی

ہیں۔ وہ جو ہم سے محبت کرتی ہیں‘ اس محبت کو مزید رشتوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہیں‘ جو میں انہیں نہیں دے سکتی۔“ اس نے نرم رویہ رکھا۔

”کیا اولاد کے لیے میں دوسری شادی رچالوں۔“ وہ بگڑا

اس میں برائی کیا ہے۔ وہ ماں ہیں‘ اپنی گود میں‘ اپنے اکلوتے بیٹے کی اولاد کو کھلانا چاہتی ہیں‘ میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیں کہ آپ کا دل نہیں چاہتا کہ آپ کے بھی بچے ہوں‘ اس سنسان گھر میں بھی قلقاریاں گونجیں۔“

اس نے احسن کا ہاتھ پکڑا جو بے اختیار اس نے واپس کھینچ لیا۔

”رکھو ہاتھ میرے سر پر احسن۔“

محبت آزمائش کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ وہ چپ تھا اس کی نظریں جھکی تھیں۔

”کیا بے وقوفی ہے انو۔۔؟“ لہجے میں دبدبہ مفقود تھا۔

کھوکھلی سی آواز۔ انعم کا جی چاہا کہ روز محشر بپا ہو جائے۔ دل آرا نے مرد ذات کے متعلق بالکل درست اندازہ لگایا تھا‘ جب شام سے احسن کمرہ بند تھا تو اس کا ایمان بھی ڈانواڈول ہوا تھا۔

وہ اس سے واقعی پہلے جیسی محبت کرتا ہے۔ اس کے دل میں وہم آیا ہے اور دل آرا اس وہم کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔ اسکی ساری خوش فہمی اس پل دھری کی دھری رہ گئی تھی۔

”نظریں چرانے سے حقیقت نہیں چھپتی‘ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے بچے ہوں‘ میں آپ سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ آپ کا نام اس دنیا میں باقی رکھنے کے لیے‘ اس دل پر پتھر رکھ لوں گی‘ سوتن برداشت کرلوں گی۔“

اس نے اپنی طرف سے اسے مکمل طور پر مطمئن کرنا چاہا کہ وہ اس کی طرف سے بے فکر ہو کے‘ اس مسئلے پر غور کرے۔ انعم جانتی تھی اگر وہ دل آرا سے چوری چوری احسن کو دوسری شادی کے لیے منع کردے‘ بندوق احسن کے کندھے پر رکھ کے چلائے تو‘ وہ انکار کردے گا‘ انعم پر الزام نہیں آئے گا‘ وہ صاف بچ جائے گی۔ لیکن وہ اپنی ماں کو دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔

”اتنا بڑا دل‘ حوصلہ اور ظرف کہاں سے لیا ہے تم نے؟“

احسن کی آنکھیں اس کے نم چہرے پر گڑ گئیں۔

”اس عورت سے‘ جس نے ایک یتیم بچی کو گود میں لیا‘ اسے واقعی ماں کی محبت و شفقت دی۔

اس ماں سے‘ میں نے چیونگم چباتے بڑے لاپروا انداز میں کہا کہ میں احسن سے محبت کرتی ہوں‘ اس نے اپنا جوان بیٹا‘ مجھے سونپ دیا۔

اس ماں سے جس نے میری بے اولادی کی خبر سن کے بھی‘ مجھ پر کوئی طنز بھی کوئی پریشر نہیں ڈالا۔ میرا حوصلہ نہیں توڑا، میں اس ماں کو مایوس کردوں؟

اپنی کم ظرفی اور ضد کی خاطر انہیں اور تمہیں خوشی سے کیوں محروم رکھوں‘ میں ایسا نہیں کرسکتی‘ میں ماما کو انکار کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتی میں‘ میری محبت اور میرا شوہر اس خواہش پر قربان۔“ وہ احسن کے گلے لگ کے رودی۔ احسن کا جسم بے جان و ساکت تھا۔

”پلیز احسن مان جاؤ‘ اپنی ماں کو کبھی انکار مت کرنا‘ ہم نے ان کے مان اور محبت کو نہیں توڑنا‘ پلیز مان جاؤ‘ میں بالکل دل سے کہہ رہی ہوں۔“

اس نے آج تک کبھی انعم کا کہا نہیں ٹالا تھا۔ اس کی کوئی منہ سے نکلی بات رد نہیں کی تھی۔ آج بھی وہ چپ تھا۔ اس کی اس چپ میں ”ہاں“ پوشیدہ تھی۔

(باقی آئندہ ماہ‘ ان شاء اللہ)

ہاجرہ ریحان

اُستانی

''کرتی کیا ہے، کیا تمہارے آفس میں......؟''
آپا نے خوشی سے پوچھا۔

''وہ زوہیب اور سعدیہ کو اردو کی ٹیوشن دیتی ہے۔ گورنمنٹ اسکول میں پڑھاتی ہے۔'' میں نے ہر ممکن اپنے لہجے میں کوئی تبدیلی لائے بغیر جواب دیا۔

''ہیں...... ایک تو گورنمنٹ اسکول، اوپر سے اردو کی استانی...... ارے کیا دماغ خراب ہوگیا ہے؟ پتا بھی ہے اردو پڑھانے والی استانیاں کیسی ہوتی ہیں؟ پڑھانے کے لیے منہ تک دھو کر نہیں آتیں، اوپر سے برقعہ اوڑھ کر سمجھتی ہیں کہ اپنے پاس سے آنے والی بدبو کو بھی برقعے میں چھپا لیں گی۔ پڑھاتے پڑھاتے سو جاتی ہیں۔ جب کام میں ایسی ہیں تو گھر میں کیسی ہوتی ہوں گی، کبھی سوچا؟'' آپا کے مختصر سے تبصرے پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔ دوسری طرف آپا بھی ہنس پڑیں۔

''اچھا چلو، نام کیا ہے؟''

''میں جانتا تھا، نام سن کر تو آپا بالکل ہی قابو سے باہر ہو جائیں گی، پھر بھی نام تو بتانا ہی تھا۔ میں تھوڑے توقف کے بعد گہری سانس لے کر گویا ہوا۔

''ارجمند بانو!''

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد آپا کے کھانسنے کی آواز آئی۔

''حسیب...... میرے پیارے بھائی! کیوں آخر، ایسی بھی کیا مشکل آن پڑی میرے بھائی، کیا ثمرین کا بدلہ لے رہے ہو مجھ سے، تمہارے لیے لڑکیوں کی کمی ہے کیا؟ ارے دوسری شادی ہے تو کیا ہوا، میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔ تم بس مجھے ایک سال دے دو، میں تمہارے لیے شاہینہ کی طرح کی ہی کوئی خوب صورت لڑکی تلاش کرلوں گی۔ دل چھوٹا نہ کرو میرے بھائی! اپنی بہن پر اعتبار تو کرو۔ ارے اس اردو کی استانی ارجمند بانو کو دفع کرو، کیوں اپنی زندگی خراب کرنے پر تلے گئے ہو؟ آپا اب باقاعدہ گڑگڑا کر درخواست کر رہی تھیں۔

میں گلا کھنکھار کر رہ گیا۔ ''آپ کو کیسے سمجھاؤں؟ آپ ملیں گی تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا آپ کو؟'' میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر ایک کوشش اور کی۔

''ارے کیا اندازہ ہو جائے گا، میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ گندگی تم سے برداشت نہیں ہوتی۔ بدتمیزی تم سہہ نہیں سکتے۔ رکھ رکھاؤ تمہارا شاہانہ ہے۔ لیے دیے پورے رشتہ داروں میں تم مشہور ہو۔ ٹھیک ہے، مانا کہ شاہینہ کے جیسی تو خیر اب ملنے سے رہی، مگر ایسا بھی نہیں کہ تم بالکل ہی گر جاؤ۔ تمہارا ایک اسٹیٹس ہے۔ ایک معیار ہے۔ بڑے اور اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ میرے بھائی کیسے نبھاؤ گے یہ سب اس...... اس...... بانو کے ساتھ؟'' آپا ایک بار پھر سے بھڑک کر بولیں۔

''اوہو آپا! بس، میں نے کہہ دیا نا مجھے ارجمند بانو سے ہی شادی کرنی ہے۔ آپ بس اس سے ایک بار مل لیں؟''

میں نے کسی ضدی ناسمجھ بچے کی طرح کہنے کو تو کہہ دیا تھا، مگر مجھے خود اپنے ہی لہجے پر ہنسی آگئی تھی۔

مجھ جیسے بردبار، سمجھ دار اور پڑھے لکھے آدمی سے کسی عورت کے لیے اپنی بڑی بہن کو اس طرح منانا حیران کن ہی نہیں مضحکہ خیز بھی تھا۔ دوسری

طرف آپا کو بھی جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ انہیں شاید اب اندازہ ہوا تھا کہ میں اردو کی استانی ارجمند بانو کے لیے کس قدر سنجیدہ ہوں۔ ویسے آپا کے اس طرح کے ردِعمل کا مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا۔ حالت تو میری بھی غیر ہوئی تھی جب پہلی بار میرا باقاعدہ ارجمند بانو سے تعارف ہوا تھا۔ اس سے پہلے کتنے ہی مواقع آئے تھے جب میں اس سے نہ صرف مل سکتا تھا، بلکہ اس کی قربت میں وقت بھی گزار سکتا تھا۔ اس کا باتیں کرنا، زیرِ لب مسکرانا، دائیں ابرو اٹھائے بہت انہماک سے کتاب کی ورق گردانی کرتے دیکھ سکتا تھا، مگر نہیں، میں نے اپنی کم علمی میں کتنے ہی ایسے سنہری مواقع گنوا دیے۔ صرف یہ سوچ کر کہ وہ اردو کی ایک معمولی سی استانی ہی تو ہے، اور رہی سہی کسر اس کے نام نے پوری کر دی تھی۔



جب بھی مجھے بتایا جاتا کہ زوہیب اور سعدیہ کی اردو کی استانی ارجمند بانو آئی بیٹھی ہیں اور بچوں کو نیچے اترنے میں وقت لگ رہا ہے تو میں چاہ کر بھی اپنی اسٹڈی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں نہ جاتا۔ کیونکہ مجھے یہ ہی لگتا تھا کہ میں اگر ملنے گیا بھی تو برقعے یا بڑی سی میلی سی چادر میں لپٹی بدرنگ، بے ڈھنگے سے کپڑے پہنے، پیروں میں دو پٹی کی ہوائی چپل ڈالے ادھیڑ عمر کی خاتون سے ملاقات ہوگی، جو مجھے یعنی کسی غیر مرد کو دیکھتے کے ساتھ ہی ''اوئی ماں'' کہہ کر دانتوں میں اپنی چادر کا ایک کونا دبا لے گی اور میرے حال چال پوچھنے پر صوفے پر شرم سے لوٹ پوٹ ہوتی رہے گی۔ حالانکہ اس کی جگہ جب بھی جیوگرافی یا میتھ کے ٹیچر کو انتظار کرنا پڑتا تو میں فوراً سب کام چھوڑ کر ان کے پاس جا بیٹھتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کے انتظار کو آسان بناتا، مگر اس اردو کی استانی کا نام ہی سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے جیسے کوئی ساری جان کھینچ کر نکال دیتا اور میں خود کو ملامت کر کے بھی اس کے انتظار کی کوفت ختم کرنے نہ پہنچتا۔

ایسے میں یہ کام مومو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتی۔ گو وہ ابھی کافی چھوٹی تھی، مگر اسے ارجمند بانو بڑی پسند تھی۔ زوہیب اور سعدیہ کے برعکس مومو، ارجمند بانو کے آنے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں جیسے اس کے استقبال کے لیے پہنچ جاتی، اسکول سے واپس آ کر زوہیب اور سعدیہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو جاتے تھے اور ارجمند بانو کے آنے پر جاگتے۔ لہٰذا اکثر ہی مومو کو ارجمند بانو کے ساتھ کافی وقت مل جاتا تھا۔ میں جب بھی گھر جلدی آ جاتا تو اپنی اسٹڈی میں بیٹھا آفس کے مختلف کام نپٹایا کرتا اور وہیں مومو کے قہقہے سنتا اور مسکرا دیتا۔

بچوں کی یہ ہی بات تو سب سے اچھی ہوتی ہے کہ وہ ظاہری شکل و صورت سے —— لاپروا ہوتے ہیں، بلکہ شاید وہ ایسے کسی شخص پر زیادہ ہی مہربان ہوتے ہیں۔ جس پر دنیا بدصورتی یا ناپسندیدگی کا لیبل لگا دیتی ہے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ مومو، ارجمند بانو کے آنے کا باقاعدہ انتظار کرتی تھی اور جب وہ زوہیب اور سعدیہ کو پڑھا چکی ہوتی تو دونوں کے ساتھ مل کر اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی۔ اس معاملے میں مجھے خوشی ہوتی تھی کہ چلو میرے بچوں کو اپنے کسی ٹیچر کی تو عزت کرنی آتی ہے، چاہے وہ اردو کی استانی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایک کی عزت کرنی سیکھ گئے ہیں تو دوسروں کی بھی عزت کرنی آ جائے گی۔ کبھی مجھے لگتا کہ کہیں اس اردو کی استانی نے ان تینوں کو ذرا دھمکا کر تو یہ شرط نہیں لگا رکھی کہ اس کے جانے پر وہ تینوں دروازے تک اسے چھوڑنے جائیں۔

ایک، دو بار میں نے تینوں کو کریدا بھی، مگر وہ تینوں ارجمند بانو کے نام سے ہی کھل اٹھتے اور چہکنے لگتے۔ تعریفوں کے پل باندھ دیے جاتے۔ میں نے سوچا بچے ہی ہیں، بے چارے ماں کی کمی کو اب کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگے ہیں۔ زوہیب اور سعدیہ تک تو ٹھیک تھا۔ وہ دونوں اپنی مرحوم ماں شاہینہ کے ساتھ اپنے ہوش میں آنے تک وقت گزار چکے تھے، مگر چھوٹی مومو، اسے شاہینہ کے لمس کا احساس تو تھا، مگر اس کے وجود کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ تصاویر میں مومو، شاہینہ کو حیران نظروں سے دیکھتی تھی اور اکثر ہی رونے لگتی۔ وہ معصوم بچی اس بات پر رو پڑتی تھی کہ یہ تصویر میں نظر آنے والی اگر اس کی ماں ہے تو مومو اس سے اس قدر نامانوس کیسے ہے؟

☆☆☆

شاہینہ سے بھی میں نے پسند سے شادی کی تھی۔ وہ میری یونی ورسٹی فیلو تھی۔ نام کی شاہینہ تھی اور خاندان اور شخصیت کی بھی شاہانہ تھی۔ ایم بی اے کے بعد میں نے کینیڈا کی شہریت کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور امی، ابو بضد تھے کہ میں شادی کر کے بیوی کے ساتھ پردیس سدھاروں۔ میں نے شاہینہ کا نام لیا۔ امی کو وہ فوراً پسند آ گئی۔ شادی کے چند سال یہاں گزار کر ہم کینیڈا سدھار گئے۔

میرے والد کا جو کاروبار پاکستان میں تھا، میں

نے اسی کی شاخ ٹورنٹو میں کھول لی اور ابو کی مدد اور میری دن رات کی محنت سے پندرہ سال میں میرا کاروبار اچھا خاصا ترقی کر گیا۔ اسی دوران زوہیب اور سعدیہ کی پیدائش ہوئی۔ مومو کے وقت شاہینہ کو کینسر کا خدشہ لاحق ہوا۔ میں مومو کے حق میں نہیں تھا، مجھے شاہینہ کی زندگی عزیز تھی، مگر وہ رسک لینے پر بضد ہوگئی۔ مومو کی پیدائش سے شاہینہ کی طبیعت جو بگڑی تو دس مہینوں میں ہی وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ کینیڈا میں اتنے چھوٹے بچوں کو تنہا دیکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنا کاروبار جلد از جلد سمیٹا اور واپس پاکستان اپنے آبائی گھر آ گیا۔ جس میں میرے والدین کے انتقال کے بعد اب تین پورشن بن چکے تھے۔

ایک میں آپا رہتیں، ایک میں میرا چھوٹا بھائی اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور ایک پورشن جو خالی پڑا تھا میرے حوالے کر دیا گیا۔ والد کا کاروبار اب چھوٹا بھائی سنبھالتا تھا۔ میں نے اپنا الگ سیٹ اپ بنانے کا سوچا اور اسی سلسلے میں کافی مصروف رہتا تھا۔ مگر ایک اطمینان تھا کہ بچے گھر پر اکیلے نہیں ہیں۔ آپا کے تمام بچے شادی بیاہ کر کے الگ گھروں میں آباد تھے۔ آپا میرے بچوں کو کافی وقت دیا کرتی تھیں، پھر چھوٹے بھائی کی بیوی، افشاں بھی میرے بچوں کے ساتھ کافی اچھی تھی۔

زوہیب صرف تیرہ سال کا تھا، مگر اپنے سے دو سال چھوٹی سعدیہ اور سات سالہ مومو کا خیال مجھ سے کہیں زیادہ رکھتا تھا۔ کسی محفل میں یا گھر میں ہی آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے وہ اپنی دونوں بہنوں پر جیسے کڑی نظر رکھتا کہ وہ دونوں کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کر گزریں جس سے بعد میں مجھے یا آپا کو شکایت ہو۔ آپا کو اس کی بردباری بڑی پسند آتی تھی، مگر میرے دل پر لگ جاتی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ اس کی ماں ہوتی تو اکلوتا لڑکا ہونے کے باعث اس کو کس قدر لاڈ، پیار سے رکھتی۔

ہفتہ اور اتوار کے علاوہ بچے ہر شام کو مصروف رہتے تھے۔ کینیڈا سے آنے پر بچوں کو یہاں اچھے اسکول میں داخلہ کرانے پر بھی ان کو ٹیوشن دلوانا میری مجبوری تھی۔ کیوں کہ پاکستان کی پڑھائی کینیڈا کی پڑھائی کی بہ نسبت زیادہ مشکل تھی۔ وہاں تو میرے بچے اسکول سے کوئی ہوم ورک بھی لے کر نہیں آتے تھے۔ یہاں لگتا تھا کہ سارے سال کا کورس ہوم ورک کی صورت ایک ہی دن میں مکمل کرنے کے لیے بچوں کو دے دیا گیا ہے۔ نہ آئے دن ٹیسٹ ہوتے تھے کہ سارا سال زور و شور سے پڑھائی جاری رکھنی پڑے۔ یہاں آ کر ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بچوں کی پڑھائی وہ بلا ہے۔ جو نہ بچوں کو چین لینے دے اور نہ والدین کو، پتا نہیں ان لوگوں کو پڑھانے والے استادوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

☆☆☆

شروع کے چند مہینے تو میں نے بچوں پر زور دیا کہ وہ کسی طرح خود ہی اسکول کی پڑھائی میں جدوجہد کریں، مگر پھر ثمرین نے یکے بعد دیگرے بچوں کے لیے مختلف استاد بھیج دیے اور یوں میرے بچے دنیا کی مصروف ترین شخصیت بن گئے۔ ساڑھے چھ بجے سے دن کا آغاز ہوتا۔ اسکول سے آ کر چند گھنٹے سو کر ساڑھے چار بجے سے اٹھ کر اردو، میتھ اور جیوگرافی کی ٹیوشن لیتے لیتے رات کے آٹھ بج جاتے، کھانا کھاتے، ایک آدھ گھنٹہ آپا ان کو قرآن شریف پڑھا دیا کرتیں۔ تھوڑا سا ہی ٹی وی دیکھ پاتے اور اس قدر تھک جاتے کہ گیارہ بجے تک بے سدھ سو جاتے۔ ہفتے اور اتوار کے روز بھی آدھے سے زیادہ دن ہوم ورک کرنے میں گزارتے۔

زوہیب اور سعدیہ اس قدر محنت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے تھے، جبکہ مومو کے مزے آ گئے تھے۔ اس کا داخلہ ابھی پہلی کلاس میں ہوا تھا، جہاں اس کو بڑے بھائی بہن کی طرح محنت نہیں کرنی پڑتی، لہٰذا وہ گھر پر آنے والے بھانت بھانت کے ٹیچرز کے ساتھ گپ لگاتی رہتی اور جو وقت بچ جاتا اس میں آپا یا افشاں کی جان کھائی رہتی۔ چھوٹے بھائی کی شادی

میری شادی کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ اس کے دو بچے تھے جو کہ زوہیب اور سعدیہ کی عمر کے تھے۔ لہٰذا مومو گھر کی واحد چھوٹی بچی تھی، جس کو بات کرنے کے لیے بڑی تعداد میں لوگ ملے ہوئے تھے۔

میں نے بچوں پر واضح کر دیا تھا کہ ابھی تو ٹیوشن دلوا رہا ہوں، مگر ایک دو سال بعد ان لوگوں کو اس قدر خود پر بھروسا کرنا آ جانا چاہیے کہ ٹیوشن کی ضرورت نہ پڑے اور میرے بچے میری بات پر دل و جاں سے عمل کر رہے تھے اور ان کی محنت صاف دکھائی دیتی تھی۔ باقی مضمون کے بارے میں تو مجھے یقین تھا کہ میرے بچے جلد ان پر قابو پا لیں گے، مگر اردو کے سلسلے میں ان کی کمزوری کا مجھے شدت سے احساس تھا۔ اسی لیے میں نے جلد از جلد اردو کی ٹیچر کا بندوبست کرنے کا سوچا تھا اور جب ثمرین نے مجھ سے ایک گورنمنٹ اسکول میں اردو پڑھانے والی ارجمند بانو کا تذکرہ کیا تو میں نے فوراً ہی ہامی بھر لی تھی۔ کیوں کہ میں بچوں کے اسکول میں اردو پڑھانے والی ٹیچر سے مل چکا تھا۔ جس کی اردو اس قدر خراب تھی کہ مجھ جیسے بندے کو بھی اس سے بات کر کے الجھن ہو رہی تھی۔

نہ وہ ٹھیک سے اردو میں بات کر رہی تھی، نہ ہی انگلش میں، اگر صرف امتحانات میں پاس کرانا مقصود ہوتا تو میں یقیناً اس کو بھی رکھ لیتا، مگر میں چاہتا تھا کہ میرے بچے صحیح معنوں میں اردو سیکھیں، تاکہ آئندہ وہ اردو زبان میں دلچسپی لے سکیں۔ پھر بھی مجھے اپنے ہی بچپن کے گورنمنٹ اسکول کے اردو کے استاد کی یاد آئی تھی، جو کہ منہ میں پان بھر کر رکھتے تھے۔ لہٰذا منہ سے زیادہ ان کے ہاتھ چلتے تھے۔

ڈھیلا ڈھالا شکن زدہ سفید کرتے پاجامے پر صدیوں پرانی کالے رنگ کی شیروانی زیب تن کیے وہ ہمیشہ جیسے اچانک ہی کلاس میں وارد ہوتے اور اچانک ہی کلاس سے غائب ہو جاتے۔ بات وہ نہ کرتے تھے، نہ ہی سنتے تھے۔ سب بچوں کو معلوم تھا کہ ان کے آتے ہی اردو کی کتاب کھول کر سامنے رکھنی ہے۔ وہ بلیک بورڈ پر صفحہ نمبر لکھتے، ہم سب مطلوبہ صفحے پر آ کر اسے خاموشی سے تکتے جاتے اور سمجھ نہ پاتے کہ اب کیا کریں۔ ان کے ہاتھوں اور آنکھوں کی دہشت ایسی تھی کہ پوچھ بھی نہ پاتے۔ بہرحال وہ تھوڑی دیر سب کو غضب ناک نگاہوں سے تولتے رہتے، پھر کسی ایک کو اپنے غضب کا نشانہ بناتے۔ جب اس سے نپٹ لیتے تو بلیک بورڈ پر ہی کچھ سطریں لکھتے، یعنی کہ کچھ سوال جواب جو اس دن کے صفحے کے متعلق ہوتے، اور اس سے پہلے کہ ہم پلکیں جھپکیں، وہ نظروں سے غائب ہو جاتے۔ میں اکثر ان کے جانے کے بعد سوچتا کہ ویسے تو بڑی مری سی چال چلتے ہیں، مگر کلاس میں داخل ہوتے اور جاتے ہوئے پتا نہیں ان کی رفتار اتنی تیز کیسے ہو جاتی ہے کہ کبھی پکڑائی نہیں دیتے۔

بہرحال ایک بات تو طے تھی کہ ان کی کلاس میں آج تک کوئی فیل نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں کس طرح گھول کر پورا کورس پلاتے تھے کہ میں آج تک سب کچھ بھول کر بھی اردو کے کئی اسباق یاد رکھتا ہوں۔ میں نے بچوں کو پہلے ہی سکھا پڑھا دیا تھا کہ اگر کبھی اردو کی استانی ان کو مارے پیٹے یا کوئی اور زیادتی کرے تو بلا جھجک مجھے بتائیں، مگر مجھے بڑی حیرت تھی کہ بچے ارجمند بانو سے کافی خوش تھے۔ اور اکثر دونوں کے اردو ٹیسٹ میں اچھے گریڈ دیکھ کر مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کی اردو کی استانی گھول کر پلانے میں ویسی ہی ماہر ہے جیسے میرے اردو کے استاد تھے۔

☆☆☆

آپا کو ثمرین پسند تھی، لہٰذا اس کے بھیجے ہوئے تمام ٹیچرز کو وہ اس کے ایجنٹ کہا کرتی تھیں اور بچوں کے ٹیوشن کے اوقات میں شاذ ہی ہماری طرف آتی تھیں۔ ویسے تو میں نے کچھ ہی دنوں میں اندازہ کر لیا تھا کہ آپا اور افشاں دونوں ہی ثمرین کی طرف سے تھوڑی اکھڑی ہوئی سی رہتی تھیں اور جب ثمرین گھر پر آتی تو یہ دونوں کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر اپنے اپنے پورشن میں چلی جاتی تھیں۔

ثمرین میرے بزنس پارٹنر اور میرے مرحوم والد کے عزیز دوست مشرف امین کی بیٹی تھی۔ چند ایک ملاقاتوں میں ہی ہم دونوں میں بے تکلفی ہوگئی، کیونکہ میرے اور ثمرین کے کچھ شوق ملتے جلتے تھے۔ ثمرین میرے گھر بلا جھجک آنے لگی اور شاید یہ ہی بات آپا کو پسند نہیں آئی تھی۔ ہم لوگ یوں تو کاروباری خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مگر ہمارے ماں، باپ سے ہمیں قدامت پسندی اور رکھ رکھاؤ بھی ورثے میں ملا تھا۔ ہمارے ہاں کی خواتین پڑھتی لکھتی بھی تھیں۔ کاروبار بھی کرسکتی تھیں۔ مگر پھر بھی ملنے ملانے میں احتیاط برتی جاتی تھی۔ خاص طور سے مخالف جنس کے لیے ایک خاص قسم کی دوری رکھی جاتی تھی اور اس پر کسی کو کوئی شکایت بھی نہیں ہوئی تھی۔

بہرحال ایک دن یوں ہی میں نے ہنسی مذاق میں آپا سے کہیں کہہ دیا کہ ثمرین سے اگر میں شادی کرلوں تو...... آپا نے مجھے اسی وقت ایسی سختی سے منع کردیا تھا کہ میں حیران رہ گیا تھا۔ مگر کیونکہ میرا خود بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے ان کو کریدنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں نے ثمرین کے کہنے پر ہی تمام ٹیچرز رکھے تھے۔ وہ اکثر کو جانتی تھی، ان کی دوست تھی۔ جب بھی گھر آتی، کوئی نہ کوئی ٹیچر موجود ہوتا۔ اس سے ٹیوشن کے بعد گپ لگالیتی۔ ان کے بارے میں مجھ سے بات چیت کرلیتی تھی۔ مگر ارجمند بانو کے لیے اس کے منہ سے کبھی کچھ نہیں نکلا تھا اس نے وجہ یہ ہی بتائی تھی کہ ارجمند بانو اس کی دوست نہیں، بلکہ اسے کسی دوست نے اس ٹیوشن کے لیے سفارش پر رکھوایا تھا۔

بہرحال بچوں کے اسکول کے سالانہ امتحانات ہوئے، جس میں زوہیب اور سعدیہ نے غیر متوقع طور پر بہت اچھے گریڈ لیے تھے۔ تمام ہی ٹیچرز ان دونوں کے کیمبرج کے سالانہ امتحانات میں اچھی کامیابی پر یقین رکھتے تھے۔ بچے خوش تھے اور مجھے بھی بہت اطمینان ہوا تھا۔ کیمبرج کے امتحانات میں وقت تھا۔ لہٰذا میں نے گھر کے لان میں ہی ایک چھوٹی سی دعوت کا اہتمام کرلیا، جس میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے والے تینوں ٹیچرز اور اسکول کے کچھ ٹیچرز کو مدعو کیا تھا۔ بچوں نے اپنے کچھ کلاس فیلوز بھی مدعو کرلیے تھے۔

میری اچانک کاروباری مصروفیت کی بنا پر دعوت کا انتظام افشاں اور میرے چھوٹے بھائی نے سنبھال لیا تھا جبکہ آپا طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے آنے سے قاصر تھیں۔ میں جب خود بھی کسی مہمان کی طرح گھر کے لان میں داخل ہوا تو اس وقت تک تمام بلائے گئے مہمان آچکے تھے۔ زوہیب اور سعدیہ ادھر ادھر چہکتے پھر رہے تھے اور موموان دونوں کے درمیان بھاگ دوڑ کررہی تھی۔ میں شرمندہ سا ہوکر افشاں کے پاس خاموشی سے جا کھڑا ہوا، جو کہ برتنوں کی میز کے پاس کسی سے بات کرنے میں مصروف تھی اور مجھے دیکھ نہیں سکی تھی۔

لان میں داخل ہوتے ہی چند ایک مہمانوں سے مل کر افشاں کے پاس پہنچنے کی وجہ وہ بھی تھی۔ جس سے افشاں بات کرتی نظر آرہی تھی۔ وہ جس کی پشت پر اس کے لمبے گھنے سیاہ بال قدرتی ہوا سے لہروں پر لہریں کھارہے تھے۔ میں یوں تو مہمانوں سے مل رہا تھا۔ کچھ ٹیچرز کا شکریہ ادا کررہا تھا، مگر میری نظر ایک بار جو اس پر پڑی تھی تو اس سے ہٹ نہیں سکی تھی۔ یہ بچوں کی ٹیچر تو نہیں ہے یقیناً۔ ورنہ میں نے دیکھا ہوا ہوتا۔ نہ ہی بچوں کے کسی کلاس فیلو کی اماں یا بہن لگ رہی ہے۔ شاید افشاں کی ہی کوئی دوست ہو اور اگر ایسا ہے تو اس سے بہتر کون سا موقع ہوسکتا ہے کہ افشاں میرا اور اس کا باقاعدہ تعارف کروادے۔ میں غیر ارادی طور پر اپنی ٹائی کی ناٹ کو چیک کرکے کوٹ کے نیچے شرٹ کی سلوٹیں ٹھیک کرتا ہوا افشاں کے پاس جا کھڑا ہوا۔

دبلے لمبے سراپے پر فیروزی رنگ کی ساڑھی پہنے۔ ہلکے گلابی رنگ کی عمدہ سی سلک کی چادر کندھوں پر ڈال کر دونوں بازوؤں پر چادر کے کونے لپیٹے وہ زیرلب مسکراتی افشاں کی باتیں بہت انہماک سے سن

رہی تھی۔ افشاں اتنی مگن تھی کہ اسے میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی اور اتنی ہی دیر میں، میں نے اپنے مقابل پر غور کیا۔ صاف، شفاف چمکتے ہوئے چہرے پر بڑی بڑی گہری سوچتی ہوئی آنکھیں اور کانوں سے لٹکتے ہوا سے جھولتے لمبے آویزے جو اس کی پتلی لمبی گردن کا پتا دیتے تھے۔ میری نظر کو خود پر مرکوز دیکھ کر اس نے مسکرا کر مجھے دیکھ کر افشاں کی طرف دیکھا، جیسے اسے احساس دلا رہی ہو کہ اب ہمارے ساتھ کوئی اور بھی کھڑا ہے۔

''بھائی جان! اتنی دیر لگا دی۔ آپ کے انتظار میں کھانا لگانے کو بیٹھے ہیں۔'' افشاں نے تھوڑی دیر اپنی بات جاری رکھنے کے بعد آخرکار مجھے مخاطب کر کے کہا۔

میں منمنا کر رہ گیا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا، افشاں تیزی سے دوسری طرف چلی گئی۔ اس سے تعارف کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی۔ افشاں کے جاتے ہی وہ بھی مسکرا کر آگے بڑھنے والی تھی کہ مومو دور سے بھاگتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس کے پیچھے ہی سعدیہ بھاگتی دوڑتی آئی اور اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس سے خوشی خوشی باتیں کرنے لگی۔

میں حیران ہوا۔

''آخر یہ ہے کون جس کو میرا پورا خاندان جانتا ہے اور ایک میں ہی اس سے لاعلم ہوں؟''

اس کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی تو میں کبھی بھی اس طرح بار بار اس کے کسی اور سے باتیں کرنے کے دوران زبردستی مخل ہونے کا سوچتا بھی نہیں۔ مگر اس کو جاننے کے شوق نے میرے تمام تر رکھ رکھاؤ کا بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ میں زبردستی اس کے ساتھ کھڑا اپنے بچوں کی اس سے بات چیت سنتا رہا تھا کہ اس نے ایک بار پھر سے نظریں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔

''آپ بچوں کی پڑھائی کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہ رہے ہیں؟''

سعدیہ کے وہاں سے جاتے ہی اس نے مجھ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

میں گڑبڑا گیا۔ ''بہت بہت معافی چاہتا ہوں، مگر اصل میں...... میں آپ کو...... پہچان نہیں پا رہا۔ آپ اسکول میں کون سا مضمون لے رہی ہیں؟''

میری بات سن کر ایک لمحے کے لیے اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی، پھر اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ شاید ہنسنا چاہتی تھی، مگر مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں جس اسکول میں پڑھاتی ہوں، وہاں آپ کے بچے نہیں پڑھتے۔ ارجمند بانو نام ہے میرا۔ شاید آپ کو یاد ہو، میں آپ کے بچوں کو ہر شام دو گھنٹے اردو کی ٹیوشن دیتی ہوں۔''

میں ابھی سکتے سے باہر نہیں آیا تھا کہ میرے پاس ثمرین چلی آئی۔

''آؤ، آؤ ثمرین...... ان سے ملو، یہ...... یہ ارجمند بانو بچوں کو اردو کی ٹیوشن دیتی ہوں۔'' میں نے جیسے نیند میں ڈوبے لہجے میں بے ربطی سے کہا۔ میں مخاطب تو ثمرین سے تھا، مگر میری نظریں ابھی تک ارجمند بانو پر ہی ٹکی ہوئی تھیں۔

''اوہ اچھا اچھا! آپ ہیں ارجمند بانو، کافی تعریف کرتے ہیں، آپ کی شجاع انکل، خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' ثمرین نے ٹھوس انگریزی میں سب کچھ کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

مجھے ثمرین کی یہ بات بہت عجیب لگی۔ میں نے شرمندہ سی نظروں سے ارجمند بانو کو دیکھا، مگر وہ میری شرمندگی سے بے خبر جب تک ثمرین سے ہاتھ ملا چکی تھی۔

''شجاع سر بذات خود بہت اچھے انسان ہیں۔ میرے استاد بھی ہیں اور محسن بھی۔ مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ انہوں نے میرے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے۔''

میرے ساتھ ساتھ ثمرین بھی جز بز ہو گئی تھی، کیونکہ ارجمند بانو نے ثمرین کی ہی طرح ٹھوس

انگریزی میں جواب دیا اور یہ کہتے ہی وہ سر کو ذرا سا خم دے کر دوسری طرف مڑ گئی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ثمرین کو ارجمند بانو پسند نہیں آئی تھی اور ارجمند بانو نے بھی صاف ظاہر کر دیا تھا کہ اسے ثمرین کی پسند ناپسند کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں ہے۔ میں پورا وقت کسی طرح اس سے قریب ہونے کی ترکیب سوچتا رہا تھا، مگر ہر بار ناکامی ہوئی۔ ادھر ثمرین بھی میرے ساتھ سائے کی طرح لگ گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ ثمرین کے سامنے اس سے بات کرنا ناممکن ہے۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اب جب یہ بچوں کو پڑھانے آئے گی تو ہی ڈھنگ سے انٹرویو لوں گا۔" میں نے دل میں سوچا۔

عجیب سی جستجو محسوس ہوئی تھی مجھے، ارجمند بانو کے متعلق جاننے کی شدید خواہش۔ ایسا میرے ساتھ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یقیناً بہت زیادہ پڑھی لکھی ہے۔ خوب صورت بھی، کپڑوں اور انداز سے بھی کسی اونچے گھر کی لگ رہی تھی۔ ثمرین نے جس طرح شجاع انکل کا تذکرہ کیا تھا اس کا مطلب تھا یہ کوئی قریبی ہی تھی، مگر آج تک جان پہچان کے لوگوں کی کسی محفل میں نظر نہیں آئی اور پھر جو شوخی، خود پر مان جیسے انداز اس کی شخصیت کا خاصا ہونے چاہئیں یکسر ندارد تھے۔

کچھ لوگ کتنے واضح، کتنے صاف شفاف نظر آتے ہیں، مگر پھر بھی پہلی ہی نظر میں ان کو دیکھتے کے ساتھ ہی احساس ہوتا ہے جیسے ان کے دل گہرے پانیوں کی مانند کئی طوفان سمیٹے بظاہر خاموش اور مطمئن نظر آ کر ملنے والوں کو کھلا دھوکا دینے میں مصروف ہیں۔ میں اس کے دھوکے میں رہنا نہیں چاہتا۔ اب اسے میرے سامنے مکمل طور پر کھلنا ہوگا۔ سوال تو بس یہ ہی تھا کہ کیا وہ بھی ایسا چاہے گی۔ مجھ سے سب کچھ کہے گی۔ میرے سامنے اپنا آپ کھولے گی؟

☆☆☆

ثمرین کی ناپسندیدگی محسوس تو ہوئی تھی، مگر اس قدر نہیں کہ وہ دعوت کے تیسرے ہی دن مجھ سے ارجمند بانو کو نکالنے کا کہہ دے گی۔ اس نے ہی تمام ٹیچرز میرے پاس رکھوائے تھے۔ لہٰذا وہ خود کو سب کی قسمت کا ان داتا سمجھتی تھی۔

میں اس دن بے حد مصروف تھا۔ ایک میٹنگ نپٹا کر نکلا تھا اور دوسری میں جانے کے لیے مختلف ٹینڈرز کی فائلیں کھولے اپنے لیے اہم نکتے لکھ رہا تھا کہ اس کا فون آ گیا۔ اکثر ہی وہ فون کر لیا کرتی تھی اور میری فرصت کا سن کر آفس چلی آتی تھی، مگر آج اس کا لہجہ نہایت اکھڑا ہوا تھا۔ میرے ہیلو کہتے ہی اس نے مجھ سے کسی طرح کی بھی رسمی گفتگو کرنے کے بجائے ارجمند بانو کو ابھی اور اسی وقت فارغ کر دینے کا کہا۔

میں نے وجہ جاننے کے بجائے اسے دلاسا دیا اور یہ ہی بتایا کہ ابھی تو آفس میں ہوں، آ کر بات کرتا ہوں، مگر وہ بضد ہوگئی۔ کہنے لگی کہ میں گھر پر فون کروں، کیونکہ وہ خود بھی میرے گھر پر موجود تھی اور ارجمند بانو بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔

"اس نے بہت بدتمیزی کی ہے۔ تم ابھی گھر پر فون کر کے اس سے بات کرو اور اسے ابھی فوراً اس گھر سے نکل جانے کا کہو۔ میں ایک منٹ اس عورت کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔" ثمرین نے دوٹوک انداز میں فون پر تقریباً چیختے ہوئے مجھ سے کہا اور کھٹ سے فون بند کر دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ثمرین اس قدر اکھڑی ہوئی کیوں ہے۔ ویسے تو اس کا مزاج زیادہ تر بگڑا ہوا ہی رہتا تھا۔ مگر میرے سامنے وہ ہر ممکن خوش اخلاق نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ آپا اور افشاں تو ویسے بھی ثمرین کے آتے کے ساتھ ہی اپنے پورشن میں چلی جاتی ہیں۔ ملازم وغیرہ بھی اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کیا ہوا ہے؟ کیا ارجمند بانو نے میرے بچوں کے ساتھ کوئی زیادتی...... ثمرین نے کہا کہ اس نے بہت بدتمیزی کی ہے...... بدتمیزی...... کس کے ساتھ...... ثمرین اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتی...... غصے میں ثمرین اپنی بات بھی ٹھیک سے نہیں کر سکی تھی۔

میں میٹنگ کو پس پشت ڈال کر گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔ میں اپنے بچوں کے لیے بہت حساس تھا اور ثمرین کا اس طرح فون کرنا مجھے بہت سے خدشات میں مبتلا کر چکا تھا۔ میں نے نکلنے سے پہلے ایک چھوٹا سا میسج ثمرین کو کر دیا تھا کہ میں خود آ کر معاملے کو دیکھتا ہوں، وہ میرا انتظار کرے اور جب تک میں نہ آؤں، بچوں کی خاطر گھر پر رہے۔ گھر پہنچا تو ثمرین لان میں ہی ٹہلتی نظر آ گئی۔

میرے گاڑی سے اترتے ہی وہ تیزی سے میرے پاس آ گئی۔

''اس جیسی عورتوں کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں، گھمنڈی، مغرور، بدتمیز۔'' ثمرین غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں نے دلاسا دینے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا۔

''چلو میری اسٹڈی میں۔'' وہ میری بات سن کر جھنجلا گئی۔

''اسٹڈی میں کس خوشی میں، وہ تمہارے بچوں کو لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ وہاں جاؤ اور ابھی اسے نکال باہر کرو۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔ میں وہی کروں گا جو تم کہہ رہی ہو۔ مگر پہلے مجھے سب بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟'' میں نے تحمل سے جواب دیا۔

''ہونا کیا ہے؟ خودسر تو وہ ہمیشہ سے ہے۔ ہر بات میں ٹانگ اڑانے والی۔ ایسی نہ ہوتی تو آج کو اپنا اتنا ہینڈسم شوہر نہ سنبھالے بیٹھی ہوتی؟'' ثمرین کا غصہ کسی طرح کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہم اب اسٹڈی میں آ گئے تھے۔ میں نے کمرے میں آتے ہوئے ایک ملازم سے کہہ دیا تھا کہ ارجمند بانو کو فوراً میری اسٹڈی میں بھیجے۔

''میری ہی غلطی ہے۔ مجھے شجاع انکل کی بات ماننی ہی نہیں چاہیے تھی۔ ایسی ڈپریسڈ عورت، جس کے ڈپریشن کو رفع کرنے کے لیے شجاع انکل نے اسے گورنمنٹ اسکول میں پڑھانے کے لیے کہا تھا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ بھلا اس طرح کوئی ڈپریشن کا علاج ہوا ہے؟ سائیکو، مینٹل، ہونہہ!''

دروازے پر ہلکی دستک دے کر وہ اندر چلی آئی تھی اور شاید اس نے ثمرین کی بات کا آخری کا کچھ حصہ سن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے دکھ نظر آیا، مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور خاموشی سے آ کر میرے سامنے میز کی دوسری طرف کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی ثمرین کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے بدتمیزی کرنے کی؟ بولو؟'' ثمرین اس کی لاتعلقی سے جیسے اور بھڑک گئی اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس پر برس پڑی۔

اس نے بہت اطمینان سے سر گھما کر ثمرین کی طرف دیکھا اور واپس میری طرف دیکھنے لگی۔

''آپ نے...... مجھے بلایا ہے؟''

اس نے ''آپ'' پر زور دے کر مجھ سے پوچھا، تو میں گڑبڑا گیا۔ ثمرین غصے سے اور پاگل ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر غصے سے پھنکارتے ہوئے بولی۔

''اس نے...... اس نے...... میرا ہاتھ...... اس نے کہا کہ یہ میرا ہاتھ توڑ دے گی۔ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو......؟''

''یقین کیجیے، میں واقعی ایسا کر سکتی ہوں۔ بچوں سے زیادتی میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ کسی کے بھی بچے ہوں۔'' ارجمند بانو نے اسی اطمینان سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں اسے صرف سمجھا رہی تھی۔ بچوں کو تمیز سکھانا ضروری ہے۔ مگر تم کیا جانو تمیز کیا ہوتی ہے؟ تم تو خود اپنے شوہر سے لڑ مر کر اس سے علیحدہ ہوئی ہو؟'' ثمرین نے اسی طرح بھڑک کر دانت پیستے ہوئے کہا۔

''کس کو تمیز سکھا رہی تھیں تم؟ کس بات پر؟''

میں ثمرین کے منہ سے بچوں کے بارے میں سن کر چونک پڑا۔ اس سے پہلے میں یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ صرف ارجمند بانو اور ثمرین کے درمیان ہونے والی کسی بحث کا نتیجہ ہے۔

''یہ مومو کو دھڑا دھڑ پیٹ کر ان سے بغیر

پوچھے ان کے لائے ہوئے کیک سے ایک حصہ لینے پر تمیز سکھا رہی تھیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا تو انہوں نے جذبات میں آ کر بچوں کے سامنے ہی جو زبان استعمال کی ہے وہ میں بتا نہیں سکتی۔'' ارجمند بانو نے پہلی بار ثمرین کو گہری نظروں سے دیکھا۔

''ہاں تو تم نے بھی تو کہا کہ میرا ہاتھ توڑ دو گی۔ تم کیا بڑی پارسا ہو؟'' ثمرین اپنا پول کھلتا دیکھ کر نرم پڑتی نظر آ رہی تھی۔

''ثمرین...... تم باہر جاؤ۔'' میں نے ثمرین کو سخت لہجے میں ہدایت کی۔ ثمرین نے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف اور سر جھٹک کر تیزی سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زوردار دھماکے سے اسٹڈی کا دروازہ بند کر گئی۔ جس کی آواز سے ارجمند بانو ایک دم لرز گئی۔

''ارجمند بانو...... میں جو کچھ بھی پوچھوں اس کا دوٹوک الفاظ میں جواب دیں۔ سمجھ رہی ہیں آپ؟'' میں نے ثمرین کے جاتے ہی ارجمند بانو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پہلے تو نظریں چرائیں، پھر جیسے کچھ سوچ کر فیصلہ کن سانس لی۔ حسب عادت اس کی دائیں ابرو اٹھی اور آنکھیں مجھ پر ٹک گئیں۔

میں نے اپنی تمام ہمت جمع کی۔ مجھے اپنے الفاظ بہت ناپ تول کر کہنے تھے۔ آج سے پہلے میں کئی بڑے لوگوں سے ملا۔ بہت سی بزنس میٹنگز میں اپنی بات منوائی۔ مگر کہیں بھی آج تک مجھے اس طرح اپنے الفاظ پر بولنے سے پہلے غور نہیں کرنا پڑا تھا۔ بلکہ الفاظ جیسے میرے حق میں خود بخود میری زبان سے ادا ہوتے جاتے تھے۔ مگر آج میں پہلی بار اپنے لفظوں کو باقاعدہ ترتیب دے رہا تھا۔

''ارجمند بانو...... کیا تم...... مجھ سے شادی کرو گی؟''

کہنے کو تو میں کہہ گیا، مگر خود ہی حیرت میں ڈوب گیا۔ یہ میرے منہ سے ابھی ابھی جو نکلا ہے وہ کیا واقعی میں نے ہی کہا ہے؟ میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا تھا۔ پتا نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا تھا۔ مگر اب تو کہہ ہی گیا تھا اور اپنی بات واپس لینا بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ ''جی؟'' ارجمند بانو کو بھی میری بات سے اتنی ہی حیرت ہوئی تھی جتنی مجھے خود اپنے سوال سے ہوئی تھی۔

''آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور شاید آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے۔'' وہ تھوڑی دیر مجھے اسی طرح حیرت سے تکتے رہنے کے بعد گویا ہوئی۔

''میں انکل شجاع سے مل چکا ہوں۔ تمہارے ماضی سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر کیا تمہیں میرے ماضی سے فرق پڑتا ہے؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

مجھے فکر تھی تو بس یہ ہی کہ وہ دوٹوک انکار کر کے نہ اٹھ جائے۔ مجھے انکل شجاع نے پہلے ہی اس کے دنیا سے کنارہ کرنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ابھی وہ کچھ کہتی کہ ثمرین ایک بار پھر بغیر دستک دیے کمرے میں جارحانہ چلی آئی۔

''ہاں تو بولو؟ کیا جھوٹ سنایا ہے اس نے تمہیں؟ نکالا تم نے اسے یا نہیں؟''

ثمرین کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس قدر بدتمیزی سے ارجمند بانو کے بارے میں بات کر رہی تھی کہ مجھے اس کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ میں نے امید سے ارجمند بانو کی طرف دیکھا۔

''ہاں...... نکال دیا ہے میں نے اردو کی استانی؟ ارجمند بانو کو...... کیونکہ......''

''کیونکہ؟ کیونکہ کیا؟'' میرے بیچ میں بات روک دینے پر ثمرین ایک بار پھر جھنجلا گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ارجمند بانو دھیرے سے مسکرانے لگی تھی اور میرے لیے اس کی طرف سے اتنی ہی ہمت افزائی کافی تھی۔ خوشی سے میری نظر ارجمند بانو پر ہی ٹکی رہ گئی تھی۔ آخرکار میں نے ارجمند بانو کی مسکراہٹ کی خوشی میں شوخی سے جواب دیا۔

''کیوں کہ میں اور ارجمند بانو...... شادی کر رہے ہیں۔''

☆

''تھوڑی دیر صبر کر لیں نانی جان' ہوسکتا ہے طبیعت سنبھل جائے۔''

''اے شاباش ہے لڑکی! ادھر سر ہے کہ درد سے پھٹنے کو ہے، بلڈ پریشر بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور تم صبر کا مشورہ دے رہی ہو' اگر طبیعت سنبھلنے کے بجائے بگڑ گئی اور میں چل بسی تب بھی تو کفن دفن کا انتظام کروانے کے لیے ہمسائیوں کے گھر کہنے جاؤ گی یا نہیں۔''

''اوہ نانی جان! کیسی خوفناک باتیں کرتی ہیں آپ!''

زیب النساء نے کچھ خوفزدہ سے انداز میں ان ہوں۔ لڑکیوں کی بھی کافی تعداد معلوم ہوتی ہے کوئی نہ کوئی دوا لا ہی دے گا۔''

''نانی! وہ اتنی بڑی کوٹھی ہے' پتا نہیں کس مزاج کے لوگ ہوں گے۔ امیر لوگ غریبوں کو منہ لگانا کب پسند کرتے ہیں' جب انہیں پتا چلے گا کہ میں اس پرانے سے مکان سے آئی ہوں تو ہوسکتا ہے سیدھے منہ بات بھی نہ کریں۔''

''تم بس گھر بیٹھی اندازے لگاتی جاؤ اور کوئی ایسی عالیشان کوٹھی بھی نہیں ہے، ہائے میرا سر' لگتا ہے' آج تو نہیں بچوں گی میں۔''

انہوں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور

ہندوستاں کی بات

ثمرہ بخاری

کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سچائی ہے، بوڑھی جان ہوں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ ذرا سا بہانا ہی موت کا سبب بن سکتا ہے۔ اور میں پوچھتی ہوں تم آخر ان کے ہاں جانے سے اس قدر ہچکچا کیوں رہی ہو۔''

''نانی! کل تو ہم اس گھر میں آئے ہیں ابھی پاس پڑوس واقفیت بھی نہیں ہے اور میں جا کر کہوں کہ یہ دوائیں لا دیجیے۔ کچھ مناسب نہیں لگتا ابھی امی بازار سے آتی ہوں گی ان سے منگوا لیجیے گا۔''

''وہ بے چاری ابھی بازار سے تھکی ہاری گھر آئے گی اور میں اسے پھر بازار دوڑا دوں۔ یہ ظلم مجھ سے نہیں ہوتا۔ تم جاؤ پڑوسیوں کے ہاں۔ بھرا پُرا گھر ہے' لڑکوں کی بھی آوازیں میں کل سے سن رہی پیشن گوئیاں کرنے لگیں۔

''نانی! کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟'' زیب النساء نے گھبرا کر پوچھا۔

''اے تو تمہارے خیال میں، میں اتنی دیر سے ڈراما کر رہی ہوں۔'' انہوں نے چیخ کر کہا پھر دوبارہ سے ہائے ہائے کرنے لگیں۔

''آپ پریشان نہ ہوں' ذرا حوصلہ پکڑیں میں جاتی ہوں ہمسائیوں کی طرف۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی' سیاہ چادر کھونٹی سے اتار کر سر پر اوڑھی' الماری سے کچھ پیسے لیے اور الجھتی گھبراتی وہ گھر سے باہر آگئی۔

پتا نہیں کس مزاج کے لوگ ہوں گے' دوا لا کر دیں گے بھی یا نہیں' کئی مرتبہ نانی سے کہا ہے اپنی

ضرورت کی اشیاء ختم ہونے سے پہلے ہی منگوا کر رکھ لیا کریں۔ اب امی بھی گھر پر نہیں ہیں مجھے ایروں غیروں سے مدد لینا پڑ رہی ہے۔ سوچتی الجھتی وہ ہمسائیوں کے اونچے سے سفید گیٹ کے سامنے آگئی گیٹ کھلا تھا۔ پھر بھی اس نے اطلاعی گھنٹی بجائی، دوسری مرتبہ انگلی رکھنے پر ایک پیارا سا بچہ نمودار ہوا اور سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

''اندر آنا ہے مجھے!''

وہ اثبات میں سر ہلا کر پیچھے ہٹا اور بولا۔

''آپ ضرور فری خالہ کی سہیلی ہوں گی مگر فری خالہ اس وقت آپ سے نہیں مل سکتیں ان کی چھوٹے ماموں سے لڑائی ہوئی ہے اور اب وہ اپنے کمرے میں بیٹھی رو رہی ہیں۔''

وہ بچے کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر اندر آگئی یہاں لان میں جو نظارہ دیکھا وہ کچھ حیران کن سا تھا۔ ایک اچھا خاصا اسمارٹ نوجوان پیارے سے بکری کے بچے کی دونوں اگلی ٹانگیں پکڑے اسے ہوا میں گول گول گھما رہا تھا اور ساتھ میں کوئی گیت گنگنا رہا تھا۔

''یہ ہمارے چھوٹے ماموں ہیں اور یہ بنٹی ہے۔ بنٹی ان کی بکری کا بچہ ہے' مگر ماموں کہتے میں اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا ہوں۔''

چھوٹا سا لڑکا بڑی سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔

زیب النساء کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی مگر چند لمحوں کے لیے کہ وہ نوجوان اب ادھر ہی آرہا تھا۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو؟'' بنٹی کو گود میں لیے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے وہ زیبا سے مخاطب تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے اسے، خاموش کھڑی رہی۔ ''آخر کسی سے تو ملنا ہی ہوگا، چلیے اندر تشریف لے چلیے۔''

کہتے ہی وہ شاید رہنمائی کے خیال سے آگے چل پڑا۔ راہداری سے ہو کر ایک بڑے سے کمرے میں اسے لا کھڑا کیا اور بولا۔

''یہاں اس وقت گھر کے تین افراد موجود ہیں آپ کو جو پسند آئے' اس سے بات کر لیں۔''

زیبا نے پلکیں اٹھا کر دیکھا سامنے بچھے تخت پر امی کی عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھیں، ان کے برابر کرسی پر بھی امی کی عمر کی ہی ایک اور خاتون پھر نیچے قالین پر اسی لڑکے کا ہم عمر ایک لڑکا بیٹھا تھا اور یہ سب زیبا ہی کو دیکھ رہے تھے۔

''السلام علیکم!'' اس نے گھبراہٹ کے عالم میں سلام کیا اور اپنی ہی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی تینوں نے جواب دیا اور کرسی والی خاتون نے اسے اپنے برابر میں رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''کہاں سے آئی ہو بیٹی؟ میں نے پہچانا نہیں' کیا تم فری کی سہیلی ہو؟''

جواب ظاہر ہے کہ نفی میں ہونا تھا۔

''اچھا اچھا' پھر نائلہ کے ملنے والوں میں ہوگی۔'' جواب پھر ناں میں اب کے وہ سوالیہ انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

''یہ جو آپ کے گھر سے بائیں طرف ایک گھر ہے ہم لوگ کل وہاں آئے ہیں۔'' گھر کی حالت کی وجہ سے وہ شرمندگی سے بتا رہی تھی۔

''اچھا تو تم بھائی ظفر اللہ کے کرائے دار ہو، ہاں کل نوما اور مای بتا رہے تھے کہ سامان آیا ہے نئے پڑوسی آرہے ہیں مگر ہم نے دھیان نہیں دیا۔ بیٹی تم ٹھیک سے بیٹھ جاؤ۔''

تخت پر بیٹھی خاتون نے محبت سے کہا پھر اس لڑکے سے جو اسے یہاں تک لے کر آیا تھا بولیں۔

''تم کھڑے کیا کر رہے ہو اس منحوس بکری کا بچہ کو گود سے اتارو اور فرج سے شربت نکال کر لاؤ۔''

''آپ اسے منحوس نہ کہا کریں میں نے اسے بیٹا بنایا ہے' اس لحاظ سے آپ اس کی دادی لگتی ہیں۔''

''بکومت۔'' اس کی بات پر قالین پر بیٹھا لڑکا ہنس پڑا تھا اور یہ ہنسی خاتون کو تپا گئی تھی۔

''بیٹی! کیا نام ہے تمہارا؟'' کرسی پر جو بیٹھی تھیں، وہ پوچھ رہی تھیں۔

''زیب النساء'' اس نے دھیرے سے بتایا پھر بولی۔

''میں ایک کام کے لیے آئی تھی اگر کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی''

''ہاں ہاں ضرور بتاؤ کیا کام ہے'' دونوں دل و جان سے تیار دکھائی دینے لگیں۔

اس نے نانی کی بیماری کا بتایا اور دوا کا نام بتا کر بولی۔

''امی بھی بازار گئی ہیں' ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتے۔''

''اس میں زحمت کی بھلا کیا بات ہے۔ پڑوسیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے چلو جنید! بہن کو دوا لا کر دو''

انہوں نے لڑکے سے کہا' وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی زیبا یہ کہتے ہوئے اٹھی۔

''نانی گھر میں اکیلی ہوں گی' میں چلتی ہوں۔ پندرہ منٹ کے بعد آ کر پتا کر جاؤں گی۔''

''یہ خود دوا تمہارے گھر دے آئے گا اور جب تمہاری نانی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے پھر ہماری طرف ضرور آنا۔ فری اور نائلہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی' اپنی نانی اور امی کو ہماری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہ ہم نانی کا حال پوچھنے آئیں گے تمہاری طرف۔''

وہ ان لوگوں کے اخلاق سے متاثر ہوتی خدا حافظ کہتی باہر نکلی تو راہداری میں بکری والا لڑکا ٹکرا گیا۔

''آپ جوس پیے بغیر تشریف لے جا رہی ہیں؟'' لہجہ شائستہ مگر آنکھوں میں شوخی و شرارت سی تھی۔

''جی بس مجھے جلدی ہے آپ کا شکریہ۔'' اس نے جانے کو قدم بڑھائے۔

''شکریہ تو آپ کا کہ آپ کی بدولت آج ہم جوس پئیں گے ورنہ ہماری اماں تو ہر شے کو سنبھال سنبھال کر رکھتی ہیں۔'' یہ کہہ کر گلاس منہ سے لگا لیا وہ تیز قدموں سے باہر آ گئی۔

نانی اس کی منتظر تھیں جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی بولیں۔

''ہاں کیا کہتے ہیں لا کر دیں گے یا نہیں؟''

''نانی! وہ تو بہت اچھے لوگ ہیں انہوں نے فوراً اپنے لڑکے کو دوا لانے بھیج دیا بس چند منٹوں میں لے کر آتا ہوگا' کہہ رہی تھیں ہم تمہاری نانی کا حال پوچھنے آئیں گے۔''

''اور تم تھیں کہ ان کی طرف جانا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ پڑوسیوں سے میل ملاقات رکھنا چاہیے اب میں تو اپنی بیماریوں کی وجہ سے ایسی لاچار ہوئی ہوں کہ کہیں آ جا ہی نہیں سکتی ورنہ تو خود بن کہے نہاں جاتی۔''

''نانی جان! میں تو اس خیال سے نہیں جا رہی تھی کہ معلوم نہیں کس مزاج کے لوگ ہوں گے۔ اتنا بڑا سا گھر ہے ان کا مزاج بھی نخریلا سا ہوگا' مگر وہاں بڑے گھروں والی کوئی بات ہی نہیں' سادہ سا فرنیچر ہے اور بہت اچھے مزاج کی خواتین ہیں' دونوں ہی سادہ اور پرخلوص تھیں۔ ان کے گھر میں دو لڑکیاں بھی ہیں، پہلے وہ یہی سمجھیں کہ میں ان کی لڑکیوں کی سہیلی ہوں اور نانی جان ان کے گھر میں ایک لڑکا ہے اس نے بکری کا ایک بچہ پال رکھا ہے بلکہ اس کو اپنا بیٹا بنایا ہوا ہے جب میں ان کے گھر میں داخل ہوئی تب وہ اسے ہوا میں گول چکر دے رہا تھا۔''

اس نے ہنستے ہوئے نانی کو یہ بات بتائی تھی سن کر بولیں۔

''ہاں بھئی ہوتے ہیں کچھ لوگ جو جانوروں سے بہت محبت کرتے ہیں مگر تمہیں ان کے لڑکوں کو دیکھنے ان کی عادات جاننے کی کوئی ضرورت نہیں بس لڑکیوں کے پاس چلی جایا کرنا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ جایا کرنا۔''

''کمال کرتی ہیں آپ بھی نانی! اب بھلا میں کوئی ایسی دیسی ہوں مجھے تو اس کی اس محبت پر ہنسی آرہی تھی اس لیے آپ سے بھی ذکر کر دیا۔''

''بہت دیر کر دی تمہاری ماں نے' اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔ چلو خیر آجائے گی' خریداری بھی تو خاصی کرنا تھی۔''

خود ہی سوال خود ہی جواب زیب کی رائے نہیں چاہی تھی ذرا دیر کے بعد بولیں۔

''مجھے پانی تو پلاؤ اور سنو' اب جوان کا لڑکا دوا لے کر آئے گا تو اسے دروازے سے ہی نہیں لوٹانا اندر بلا لینا چائے پلا کر بھیجنا۔''

''نانی! اتنی گرمی میں وہ بے چارا دوائی لے کر آئے گا اور پھر اوپر سے مزید ظلم یہ کہ اسے چائے پلائی جائے گی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ میں نے ان کی مدد کر کے انتہائی غلطی کی ہے۔''

''اچھا زیادہ باتیں مت بناؤ شربت ختم ہو چکا ہے اگر لیموں رکھے ہیں تو سکنجبین بنا لینا۔'' وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں آگئی۔

کچھ دیر بعد امی اور ان کی آمد کے پانچ منٹ بعد جنید نانی کی دوا لے کر آگیا نانی نے امی سے کہا۔

''اسے میرے کمرے میں ہی لے آؤ ایسے نیک بچے کو دیکھ کر دعا تو دے دوں۔''

امی کی ساری شاپنگ اسی کمرے میں نانی کے پلنگ کے برابر والے پلنگ پر پھیلی ہوئی تھی زیبا اور امی نہیں چاہ رہی تھیں کہ جنید یہاں آئے مگر نانی نے آواز دے کر بلا لیا۔ سر پر دست شفقت پھیرا۔ حال احوال' نام مشاغل غرض دس منٹ میں اچھا خاصا انٹرویو کر ڈالا۔

''نانی! میرے کزن کو آپ جیسی خواتین بہت اچھی لگتی ہیں اگر وہ میرے ساتھ آتا تو آپ کو دیکھ کر مجھ سے کہیں زیادہ خوش ہوتا۔''

''اچھا کہاں ہوتا ہے تمہارا کزن؟'' نانی کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ویسے جنید سے گفتگو کے دوران وہ اپنی بیماری کو فراموش کر چکی تھیں اور خاصی فریش دکھائی دینے لگی تھیں۔

''یہیں گھر پر ہوتا ہے' میرے ماموں کا بیٹا ہے وامق نام ہے اس کا۔''

''اچھا میری طبیعت سنبھل جائے تو میں آؤں گی تم لوگوں کی طرف۔''

جنید کچھ دیر بیٹھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''کیسا سعادت مند بچہ ہے۔ نیک والدین کی اولاد لگتا ہے' بتا رہا تھا والد حیات نہیں یہ اور اس کی بہن بس دو ہی بہن بھائی ہیں' بہن اس سے چھوٹی ہے۔''

''واہ نانی! آپ نے تو مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔'' وہ ہنس پڑی تھی۔

''پڑوسی ہیں ہمارے اور ان کے بارے میں ہمیں ایک نہ ایک روز تو سب علم ہونا ہی ہے' پھر میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اس کے ساتھ اور اگر اسے ہم سے کچھ چھپانا ہوتا تو میری باتوں کے جواب دیتا ہی نہیں نسیمہ تم ہو آنا ان کی طرف' اچھے لوگ ہیں۔ زیبا بھی بڑی تعریف کر رہی تھی۔''

''زیبا کو کس نے بتایا ان کے بارے میں؟'' امی حیران ہوئیں۔

جواب میں زیبا نے سب بتا دیا۔

''اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی' ذرا دیر بعد میں آہی جاتی۔''

''اچھا! ماں کا کوئی احساس ہی نہیں' میں چاہے دنیا سے اٹھ جاتی۔'' نانی کو سخت غصہ آگیا۔ بلڈ پریشر پہلے ہی ہائی تھا' دونوں پریشان ہو کر انہیں منانے لگیں۔

☆☆☆

شام کو زیبا نے سموسے بنائے' نانی کو پڑوسی یاد آگئے بولیں۔

''چار پانچ سموسے پڑوس میں دے آئے۔''

''اچھا نہیں لگتا بار بار ان کے ہاں جانا۔'' وہ

جانا نہیں چاہ رہی تھی۔

''کیوں اچھا نہیں لگتا' یوں کہو کچھ دینا اچھا نہیں لگتا۔ بی بی! دل کو کشادہ رکھتے ہیں اور پڑوسیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے۔''

''وہاں اتنے سارے لوگ رہتے ہیں اور میں چار سموسے لے کر پہنچ جاؤں اپنی اوقات بتانے۔''

''ایک تو تمہیں' احساس کمتری نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اگر محل نہیں ہے ہمارے پاس تو جھونپڑا بھی تو نہیں اچھے خاصے پکے گھر میں رہتے ہیں۔ زیادہ نہیں مگر اتنی زرعی زمین تو ہے کہ ہم تینوں کی گزر بسر ہو سکے۔ تم پتا نہیں کن سوچوں میں رہتی ہو' دولت کی خواہش نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔''

''یہ بات نہیں ہے نانی جان! میں تو بس اتنا کہنا چاہ رہی تھی۔''

''کوئی ضرورت نہیں صفائیاں پیش کرنے کی' سموسے رکھو پلیٹ میں اور دے کر آؤ ان کے ہاں۔''

''امی سے تو پوچھ لوں' انہیں پہلے بھی میرے ادھر جانے پر اعتراض ہو رہا تھا۔''

''کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چلو جلدی دے کر واپس آؤ میں چائے کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔''

دوپٹہ درست کرتی پلیٹ میں پانچ سموسے رکھے وہ شرمندہ سی ایک بار پھر ان کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

''آیئے آیئے رک کیوں گئیں۔'' وہی بکری والا لڑکا یہاں قریب ہی کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ زیبا نے اندر آ کر شائستگی سے سلام کیا۔ جس کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا پلیٹ پر نگاہیں جمائے بولا۔

''کیا لے کر آئی ہیں؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے اسے تھما دی سفید کروشیے کا رومال ہٹا کر دیکھا اور بولا۔

''آہا! سموسے' تو یہ خوشبوئیں آپ کے گھر سے اٹھ رہی تھیں، ادھر میں بری طرح بے چین ہو رہا تھا ہمارے گھر میں تو سب کے سب نکمے کام چور ہیں' تین وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں پکتا یہاں۔ آپ جب بھی ایسی مزے مزے کی چیزیں پکایا کریں مجھے ضرور بھیجا کریں۔'' ایسی بے تکلفی اور ندیدے پن پر وہ حیران تو ہوئی مگر حیرت ظاہر نہیں کی اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ ایک سموسہ اٹھا کر کھانے لگا' ساتھ میں تعریف بھی جاری رہی اور کھانے کے بعد بولا۔

''مجھے جنید نے بتایا تھا آپ کے گھر میں ایک نانی بھی ہیں جو مجھے بے حد پسند آئیں گی' اور اب تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ پڑوسی ہی مجھے بے حد پسند آئیں گے۔''

''میں اب چلتی ہوں۔'' وہ اسے اندر جانے کو بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ گیٹ کے سامنے اس کا راستہ روکے ہی کھڑا سموسوں سے انصاف کرنے میں مشغول تھا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے۔''

''مجھے چائے بنانی ہے۔ نانی انتظار کر رہی ہوں گی۔''

اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

''اپنی پلیٹ تو لیتی جائیں۔''

''پھر بھی لے جاؤں گی۔''

''چلو جیسے آپ کی مرضی۔'' اور وہ واپس آ گئی لگتا ہے سب سموسے یہی کھا جائے گا گھر والوں کو تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کچھ لے کر آئی تھی ویسے مجھے پلیٹ واپس لے آنی چاہیے تھی اتنا قیمتی سیٹ ہے



ہمارا اب جو یہ پلیٹ اس نے ادھر ادھر رکھ دی تو سب خراب ہو جائے گا۔
گھر آئی تو نانی رپورٹ لینے کو بے تاب اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔
''ہاں پھر دیے تم نے ان کو سموسے؟ لے کر کیا کہا انہوں نے؟''
''نانی! ان کا بکری والا لڑکا گیٹ پر ہی مل گیا تھا اس نے پلیٹ وہیں پکڑ لی اور میں واپس آ گئی''
''اے ہے کیسی بے وقوف ہو تم اندر جا کر کسی خاتون کے ہاتھ میں پکڑانی تھی۔ لڑکے تو بڑے چٹورے ہوتے ہیں وہ سب خود ہی کھا جائے گا گھر کی عورتوں کو تو علم بھی نہیں ہوگا۔''
''چلیں نہیں تو نہ سہی' ہم کون سے سونے کے سموسے لے کر گئے تھے۔''
نانی اس کی حماقت پر بڑبڑاتی رہیں' وہ کچن میں آ گئی امی نے چائے بنائی تھی اب کپوں میں انڈیل رہی تھیں وہ بھی ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔
''زیبا' کتنے لوگ ہیں پڑوس میں؟'' انہوں نے پوچھا۔
''پتا نہیں امی میری ملاقات ابھی سب سے نہیں ہوئی ویسے میرا خیال ہے کافی سارے لوگ ہیں تقریباً سات آٹھ یا شاید اس سے بھی زیادہ بھرے پرے گھر کتنے اچھے لگتے ہیں' ہے ناں امی!''
اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ انہوں نے محسوس کیا جواب میں بولیں کچھ نہیں ''اگر ممانی اتنے تیز مزاج کی نہ ہوتیں تو ہم ان کے ساتھ رہ سکتے تھے ان کی دونوں بیٹیوں سے تو میری اچھی دوستی تھی' ہم ان سے کچھ مانگتے تو نہیں تھے' پھر بھی ممانی کو ہمارا وہاں رہنا اچھا نہیں لگا۔ بے چاری نانی بھی آپ کی خاطر بیٹے کا گھر چھوڑ آئیں''
''اب چھوڑو ان باتوں کو'' جو ہونا تھا' وہ ہو چکا''
''امی! اگر ابا دوسری شادی نہ کرتے تب ہم اتنے اکیلے نہ ہوتے'' ان کی بات ان سنی کر کے وہ کہہ رہی تھی۔
''اگر' مگر' کاش ان باتوں سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے'' انہوں نے دھیرے سے کہا۔
''اب بھی تو ابا کو دو مزید بیٹیاں ہی ملی ہیں بیٹے کی آرزو میں دوسری شادی کی تھی مگر بیٹا نہیں ہوا اور میری دعا ہے ہو بھی نہیں۔ انہوں نے ہم پر ظلم توڑا ہے انہیں سزا ملنی چاہئے۔''
''تم جی مت جلایا کرو' خوش رہا کرو' میں اور اماں تو ہیں تمہارے سر پر پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔''
''امی! مجھے ابا پر بڑا غصہ آتا ہے۔ کس طرح انہوں نے بیوی اور بیٹی کو در بدر کر دیا۔ ہمیں زمانے کے سرد و گرم سہنے کو اکیلا چھوڑ دیا۔ یوں بھول گئے جیسے ہم سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔''
''یہ مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے'' امی کے منہ سے آہ نکل گئی۔
''اور ماموں' انہیں بھی تو توفیق نہیں ہوتی کہ مہینے دو مہینے بعد ہمارا نہیں تو نانی کا ہی حال پوچھنے آ جایا کریں۔
سچ امی! اگر نانی کی یہ تھوڑی سی جائیداد آپ کے حصے میں نہ آتی تو ہم تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔
''ایسے نہیں سوچتے بیٹی! اللہ تعالیٰ سب کا رازق ہے' وہ تو وہاں سے بھی رزق عطا کرتا ہے جہاں سے انسان کو امید بھی نہیں ہوتی، چلو شاباش یہ چائے کے برتن باہر رکھو' اماں منتظر بیٹھی ہوں گی ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ان کی طبیعت آج ویسے بھی کچھ ٹھیک نہیں۔''
وہ ان سے برتنوں کی ٹرے لے کر باہر آ گئی جہاں نانی واقعی منتظر بیٹھی تھیں۔ امی آئیں تو انہیں دیکھتے ہی بولیں۔
''تم نے سنا! یہ پلیٹ کیسے تھما آئی ہے'' اور پھر تفصیل سے اس کی حماقت کے بارے میں بتانے

لگیں۔

''چلیں اماں کوئی بات نہیں، دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اگر یہ اس لڑکے کی قسمت کا تھا تو پھر وہی کھائے گا آپ غصہ نہ کریں۔''

نانی اماں کو سموسے پسند نہیں آئے' مرچیں زیادہ لگ رہی تھیں انہیں اور ایک اعتراض یہ بھی تھا۔

''تم نے ٹھیک طرح سے لال نہیں کیے کچے ہی نکال لیے ہیں۔ زیبا تم حد سے زیادہ کام چور ہوتی جا رہی ہو' ایسے سموسے کھا کر ہمسائے کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں' کیسی پھوہڑ عورتیں ہیں' کچھ بنانے پکانے کا سلیقہ ہی نہیں ہے انہیں۔''

''نانی! ایسی باتیں خواتین کرتی ہیں اور یہ تو ان تک پہنچیں گے ہی نہیں۔ وہ لڑکا سارے کے سارے ہڑپ کر چکا ہوگا۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔''

کوئی انہیں یا ان کے خاندان کو پھوہڑ کہہ دے' یہ ان کی برداشت سے باہر تھا کہ وہ واقعی بڑی طریقے سلیقے والی خاتون تھیں اب تو صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ کچھ پکانے کو کچن میں جائیں یا سلائی بنائی کریں جب تک صحت رہی' خاندان میں اور ملنے والوں میں ان کی بے حد تعریف اور دھوم رہی' وہ چاہتی تھیں سارے ہنر اب نواسی کو بھی سکھا دیں مگر زیبا کو اپنی پڑھائی بڑی عزیز تھی کچن کا کام تو دلچسپی سے کر لیتی مگر اون کروشیے میں اسے بالکل مزا نہیں آتا تھا' یہ بھی بھلا کوئی بات ہے' ایک خانہ اتارو چڑھاؤ' نظر لگائے صبح سے شام الجھے رہو' البتہ اس کی امی یعنی نسیمہ بیگم بہت ماہر تھیں سلائی بنائی اور کروشیے کے کام میں۔

☆☆☆

''کیسا اجاڑ سا صحن ہے اور ہے بھی اچھا خاصا اگر ادھر کیاری بنا کر گلاب موتیا اور کچھ سبزیاں لگائی جائیں تو بہت اچھا رہے۔'' نانی آج گھر کے ایک ایک کونے کو سنوارنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

''ہاں نانی جان! ٹماٹر کے پودے تو بہت سارے ہونے چاہئیں پھر جب لال لال ٹماٹر لگیں گے تو میں کیچپ بناؤں گی۔''

''صرف ٹماٹر ہی نہیں مولیاں' گاجریں' مٹر اور چقندر سب ہی کچھ لگ سکتا ہے نسیمہ کل تم بازار جاؤ تو بیج لیتی آنا۔''

''اماں! آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں' صبح کیاریاں بنانے میں لگ جائیں گی' کچھ دن آرام کریں پھر یہ سب دیکھا جائے گا۔''

''برسات تو بس شروع ہوا ہی چاہتی ہے اس موسم میں سبزی لگادوں گی تو اچھا رہے گا' بس تم کل بیج لیتی آنا۔''

شام تک موسم بالکل ٹھیک تھا' یہ تینوں رات نو بجے تک صحن میں ہی بیٹھی رہیں۔ نانی کی طبیعت بھی بہتر تھی وہ موڈ میں بھی تھیں۔ پرانے قصے کہانیاں جن میں زیبا کو ہمیشہ ہی بڑی دلچسپی اور کشش محسوس ہوتی تھی سناتی رہیں۔ نانی بتایا کرتی تھیں۔

''میرا میکہ بہت امیر تھا بہت سے باغات ہماری ملکیت تھے' لکڑی کا کام یعنی درختوں کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی ''میرے ابا کا بہت بڑا بنگلہ تھا' جس کے کمرے اتنے بڑے تھے کہ پوری بارات آرام سے سما سکتی تھی' ہمارے ہاں لحافوں کے غلاف خالص ریشم کے بنتے تھے ان پر سچا گوٹا لگایا جاتا تھا یا پھر شنیل کے خوبصورت لحاف ہوا کرتے تھے۔ مسہری پر باریک جالی جس پر چاندی کا خوبصورت کام بنا ہوتا تھا' ڈالی جاتی تھی اور ملازم عورتیں باورچی خانے میں گھسی ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی مزیدار چیز تیار کرتی رہتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور چوبیس گھنٹے ہی ہمارے ہاں چولہا جلتا تھا۔''

آنے والے مہمانوں کے قصے جو بے حد نفیس تھے' تحائف کے ساتھ نانی کے ابا کی حویلی میں اترا کرتے تھے' گھر میں رہنے والی پھوپھیوں' چاچیوں کے قصے اور اس دور کی بہت سی باتیں برسات یوں منائی جاتی تھی۔ جاڑے کا استقبال پنجیری اور حلوہ جات بنا کر کیا جاتا تھا۔

گرما کے آغاز پر ڈھاکہ سے ململ منگوائی جاتی تھی۔

''ہائے کیا دور تھا اور کیا مزے تھے نانی اماں کے۔ کتنا خوبصورت اور بھرپور وقت گزارا ہے انہوں نے۔ اسی لیے تو ایسی بااعتماد ہیں۔ کسی کی دولت سے قطعاً مرعوب نہیں ہوتیں' کبھی جو میں ایسی بات منہ سے نکال دوں تو کندھے اچکا کر کہتی ہیں۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں میرے ابا کے پاس تو اس سے کہیں زیادہ دولت تھی اور ساری کی ساری حق حلال کی کمائی تھی۔ ۔ایک میں ہوں' جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ امان کو ترس رہی ہوں۔ اچھا گھر میرا خواب ہے۔ نانی کے ابا جتنی دولت نہ ہو' اتنے ٹھاٹ نہ ملیں مگر کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔ اب یہ گھر' اس میں تو رہتے ہوئے شرم آتی ہے' کمروں کی حالت تو درست ہے مگر بیرونی دروازہ اور دیوار کیسی بدرنگ ہو رہی ہے' باہر سے دیکھو تو یہ بالکل کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ ظفر اللہ صاحب نے کرایہ بہت کم مانگا تھا۔ امی نے غنیمت جانا اور آگئیں یہاں پر' ویسے ظفر اللہ صاحب کو ایسے کھنڈر کا کرایہ مانگتے ہوئے شرم آنی چاہیے تھی' بھلا یہ انسانوں کے رہنے کے قابل ہے دو کمرے اور جھڑتے سیمنٹ کی دیواروں والا صحن جس کا فرش آدھا کچا ہے آدھے میں ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ صحن میں نکلو تو سنبھل کر چلنا پڑتا ہے ورنہ ٹھوکر کھا کر گر بھی سکتے ہیں پتا نہیں مجھے کبھی کسی اچھے سے گھر میں رہنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں۔ ہائے مالک مجھے ان حسرتوں کے ساتھ ہی دنیا سے نہ اٹھالینا تیرے یہاں کس چیز کی کمی ہے بس مجھے اچھا سا گھر اور آسودہ حال زندگی عطا فرمادے۔''

نانی اور امی سونے کے لیے برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ چکی تھیں اور اس کے ذہن میں نانی کی سنائی کہانیاں چکرا رہی تھیں۔ وہ کھلے کھلے آنگن جن میں موتیے اور گلاب کے خوشبو لٹاتے پھول کھلتے تھے۔ بڑے بڑے سجے سجائے کمرے اور زیورات

میں لدی قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہنستی مسکراتی ادھر سے ادھر جاتی لڑکیاں۔

وہ صحن میں بیٹھی دور بہت دور کہیں گم تھی۔

پھر اسے نیند آ گئی' وہ وہیں تخت پر لیٹی اور سو گئی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کچھ نامانوس سے شور سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بجلی بڑے زور و شور کے ساتھ چمک رہی تھی بارش بس شروع ہوا چاہتی تھی۔ وہ برآمدے میں آ کر امی کے برابر والے بستر پر لیٹ گئی۔

بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے نانی اور امی کو بھی بیدار کر دیا تھا نانی اور زیبا دونوں ہی کڑکتی چمکتی بجلیوں سے بہت ڈرتی تھیں اور موسم کے تیور انہیں سہائے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسا طوفان کہ دل سہم جاتے تھے انہیں یہ فکر بھی تھی کہیں کوئی دیوار نہ گر جائے۔ مگر خیریت ہی رہی۔

☆☆☆

صبح موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ نہیں نکلی یا دل چھائے ہوئے تھے اور ہواؤں میں مستی سی بھری تھی۔ نانی بہت خوش تھیں۔ امی سے کہہ دیا تھا آج میں کیاریاں بناؤں گی۔ بازار سے سبزی گوشت لینے جاؤ تو بیج یاد سے لیتی آنا۔ زیبا صحن میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اس کے چھوٹے سے گھر کے برابر میں کھڑی وہ بڑی سی عالیشان عمارت جس میں کئی درخت تھے اور سبز درختوں میں گھری وہ سفید عمارت جس پر سرمئی بادلوں کا سایہ تھا' کتنی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ مکین بھی اچھے سادہ مزاج کے مالک ہیں اگر ان کے ہاں جایا جائے اور ان کے لان میں لگے پھولوں کو چھوا جائے تو ہرگز برا نہیں مانیں گے۔

''نانی جان! کیا خیال ہے موسم بہت اچھا ہو رہا ہے آج ہم ہمسائیوں کے ہاں نہ ہو آئیں؟''

''خیال تو نیک ہے' میں کپڑے بدل کر بالوں میں کنگھا کر لوں پھر چلتے ہیں۔'' نانی کو اپنے ہار سنگھار کی بڑی فکر رہتی تھی۔

''اماں ابھی تو آپ کیاریاں بنانے کی بات کر رہی تھیں اب ہمسائیوں کے ہاں جا رہی ہیں۔''

نسیمہ بیگم چادر اوڑھ کر بازار جانے کو تیار کھڑی تھیں۔

''گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر واپس آ جائیں گے' ہم نے کون سی داستان امیر حمزہ شروع کرنا ہے وہاں جا کر۔''

امی بازار چلی گئیں۔ زیبا نے منہ ہاتھ دھو کر بال بنا لیے مگر نانی کی تیاری مکمل ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا پھر دونوں کلائیوں میں سونے کے کڑے' ہاتھ میں انگوٹھیاں' کانوں میں ہلکی سی جھمکیاں مگر انہیں لگتا کہ شاید کمی رہ گئی ہے۔

''ابھی بھی تیاری نامکمل ہے چلیں ناں نانی جان! اب تو دیر ہو رہی ہے۔''

''دیر کا ہے کی صبح کے ساڑھے نو ہی تو بج رہے ہیں''

''مگر آپ اتنی لمبی چوڑی تیاریوں میں کیوں لگ جاتی ہیں۔''

''یہ ضروری ہے زیبا بیٹی! آخر لوگوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ ہم شروع سے ہی حالات کے ستائے ہوئے ہرگز نہیں ہیں' کبھی ہم پر بھی بہت فضل رہا ہے' ہم طریقے سلیقے والی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمیں آنے جانے' ملنے ملانے کا ڈھنگ آتا ہے ہمیں۔''

وہ بھی نانی کی بات کی قائل ہو گئی' واقعی اگر نانی زیورات پہن کر ان کے ہاں جائیں گی تو زیادہ قدر ہو گی۔

دونوں جب اس سفید عمارت میں داخل ہوئیں تو یہاں وہاں ویرانی تھی لان بالکل سنسان تھا۔ ''بڑے ہی بدذوق لوگ ہیں۔ ایسے موسم میں بھی کمرے میں گھسے بیٹھے ہیں!'' نانی نے ناک چڑھا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''گیٹ کھلا تھا ہم بغیر بیل دیے اندر آ گئے' میرا خیال ہے کال بیل بجانی چاہیے تاکہ کوئی باہر آئے' وہ دوبارہ گیٹ کی طرف بڑھی' نانی بڑے شوق سے

یہاں کھلے پیارے پیارے پھولوں کو دیکھنے لگیں بیل کی آواز پر وہی شوخ سالڑ کا باہر آیا تھا پہلے نگاہ نانی پر پڑی اس نے سلام کیا اور بولا۔

''آپ شاید سلیم کی دادی ہیں اگر وہی ہیں تو سلیم سے کہہ دیجئے گا۔ اب بہت دن ہو گئے مجھ سے جو نوٹس لے کر گئے تھے واپس کردو۔ اتفاق سے وہ میں نے اپنے لیے تیار کیے تھے اور ایک شکایت مجھے اور بھی کرنا تھی آپ سے۔''

''السلام علیکم!'' زیبا نے دھیرے سے کہا اس نے نانی سے نگاہ ہٹا کر اسے دیکھا اور بولا۔

''آیئے میں۔۔۔صبح سے آپ کا انتظار کررہا تھا۔'' ایسی بات پر نانی کی آنکھیں پھٹ سی گئیں اور منہ کھل گیا۔ ادھر زیبا کا رنگ واضح طور پر بدلا اور چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی۔ ادھر وہ کہہ رہا تھا۔''اصل میں مجھے پوری امید تھی کہ ہمارے باذوق ہمسائے ایسی پیاری برسات کو منائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ وہ ضرور برسات کے اس حسین موسم کی مناسبت سے کوئی پکوان تیار کررہے ہوں گے بس میں انتظار میں ہی تھا مگر آپ تو خالی ہاتھ دکھائی دے رہی ہیں۔'' اس کی وضاحت سے دونوں کی جان میں جان آئی۔

''یہ میری نانی ہیں۔ انہیں میں لے کر آئی ہوں۔''

اس نے تعارف کروایا۔

''اچھا تو آپ کے ہاں برسات کے موسم میں پکوان کے بجائے نانی۔''

کچھ کہتے کہتے خیال آیا فقرہ نامکمل چھوڑا اور بات بدل کر بولا ''میں پہلے ہی سوچ رہا تھا ایسی معقول خاتون سلیم کی دادی ہو نہیں سکتیں۔''

''آیئے۔ آپ لوگ اندر آجائیں۔''

اس نے انہیں اسی بڑے سے کمرے میں لا بٹھایا جہاں کل لے کر آیا تھا مگر آج یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

''بیٹا! تمہاری والدہ کہاں ہیں انہیں بلواؤ''

''نانی! انہیں بلوا تو لوں مگر کافی ٹائم لگ جائے گا۔ آنے جانے میں اصل میں ہمارے رشتے کے ایک دادا ابا اچانک صرف پچاسی سال کی عمر عزیز پا کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔

صبح ہی صبح جب سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے انہیں دادا کی ابدی نیند کی اطلاع ملی لپک جھپک جیسے تیسے سب تیار ہوئے اور افسوس کو چل پڑے۔ گھر میں صرف میں ہوں اور میں نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا کیونکہ مجھے صرف انڈا ابانا اور توس گرم کرنا آتا ہے اور مزے کی بات آج گھر میں نہ انڈے ہیں نہ توس میں صبح سے خیالوں ہی خیالوں میں مزیدار پراٹھے کھا کر خود کو بہلا رہا ہوں اب یہ آپ کی نواسی آئیں تو بیان نہیں کرسکتا مجھے کیسی مسرت حاصل ہوئی تھی خیال تھا موسم کی مناسبت سے حلوہ پوری وغیرہ بنا کر لائی ہوں گی مگر ہائے افسوس ایسے نصیب والے بھی کہاں ہیں ہم کہ جو آرزو کریں وہ جھٹ سے پوری ہو جائے۔''

''ہائے بچے صبح سے بھوکے بیٹھے ہو یہ ساتھ تو ہمارا گھر تھا دروازہ کھٹکھٹا دیتے زیبا تمہیں ناشتا بنا دیتی۔''

''کون زیبا؟''

''میرا نام زیبا ہے۔'' اس نے دھیرے سے یاد دلایا۔

''بہت شکریہ نانی جان! ایسے پُر خلوص لوگوں کے لیے میرے دل میں خود بخود جگہ بن جاتی ہے میں آپ کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔''

''جاؤ بیٹی! باورچی خانے کا پوچھ لو اور بھائی کے لیے ناشتا بنا دو۔''

''کیا؟ آپ کے بھائی نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟''

''میرا تو کوئی بھائی نہیں نانی آپ کے لیے ناشتا بنانے کو کہہ رہی ہیں۔''

''میرا نام وامق ہے۔ وامق فرحان۔'' اس نے وضاحت کی۔

''کچن کس طرف ہے؟'' نانی نے پھر اشارہ کیا

تو اسے اٹھنا پڑا ورنہ پرائے گھر میں جہاں معلوم ہی نہیں کون سی چیز کہاں رکھی ہے ناشتا بنانا اسے خاصا مشکل لگ رہا تھا۔

اس نے اشارے سے بتا دیا اور خود نانی کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بیٹا! تمہارے دادا بیمار تھے کیا؟''

''نہیں، بیمار کہاں تھے سنا ہے چنگے بھلے تھے اچانک ہی ظالم موت نے آن دبوچا۔ ہائے ہائے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

افسوس اور دکھ کا گہرا تاثر اس وقت اس لڑکے کے چہرے پر دیکھا جاسکتا تھا۔

''رشتے کے دادا بتایا ہے نا تم نے؟''

''جی ہاں، وہ میری بہن کے شوہر کے چچا تھے۔ سسرال کا معاملہ تھا اس لیے بھی سب سویرے ہی سویرے چل پڑے۔ مجھے بھی جگایا تو بہتیرا تھا مگر میں اس وقت ایک بڑا ہی اچھا خواب دیکھ رہا تھا کہہ دیا میرے جانے سے وہ زندہ تھوڑی ہو جائیں گے، مجھے سو یا رہنے دیں آپ لوگ ہو کر آئیں ویسے بھی گھر میں کسی نہ کسی کو تو ٹھہرنا تھا۔''

نانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ یہ سب مذاق کے رنگ میں کہہ رہا ہے یا اس کے بات کرنے کا انداز ہی ایسا ہے۔

''میں آپ کو اپنے بنٹی سے ملواتا ہوں۔ بڑا ہی شریر اور ہنس مکھ ہے، آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

وہ اٹھ کر بنٹی کو لینے چلا گیا اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زیبا ناشتا بنا کر لے آئی۔

کہاں گئے؟ آپ اکیلی بیٹھی ہیں۔''

''کسی بنٹی کو لینے گیا ہے کہتا ہے بڑا پیارا بچہ ہے۔''

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ وہ تو اس کی بکری کا نام ہے۔

''اچھا میں سمجھی کوئی بھانجا بھتیجا ہوگا' یہ لڑکا مزاج کا اچھا ہے، مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا،

باتیں کچھ عجیب سی ہیں اس کی۔''

''نانی! ان کا گھر کتنا پیارا ہے' اور یہ صوفے کتنے نرم نرم ہیں بیٹھ جاؤ تو اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

نانی نے سرسری انداز میں نگاہ ادھر ادھر دوڑائی اور ہلکے سے ہنکارا بھرا' پھر بولیں۔

''وہ بتا رہا تھا۔ گھر میں نہ تو انڈے ہیں نہ توس تم نے ناشتا کیا بنایا ہے۔''

''ان کے فریج میں تھوڑا قیمہ پڑا تھا۔ آٹا بھی گندھا ہوا رکھا تھا۔ قیمے والا پراٹھا بنایا ہے اور ساتھ میں دہی ہے۔''

''دہی میں کالی مرچ' نمک اور زیرہ ڈال لینا تھا۔''

''جی نانی جان! ڈال دیا ہے۔''

''یہ دیکھیے یہ ہے بنٹی! آپ کے بارے میں بتایا تو خوش ہو کر آپ سے ملنے کے لیے آگیا ہے ورنہ بڑے نخرے دکھاتا ہے، ہر کسی سے نہیں ملتا۔''

بنٹی کو لا کر نانی کے برابر والی کرسی پر بٹھا دیا اور خود ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

''آہا! کتنے دنوں کے بعد ایسا مزے کا ناشتا کر رہا ہوں' آپ کا بہت شکریہ۔''

''چائے بناؤں؟''

''نہیں صبح سے نجانے کتنے کپ چائے کے پی چکا ہوں۔ اب مزید نہیں پی سکتا۔''

''بیٹا! تم کیا کرتے ہو آج کل؟''

''نانی! میں ہر فن مولا ہوں، سب کچھ کرتا ہوں اور آج کل ہی کیا میں تو شروع سے بیک وقت کئی منصوبے شروع کرنے کا عادی ہوں۔ دیکھیے ناں اس طرح ناکامی کے امکانات خاصے کم ہو جاتے ہیں کہ آخر ایک آدھ منصوبہ تو پایۂ تکمیل تک پہنچ ہی جاتا ہے' کیوں آپ کی کیا رائے ہے؟'' اس نے خاموشی سے بنٹی کو دیکھتی زیبا کو متوجہ کیا۔

وہ جواب دینے کے بجائے نانی کو دیکھنے لگی کہ واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا' کیا کہنا چاہیے اس کی اس بات سے سراسر اختلاف تھا مگر یہ کہہ دینا بھی کچھ مناسب نہیں تھا۔

نانی بھی خاموشی سے وامق کی بات سن رہی تھیں وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگا تو بولیں۔

"میرا مطلب تھا بیٹا! پڑھتے ہو یا کہیں ملازم ہو؟"

"پڑھتا بھی ہوں اگر اتنے سارے منصوبوں سے ٹائم بچ جائے تو ویسے میں حیرت انگیز حد تک ذہین ہوں۔ ایک بار کتاب پر نظر دوڑا لوں تو سب یاد ہو جاتا ہے اگر ذرا محنت کروں تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ سکتا ہوں مگر مجھے توڑ پھوڑ سے سخت نفرت ہے آپ پڑھتی ہیں؟ اس نے زیبا سے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ زیبا جواب دیتی نانی بولیں۔

"ہاں بے چاری پڑھ رہی ہے اور یہ اسی کی ہمت ہے ورنہ جس طرح کے حالات تھے اور جتنی یہ نازک مزاج ہے اس کا پڑھائی کر لینا کسی معجزے سے کم نہیں۔"

"کیسے حالات؟" اس نے پوری طرح دلچسپی لی۔

"میرا خیال ہے اب ہم چلتے ہیں پھر کسی روز آئیں گے جب آپ کی پھپھو اور امی گھر پر ہوں گی۔" زیبا نے نانی کو کچھ بتانے نہیں دیا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس گھر میں میری پھوپھو بھی رہتی ہیں؟" اس نے آنکھیں نچا کر حیرت کا اظہار کیا۔

"ہمیں جنید نے بتایا تھا وہ بھی بڑا سلجھا ہوا بچہ ہے اور بڑا ہی نیک فطرت بڑی مدد کی اس نے میری۔"

"اچھا تو جنید کو بھی جانتی ہیں مگر کیسے؟" اس کی بے چینی اور بھی بڑھی۔

نانی نے اسے تفصیل سے جنید کی اپنے ہاں آمد کے بارے میں بتایا۔

"اوہ تو اس کا مطلب ہے جنید گھر تک ہو آیا ہے اب میری باری ہے میں بھی چکر لگاؤں گا۔"

"ضرور ضرور تمہارا اپنا گھر ہے۔"

"اب ہم چلتے ہیں۔" زیبا اٹھ کر کھڑی ہوئی نانی نے بھی اپنی چکن کی آف وائٹ چادر سنبھالی یہ چادر وہ گزشتہ کئی برس سے استعمال کر رہی تھیں پہلے اس کا رنگ سفید ہوتا تھا مگر یہ سفید رنگ کب تک سفید رہتا۔ آخر نانی نے اسے آف وائٹ کلر کرا لیا۔

"اتنا اچھا ناشتہ بنانے کا بہت شکریہ" اس نے زیبا کو مخاطب کیا وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ جب دونوں گھر واپس آئیں تو نانی کو اس گھر کی خواتین سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بے حد افسوس تھا۔

"یونہی حفاظت سے رکھا ہوا زیور نکالا اگر علم ہوتا گھر پر نہیں ہیں تو کاہے کو اتنی تیاری کرتی۔"

وہ اتنا کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئیں کہ یہ جو سوٹ آج وہ پہن کر گئی تھیں۔ یہ بہت نرم ملائم قیمتی لان کا تھا اور وہ صرف کہیں خاص جگہوں پر آنے جانے کے لیے ہی استعمال کرتی تھیں۔

زیبا اکیلی بیٹھی اس گھر کے بارے میں سوچنے لگی ہائے وہ کچن تھا کیسا قیمتی سامان اور میں تو جانتی بھی نہیں پتا نہیں کون کون سی بجلی کی مشینیں تھیں وہاں پر پھر کراکری ایسی خوبصورت فریج میں اتنا ڈھیر سارا پھل کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے پاس اتنی دولت ہے۔ ایک ہم ہیں یہ ٹوٹا پھوٹا مکان ہے اور وہ بھی اپنا نہیں اگر یہ گھر اپنا ہوتا تو چلو آہستہ آہستہ مرمت ہی کروا لیتے۔

"زیبا! تم کیا سوچ رہی ہو چلو آؤ کیاریاں بناتے ہیں۔"

"نانی! ان لوگوں کا کچن دیکھنے کے قابل ہے اتنا قیمتی سامان رکھا ہوا تھا وہاں پر اور کھانے پینے کا سامان بھی بہت تھا خاصے امیر لوگ ہیں وہ۔"

"ہمیں ان کی امارت غربت سے کیا لینا دینا مزاج کے اچھے ہوئے تو اچھے ہیں ورنہ پھر میں تو نہ جاؤں گی ان کے گھر ویسے اچھے ہی لگتے ہیں۔ گھر کی عورتیں اچھے اخلاق والی ہوں تب ہی بچوں کی تربیت بھی اچھی ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی لڑکے اچھے اخلاق والے ہیں۔"

جس وقت نسیمہ بازار سے گھر واپس آئیں یہ دونوں ایک لمبی سی کیاری بنا چکی تھیں۔

''بڑی جلدی آگئیں آپ دونوں' پڑوسیوں کے ہاں سے؟''

''وہ لوگ گھر پر ہی نہیں تھے۔ بس ایک لڑکا گھر میں موجود تھا ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگئے۔''

وہ سر ہلا کر کچن میں چلی گئیں اور لایا ہوا سودا سلف رکھنے لگیں۔

بادل اب پہلے سے زیادہ گہرے ہوگئے تھے' لگتا تھا ایک بار پھر زور کا مینہ برسے گا۔

''پتا نہیں پڑوس کی عورتیں کب واپس آئیں وہ لڑکا بے چارہ بھوکا پیاسا رہے گا۔'' دوپہر میں بھی جب امی گوشت کا مسالہ بھون رہی تھیں تو نانی کو رہ رہ کر وامق کا خیال آرہا تھا۔

''نانی جان! اب ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے ان کے فریج میں ڈھیروں ڈھیر پھل رکھے ہوئے تھے۔ دودھ بھی موجود تھا بھوک لگے گی تو کچھ بھی کھالے گا۔''

''اے نسیمہ! تم بازار گئی تھیں' موسم ایسا اچھا ہو رہا ہے۔ سوجی ہی لے آتیں، شام میں حلوہ بنالیتے۔'' اب اس عمر میں آکر نانی کی اور تو کوئی مصروفیت رہی نہ تھی۔ دھیان کھانے پینے کی طرف ہی رہتا تھا۔

''اماں! سوجی تو گھر میں موجود ہے مگر مجھے تو یہ بادل دیکھ کر فکر ہو رہی ہے۔ خستہ حال دیواریں ہیں گھر کی' کہیں کوئی دیوار گر نہ پڑے۔ کچھ بھی بنانے اور کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔''

''چار دیواری پرانی ضرور ہے مگر میں جائزہ لے چکی ہوں۔ چنائی اچھی کی گئی ہے۔ بظاہر دیوار جھڑتی دکھائی دے رہی ہے' مگر اندر سے حالت اتنی بری نہیں ہے۔ یہ کوئی آج کا بنا ہوا مکان تو ہے نہیں کہ ایک سال بنانے کو ہوا اور ادھر زور کی آندھی چلی ادھر دیوار سجدہ ریز ہوگئی۔ پرانی عمارت ہے اور خاصی مضبوط ہے تم اس طرف سے تو بے فکر رہو۔''

''امی! ہمسائیوں کے گھر میں اتنے بڑے بڑے گلاب ہیں اور ان کے ہاں جامن کا پیڑ بھی ہے' خوب موٹے موٹے جامن لگے ہوئے تھے' اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک پلیٹ جامن ہی ادھر بھیج دیں۔ ہم نے کل سموسے بھیجے آج میں نے ناشتا بنا کر دیا۔ سچ ہے امیر لوگوں کے دل بڑے تھوڑے ہوتے ہیں' یہ ہم جیسے ہی ہیں جو ہر کسی کے کام آنے کو تیار رہتے ہیں' ویسے امی اگر ہم امیر بھی ہو جائیں تب بھی ہمارے دل تو سخی ہی رہیں گے ہم تو کسی سے برائی کر ہی نہیں سکتے۔''

''تم اٹھ کر کپڑے الماری میں رکھ لو کل میں نے دھوئے تھے آج بھی کرسی پر اسی طرح پڑے ہیں۔''

وہ سستی سے اٹھ کر اندر آگئی کپڑے تہہ کرتے ہوئے بھی یہ سوچتی رہی اگر اللہ مجھے دولت دے گا تو میں اس طرح اتراؤں گی نہیں جو مستحق ہوگا اس کی مدد کروں گی اور بہت اچھا سا گھر بناؤں گی۔''

کام سے فارغ ہو کر وہ بستر پر آلیٹی اور اسی بارے میں سوچتی رہی۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ خود کو ایک امیر کبیر لڑکی کے روپ میں دیکھا کرتی تھی جس کے پاس قیمتی کپڑوں اور جیولری کا ڈھیر تھا۔ جس کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ اور وہ لڑکی جب بازار جاتی تھی تو ڈھیروں شاپنگ کیا کرتی تھی۔ یہی خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھتی وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

شام کو امی نے اسے جگایا تھا، وہ جاگنے کے باوجود اٹھنے میں سستی کر رہی تھی۔

''اب اٹھ بھی جاؤ پڑوس سے ایک لڑکی اور دو عورتیں آئی ہیں۔''

تب وہ ایک دم سے جاگ گئی۔ بالوں کی چوٹی دوبارہ بناتی تو خاصا ٹائم لگ جاتا۔ بس اوپر سے برش پھیرا منہ دھویا اور نانی کے کمرے میں چلی آئی جہاں مہمان بیٹھی تھیں۔ دونوں خواتین سے تو وہ مل چکی تھی اب لڑکی سے ملاقات ہوئی اور بتایا یہ فرح ہے، ہم اسے فری کہتے ہیں۔''

نانی' امی اور دونوں خواتین باتیں کرنے لگیں' وہ اور فرح خاموش بیٹھی بس ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

''لڑکیو! کچھ بات کرو' فری ویسے تو تمہیں بڑا شوق تھا کہ تمہاری کوئی دوست تمہارے گھر کے قریب بھی رہتی ہو اور اب کیسے منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ گئی ہو۔''

''وہ اصل میں ہم' آپ لوگوں کی باتیں سن رہے تھے۔''

''کیا بتاؤں خالہ جی! ہم یہاں کتنا بور ہوتے رہے ہیں۔ آپ کو تو علم ہی ہے اس جگہ پر آبادی کوئی خاص نہیں' یہاں سے تھوڑی دور آبادی ہے مگر وہاں کے لوگ ان پڑھ اور مزدور قسم کے ہیں۔ یہاں جو چند ایک گھر ہیں۔ ان میں فیملی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ادھر ایک ملک صاحب ہیں وہ ایک ملازم کے ساتھ اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہیں اور سامنے والے گھر میں جو میاں بیوی رہتے ہیں ان سے تو اللہ بچائے اور' دونوں ہر وقت مرچیں چبائے رکھتے ہیں پھر اس سے آگے جو دو مکان ہیں وہ کسی نے کرائے پر لے کر وہاں پلاسٹک کی بوتلیں بنانے کی مشینیں لگا رکھی ہیں۔ ہم تو سمجھیں بالکل ویرانے میں ہی بیٹھے تھے آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے کل جنید آپ کے ہاں سے ہو کر گیا تو آپ کی بڑی تعریف کر رہا تھا کہہ رہا تھا' بہت نیک اور اچھے مزاج کی نانی اماں ہیں پھر آج واثق نے بتایا کہ آپ لوگ ہم سے ملنے آئی تھیں اور کل جو سموسے بھیجے تھے ان کا بھی واثق نے آج بتایا۔ میں نے تو خوب ڈانٹا کہ ہمارا حصہ رکھا ہی نہیں خود ہی سب کھا گیا۔''

''بچے ایسی شرارت تو کرتے ہیں۔'' امی نے کہا تو واثق کی امی بولیں۔

''وہ صرف شرارت ہی کرتا ہے اور کچھ نہیں آتا اسے' اب صبح آپ لوگ آئیں' بجائے اس کے کہ وہ مہمانوں کی خاطر مدارت کرتا الٹا باجی سے ناشتا بنوا کر کھایا اس نے' بہت ڈانٹا ہے میں نے اس کو۔''

''کوئی بات نہیں' اپنا ہی بچہ ہے اسے بھوک لگ رہی تھی ناشتا بنا دیا تو کیا ہوا؟''

''مگر خالہ جی! اس نے مہمانوں کو پانی تک نہیں پوچھا۔ سچ ہم تو سخت شرمندہ ہیں آپ سے۔''

''بیٹی! شرمندگی کا ہے کی' لڑکے ایسے ہی لاابالی ہوتے ہیں' بھلا انہیں مہمان داری کا کیا علم۔''

فری' زیبا سے اس کی تعلیم سبجیکٹ وغیرہ کے بارے میں پوچھنے لگی پھر بات پسند ناپسند تک پہنچی بھلا اس کا اور فری کا کیا مقابلہ۔ شوق تو دونوں کو شاپنگ کا تھا مگر زیبا کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے تھے کہ وہ یہ شوق پورا بھی کر سکے جبکہ فری اسے بتا رہی تھی فلاں مارکیٹ میں کپڑا اچھا ملتا ہے جیولری میں وہاں سے خریدتی ہوں کاسمیٹکس یہاں سے' زیبا بس خاموشی سے سنتی رہی۔

''میرا ٹیلر بہت اچھا ہے میں ریڈی میڈ خریدنے کے بجائے ڈیزائن بتا کر سلوا لیتی ہوں اپنا خریدا ہوا کپڑا ایک تو پائیدار ہوتا ہے' اور پھر مجھے خود سے کپڑا خریدنے اور پھر سلوانے میں مزا بھی بہت آتا ہے۔ تم کپڑے کہاں سے سلواتی ہو؟''

آخر وہ سوال آ ہی گیا جس سے زیبا خوفزدہ ہو رہی تھی۔

''بیٹا! ہم تو کپڑے گھر پر ہی سی لیتے ہیں۔'' امی نے بتایا نانی بولیں۔

''نسیمہ کو تو بڑا شوق تھا سلائی بنائی کا' جبکہ زیبا کو تو ہم نے زبردستی ہی سکھائی ہے' اور سلائی کڑھائی بھی بس اس نے اسی لیے سیکھ لی کہ اپنے کپڑے اچھے ڈیزائن کے بنا سکے۔''

''اچھا تو آپ خود سی لیتی ہیں دکھائیں کوئی سوٹ!'' فری بڑے شوق سے کہہ رہی تھی۔ شکر ہوا ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک نیا سوٹ بنایا تھا۔ فان کلر پر بلیک اور میرون کڑھائی کی تھی۔ سلائی اتنی صاف' کٹنگ فٹنگ شان دار اور سب سے بڑھ کر ایمبرائیڈری تینوں دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ فری از حد متاثر دکھائی دینے لگی۔

''کیا آپ یہ ڈیزائن مجھے دیں گی؟'' وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

''جی کیوں نہیں۔'' اس نے فراخ دلی دکھائی۔

"ایسا اچھا تو میرا ٹیلر بھی نہیں سیتا۔"

"فری بیٹا! تم آج کل فارغ ہی ہو' موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور زیبا سے کچھ سیکھ لو' یہ بڑی گنوں والی بچی ہے۔"

فرح کی والدہ ناصرہ بیگم اسے سمجھا رہی تھیں، مگر فرح اچھی خاصی کام چور واقع ہوئی تھی اور پھر جب اللہ نے اتنا دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی چیز چند پیسے خرچ کر کے خرید سکتی تھی تو پھر اتنی محنت اور جانفشانی کی کیا ضرورت تھی۔

"اگر کچھ سلوانا ہو تو زیبا کو دے دینا' یہ سلائی کر دے گی۔"

نانی کی اس پیشکش پر فری نے بے یقینی سے زیبا کی طرف دیکھا اس نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی۔

"مجھے بھلا گھر میں کام ہی کیا ہوتا ہے۔ کھانا پکانا اور صفائی کرنا گھر کی' بس اس کے بعد میں فارغ ہی ہوتی ہوں آپ جب چاہیں مجھ سے سوٹ سلائی کروالیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں بازار جاؤں گی، اور اسی کلر کا سوٹ لے کر آؤں گی بالکل ایسا ہی سی کر دینا۔"

"دیکھو کیسی اچھی بچی ہے۔ کتنی گنوں والی ہے گھر کے سارے کام بھی کرتی ہے اور سلائی کڑھائی بھی خود کرتی ہے۔ ایک تم ہو سارا دن فارغ بیٹھی رہتی ہو اور پھر بھی کوئی کام کہے تو جواب ہوتا ہے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" اس کی امی یہیں بیٹھی اسے ڈانٹنے لگیں مگر فری اچھی خاصی لاپروا لڑکی تھی اس ڈانٹ ڈپٹ کا نہ تو برا مانا اور نہ ہی کوئی اثر لیا۔

پھر وہ لوگ جانے کی اجازت لے کر اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر چلی گئیں۔

"کیسے اچھے ہمسائے ملے ہیں ہمیں۔" امی بہت خوش تھیں' اور ان لوگوں کے سادہ مزاج کی تعریف کر رہی تھیں۔

نانی بھی تعریف کرتی رہیں، جبکہ زیبا خاموش بیٹھی تھی وہ کچھ اداس سی ہو رہی تھی پتا نہیں کچھ لوگ اتنے امیر اور کچھ اتنے غریب کیوں ہوتے ہیں۔ فری نے کتنے خوبصورت ٹاپس پہن رکھے تھے' نگ اتنا چمکدار کہ روشنی اس کے چہرے پر پڑتی تھی اور نیل پالش کا کلر بھی بڑا خوب بصورت تھا ہوگی کسی مہنگی سی کمپنی کی میرے حصے میں تو یہی ایک میڈ ورا آتی ہے اور اس میں چند ایک کلر ہی مجھے پسند ہیں۔ بس بار بار وہی استعمال کیے جاؤں اور فری نے سینڈل بھی کیسی اچھی پہن رکھی تھی حالانکہ اس کا رنگ اتنا صاف نہیں مگر وہ سینڈل اس کے پاؤں میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"زیبا! تم کیا سوچنے بیٹھ گئیں؟" امی کسی کام سے باہر نکلیں تو نانی کی توجہ اس کی طرف ہوئی۔

وہ گہری سی سانس کھینچ کر بولی۔

"نانی جان! بس میں ایسے ہی الٹی سیدھی سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔"

"ہاں، پھر بھی پتا تو چلے اتنی اداس اور خاموش کیوں دکھائی دے رہی ہو۔"

"نانی جان! یہ کیسی ناانصافی ہے دنیا میں کوئی اتنا امیر اور کوئی اتنا غریب، میں ایک ایک چیز کو ترستی ہوں، مجھے کتنا شوق ہے اچھے کپڑوں اور خوبصورت جیولری کا' مگر میرے پاس اتنے پیسے ہی کب ہوتے ہیں، میں تو بس یہ سب خواب میں ہی دیکھ سکتی ہوں، اچھا سا خوبصورت گھر' جس میں قیمتی فرنیچر ہو ایسا کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، ہائے، یہ سب ہماری قسمت میں کہاں نانی مجھے تو آپ پر بھی رشک آتا ہے کہ آپ نے جوانی بہت اچھے ماحول میں گزاری ہے' آپ کو کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑا' آپ نے جو چاہا حاصل کر لیا، زندگی تو یہی ہے۔"

"زیبا! تم نے پہلے تو کبھی ایسی بات نہیں کی۔"

نانی شدید حیرت کے عالم میں تھیں وہ چپ رہی اور سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی نانی کے چہرے پر دکھ اور تھکن کے سائے پھیل گئے۔

"زیبا! کیا ہوا' کچھ تو بولو کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"بس نانی! یہ میری خواہش ہے۔ مجھے بڑے بڑے خوبصورت گھر اچھے لگتے ہیں۔"

اس کی خواہش جان کر نانی کچھ خاموش سی ہوگئیں۔ ان کے چہرے پر تفکر اور آنکھوں میں ایک سوچ تھی۔

نماز میں نانی سجدے تو پہلے بھی طویل کرتی تھیں مگر آج جب انہوں نے نماز پڑھی تو سجدے پہلے سے بھی طویل ہوگئے اور آنسو آنکھوں سے ایک تواتر سے بہتے رہے۔

☆☆☆

فری دوسرے روز ہی بازار جاکر کپڑا خرید لائی تھی۔

"دیکھو یہ نا وہی کلر۔"

"ہاں کلر تو وہی ہے" زیبا نے کپڑے پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائمت پر غور کیا۔ یہ کپڑا اس کے سوٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ قیمت کا ہوگا۔

"میں آج ہی اس پر ٹریس کرکے کڑھائی شروع کردوں گی، کڑھائی میں کافی دیر لگتی ہے۔ اس لیے آپ کو کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

"یہ آپ جناب کیا ہوا۔ بس اب ہم اچھی دوست ہیں ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہیے اور مجھے کچھ ایسی جلدی بھی نہیں ہے تم آرام سے سوٹ تیار کرلینا۔"

"وامق کہہ رہا تھا ہم مانی کی سالگرہ منائیں گے تو میں سوچ رہی ہوں۔ یہ سوٹ اس کی سالگرہ پر پہنوں تم بھی ایسا ہی پہننا، اچھا لگے گا دونوں کا ایک جیسا۔"

"مانی کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مانی ہمارا بھانجا ہے نائلہ باجی کا بیٹا۔ نائلہ باجی وامق کی بڑی بہن ہیں، یعنی میری ماموں زاد، پہلے ہم لوگ فیصل آباد میں رہا کرتے تھے تب بھی میرے پپا ملک سے باہر تھے، پھر جنید بھائی نے ادھر لاہور میں ایڈمیشن لے لیا تو ہم بھی ادھر ماموں کے پاس آگئے نائلہ باجی اپنے گھر کی ہیں بھی کبھار ہی آتی ہیں گھر میں میری تو کوئی ہم عمر نہیں مگر پھر بھی اکٹھے رہنے میں مزا آتا ہے۔ یہاں گھر میں وامق، رونق لگائے رکھتا ہے۔ جنید بھائی خاموش طبیعت کے مالک ہیں، معصوم سے ہیں۔ وامق کے ساتھ ان کی کافی دوستی ہے حالانکہ دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ زیبا تم آؤ ناں کسی روز ہمارے گھر؟"

"ہاں میں امی اور نانی کے ساتھ آؤں گی وہ دونوں پروگرام تو بنا رہی ہیں، دیکھیں کب تک تم لوگوں کے گھر آتی ہیں۔"

"یہ ساتھ تو گھر ہے ہمارا۔ تم اکیلی بھی تو آسکتی ہو کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے۔ میں تمہیں اپنی جیولری اور چیزیں دکھاؤں گی۔"

☆☆☆

فری کو گھر میں کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا اور باتیں کرنے کو اسے کوئی دوست چاہیے تھا بس وہ آتی تو واپس جانا جیسے بھول ہی جاتی زیبا کچن میں کام کررہی ہے تو وہ کچن کے دروازے کے سامنے برآمدے میں کرسی رکھے بیٹھی ہے اور دنیا جہان کے قصے چل رہے ہیں۔ وہ کسی کام سے کمرے میں آتی ہے تو بھی فری پیچھے ہے۔

"چلو زیبا کو بھی کوئی دوست تو ملی، بے چاری سارا دن خاموشی سے ادھر ادھر کے کام نبٹاتی پھرا کرتی تھی۔" امی فری کی آمد سے خوش تھیں۔

جبکہ نانی کل سے کچھ خاموش سی تھیں، اب جو فری ان کے ہاں آئی تھی تو انہوں نے فری اور پھر اپنی زیبا کو بغور دیکھا تھا فری عام سی شکل وصورت کی مالک لاپرواسی لڑکی تھی جس نے نفیس لان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور گلے میں سونے کی خوبصورت چین تھی۔

جبکہ اس کے مقابلے میں ان کی زیبا کیسی پیاری صورت کی مالک تھی۔ عام سے کپڑوں میں بھی اس کا روپ جیسے دمکتا تھا۔ اس کے لہجے اور چال میں ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی، اور وہ بہت سلیقے سے بات کرنے کی عادی تھی۔

''خدایا میری بچی کا نصیب اچھا کرنا' اسے زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ آنے دینا۔''

دونوں لڑکیاں کچن میں تھیں۔ جب نانی نے نسیمہ بیگم سے کہا۔

''ہم جب ان کے ہاں جائیں گے تو یاد سے فرح کی امی سے پوچھنا اس لڑکی کا رشتہ کہیں طے ہو چکا ہے یا نہیں۔''

''کیوں اماں! آپ بھلا اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہیں' کوئی لڑکا ہے نظر میں؟'' نسیمہ ان کی بات سن کر مزاح کے رنگ میں بولی تھیں۔

ان کی بات جیسے نانی نے سنی ہی نہیں خود کلامی کے انداز میں بولیں۔

''اگر طے ہو گیا ہے یا نہیں بھی ہوا تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے' ویسے بھی لڑکے تو دو ہیں ان کے گھر میں اور جنید تو فرح کا بھائی ہوتا ہے۔'' پھر ان کے چہرے پر اطمینان سا جھلکنے لگا۔

فرح نے دوپہر کو کھانا بھی ان کی طرف کھایا اور جب جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی تو وامق آ گیا۔ دروازہ امی نے کھولا، نانی اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ دروازے پر کھڑے وامق کو دیکھا تو لپک کر گئیں اور اسے اندر لے آئیں۔

''نانی! میں تو فری کو لینے آیا تھا۔ اسے یہ یاد دلانا تھا کہ اس کا گھر یہ نہیں بلکہ ساتھ والا ہے۔''

''کیوں کوئی کام تھا فرح سے؟'' نانی نے اس کے چہرے کو جانچنے والی نظر میں رکھ کر سوال کیا۔

''اس نکمی لڑکی سے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اسے تو بندہ کچھ کہہ کر پچھتاتا ہے۔''

انہیں قدرے اطمینان ہوا سر ہلا کر بولیں۔

''بیٹھو اب آئے ہو تو کچھ شربت' چائے وغیرہ پی کر ہی جانا۔''

''کیوں نہیں نانی یہ تو مہمان کا حق ہوتا ہے۔'' وہ بھی جھٹ بیٹھ گیا۔

نانی زیبا کو آوازیں دینے لگیں وہ اپنے دھیان میں کمرے میں سے نکلی' یوں کہ دوپٹہ گلے میں تھا اور پیروں میں چپل بھی نہیں تھی۔ پھر جونہی نگاہ اس پر پڑی' جھجک کر رک گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔ وامق اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور نگاہوں کی تپش زیبا کے ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی۔

''کیا پیو گے بیٹا؟ چائے یا شربت؟ شربت فالسے کا ہے۔ ہم نے گھر میں تیار کیا ہے بہت ذائقے دار ہے۔''

''چلیں پھر آج شربت ہی پی لیتا ہوں جب اگلی مرتبہ آؤں گا تب چائے پلوا دیجئے گا۔''

''کیوں نہیں بچے تمہارا اپنا گھر ہے۔ جم جم آؤ۔''

''ہا وامق! تم کب آئے؟'' فری نے کمرے کے دروازے سے جھانکا اور اس کی یہاں آمد پر شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''میں تمہیں سارے شہر میں تلاش کرنے کے بعد آخر کار یہاں پہنچا ہوں۔ یہ بتاؤ' کچھ یاد بھی ہے کہ تمہارا ایک گھر بھی ہے جہاں تمہاری امی۔ ممانی اور ایک عدد ہونق بھائی رہتا ہے۔''

''ہونق کس کو کہا؟ جنید بھائی کو' اچھا میں جاتے ہی تمہاری شکایت لگاؤں گی۔''

''لگا دینا شکایت۔ میں بھی بتا دوں گا کہ پیار سے کہا ہے۔''

پھر اس نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی۔

''تینوں ہی یہاں موجود ہیں، شربت کون بنائے گا۔''

''زیبا! جاؤ جلدی سے بنا کر لاؤ' بچے کو پیاس لگ رہی ہے۔''

''بچہ پیاسا نہیں بھوکا ہے۔'' فری نے جھٹ سے کہا۔

''اور تم جو صبح سے یہاں آئی بیٹھی ہو۔ پتا نہیں ان کا بجٹ کتنا ڈسٹرب ہوا ہوگا آج۔''

''نہیں' یہ تو بڑی پیاری بچی ہے۔ زیبا سے تو بہت دوستی ہو گئی ہے اس کی۔'' نسیمہ' فرح کو بہت پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں جبکہ نانی' وامق کو

بتانے لگیں کہ زیبا کھانے کے علاوہ سلائی کڑھائی میں بھی پوری مہارت رکھتی ہے اور فرح کا سوٹ بھی وہ سی رہی ہے۔

''فرح! تمہیں شرم نہیں آتی ایک تو وہ گھر کا کام سنبھالتی ہے اور تم نے اسے اپنے کپڑے بھی سینے کے لیے دے دیے ہیں۔''

''تم کیوں جلتے ہو۔ ہم تو سہیلیاں بن گئی ہیں جیسے زیبا میرا کام کر رہی ہے ایسے ہی میں بھی اس کا کوئی کام کر دوں گی۔''

''تم صرف کام خراب کر سکتی ہو۔''

''ایسے ہی خوامخواہ۔'' فرح نے ناراضی دکھائی اور وامق نانی کو اس کے پھوہڑ پن کے قصے سنانے لگا جنہیں سن کر نانی کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بے حد تسلی ہوئی کہ وامق کو اس لڑکی میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی اور برائیاں بے شمار یاد رکھے ہوئے ہے۔

زیبا شربت لے کر آ گئی وامق نے پیا اور بہت تعریف کی۔ نانی نے وامق سے کہا۔

''بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے آتے جاتے رہا کرو۔''

''جی ضرور کیوں نہیں''

''ہاں نانی جان! جہاں کھانے پینے کو اچھی چیزیں مل رہی ہوں وہاں تو وامق بھائی ضرور جائیں گے۔'' فری نے جل کر کہا۔

جواب میں وہ پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

''واقعی اس گھر میں سلیقہ بہت ہے۔ کھانا بھی اچھا بنتا ہے۔ صفائی ستھرائی بھی دیکھو کتنی اچھی کی گئی ہے۔''

پھر نسیمہ سے بولا۔ ''آنٹی! کچھ روز کے لیے فری کو اپنے ہاں رکھ لیں اور ٹریننگ دیں اسے۔''

''فری بیٹی کو کیا ضرورت ہے گھر کے کام کاج کرنے کی بڑے گھر کی بیٹی ہے بیاہ کر بھی بڑے گھر میں جائے گی۔''

نانی کی اس بات پر فری' وامق کو چڑانے کے انداز میں مسکرا دی جبکہ زیبا کو دھچکا سا لگا تھا۔ کیا بڑے گھر کی بیٹیاں ہی بیاہ کر بڑے گھروں میں جا سکتی ہیں ہم جیسیوں کے مقدر میں جھاڑو اور چولہا ہی لکھا ہے یہ انصاف تو نہیں ہے۔

جتنی دیر یہ لوگ بیٹھے رہے' وہ خاموش اپنی سوچ میں گم بیٹھی رہی پھر وامق' فرح کو لے کر چلا گیا تو نانی بولیں۔

''لڑکیوں میں طریقہ سلیقہ ضرور ہونا چاہیے گھر میں چاہے کتنے بھی ملازم ہوں اگر مالکن توجہ نہ دے تو گدھے لوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔''

''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں فرح کو کام کاج سیکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔'' امی نے کچھ حیرت کے انداز میں انہیں یاد دلایا۔

انہوں نے سن کر بھی ان سنی کر دی اور بولیں۔

''یہ برتن کچن میں رکھ آؤ برسات کا موسم ہے مکھیاں بھی بہت ہو رہی ہیں۔ دھو کر خشک کر کے رکھو تو بہتر ہے۔''

نسیمہ برتن اٹھا کر لے گئیں تو زیبا سے بولیں۔

''میری بچی! میں دیکھ رہی ہوں تم بولتے بولتے یکدم سے چپ ہو گئی ہو۔ خیر تو ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کہیں سر میں درد تو نہیں ہو گیا؟ وہ بچی فرح بولتی بھی تو بہت ہے۔''

''نہیں نانی! وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے' میں تو آپ کی کہی بات کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ یہ کیسا چلن ہے دنیا کا۔ امیر کی بیٹی بیاہ کر بھی امیر کے گھر میں جاتی ہے اور غریب کی بیٹی لاکھ خوبیوں کی مالک ہو پھر بھی اس کے نصیب میں ایک جھونپڑے کے بعد دوسرا جھونپڑا ہی لکھا ہوتا ہے۔ وہ محلوں کے خواب تو دیکھ سکتی ہے مگر رانی بن نہیں سکتی۔''

نانی نے اس کے دکھ اور حسرت کو دل سے محسوس کیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد بولیں۔

''یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ کوشش سے نظام کو بدلا جا سکتا ہے۔ بس ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور نہ ہی جی چھوٹا کرنا چاہیے تم ایسی باتیں سوچ سوچ کر اپنا دل خراب نہ کرو سارے کھیل قسمت کے ہوتے

ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو میرے ابا کتنی بڑی جائیداد کے مالک تھے مگر بیاہ کر میں درمیانے درجے کے زمینداروں کے ہاں آئی تھی۔ جہاں کا ماحول میرے میکے کے گھر کے ماحول کے مقابلے میں بے حد اجڈ اور غریب سا تھا مگر میں نے صبر شکر کر کے وہ وقت کاٹ ہی لیا اور اب تو وہ درمیانے درجے کا زمیندارہ بھی پاس نہیں۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ اس بات کو سمجھو وقت ایک سا نہیں رہتا حالات بدلتے دیر نہیں لگتی' بس تدبیر ساتھ ساتھ ہونا چاہیے تمہیں اچھے گھر میں بیاہنا میرا بھی خواب ہے۔"

نسیمہ برتن الماری میں لگا کر واپس آئیں تو نانی نے بات بدل دی اور موسم پر تبصرہ کرنے لگیں۔

☆☆☆

چند روز کے بعد یہ تینوں فرح کی طرف گئیں تو گھر کے سب ہی افراد گھر پر تھے دونوں خواتین اور فری بڑے تپاک سے ملیں۔ نسیمہ تو کم گو تھیں۔ نانی البتہ باتوں کی شوقین تھیں۔ آج بھی زیور گہنے پہن کر گئی تھیں جبکہ اس کے مقابلے میں نسیمہ بالکل سادہ تھیں۔

"آپ کی چوڑیوں کا ڈیزائن بہت خوبصورت ہے خالہ!" فری کی امی نے ان کے بازو میں پڑی چھ سونے کی چوڑیوں کی تعریف کی۔ نانی کھل اٹھیں اور انہیں بتانے لگیں کہ "یہ چوڑیاں مجھے میرے ابا نے بنوا کر دی تھیں۔ تب سونا خالص اور سستا تھا مگر خیر سستا صرف ان لوگوں کے لیے تھا جن کے پاس پیسہ تھا اور میرے ابا تو شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔" پھر نانی نے انہیں اپنے ابا کی امارت اور دولت کے کئی قصے سنائے ان کا انداز ایسا دلکش اور سادہ ہوتا تھا کہ سننے والے کو برا نہیں لگتا تھا۔ وہ دونوں بڑی ہی دلچسپی سے سن رہی تھیں زیبا، فری کے ساتھ باہر آ گئی اور واثق سے ملاقات ہو گئی جو اپنے بنٹی کو گود میں اٹھائے ہلکے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

"یہ واثق شروع سے ہی کچھ کریک ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم بچپن میں ان کے گھر آیا کرتے تھے تب اس نے ایک مرغی پالی تھی اور سارا دن اس کی ناز برداری میں گزارا کرتا تھا اب یہ مصیبت بکری کا بچہ پتا نہیں کہاں سے چرا لایا ہے۔"

"خبردار جو میری یا بنٹی کی شان میں گستاخی کی ورنہ مہمان کے سامنے تمہاری بہت زیادہ عزت افزائی ہو جائے گی۔"

"یہ جو صفائی ستھرائی کا رونا روتا رہتا ہے ناں کبھی تم اس کا کمرا دیکھنا ایسا گند مچا رکھا ہے کہ وہاں کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ آؤ تمہیں ایک جھلک دکھاؤں۔"

فرح نے کہنے کے ساتھ ہی قدم بڑھائے زیبا نے تقلید کی تو وہ بولا۔

"غیر لڑکی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ نامحرم کے کمرے میں جھانکتی پھرے۔"

اور زیبا کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ فرح سے بولی۔

"تمہارا کمرا کون سا ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔" فری اثبات میں سر ہلا کر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

"سنو فرح! مہمان کی خاطر تواضع کے لیے کچھ منگواؤ تو مجھے بھی دے جانا۔ صبح سے منہ کچھ پھیکا سا ہو رہا ہے۔"

"امی اور ممانی ہال میں بیٹھی ہیں ان سے پوچھ لو کیا منگوانا ہے اور جا کر لے آؤ۔"

"اب اتنی تیز دھوپ میں' میں بھلا کہاں جاؤں گا تم گھر میں ہی کچھ بنا لو۔"

"کام چور ہو پورے اور باتیں دوسروں کو بناتے ہو۔ اب جو بھی بنے گا تمہیں بالکل نہیں ملے گا۔"

"ہونہہ یہاں بنتا کیا ہے ایک' ایک گلاس شربت پر مہمانوں کو ٹرخا دو گی۔"

"آؤ زیبا! اسے تو بولنے کا خبط ہے۔" فری اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

☆☆☆

"نانی! میں تو فرح کا کمرا دیکھ کر حیران ہی رہ

گئی۔ میں نے پہلے کبھی کسی لڑکی کے پاس اتنا کچھ نہیں دیکھا۔ الماری تھی کپڑوں سے بھری ہوئی‘ ڈریسنگ ٹیبل پر اتنا سامان‘ نیل پالش اور لپ اسٹک کے اتنے شیڈ کہ کیا بتاؤں۔ جیولری تھی وہ بہت مہنگی اور خوبصورت، اور اس کے کمرے میں ٹی وی بھی تھا‘ وہ کہتی ہے میرے ابو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ میری کوئی فرمائش نہیں ٹالتے۔ امی کی بھی میں لاڈلی بیٹی ہوں میں نے جو بھی مانگا انہوں نے مجھے دلا دیا۔ تب میں سوچ رہی تھی نانی! یہ سب تو پیسے کے کھیل ہیں ناں اب اگر میری امی مجھے مہنگے والے کپڑے نہیں دلا سکتیں یا میرے لیے اتنی مہنگی جیولری نہیں خرید سکتیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں بنتا کہ انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

”ہاں زیبا بیٹی! یہ سب پیسے کے کھیل ہیں۔ میری بچی کے پاس بھی اتنا پیسہ ہوگا کہ جو چاہے گی خرید لے گی۔“

انہیں پتا نہیں چلا نسیمہ ساتھ کے کمرے میں موجود ان کی باتیں سن رہی ہیں وہ ادھر آئیں اور بولیں۔

”دولت سے زیور کپڑا تو خریدا جا سکتا ہے مگر سکون اور محبت نہیں اور یاد رکھو بیٹی! دنیا میں سکون اور محبت سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔“

”جب سب کچھ حاصل ہو جائے امی تو پھر سکون تو خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور جہاں آسودگی ہو وہاں محبت بھی ہوتی ہے۔ دکھ‘ پریشانی‘ نفرت‘ یہ سب تو غربت کی دین ہیں۔ کیوں نانی جان! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“

”ہاں ہاں تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“

”اماں! آپ بجائے اسے سمجھانے کے خود بھی اس کے ساتھ مل گئی ہیں۔ اسے بتائیں ہر خواہش پوری ہونے کے لیے نہیں ہوتی اور پھر دولت کی چاہ کو سر پر سوار کر لینا تو بے وقوفی ہے۔ یہ خواہش سوائے دکھ کے اور کچھ نہیں دیتی۔“

”کس چیز کی کمی ہے ہماری زیبا میں شہزادیوں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔“

”مگر شہزادی نہیں ہے کہ اسے کوئی شہزادہ بیاہنے آجائے۔“

امی کی باتیں اس کا دل برا کر رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔

”تمہیں نئے پڑوسی کیسے لگے؟ ان کے دو بیٹے ہیں۔ پہلے تو مجھے وامق زیادہ پسند آیا تھا مگر اب میں سوچتی ہوں ہماری بچی بہت معصوم اور کم گو ہے اس کے لیے ایسا ہی لڑکا ہونا چاہیے اور اس لحاظ سے اب میں جنید کے بارے میں سوچنے لگی ہوں وہ بھی بہت سنجیدہ مزاج کا مالک‘ سادہ سا لگا ہے۔ میری زیبا کے مزاج سے بہت ملتا ہے اس کا مزاج ذہین بھی ہے اور محنتی بھی۔ ناصرہ بتا رہی تھی ہماری دو کوٹھیاں اسلام آباد میں ہیں اس کے علاوہ بھی جائیداد ہے مگر پھر بھی وہ لڑکا پڑھائی میں محنت کرتا ہے اور خود کچھ بننا چاہتا ہے۔“

”اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ‘ ان لوگوں کے پتا نہیں کتنے اونچے خیالات ہوں گے اور آپ یوں بات کر رہی ہیں جیسے دونوں کے رشتے آئے ہوئے ہیں اور آپ کو کسی ایک کے لیے ہاں کر کے دوسرے کو انکار کرنا ہے۔ زیبا کے سامنے ایسی باتیں مت کریں۔ وہ بچی عمر میں ہے نادان لڑکی ہے یونہی خواب آنکھوں میں سجا بیٹھی تو زندگی بہت مشکل ہو جائے گی اس کے لیے۔“

”تم نہیں جانتیں نسیمہ! زیبا مجھے کتنی پیاری ہے میری اس معصوم بچی نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی‘ اچھے وقت کا انتظار وہ اس شدت سے کر رہی ہے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا مگر چند روز پہلے انجانے میں ہی وہ اپنی خواہشات کا ذکر مجھ سے کرتی چلی گئی اور یقین مانو میرا تو دل رونے لگا ہائے میری معصوم بچی کیسے کیسے خواب آنکھوں میں بسائے بظاہر کتنے صبر اور سکون کے ساتھ دن کاٹ رہی ہے۔ میں نے تو اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے خوابوں کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے مجھ سے جو بھی ہو سکا میں وہ

کروں گی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے اماں! مگر کہاں پڑوس میں رہنے والے آسودہ حال لوگ اور کہاں ہم تین پریشان حال' اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا عورتیں وہ تو ہمارے بارے میں سوچیں گے بھی نہیں۔"

"کیوں نہیں سوچیں گے' تم شاید اس وقت وامق کی امی سے باتوں میں مصروف تھیں میں نے ناصرہ کو اپنا حسب نسب' خاندانی شرافت اور دولت سب کے بارے میں بتایا تھا اور سن کر وہ بے حد متاثر بھی ہوئی تھی۔ ارے یہ تو اب میاں کے بیرون ملک جانے سے امیر ہوئی ہے ہم تو جدی پشتی رئیس رہے ہیں۔ ہائے بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے' وہ حویلیاں' نوکر چاکر' زیورات کے بکس کپڑوں کی الماریاں' سب خواب ہوئیں مگر وہ عزت و وقار تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا' ہم خاندانی لوگ ہیں۔"

انہیں سمجھانا شاید بے کار ہی ہے۔ سچ ہے بڑھاپے میں انسان پھر سے بچہ بن جاتا ہے ایک بار جس شے پر طبیعت آجائے پھر کسی طرح دھیان ہٹتا نہیں ہے۔ نسیمہ نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

زیبا کو فرح کا سوٹ پہلے بھی جلد مکمل کرنا تھا اور اب تو جیسے وہ چاہ رہی تھی چند گھنٹوں میں سلائی کڑھائی سب مکمل ہو جائے اور اس بہانے وہ ایک بار پھر فرح کے گھر جائے۔ کتنے اچھے لوگ ہیں وہ' غرور تو نام کو نہیں۔ فرح بار بار آنے کو کہہ رہی تھی اور اس کا کمرا تو ایسا اچھا اتنا شان دار سا ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کاش یہ میرا ہوتا اور وہ جو وامق ہے اس کا خیال آیا تو دل دھڑک اٹھا۔ دیکھنے میں کیسا لاپروا سا ہے مگر فرح بتا رہی تھی بہت ذہین ہے پڑھتے تو ہر وقت جنید ہیں مگر نمبر ہمیشہ وامق کے زیادہ آتے رہے ہیں۔ وامق کے انداز میں کس قدر بے تکلفی اور اپنائیت ہے۔

وہ فرح کے ہاں جانا چاہ رہی تھی مگر سوٹ مکمل ہونے کے بعد لیکن نانی نے سویرے اٹھتے ہی بڑی محبت کے ساتھ انڈوں کا حلوہ تیار کیا اور اس سے بولیں۔

"یہ تم ہمسایوں کے ہاں دے آؤ۔ ٹھنڈا ہو جائے گا تو اچھا نہیں لگے گا ویسے بھی ابھی وہ ناشتا کر رہے ہوں گے وقت پر پہنچ جائے گا تو کھا لیں گے۔"

"نانی! اتنے سویرے کسی کے ہاں جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔"

"کیا مناسب اور کیا غیر مناسب ارے پڑوسی ہیں وہ ہمارے' پڑوسی تو رشتے داروں سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں اور پھر وہ بھی ہماری طرح سادہ مزاج کے پرخلوص لوگ ہیں۔ جاؤ تم جا کر دے آؤ۔"

جب وہ ان کے ہاں آگئی تو واقعی ادھر ناشتا ہو رہا تھا۔ کچن میں وامق کی امی مصروف تھیں۔ اس نے اندر جانے کے بجائے انہیں پلیٹ تھما دی۔

"تم اندر چلو۔ ناشتا کرو۔ سب کے ساتھ۔"

وہ بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں مگر اس نے بتایا۔

"میں ناشتا کر چکی ہوں"

"اچھا پھر چائے ہی پی لینا۔"

"امی! میں نے کہا بھی تھا میں ہاف فرائی انڈہ۔"

وامق کچھ کہتے ہوئے کچن میں داخل ہوا تھا پھر جو نگاہ زیبا پر پڑی تو بولا۔

"اتنے سویرے آپ یہاں خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں ہاں اللہ کے فضل سے خیریت ہے۔ دیکھو تو بچی سویرے سویرے کیا بنا کر لائی ہے۔ بہت ہی سگھڑ اور پیاری بچی ہے۔"

"ارے آپ کھڑی کیوں ہیں' تشریف رکھیے۔"

پلیٹ دیکھتے ہی وامق کا انداز بدل گیا وہ اس کی شوخی کو سمجھ کر ہنس پڑی اور بولی۔

"فرح کدھر ہے؟ میں اس سے مل لوں تو پھر گھر واپس جاؤں گی۔"

"ضرور ملیں مگر اس حلوے کے بارے میں ہرگز نہ بتائیں پھر میرے حصے میں تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔"

"شرم کرو وامق! اس سے پہلے بچی سموسے

لے کر آئی تھی' وہ بھی سارے تم نے کھا لیے۔ اب حلوے پر بھی نظریں لگائے بیٹھے ہو اتنا چٹورا پن بھی اچھا نہیں ہوتا مل بانٹ کر کھانے میں ویسے بھی برکت ہے۔"

"امی ایک تو ہمارے ہاں تین وقت کی روٹی کے علاوہ کچھ بنتا نہیں اب اگر ہمسائے مجھ پر ترس کھا کر کچھ بھیج دیتے ہیں تو اس پر بھی سب نظر لگا لیتے ہیں۔ یہ نانی نے میرے لیے بھیجا ہے جب وہ ہمارے ہاں آئی تھیں تو میں نے ان سے فرمائش کی تھی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟"

اس نے زیبا سے پوچھا وہ جواب دینے کے بجائے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ امی کو ہنسی آ گئی بولیں۔

"ہر کوئی تمہاری طرح دھڑلے سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ تو بڑی نیک فطرت کی بچی ہے اس سے تو ہرگز یہ امید نہ رکھو کہ تمہارا ساتھ دے گی۔"

"ممانی! ناشتا تیار ہو گیا ہے؟" فری نے کچن میں جھانک کر پوچھا پھر زیبا پر نگاہ پڑی تو خوشی اور حیرت سے بولی۔

"تم اتنے سویرے ہمارے گھر میں' آؤ اندر آجاؤ۔

آج ناشتا مل کر کریں گے۔"

واثق نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا اور تیزی سے حلوہ کھا رہا تھا۔ فری نے اس خاموشی اور مصروفیت کو محسوس کیا آگے ہو کر سامنے آئی اور بولی۔

"میں بھی کہوں' یہ اور خاموشی عجیب سی بات ہے یہ نہیں معلوم تھا آج ممانی نے ناشتے میں حلوہ بھی بنایا ہے اور یہ زیادہ کھانے کے چکر میں کچن میں گھسے کھڑے ہیں۔"

"تمہارا حصہ ٹیبل پر پہنچ جائے گا چلو' سہیلی کو لے کر اندر چلو اس کے سامنے صبح صبح لڑائی یہ کوئی اچھی بات نہیں اس سے ہمسائیوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔"

"آؤ زیبا!" فرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی واثق نے اطمینان سے پلیٹ صاف کی اور پھر ڈائننگ روم میں آبیٹھا جہاں اہل خانہ ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

واثق کے ابو اخبار کی خبروں میں گم تھے۔ جنید کی خاموشی اور چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ پوری شدت سے ناشتے کے انتظار میں ہے جبکہ فرح اور پھوپھو زیبا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

"بتا دیا؟" واثق نے جاتے ہی بڑی رازداری کے عالم میں زیبا سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیا؟ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟" دونوں متوجہ ہوئیں۔

"کچھ نہیں ہماری آپس کی بات ہے۔" واثق نے بڑے آرام سے کہہ دیا مگر اس کے اس انداز پر زیبا کچھ گھبرا سی گئی۔ کیا سوچیں گے گھر والے میری واثق سے ایسی بے تکلفی کب سے ہو گئی جو سب سے چھپ کر ہم آپس میں راز کی باتیں کرنے لگے۔

"کیا مطلب ہے؟ صاف صاف بتاؤ ناں۔" فرح واثق کے پیچھے پڑ گئی۔

"بس ہے نا ہماری آپس کی بات۔" اس نے شانے اچکا کر مزے سے کہا۔

"میں بتاتی ہوں ویسے کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے' یہ یونہی تنگ کر رہے ہیں تمہیں۔" اس سے پہلے کہ کوئی بدگمان ہوتا زیبا نے بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

"اے اے کچھ نہ بولنا ورنہ آج سزا کے طور پر یہ سب میرا ناشتا ضبط کر سکتے ہیں۔"

وہ روک رہا تھا مگر زیبا کو تو اپنی پڑ گئی تھی بتا کر دم لیا۔

سنتے ہی فرح اسے برا بھلا کہنے لگی اور اپنے ماموں سے بھی شکایت لگا دی۔

"واثق! تم اتنے بڑے ہو کر بھی بچوں والی حرکتیں کرتے ہو۔ مجھے تمہاری تعریف تو کبھی سننے کو نہیں ملی۔ البتہ شکایتیں اکثر میرے پاس آتی ہیں۔"

"ابو! میں تو انہیں خوش کرنے کے لیے یہ سب کرتا ہوں۔" اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

"جی ہاں' ہمیں خوش کرنے کے لیے یہ سب کچھ خود ہڑپ کر جاتے ہیں۔"

''اصل میں وہ حلوہ ان کی نانی نے بھیجا ہی میرے لیے تھا اب آپ چپ کھڑی میرا تماشا کیوں دیکھ رہی ہیں۔ بتائیں ناں انہیں کہ وہ تو آیا ہی میرے لیے تھا۔''

اور زیبا نے گڑبڑا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابو ایک بار پھر اخبار میں گم ہو گئے وہ آ کر پھوپھو اور فرح کے قریب بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔

''ہو گئی اب تو تسلی۔ اصل میں ان کی نانی کو میں نے بہن بنایا ہوا ہے تو وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہیں۔''

''میں چلتی ہوں۔'' زیبا اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی ضرور۔ آپ کو آئے ویسے بھی کافی ٹائم ہو چکا ہے۔''

وامق کی بات نے اسے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔ اور پھوپھو کے روکنے کے باوجود وہ پھر آؤں گی کہہ کر باہر آ گئی۔

وامق بھی اس کے پیچھے آیا اور بولا۔ ''نانی جان کا شکریہ ادا کریں۔ آپ کا بھی بہت شکریہ کہ میرا ساتھ دیا۔''

وہ جواب میں کچھ بھی کہے بغیر چلی آئی۔ گھر آئی تو نانی نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''دے آئیں کون ملا تھا؟ پلیٹ کس نے پکڑی؟''

جواب میں اس نے ساری بات بتا دی۔ سن کر انہیں ہنسی آ گئی اور بولیں۔

''بڑا ہی شریر لڑکا ہے اور میں نے بھلا کب اسے بھائی بنایا ہے۔''

''نانی! اتنے سویرے آپ نے مجھے ان لوگوں کے گھر بھیج دیا پتا ہے، ابھی انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کسی کے ہاں جانے کا۔''

''جنید بیٹا کیا کر رہا تھا۔'' انہوں نے بڑی محبت اور اپنائیت کے ساتھ جنید کا ذکر کیا۔

''کچھ نہیں ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فرح کی امی اور ممانی آپ دونوں کو سلام کہہ رہی تھیں اور وامق نے شکریہ ادا کیا تھا۔''

اس روز غیر ارادی طور پر کئی بار اس نے وامق کے بارے میں سوچا۔ بھلا لوگ اتنے زندہ دل، خوش باش کس طرح سے ہوتے ہیں۔ اسے کسی کی پروا ہے نہ جھجک، کتنے اعتماد سے بات کرتا ہے وہ۔ اس کے فقروں کو یاد کر کے کئی بار آپ ہی آپ مسکرائی۔

☆☆☆

وامق کے بھانجے نانی کی سالگرہ تھی۔ فری ان کے ہاں آئی اور بتایا۔

''وامق جا کر نانا، نانی اور بچوں کو لے آیا ہے پرسوں نانی کی برتھ ڈے ہے۔ کیک کا آرڈر بھی وامق نے دیا ہے اور کہتا ہے سموسے تو ہمسایوں سے بنواؤں گا کہ ایک بار کھائے تھے ذائقہ اب تک زبان پر ہے۔ نانی نے تو بہت منع کیا کہ اتنی گرمی میں کہاں وہ لوگ اتنی محنت کریں گی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، میں اور امی مل کر بنا لیں گے۔''

''اور آپ سب انوائٹڈ ہیں۔''

''ہم سب؟'' زیبا کچھ ہچکچا کر بولی۔

''ہاں اس میں اس قدر حیرانی و پریشانی کی بھلا کیا بات ہے، گھر کے لوگ ہوں گے اور آپ سب بس اور تو کوئی نہیں۔''

''اچھا چلو ٹھیک ہے۔'' یہ سن کر اطمینان ہوا۔

جب سے فری نے برتھ ڈے کا ذکر کیا تھا۔ ان دونوں نانی، نواسی پر ایک ہی فکر سوار تھی۔ تحفہ کیا دیں گے ہم، ایسا ہونا چاہئے جو ان لوگوں کے شایان شان ہو، جبکہ امی مطمئن سی بیٹھی تھیں۔ کہہ دیا تھا جو ہماری حیثیت ہے، اس کے مطابق دے دیں گے۔ پسند آ جائے تو ٹھیک نہیں تو نہ سہی ہم نے تو اپنا بجٹ دیکھنا ہے۔''

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی وہ اتنے پیار سے بلا رہے ہیں اور ہم بچے کے لیے ڈھنگ کی ایک چیز بھی نہ لے کر جائیں۔''

نانی کو مکمل اختلاف تھا اور ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ دیں تو کیا دیں۔

''نانی اسوٹ تو میرا نیا ہی رکھا ہوا ہے یوں بھی

فری کہہ رہی تھی ہم ایک جیسے کپڑے پہنیں گے مگر یہ جوتوں کا کیا کروں ایک بھی تو ڈھنگ کا نہیں ہے میرے پاس۔''

''اے ہاں نسیمہ! یہ تو بالکل سچ ہے۔ بے چاری زیبا کے پاس نہ ڈھنگ کے جوتے ہیں اور نہ ہی چوڑیاں ہیں۔ تم اسے بازار لے جا کر یہ دونوں چیزیں دلوا دو۔ باقی ہار' بندے تو میرے پاس موتیوں کا سیٹ رکھا ہے وہ زیبا پہن لے گی۔''

''اماں! اتنے خرچے یہ تو وہی بات ہوگئی بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔''

''بے گانی شادی کیوں پڑوس کا معاملہ ہے اور رشتہ داری بھی قائم ہو ہی جائے گی۔'' آخری فقرہ ہولے سے کہا تاکہ زیبا نہ سن سکے۔

''لتاں! آپ اپنے آپ بات کہیں سے کہیں پہنچا بیٹھی ہیں۔ کیا یہ دانشمندی ہے۔'' نسیمہ نے سمجھانا چاہا۔

''اچھا بس اب اس بات پر مجھ سے بحث مت کرو میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں اور ہاں سمو سے دل سے بنانا جتنے اچھے ہوں گے اتنی ہی ہماری زیبا کی تعریف ہوگی۔''

نسیمہ نے آخر اثبات میں سر ہلا دیا۔

فری کا سوٹ مکمل ہوگیا۔ زیبا ان کے ہاں دے کر خود امی کے ساتھ بازار چلی گئی نومی کے لیے ریڈی میڈ سوٹ خریدا۔ اپنے لیے چوڑیاں اور سینڈل بازار سے لیے۔ خوب صورت پرنٹ والے سوٹ تھے جی چاہتا تھا سب نہیں تو ایک آدھ ہی خریدے مگر امی نے صاف انکار کر دیا اس کے اصرار پر بولیں۔

''میں تو پہلے ہی اتنے امیر پڑوسیوں کے ہاں زیادہ آنے جانے کی قائل ہی نہیں تھی' مجھے پتا تھا تم وہاں جاؤ گی' ان لڑکیوں میں اٹھو بیٹھو گی تو اپنی ہر چیز میں کیڑے دکھائی دیں گے۔ لتاں کو بھی سمجھایا تھا مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی' اتنا زیادہ آنا جانا رکھا ہے ان کے ہاں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہر چیز دیکھ کر تمہارا جی مچلتا ہے اور تم ناشکری ہوتی جا رہی ہو۔''

''امی! کیا کبھی ہم بھی امیر ہوں گے؟'' جواب میں انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ تیز قدموں سے چلنے لگیں اور اسے بھی تقلید کرنا تھی۔

☆☆☆

جس روز تقریب تھی' وہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ نانی لتاں کا سچے موتیوں کا سیٹ پہنا تو اسے اپنا آپ بہت ہی اچھا لگا۔ کاش ایسے بہت سے سیٹ میرے اپنے ہوں۔ نانی نے دیکھا تو نظر اتاری اور بولیں۔

''میں تمہاری تیاری سے پوری طرح مطمئن ہوں' آج تو اگر وہ سرے شہر کی لڑکیاں بھی بلا لیں تو تمہارے مقابلے کی ایک بھی نہیں ہوگی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں لتاں! یہ کوئی مقابلہ حسن میں شرکت کے لیے جا رہی ہے؟ مت اتنا چڑھائیں اسے۔ کنواری بیٹیوں کی زیادہ تعریف اچھی نہیں ہوتی۔ یاد نہیں آپ کو آپ ہی کہا کرتی تھیں۔''

''سب یاد ہے مجھے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری بیٹی بڑی نصیبوں والی ہے۔''

یہ لوگ فرح کے ہاں پہنچیں تو پہلے ملاقات جنید اور اس کی امی سے ہوئی۔

''ارے آج تو زیبا بہت ہی پیاری لگ رہی ہے اور یہ موتیوں کا سیٹ کتنا خوبصورت ہے۔''

''یہ سچے موتی ہیں'' نانی نے جھٹ بتایا۔

''بہت خوبصورت ہے اور پہننے والی بھی بہت اچھی ہے'' ناصرہ کی اس تعریف پر نانی کا ڈھیروں خون بڑھ گیا ان کی محنت رنگ لائی تھی۔ جنید بھی زیبا کو دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس کی نگاہوں میں واضح ستائش تھی۔

''فری کہاں ہے آنٹی؟'' اس تعریف پر وہ شرما گئی اور فرح کے بارے میں پوچھنے لگی۔

''فرح شاید کچن میں ہوگی اور ہاں بھئی سمو سے ہمیں مل گئے ہیں۔ بہت مزے کے بنے ہیں۔''

ابھی کچھ دیر پہلے ان کا ملازم لے کر گیا تھا اور

نسیمہ پوچھنے ہی والی تھیں کہ پسند آئے یا نہیں ناصرہ نے خود ہی بتا دیا۔

''میری زیبا کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے' اسی نے بنائے تھے'' نانی نے بتایا۔

وہ کچن میں آگئی۔ فرح یہاں موجود تھی اور اس نے وہی سوٹ پہن رکھا تھا جو زیبا نے سی کر دیا تھا اس کی جیولری بھی بے حد خوبصورت تھی وہ بتا رہی تھی یہ سیٹ ابھی پچھلے ماہ مجھے میرے پاپا نے بھیجا ہے اور یہ چوڑیاں دیکھو میں آج لے کر آئی ہوں اور پرفیوم۔''

کہتے کہتے رکی اور بولی۔

''تم نے پرفیوم نہیں لگایا ٹھہرو میں تمہارے لیے لے کر آتی ہوں تم ذرا الماری سے برتن نکالو۔''

اس کے جانے کے بعد زیبا ابھی ادھر ادھر جائزہ ہی لے رہی تھی کہ پیچھے سے آکر کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آج تم کچن میں دکھائی دے رہی ہو؟ خیر تو ہے کہیں دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے دماغ کو گرمی۔''

کہتے کہتے اس کا رخ بھی کہنے والے نے اپنی طرف موڑا اور پھر صورت دیکھ کر ایک دم سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

''سوری! میں سمجھا فری ہے۔'' وامق جلدی سے سنبھل گیا تھا جبکہ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تو یہ کپڑے فری نے پہن رکھے تھے کیا یہ کسی پیر سے دم کروائے ہوئے ہیں اور اس نے کہا ہے کہ ان کو پہننے والی شوہر کے دل پر راج کرے گی اور سر پر چڑھ کر ناچے گی۔''

''میں نے اور فری نے ایک جیسے سوٹ بنوائے ہیں۔'' اس نے دھیرے سے تصحیح کی۔

''او تب پھر میرا قصور تو رتی بھر نہ ہوا۔'' بندہ پوچھے ایک جیسے کپڑے سلوانے کی بھلا کیا تک ہے اتنے ڈیزائن ہیں' اتنے کلر اور یہاں دونوں ایک جیسے بنا کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہی ہیں۔''

''مجھ سے تو فرح نے کہا تھا۔'' وہ صفائیاں پیش کرنے لگی۔

''فرح کا تو دماغ خراب ہے۔ آئندہ جب وہ کچھ کہے تو مجھ سے مشورہ لے لیا کرو۔''

اس نے جان چھڑانے کو جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے بندہ پوچھے کیوں آپ کے پاس اپنا دماغ نہیں ہے جو میرے کہے پر عمل کرو گی۔''

وہ بے بسی سے اس کی صورت دیکھنے لگی پھر سر جھکا لیا۔

''اتنے کام مت کیا کرو' لوگ تو پھیلتے چلے جاتے ہیں آج برتن سیٹ کروا رہے ہیں کل دھلوانے پر تل جائیں گے۔''

''جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''ارے لڑکی! تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کہاں ہے اس کا چلن تو بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آیا اکثر لوگ معصومیت میں ہی مارے جاتے ہیں۔ مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے' میں نہیں چاہتا تمہیں بھی بے خبری میں مات ہو جائے۔''

''زیبا تمہاری نانی جان دکھائی نہیں دے رہیں کیا وہ نہیں آئیں؟'' فرح پرفیوم کی شیشی ہاتھ میں پکڑے پوچھ رہی تھی۔

''تمہیں نانی سے کیا کام پڑ گیا ہے نکمی لڑکی؟'' وامق اس کی طرف مڑا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ یقیناً کھانوں کی خوشبو کے تعاقب میں آئے ہو۔''

''لڑکیوں کے تعاقب سے کہیں بہتر ہے کہ بندہ کھانے کا تعاقب کر لے' ویسے پوچھ لو اپنی دوست سے میں نے ایک چیز بھی نہیں کھائی۔''

''زیبا! کام ختم ہو گیا ہے تو آؤ سب کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں۔''

''اور اگر نہیں ختم ہوا تو تم کام کرو میں اکیلی باہر بیٹھتی ہوں' ہے ناں یہی کہنا چاہ رہی ہو ناں تم؟ شرم کرو فری بلکہ شرم سے ڈوب مرو' گھر آئے مہمانوں سے کام کروا رہی ہو۔''

"تمہیں کیا تکلیف ہے۔ یہ میری دوست ہے۔"

"فری' تمہارا فون ہے' جنید نے آکر بتایا۔

"کس کا فون ہے؟"

"انیلا نام بتایا ہے۔"

"اکثر لوگ غلط نام بتا دیتے ہیں۔ انیلا تو ویسے بھی کچھ مشکوک سا نام ہے۔ فرح ذرا سنبھل کے۔"

واثق کی بات پر جنید اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"تم یہاں کچن میں کھڑے کیا کر رہے ہو؟"

"کیوں ضروری ہے۔ جو کچن میں کھڑا ہو وہ کچھ کرے بھی۔"

"ایسے ہی پوچھ لیا تھا بابا۔"

"دیکھا ہم یوں لاجواب کرتے ہیں"۔ واثق نے زیبا سے داد چاہی مگر وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

"چلو آؤ میرے ساتھ۔" جنید واثق کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے گیا۔

فری فون اٹینڈ کرنے چلی گئی زیبا کچن میں اکیلی کھڑی تھی اور آس پاس جیسے واثق کی آواز تھی اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆☆

"نانی جان! کچھ لوگ کس قدر خوش باش اور زندہ دل ہوتے ہیں ان سے مل کر ہم بھی اپنے دکھ اور محرومیاں بھولنے لگتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک کہتی ہو تم تمہارے نانا بھی ایسے ہی مزاج کے مالک تھے۔"

"نانی! اگر گھر میں ایک فرد بھی ایسا ہو تو کس قدر رونق رہتی ہے' ہم تینوں تو بس ایک ہی مزاج کی ہیں۔"

"آج کل کا دور تو مصیبتوں اور پریشانیوں کا دور ہے' ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے امیر ہو یا غریب' کسی نہ کسی پریشانی الجھن میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں اور ایسے میں زندہ دلی ہو تو کیسے ہو۔"

"نہیں نانی! جو زندہ دل ہوتے ہیں' وہ تو ہر حال میں خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

"اچھا تم سے ایک بات کرنا تھی مجھے۔ فری سے تو تمہاری بہت دوستی ہے اور میرا اندازہ ہے وہ تمہیں پسند بھی بہت کرتی ہے بیٹا! میں نے دیکھا ہے تم جب بھی ان لوگوں کے ہاں جاتی ہو۔ صرف فری سے ہی چپکی رہتی ہو اکثر تو سلام کرنے کے بعد اس کے کمرے میں ہی چلی جاتی ہو — میں ہی ناصرہ اور فاخرہ سے باتیں کیے جاتی ہوں۔"

"نہیں نانی! اب تو نائلہ باجی بھی آئی ہوئی ہیں۔ وہ بہت اچھے مزاج کی ہیں۔ میرے ساتھ بالکل چھوٹی بہنوں والا پیار کرتی ہیں ان کے بچے بھی بہت پیارے ہیں۔ میں نائلہ باجی سے بھی کافی باتیں کر لیتی ہوں اور انہیں میری طرح کوکنگ کا بھی شوق ہے کہہ رہی تھیں کسی دن تمہارے گھر آکر تم سے ایک دو ڈشز بنانا سیکھوں گی۔"

"ہاں ہاں ضرور سیکھے' وہ واقعی بڑی ہی سادہ مزاج کی لڑکی ہے حالانکہ میں نے سنا ہے اس کا شوہر کافی بڑا افسر ہے مگر غرور نام کو نہیں۔ اصل میں خاندانی لوگ ہیں انہیں انسانیت کی قدر ہے دولت' روپیہ پیسہ' نمود و نمائش اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ناصرہ تو جب بھی میں جاتی ہوں اپنے پاس ہی بٹھا لیتی ہے اور ادھر ادھر کے قصے سناتی رہتی ہے۔ اس کی بھابھی فاخرہ البتہ خاموش مزاج کی ہے زیادہ بات چیت نہیں کرتی۔"

"مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نانی جان کہ وہ مغرور ہیں' یا انہیں ہماری آمد اچھی نہیں لگتی۔ ملتی تو وہ بھی بہت پیار سے ہیں بس یہ تو اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے وہ زیادہ بات چیت کرتی ہی نہیں ہیں' بس کچن کے کام نبٹاتی رہتی ہیں سارے گھر کی ذمے داری بھی ان پر ہی ہے۔"

"ہاں اس کے بیٹے نے کسر پوری کر دی ہے توبہ کس قدر تیز لڑکا ہے وہ۔ نہ بڑے کو دیکھتا ہے نہ چھوٹے کو بس اپنی ہی کہے جاتا ہے۔"

"ہاں نومی کی سالگرہ پر کتنی رونق لگائی انہوں نے۔" واثق کے ذکر پر زیبا کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔

"خاک رونق لگائی۔ اس کی ماں تو اس قدر

شرمندہ ہو رہی تھی ابھی تک بچوں والی حرکتیں کرتا ہے اب وہ جو بکری کا بچہ پالا ہوا ہے کس قدر لاڈ اٹھاتا ہے اس کے۔ مجھے تو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے" اسی گھر میں وہ بچہ جنید بھی تو رہتا ہے' کیسا سلجھا ہوا خاموش طبع اور نیک مزاج کا لڑکا ہے اس کے لیے تو دل سے دعا نکلتی ہے۔ اتنی سعادت مندی سے سلام کرتا ہے اور نظر نیچی کیے بیٹھ جاتا ہے۔ وامق کی طرح نہیں کہ آندھی طوفان کی طرح آئے سارا کمرا گویا زلزلے کی زد میں ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھے ایسی گفتگو کی جو کسی کے پلے نہیں پڑتی اور چلتے بنے۔"

"نانی! بہت برے لگتے ہیں وہ آپ کو؟" زیبا نے بجھے دل کے ساتھ دریافت کیا۔

"نہیں مجھے کیوں برا لگنے لگا اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک' دل کا سکون ہے۔ اللہ اسے صحت' تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ میں تو اس کی عادت کی بات کر رہی تھی کہ ماں جتنی خاموش طبع" بیٹا اتنا ہی شوخ مزاج ہے۔ ہڈی میں چین ہے ہی نہیں یہاں وہاں پھدکتا پھرتا ہے۔"

پھر ذرا توقف کے بعد بولیں۔

"لو بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آ پہنچی۔ اصل میں' میں تم سے کہنا یہ چاہ رہی تھی کہ جب تم فری کی طرف جایا کرو تو ناصرہ کو سلام کرنے کے بعد فوراً فری کی طرف دوڑ مت لگا دیا کرو۔ کچھ دیر ناصرہ کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہا کرو اس سے اچھا اثر پڑتا ہے۔"

"وہ مجھ سے اتنی بڑی ہیں میں بھلا ان سے کیا بات کر سکتی ہوں۔"

"بڑوں کی بات سن بھی لیا کرو میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو' آپس کی بات چیت اچھا اثر ڈالتی ہے۔"

"اچھا نانی! بیٹھ جایا کروں گی میں ان کے پاس بھی مگر ان سے کہوں گی کیا' یہ بھی بتا دیں؟"

"بات سے بات نکلتی جاتی ہے بھلا پہلے سے سوچ کر بھی گفتگو کی جا سکتی ہے۔ وہ سوال کر رہی ہیں گندم اور تم جواب دے رہی ہو چنا' اب یہ تو ہونے سے رہا۔"

ابھی نانی' نواسی میں یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ فرح آ گئی۔

"آؤ بیٹی! ہم تم ہی لوگوں کا ذکر کر رہے تھے۔"

"زیبا! اٹھو بہن کے لیے چائے بناؤ۔"

"نہیں نانی! چائے نہیں پینا مجھے' میں بہت جلدی میں ہوں میری دوست کا فون آیا ہے' وہ میری منتظر بیٹھی ہے میں تو امی کا یہ دوپٹہ دینے آئی تھی انہوں نے کہا ہے کہ اس پر اچھی سی کروشیے کی کوئی بیل بنا دیں۔"

"کروشیہ تو مجھے نہیں آتا" زیبا نے معذرت کرنا چاہی تو نانی نے جلدی سے دوپٹہ فری کے ہاتھ سے لے لیا اور بولیں۔

"زیبا کو نہیں آتا کیا ہوا' مجھے اور نسیمہ کو تو آتا ہے۔"

"نانی! آپ کی اتنی نظر ہی کہاں ہے اور امی کے تو بازو میں درد رہتا ہے۔"

"اب ایسی بھی نظر کمزور نہیں فری تم ناصرہ سے کہہ دینا' دو تین روز میں' میں یہ دوپٹہ تیار کر کے خود لے کر آؤں گی۔"

"اچھا جی بہت شکریہ" فری خوش ہو گئی۔

"شکریہ کی کیا بات ہے بیٹی ہم نے تو تم لوگوں کو کبھی غیر سمجھا ہی نہیں۔ ناصرہ میری بیٹی کی جگہ ہے اور تم میری زیبا ہی کی طرح ہو۔"

"اچھا اب میں چلتی ہوں' اصل میں وہ میری دوست انتظار میں ہو گی۔ ہے بھی کچھ الٹے دماغ کی فوراً ناراض ہو جاتی ہے۔"

فرح چلی گئی تو وہ زیبا سے بولیں۔

"تم بھی کبھی کس قدر احمقانہ بات کر جاتی ہو۔ ناصرہ نے کتنے مان کے ساتھ دوپٹہ بھیجا تھا اور تم انکار کی نئی نئی راہیں نکال رہی تھیں۔ مجھے تو اب یہ فکر ہے اگر اس نے گھر جا کر ناصرہ سے تمہاری باتوں کا ذکر کر دیا تو وہ کیا سوچے گی تمہارے بارے میں۔"

''میں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے نانی اب دیکھیں ناں امی کے بازو میں ہر وقت درد کی شکایت اور آپ بھلا ایسا باریک کام آسانی سے کر سکتی ہیں؟''

''چلو آسانی سے نہ سہی تھوڑی تکلیف کے ساتھ ہی سہی مگر انکار تو کسی صورت مناسب نہیں۔''

نسیمہ بھی دوسرے کمرے سے اٹھ کر ادھر آ بیٹھیں اور آتے ہی بولیں۔

''لتاں میرا خیال ہے میں چند روز تک گاؤں کا چکر لگا آؤں اگر مالک توجہ نہ دیں تو مزارعے بہت کچھ تو خود ہی ہضم کر جاتے ہیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے تم ہو آؤ گاؤں سے' میں تو دن رات یہی دعا کرتی ہوں اللہ تمہیں آرام چین کی زندگی دے اور اب تو لگتا ہے تمہاری یہ مشقت ختم ہونے والی ہے۔ آرام سے بستر پر بیٹھ کر حکم چلایا کرو گی۔''

''وہ کیسے نانی؟'' زیبا نے خوش ہو کر پوچھا۔

''بس مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔'' وہ آسودگی سے مسکرائیں نسیمہ بیگم ان کی بات سمجھ تو گئی تھیں مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ وہ سفر میں اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگانے لگیں۔

''سنو یہ بھٹوں کا موسم ہے' آتے ہوئے بھٹے لے آنا اور زیادہ لے کر آنا ہم تو تین ہی ہیں بلکہ میرا تو شمار ہی کیا مگر پڑوس میں تو اللہ کے فضل سے بھرا کنبہ آباد ہے ان کے ہاں بھی بھجواؤں گی۔''

''نانی! پتا نہیں وہ کھاتے بھی ہیں یا نہیں'' زیبا نے کہا۔

''لو کھاتے کیوں نہیں سادہ مزاج کے لوگ ہیں کوئی نخرا تو ہے نہیں ان میں تم دیکھ لینا کتنا خوش ہو کر لے لیں گے۔''

☆☆☆

نانی نے نسیمہ کو بازار بھیج کر بہت اچھا سادھا گا منگوایا اور پھر سر جھکا کر وشیہ بنانے میں مصروف ہو گئیں زیبا نے سمجھایا نسیمہ نے منع کیا مگر انہوں نے ایک نہیں سنی۔

"لٹاں! پھر رات کو سر میں درد ہوگا۔ آپ فرح سے کہہ دیتیں، وہ برا نہیں مانتی۔"

"کیوں کہہ دیتی تم نہیں جانتیں نسیمہ! اپنی زیبا کے لیے میں نے کتنی دعائیں کی ہیں، کیا کیا ارمان ہیں میرے دل میں اس کے لیے تمہاری طرف سے تو دل ٹھنڈا نہ ہوا، میں تمہیں دیکھ دیکھ کر تمہارے نصیب پر روتی ہی رہی مگر اپنی زیبا کے لیے میں نے رب کے حضور اتنی دعائیں کی ہیں کہ یقین سا آگیا ہے وہ راج کرے گی۔ ہمیشہ ہنسے مسکرائے گی۔ ناصرہ کا بیٹا مجھے اس کے لیے ہر لحاظ سے موزوں لگتا ہے اپنی زیبا کی طرح ہی ٹھنڈے سنجیدہ مزاج کا مالک ہے ایسے لوگ حساس طبیعت کے ہوتے ہیں دوسروں کا احساس کرتے ہیں۔ دل آزاری ان کی فطرت میں ہی نہیں ہوتی اور مجھے پورا یقین ہے زیبا کا نصیب اسی گھر میں کھلے گا۔"

"لٹاں! اتنے یقین سے بات مت کریں پتا نہیں ان لوگوں کی مرضی کیا ہے اگر ایسا نہ ہوسکا تو آپ کا مایوس چہرا مجھے بہت دکھ دے گا۔"

"تم اچھی امید رکھو۔" وہ کروشیہ بنانے میں مصروف ہوگئیں۔

بڑی محنت کے ساتھ انہوں نے دوپٹہ مکمل کیا زیبا اور نسیمہ نے بہت تعریف کی اور وہ مطمئن ہو کر بولیں۔

"آج شام ہی میں خود جا کر دوپٹہ ناصرہ کو دے کر آؤں گی۔ زیبا تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"ٹھیک ہے نانی جان! ضرور چلیں گے۔"

جب تک شام نہیں ہوگئی نانی جان نے کئی بار دوپٹے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ "کام میں صفائی تو ہے ناں؟"

"یہ ڈیزائن بھلا تو لگتا ہے؟" بار بار سوال کرتیں اور زیبا ہر بار ہنستے ہوئے تسلی دیتی۔

شام کو جب وہ دونوں ان کے ہاں آئیں تو گھر میں تقریباً سبھی موجود تھے جنید دکھائی نہیں دیا انہوں نے پوچھا تو پتا چلا کسی دوست کی طرف گیا ہوا ہے۔

"اچھا یہ دوپٹہ دیکھو اور بتاؤ بیل پسند آئی یا نہیں۔"

انہوں نے شاپر سے دوپٹہ نکال کر پھیلایا۔

"ارے اتنی جلدی بنا لیا، مجھے کوئی ایسی خاص جلدی تو نہیں تھی۔" انہوں نے بیل پر ہاتھ پھیرا اور ستائش بھرے انداز میں کہا فاخرہ اور نائلہ نے بھی تعریف کی جبکہ فرح بولی۔

"آپ تو بہت اچھا کام جانتی ہیں نانی! اب تو میں بھی آپ سے اپنے دوپٹے پر بیل بنواؤں گی۔"

"کیوں بیل والے دوپٹے اوڑھنے سے کیا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔" وامق نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"اتنا خوبصورت لگ رہا ہے، میں تو ضرور بنواؤں گی۔"

"ضرور بیٹی! میں بہت خوشی سے بنا کر دوں گی۔"

"اچھا خالہ یاد آیا میں نے کہنا تھا اس بار آپ سے سبزیوں کا اچار ڈلوانا ہے۔ میرے جنید کو بہت پسند ہے۔ بازار سے لا کر کھاتا رہتا ہے مگر گھر کے اچار کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ سوچا تھا اس مرتبہ آپ سے ڈلواؤں گی۔ ذائقہ بھی بہت ہے آپ کے ہاتھ میں۔"

"کیوں نہیں زیبا بہت اچھا اچار ڈالتی ہے۔" انہوں نے بڑی خوشی سے ہامی بھر لی۔

"تمہیں ایک چیز دکھاؤں" فری، زیبا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

"کیا چیز؟" اس نے بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

"آج کل ہم بھائی کے رشتے کے چکر میں ہیں چاہتے ہیں جھٹ کسی اچھی سی لڑکی کو انگوٹھی پہنا کر پابند کرلیں اسی سلسلے میں دو تین تصویریں ہیں میرے پاس تم بتاؤ کون سی زیادہ اچھی ہے۔"

فری کی بات سن کر نانی کی تو جیسے دنیا ہی ڈول گئی۔ زیبا، فری کے ساتھ چلی گئی نانی کچھ توقف کے بعد بولیں۔

"ہم بھی آج کل زیبا کے رشتے کے لیے

پریشان ہیں کوئی اچھا لڑکا ملے تو میں اس کی بات پکی کر دوں“۔

”زیبا جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے“۔ نائلہ نے کہا تو وہ بولیں۔ ”بس مجھے نیک شریف لوگ چاہئیں“۔

”آپ کے عزیزوں میں کوئی نہیں ہے خالہ؟ آج کل تو لڑکی سے زیادہ جہیز دیکھا جاتا ہے اور لوگ اپنے برابر کے لوگوں میں ہی رشتہ کرنا پسند کرتے ہیں اور یہ کچھ غلط بھی نہیں۔ لڑکا لڑکی اگر ایک جیسے گھرانوں کے ہوں تو ان کی سوچ کا انداز بھی ایک جیسا ہوتا ہے ورنہ غریب گھر سے لڑکی بیاہ کرلے آؤ تو وہ دبی دبائی جھجکتی سی رہتی ہے اور آج کل کے لڑکے بھلا ایسی لڑکیوں کو کہاں پسند کرتے ہیں۔ میرا جنید تو کہتا ہے۔ امی کسی اونچے گھرانے میں ہی شادی کروں گا لڑکی کے بھائی گورنمنٹ آفیسر ہونے چاہئیں اور لڑکی ایسی جو میرے ساتھ چلتی اچھی لگے“۔

”ہاں جنید کے خیالات بہت اونچے ہیں“ نائلہ نے کہا تو ناصرہ بولیں۔

”کیوں نہ ہوں‘ آخر کس شے کی کمی ہے میرے بچے میں اور میں تو خود یہ چاہتی ہوں لڑکی ایسے اونچے گھرانے سے لاؤں کہ سب رشتے داروں میں واہ واہ ہو جائے۔ آپ بھی زیبا کے لیے کوئی دین دار سیدھا سا لڑکا دیکھیں مرد تو کوئی ہے نہیں آپ کے گھر میں کوئی ایسا لڑکا دیکھیں جو آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہ سکے“۔

وہ مشورہ دے کر نومی سے باتیں کرنے لگیں اور نانی دھواں دھواں چہرے‘ اداس دل کے ساتھ گم صم سی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ پھر نائلہ سے بولیں۔

”بیٹی! ذرا زیبا کو بلا دو میں گھر چلوں گی طبیعت اچھی نہیں ہے“۔

”خالہ! بیٹھیے میں چائے بناتی ہوں“ فاخرہ کے کہنے پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔

”نہیں۔ میرے بازو میں بہت تکلیف ہے مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا“۔

بظاہر پسینہ پونچھنے کے بہانے انہوں نے دوپٹہ چہرے پر پھیر کر نم آنکھیں خشک کیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد ناصرہ‘ نائلہ اور فاخرہ سے بولیں۔

”لوگ بھی کیسی کیسی سوچنے لگتے ہیں۔ خالہ نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم کہاں، وہ کہاں‘ اشاروں اشاروں میں اپنی بیٹی کی بات چھیڑ دی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر صاف صاف سنانے پر بھی ہم لوگوں کی طبیعت کہاں مائل ہوتی ہے بس لحاظ آجاتا ہے۔ ویسے میں نے اپنی سوچ ان پر واضح کر دی ہے۔ اگر سمجھ دار ہوئیں تو دوبارہ ایسا ذکر بھی زبان پر نہیں لائیں گی“۔

وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تب نائلہ نے کسی گہری سوچ میں گم اپنی ماں کو دیکھا اور بولی۔

”آپ کیا سوچنے لگیں ہیں امی؟“

”بس میری نظر کے سامنے سے خالہ جی کا اداس چہرا نہیں ہٹ رہا‘ بے چاری کتنی آس کے ساتھ اشاروں میں بات کر رہی تھیں اور تمہاری پھوپھو نے کس بے دردی سے جواب دیا“۔

”امی! پھوپھو اور ان کے بچے تو ہیں ہی اسی مزاج کے‘ اپنا کام نکلوانے میں تیز ہیں۔ دوسروں کے جذبات کی انہیں کب پرواہ ہوتی ہے‘ اب اگر زیبا سے

رشتہ نہیں بھی کرنا تھا تو اس قدر خشک اور چبھتے ہوئے لہجے میں تو بات نہ کرتیں۔" "زیبا ہے۔ بہت اچھی لڑکی اور یہ لوگ بے حد شریف اور خاندانی ہیں۔"

"تو پھر کیا خیال ہے، ہم نہ اپنے بھائی کے لیے مانگ لیں۔"

نائلہ نے شوخی سے وامق کی طرف دیکھا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں البتہ وامق کا مجھے پتا نہیں اس کے خیالات بھی جنید کی طرح ہیں یا اس سے بھی اونچے ہیں۔"

"میرے خیالات واقعی جنید سے اونچے ہیں امی! مجھے صرف دولت اور ظاہری شان و شوکت متاثر نہیں کرسکتی۔ مجھے تو مخلص اور نیک دل ساتھی کی تمنا ہے جو ہر دکھ سکھ میں میرے ساتھ ہو۔"

"تو پھر کیا خیال ہے، میں ابھی ابو کے آفس فون کر کے ان سے اجازت لیتی ہوں اور پھر چلتے ہیں زیبا کے گھر۔" نائلہ ضرورت سے زیادہ پرجوش تھی اور یہی حال فاخرہ کا بھی تھا۔

نانی جس وقت سے فری کے ہاں سے ہو کر آئی تھیں چہرے پر دوپٹہ رکھے مسلسل چپکے چپکے روئے چلی جا رہی تھیں۔ زیبا کچن میں رات کا کھانا بنانے میں لگی تھی اور نسیمہ بار بار ماں سے پوچھ چکی تھیں۔

"آپ ایسے کیوں لیٹی ہیں؟" ہر بار انہوں نے سر درد کا بہانا بنایا تھا۔

"لماں! چائے ہی پی لیتیں۔" وہ ایک بار پھر کمرے میں آئیں اور اب کے انہیں احساس ہوا لماں رو رہی ہیں۔

"خیر تو ہے ناں لماں؟" وہ ان کے پاس آبیٹھیں نانی نے دوپٹہ چہرے سے ہٹایا اور بولیں۔

"تم ٹھیک کہتی تھیں نسیمہ! میں نے اپنی بچی کے لیے بہت اونچے خواب دیکھ لیے تھے۔ میں بھول گئی تھی غریب کی بیٹی بیاہ کر بھی غریب کے گھر ہی جاتی ہے۔"

"السلام علیکم" نائلہ نے صحن میں آکر زوردار سلام کیا۔ نانی جلدی سے آنسو پونچھ کر اٹھ بیٹھیں۔ نائلہ اور فاخرہ ان کے کمرے میں آگئیں اور مٹھائی کا ڈبہ میز پر رکھ کر نانی کے پلنگ پر ہی آبیٹھیں۔

"کیا اتنی جلدی جنید کا رشتہ بھی طے ہو گیا؟" مٹھائی دیکھ کر نانی نے یہی اندازہ لگایا، مگر جو بات انہوں نے کہی اور جس چاہ سے کہی۔ اس نے نانی اور نسیمہ دونوں کو حیران کر دیا۔

"مگر فاخرہ! تمہارا وامق تو کچھ اور ہی مزاج کا ہے وہ کہاں راضی ہوگا۔"

وہ دودھ سے جلی تھیں چھاچھ پھونک رہی تھیں۔

"ساری بات وامق کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ہی تو کر رہے ہیں نانی لماں!"

نائلہ نے پیار سے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا فاخرہ بولیں۔

"انکار مت کیجیے گا خالہ! میں نے تو تب سے زیبا جیسی بہو کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے جب سے میرا وامق پیدا ہوا تھا۔"

نانی نے نسیمہ کی طرف دیکھا۔ وہ آسودگی سے مسکرا رہی تھیں۔ نانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نائلہ نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبا کھولا سب کا منہ میٹھا کروایا پھر ڈبہ لے کر کچن کی طرف بھاگی۔

مٹھائی کھاتے ہوئے نانی مسکرا رہی تھیں۔

"ہم انسانوں کی پہچان میں کس قدر غلطی کر جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ فاخرہ کو مغرور اور ناصرہ کو اچھا سمجھتی رہی ایسے ہی خیالات وامق اور جنید کے بارے میں تھے مگر سب الٹ ہوا۔"

اور کچن میں بیٹھی زیبا صرف اور صرف وامق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"خدایا تو نے احسان کیا مجھ پر۔ بند لبوں سے جو چاہ میں نے کی تھی۔ تو نے اسے میرا نصیب بنا دیا۔" وامق کی چاہ کرتے اس نے صرف اور صرف وامق کی شخصیت کو دیکھا تھا، دولت کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ جب محبت ہو جائے تو یہ سب پیچھے رہ جاتا ہے۔ سب سے بڑی دولت آپس کا اعتماد اور خلوص ہے۔ جس نے یہ دولت پائی اس نے سب پالیا۔" میں قدر کرنے والوں میں سے ہوں۔ ہمیشہ قدر کروں گی۔ اور یہ دعا رہے گی۔ خدا میرا مان سلامت رکھنا۔"

☆

سدرہ حیات

کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں

کرنل شہاب کی تین بیٹیاں ہیں۔ ثانیہ میڈیکل کی اور مہرین انجینئرنگ کی طالبہ ہے۔ اقدس کو تین مرتبہ فیل ہونے پر یونی ورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی دوست مہر کے ساتھ ایک کوکنگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیتی ہے۔ جہاں کھانا بنانا سیکھنے کے دوران اس سے مزید حماقتیں ہوتی ہیں۔ اس کے اساتذہ اس سے عاجز آ جاتے ہیں۔ بالآخر انسٹی ٹیوٹ کے مالک روحان تیمور اسے اپنی اسٹوڈنٹ بنا لیتے ہیں۔

روحان تیمور اس کے والد کے دوست کے بیٹے ہیں۔ کرنل شہاب کو شیف کا پروفیشن پسند نہیں۔ ان کی سخت گیر طبیعت سے اقدس نالاں رہتی ہے۔ کرنل شہاب کے دوست کرنل سراج کی بیٹی فریال سراج بھی میڈیکل کی طالبہ ہے۔ وہ دوران تعلیم ثانیہ کو ذلیل کروانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ڈاکٹر حماد اسپتال کے سخت گیر ڈاکٹر ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی گوہر ثانیہ سے پڑھائی میں مدد لیتا ہے۔ ڈاکٹر فریال کی منگنی بچپن سے ہی اس کے ماموں کے ہاں طے ہے، مگر اس کی والدہ اور وہ خود اس رشتے میں دلچسپی نہیں لیتی۔ فریال بے حد حسین ہے اسے ڈاکٹر جنید بھی پسند کرتے ہیں، مگر وہ انہیں زیادہ لفٹ نہیں کرواتی۔

فریال، روحان کو بھی جانتی ہے۔ یہ جان کر اقدس کو صدمہ پہنچتا ہے کیونکہ وہ روحان کو پسند کرنے لگی ہے۔ روحان اسے ایونٹس مینجمنٹ کا کام بھی سکھاتا ہے۔ ایک روز روحان سے ملنے ایک لڑکی اور بچہ آتے ہیں۔ اقدس کا دل ٹوٹ جاتا

مکمل ناول



ہے۔

ثانیہ کو روز موبائل پر محبت بھرے میسج ملتے ہیں۔ بالآخر پتا چلتا ہے کہ یہ میسج ڈاکٹر حماد نے بھیجے ہیں۔ کوئی ثانیہ کی آئی ڈی ہیک کر کے فیس بک کے ذریعے یہ خبر پھیلا دیتا ہے کہ ڈاکٹر حماد نے ثانیہ کو پرو پوز کیا ہے۔ ڈاکٹر حماد یہ پڑھ کر چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ سارے اسپتال میں بات پھیل جاتی ہے۔ ثانیہ کو بہت بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔

۲
دوسری اور آخری قسط

دو دن سے اسے بخار تھا۔ اس دوران کیا سرگرمیاں ہو رہی تھیں، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ تیسرے دن اس کا بخار اترا تو اسے پتا چلا کہ روحان تیمور کی فیملی شفٹ ہو چکی ہے۔ بلکہ دو مرتبہ امی ان کو ناشتہ بھی بھیج چکی تھیں۔ بخار تو اتر چکا تھا مگر طبیعت مضمحل تھی۔ عجیب سی اداسی اور سستی سی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ اب بھی وہ لاؤنج کے صوفے پر منہ سر لپیٹے پڑی تھی۔ امی قریبی صوفے پر آ کر بیٹھیں۔

"اقدس! یہ کیا پوستیوں کی طرح پڑی ہو۔ دو دن ہو گئے تمہارا بخار اترے ہوئے۔ انسٹی ٹیوٹ نہیں جانا تمہیں۔ روحان بھی پوچھ رہا تھا۔"

"چلی جاؤں گی امی۔" اقدس نے بے دلی سے کہا۔

اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی لگا لیا۔ ذہن بٹانے کا ایک یہی طریقہ اسے سوجھا تھا۔ وہ چینل بدل رہی تھی جب مہر آ گئی۔

"یہ کیا ابھی تک ایسے ہی پڑی ہو فوراً" اٹھو، ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں۔ ویسے بھی سنا ہے شاپنگ سے ہر قسم کا بخار اتر جاتا ہے۔" مہر نے شرارتی لہجے میں کہا تھا۔ مہر کے اصرار پر وہ اٹھ گئی تھی۔

پھر ایک شاپ سے مہر نے اپنے اور اس کے لیے ٹراؤزر اور شرٹس خرید لی تھیں۔ اقدس منع کرتی رہ گئی مگر مہر نے اس کی ذرا نہیں چلنے دی تھی۔

"چار بج گئے ہیں، کچھ کھا لیتے ہیں۔" گھڑی دیکھتے ہی مہر کو بھوک کا احساس ہوا۔

"تم کھا لو، میرا موڈ نہیں ہے۔" اقدس بے دلی سے آس پاس کی رونق کو دیکھ رہی تھی۔

"اوہو۔ اچھا آئس کریم ہی کھا لیتے ہیں بلکہ آئس کریم شیک پیتے ہیں۔"

پیچھے سے آتی اس آواز پر وہ بے اختیار مڑی تھی۔ اسے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس دن والی لڑکی اور وہ بچہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ اقدس کا دل چاہا وہ فوراً" یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ مہر بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ اقدس کی حالت وہ سمجھ رہی تھی اس لیے آگے بڑھ کر اس نے نارمل انداز میں سلام کیا۔

"مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انسٹی ٹیوٹ سے چھٹی مار کر آپ یہاں گھوم رہی ہیں۔"

"مجھے تو اب بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آر یو او کے؟" (کیا آپ ٹھیک ہیں) اس لڑکی نے پوچھا۔

اقدس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا وہ آنکھوں میں نرمی لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"جی بس طبیعت بہتر تھی۔ آج تو میں زبردستی لے آئی شاپنگ کے بہانے۔" مہر نے جلدی سے صورت حال سنبھالی۔ ساتھ ہی ملامتی نظروں سے اقدس کو گھورا جو ابھی تک خاموش تھی۔ اقدس کو بھی تھوڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے بمشکل حال احوال پوچھا۔

"سوری، میں تعارف کروانا بھول گیا۔ یہ ملیحہ ہیں اور یہ عبداللہ۔ اور ملیحہ! یہ اقدس ہیں۔ میری بہت

اچھی اسٹوڈنٹ اور آپ اقدس کی دوست ہیں۔ آئم سوری مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا۔"

"مہر۔" وہ جلدی سے بولی۔

"میرا خیال ہے باقی باتیں کہیں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہم شیک پینے جارہے تھے' آپ دونوں بھی آئیں۔" ملیحہ نے آفر کی۔ اقدس نے منع کرنے کے لیے منہ کھولا مگر روحان نے حتمی انداز میں کہا۔

"یہ اچھا آئیڈیا ہے چلیں' آجائیں۔" اقدس نے بے بسی سے مہر کو دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔ بھلا وہ کیا کہتی۔

☆ ☆ ☆

لنچ بریک تھی مگر تینوں میں سے کسی کا کچھ کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ ہاوس آفیسرز روم کو خالی پا کر وہیں بیٹھ گئیں۔

"توبہ ہے سب کو ایسے ڈاکٹر حماد کی فکر ستانے لگی ہے جیسے شہر بھر میں مردوں کا کال پڑ گیا ہو۔" حنا سخت تپی ہوئی تھی۔

"یہی تھے کل تک جو ڈاکٹر حماد کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔" فرح بولی۔

"سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا منظم پلان بنایا کس نے ہے اور اس سب کے پیچھے مقصد کیا ہے۔" فرح نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

"کوئی اور بات کرو پلیز۔ ریلیکس کرنا چاہتی ہوں میں اس وقت۔ گھر جا کر بھی یہ سوچیں پیچھا نہیں چھوڑتیں۔" ثانیہ نے اپنے دکھتے ہوئے سر کو صوفے کی پشت پر رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں خاموش ہو گئیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اور کون سا موضوع چھیڑیں۔ دروازہ کھول کر اندر آتی مشال اور فریال کو دیکھ کر حنا کا کھلتا منہ بند ہو گیا۔

"اف یہ کہاں سے آٹپکیں۔" فرح کو کوفت ہوئی۔ ثانیہ بھی انہیں دیکھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھی ہوئی۔

"لو جی' یہ بھی آگئیں نئے سرے سے بال کی کھال ادھیڑنے۔ دونوں چھٹیوں پر تھیں تو کتنا سکون تھا ہسپتال میں۔" حنا نے دل میں سوچا۔

"ثانیہ! تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں' ہوا بھی نہیں لگنے دی کسی کو کہ ڈاکٹر حماد اور تمہارے درمیان کچھ ہے۔ اسی لیے تم اتنی حمایت کیا کرتی تھیں ان کی۔ ان کے بارے میں کی گئی پوسٹ پر تمہارے کمنٹس ایسے ہوتے تھے کہ تمہارے انٹرسٹ کا تو ہم اندازہ لگا سکتے تھے مگر ڈاکٹر حماد کی تمہارے ساتھ انوالومنٹ کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔" مشال آتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں ثانیہ کے سرخ چہرے پر تھیں۔

ثانیہ نے فریال کی طرف دیکھا جیسے اس کے بولنے کی منتظر ہو اور وہ واقعی شروع ہو گئی۔

"مبارک ہو ثانیہ! ویسے یہ خبر پہلے مجھ تک پہنچنی چاہیے تھی۔ آخر پڑوسیوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں اور اب ایسے ہی چپ چپاتے شادی مت کرلینا۔"

فریال کی مسکراہٹ اسے بڑی عجیب لگی تھی۔

ثانیہ کے دماغ میں جیسے کلک ہوا تھا۔ ایک بار پہلے کی فریال کی کہی گئی باتیں اس کے ذہن میں گونجی تھیں۔

"تمہاری کامیابیوں نے ہمیشہ میری خوشیوں کو نگلا ہے۔ مگر اب میری باری ہے اور فریال سراج کبھی ہار نہیں مانتی اور جو کرنے کی ٹھان لے کر کے چھوڑتی ہے۔ بیسٹ آف لک ثانیہ شہاب۔"

"کچھ بولو بھی۔" مشال کی پرتجسس آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

"ساری باتیں معلوم ہیں تو ہم سے کیا سننا چاہتی ہو۔" جواب حنا کی طرف سے آیا تھا۔

ثانیہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھاتی فریال کے قریب آئی تھی۔ "ٹھیک کہا تم نے پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔ تھینک یو فریال! فار ایوری تھنگ (شکریہ فریال' ہر چیز کے لیے)۔" نرمی سے اس کا کندھا تھپکتی وہ آگے بڑھ گئی۔

اس کے بے تاثر لہجے میں کہے گئے الفاظ سن کر پل بھر کے لیے فریال کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ حنا اور فرح ان دونوں کو چھوڑ کر ثانیہ کے پیچھے لپکیں۔

"اسے کیا ہوا۔" مشال حیران تھی۔ فریال نے کندھے اچکائے۔ تیز قدموں سے دونوں ثانیہ تک پہنچیں۔

"اوہو ۔۔۔ چھوڑو ان دونوں کی تو عادت ہے طنزیہ باتیں کرنے کی۔ وہ نمبر بھی میں نے اپنے کزن کو دے دیا تھا جس سے تمہیں میسجز آتے تھے۔ وہ دونوں میں وہ بتا دے گا کہ سم کس کی ہے۔" فرح نے اسے تسلی دینی چاہی۔

"اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اطمینان سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ دونوں حیرت سے وہیں کھڑی رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

اقدس کے دائیں طرف عبداللہ بیٹھا تھا۔ ساتھ والی کرسی پر مہر تھی اور سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ عبداللہ کے کچھ بولنے پر اقدس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ روحان سے مخاطب تھا۔ چھ سات سال کے اس بچے کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی بناوٹ بالکل روحان جیسی تھی۔

"آپ لوگ بھی بتائیں کون سا شیک لیں گے۔" روحان نے ان دونوں سے پوچھا۔

"پائن ایپل شیک۔" مہر نے جواب دے کر اقدس کو گھورا۔

"اسٹرابیری شیک۔" اقدس کو بولنا پڑا۔ اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو کسی حد تک کنٹرول کر چکی تھی۔ اب ان کے ساتھ بیٹھ ہی گئے تھے تو بات چیت کرنا بھی ضروری تھا۔ روحان اور عبداللہ شیک لینے کے لیے چلے گئے۔

"شاپنگ کی آپ نے۔" مہر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ آخر کچھ تو بولنا تھا۔

"جوتے ہی خریدے ہیں، کپڑوں کی طرف ان دونوں نے دیکھنے ہی نہیں دیا۔ ایک تو پہلے ہی روحان نے مشکل سے ٹائم نکالا اوپر سے یہ دونوں اتنی جلدی بے زار ہو جاتے ہیں۔ اسی بات پر ہماری بحث چل رہی تھی۔ اطمینان سے شاپنگ ہی نہیں کرنے دیتے۔ مزا تو گرلز شاپنگ کا آتا ہے۔" ملیحہ بے تکلفی سے بتانے لگی۔

"یہ تو ہے، شاپنگ کا مزا تو لڑکیوں کے ساتھ ہی آتا ہے۔" مہر متفق تھی۔

"مہر بہت ایکسپرٹ ہے شاپنگ میں، اس کی خدمات آپ لے سکتی ہیں کسی بھی وقت۔" اقدس نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"پھر تو اچھا ہوا۔ ہماری ملاقات ہو گئی۔ اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے بھی میں آپ کی مدد لے سکتی ہوں۔" دونوں نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔

"آپ کی شادی نہیں ہوئی۔" مہر جلدی سے بولی۔

"نکاح ہوا ہے۔"

"میرا مطلب ہے، آپ سر کی وائف ۔۔۔" مہر کو متذبذب دیکھ کر وہ ہنسی تھی۔

"آپ لوگ اتنی دیر سے یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اور روحان ۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اقدس خوشگوار حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"عبداللہ کی وجہ سے آپ لوگ یہ سمجھ رہی ہوں گی۔" مہر نے سر ہلایا۔ دونوں ہی اصل بات جاننے کے لیے بے تاب تھیں۔ ملیحہ خوب صورت انداز میں مسکرائی۔

"میرے اور روحان کے بہت سارے رشتے ہیں۔ وہ میرا کزن بھی ہے، دودھ شریک بھائی بھی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھا دوست۔ اور جہاں تک عبداللہ کی بات ہے۔ میری بڑی بہن کی شادی روحان کے بڑے بھائی آفاق سے ہوئی تھی۔ تین سال پہلے ایک ایکسیڈنٹ میں ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ تب سے عبداللہ

خالہ، خالو یعنی روحان کے والدین کے پاس ہوتا ہے۔ اسی لیے میں زیادہ تر پاکستان کے چکر لگاتی رہتی ہوں کیونکہ روحان اور میرے ساتھ عبداللہ بہت انبیج ہے۔"

دونوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بولیں۔ ملیحہ نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"بس تو پھر ڈن ہو گیا" آپ دونوں مجھے شاپنگ کروا رہی ہیں۔

"بالکل!" وہ دونوں خوش دلی سے بولیں۔

"امریکہ میں تو میں دوستوں کے ساتھ یا کبھی اکیلی ہی نکل جاتی تھی شاپنگ کے لیے 'اس معاملے میں روحان کبھی مدد نہیں کرتا۔ امریکہ میں اس کے پاس پڑھائی کا بہانا ہوتا تھا اور یہاں کام کا۔"

دلچسپی سے اس کی باتیں سنتی اقدس کو دیکھ کر مہر نے اپنے بے ساختہ امڈنے والی ہنسی کو دبایا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈاکٹر حماد کو گولی مار دے۔ آج صبح ہی ہسپتال کے ایم ایس نے اسے بلایا تھا۔ ڈاکٹر حماد نے اس کے خلاف ایک فائل بنا کر انہیں بھیجی تھی۔ جس میں اس کی چند کوتاہیوں کے علاوہ کچھ اضافی کیسز بھی تھے جو اس پر ڈالے گئے تھے۔

"دیکھیں مس ثانیہ! میں آپ کے والد کو جانتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر فاروق کے دوست بھی ہیں اور پرسنلی بھی ملا ہوں ان سے اور پھر آپ ہمارے کالج کی اچھی اسٹوڈنٹ ہیں بلکہ ٹاپر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو ہاسپٹل سے نکالا جائے وہ بھی اس وقت جبکہ آپ کی ہاؤس جاب کمپلیٹ ہونے والی ہے۔

آپ کے اتنے مہینوں کی محنت اکارت جائے گی۔ آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ ڈاکٹر حماد سے ذاتی طور پر صلح صفائی کرلیں ورنہ یہ بات بہت دور تک جائے گی۔ اور شاید میرے ہاتھوں سے نکل جائے۔ میں نہیں چاہتا آپ کی سالوں کی محنت یوں برباد ہو۔" ایم ایس کے دفتر سے نکلتے ہوئے اس کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ سیدھی ڈاکٹر حماد کے پاس آئی۔

"کیا مطلب ہے اس کا۔ آپ میرے اوپر فرضی کیسز ڈال کر مجھے ہاسپٹل سے نہیں نکلوا سکتے۔ میری وجہ سے کبھی کسی مریض کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔"

ڈاکٹر حماد نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر سنجیدگی سے ثانیہ کو دیکھا۔ جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوفی سے کھڑی تھی۔

"پہلے اپنی ٹون درست کریں۔ میں بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔" ڈاکٹر حماد کا لہجہ سرد تھا۔ "اور اتنا واویلا کیوں کر رہی ہیں۔ یہ سب اس کا جواب ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔ آغاز آپ نے کیا ہے۔ اس کہانی کو انجام تک میں پہنچاؤں گا۔"

"میں آپ کو بتا چکی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔" ثانیہ اس قدر ہی بول سکی۔

"اور میں تو جیسے یقین ہی کرلوں گا آپ کے اس ڈرامے پر۔ میں اگر آپ کے میسجز کا جواب دے دیا کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ پارٹ ون کے متعلق ہوتے تھے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یوں راہ و رسم بڑھا لیں گی۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں پارٹ ون کی تیاری کر رہی ہوں مگر میں نے آپ سے کبھی کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ ڈاکٹر جنید غنی سے پڑھائی میں مدد لی ہے اور اس بار بھی ان ہی سے لی ہے۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔" ثانیہ نے تحمل سے کہا۔

"مجھے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا آپ اگر یہ سمجھ رہی ہیں یوں معصوم بن کر مجھے شیشے میں اتار لیں گی تو ٹرسٹ می' ایسا کچھ نہیں ہے۔" ان کے زہریلے انداز نے ثانیہ کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر اور آپ کی اس سوچ پر۔ مجھے نہ آپ کو شیشے میں اتارنا ہے نہ مرعوب کرنا ہے مگر یہ جھوٹے الزامات جو آپ نے لگائے ہیں' معلوم ہو گیا کہ کس قدر دو غلے ہیں آپ۔ اصولوں پر تو

جان دیتے تھے نا آپ۔ اب کیا ہوئے وہ اصول۔ آپ میرے کام کو نہیں دیکھ رہے بلکہ ان جھوٹی کہانیوں پر یقین کر رہے ہیں۔ جن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

وہ جب بولنے پر آئی تو بولتی ہی چلی گئی۔

ضبط سے ڈاکٹر حماد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے تو ان کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

"میرے اندر برائیاں ڈھونڈنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں۔ ویسے بھی محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے اور یہ میرے لیے کسی جنگ سے کم نہیں ہے۔"

"نہیں مانتی میں اس فلسفے کو۔ میرے نزدیک جو جائز ناجائز کا فرق بھول جائے وہ انسان کہلانے کا حق دار نہیں رہتا۔ میں آپ کو اچھا ڈاکٹر ہی نہیں ایک اچھا انسان بھی سمجھتی تھی مگر افسوس میں غلط تھی۔"

بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی وہ باہر نکل گئی۔ ایک بات تو طے تھی کہ ڈاکٹر حماد سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی نہ ڈاکٹر حماد کو اپنی صفائیاں دے گی نہ آج کے بعد ان کے دفتر میں قدم رکھے گی چاہے ہاؤس جاب سے نکالی کیوں نہ جائے۔ مگر وہ غلط تھی۔

☆ ☆ ☆

"ایک بیٹا انجینئر اور دوسرا شیف سمجھ میں نہیں آیا مان کیسے گئے تم روحان کے اس شوق کے لیے۔"

کرنل شہاب کے ذہن میں اتنے دنوں سے جو سوال تھا آج وہ زبان پر آ گیا۔ سامنے بیٹھے تیمور صاحب کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیا خوب صورت جملہ ہے شوق دا کوئی مول نئیں۔ بس یہی بات ہے میرے خیال میں بچوں کے جائز شوق کے بیچ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ شروع میں جب روحان نے یہ بات کی تو مجھے بڑا ہی عجیب لگا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ پہلے پڑھائی کرو کیونکہ تعلیم ایسی چیز ہے جس پر میں کبھی کمپرومائز نہیں کر سکتا۔

بس پھر کیا تھا یہ صاحبزادے پہنچ گئے دو دن بعد میرے پاس کہ مجھے امریکہ کی آرٹ یونیورسٹی سے کولینری آرٹس اور ہوٹل مینجمنٹ پڑھنی ہے۔ میں نے سوچا جو کرنا چاہتا ہے کرنے دو۔ خوشی اور محنت سے کرے بس۔ دیکھ لو پھر غلط نہیں تھا میرا فیصلہ۔ خوشی ہے مجھے اس بات کی کہ میرا بیٹا ایک محنتی اور سیلف میڈ انسان ہے۔" تیمور صاحب نے فخر سے کہا۔ "اور عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے دے دے اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔"

"ہوں، کہہ تو ٹھیک رہے ہو۔ ہمارے ہاں اصل میں کچھ پروفیشنز کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی سن کر اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر روحان کی مقبولیت سے خاصا متاثر ہوا ہوں۔ واقعی وہ تمہارا ہی بیٹا ہے۔"

"خیر ہماری بیٹیاں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ تینوں ہی بڑی محنتی بچیاں ہیں۔ روحان بتا رہا تھا کہ اقدس بیٹی نے فوڈ فیسٹیول کروایا تھا۔ بہت کامیاب رہا۔ اس کامیابی کا سہرا تو اقدس بیٹی کو ہی جاتا ہے۔" پہلی بار کسی نے اقدس کی تعریف کی تھی۔ کرنل شہاب کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

"بلکہ روحان تو پارٹی دینا چاہ رہا ہے فیسٹیول کی کامیابی کی خوشی میں۔" وہ پرجوش سے بتا رہے تھے کہ روحان کو دیکھ کر پکارا۔

"روحان! آجاؤ یار، شہاب سے گپ شپ ہو رہی ہے۔" کرنل شہاب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ تک سک سے تیار وہ شاید کہیں جانے لگا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔ سوری بابا! فرقان صاحب نے اپنے کالج کے فنکشن میں انوائیٹ کیا ہے، میں اس وقت وہیں جا رہا تھا۔" کف لنکس بند کرتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

"چلو پھر رات میں ملاقات ہوتی ہے۔" تیمور صاحب خوش دلی سے بولے تھے۔

☆ ☆ ☆

"ڈاکٹر حماد سے اسی رویے کی امید کی جا سکتی

ہے۔" حنا نے ہاتھ میں پکڑا چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ لنچ بریک میں ہاسپٹل کی پچھلی طرف سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ کیفے جانا انہوں نے کم کر رکھا تھا۔ فرح اور ثانیہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"سم کا پتہ کرا لیا میں نے۔ کسی شیر دل کے نام ہے۔" فرح کو بروقت یاد آیا۔

"میں نے منع کیا تھا نا۔"

کیوں یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا بلکہ میرا کزن تو کہہ رہا تھا ہمیں سائبر کرائم میں رپورٹ کرنی چاہیے۔ اس طرح کوئی تمہیں مزید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اچھا ہے ڈاکٹر حماد کے سامنے بھی سب کھل کر آ جائے گا۔ وہ تو قابو آئیں گے نا کسی طرح۔"

"جتنا نقصان ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے کوئی رپورٹ نہیں کرنی۔ سب پتہ چل چکا ہے مجھے اور شیر دل کا نام سامنے آنے کے بعد کوئی شک کی گنجائش بھی نہیں رہی۔"

"کون ہے یہ شیر دل؟" حنا اور فرح بری طرح چونکی تھی۔

"خیر شیر دل بے چارے کا تو کوئی قصور ہے بھی نہیں۔ اسے تو کچھ پتا بھی نہیں ہو گا۔ انگلینڈ گیا ہوا ہے پڑھنے کے لیے۔ ہاں اس کی سم ضرور استعمال ہوئی ہے۔" ثانیہ کی بات نے ان کے تجسس کو مزید بڑھایا تھا۔

"بتاؤ بھی اب۔" حنا کو صبر کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

"اچھوڑ دو اس ذکر کو۔ میں نام نہیں لینا چاہتی۔" ثانیہ نے ٹالنا چاہا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔ ہم تمہاری دوستیں ہیں۔" فرح نے خفگی دکھائی۔

"اور یہ تم بچانا کس کو چاہ رہی ہو۔" حنا تپی۔

"اچھا ٹھیک ہے مگر ایک بات سن لو۔ مجھے کسی کے خلاف کچھ نہیں کرنا اور تم دونوں کسی سے اس سب کا ذکر نہیں کرو گی۔"

دونوں نے بے تابی سے سر ہلایا۔ ان کی منتظر نظریں ثانیہ پر تھیں۔

ثانیہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شیر دل فریال کا بھائی ہے۔"

بات سمجھ میں آتے ہی دونوں کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس دن وہ روحان کے ساتھ ہی کلاسز لینے چلی گئی تھی۔ روٹین کا آغاز پھر سے ہو گیا تھا۔ اسی دوران ایک خوشگوار شام میں اس کی ملاقات تیمور انکل اور صاعقہ آنٹی سے ہو گئی تھی۔ ہنستے مسکراتے تیمور انکل اور دھیما بولنے والی صاعقہ آنٹی اسے بہت اچھی لگیں۔ امی اور مجید چاچا کے ساتھ مل کر اقدس نے ان کے لیے دعوت کا اہتمام کیا تھا جس پر امی انہیں پہلے ہی مدعو کر چکی تھیں۔ دعوت خاصی اچھی رہی۔ سب سے زیادہ حیرت اسے کرنل شہاب کو مسلسل ہنستے مسکراتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ اتنا خوش تو اقدس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا یا پھر وہ خوشی بھی چھپا کر رکھتے تھے۔ کم از کم اسے دیکھ کر تو ان کا موڈ اکثر خراب ہی رہتا تھا۔

زندگی ایک خوب صورت ڈگر پر چل نکلی تھی۔ وہ اکثر تیمور انکل کے گھر جانے لگی تھی۔

روحان تیمور کے ساتھ ساتھ اسے اس گھر کے ہر فرد سے محبت ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ ڈاکٹر ثانیہ کے خلاف پینل بٹھا رہے ہیں۔ بھائی آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" گوہر کو جیسے ہی خبر ملی وہ فوراً" ڈاکٹر حماد کے پاس آیا۔ اس وقت ان کے دفتر میں قمر بھی بیٹھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ تم اس معاملے سے دور رہو۔" ڈاکٹر حماد سنجیدہ تھے۔

"ایسا مت کریں بھائی۔ میں انہیں جانتا ہوں' وہ ایسی لڑکی نہیں ہیں اور اگر وہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم تو یہی سچ ہو گا۔" گوہر نے انہیں

قائل کرنا چاہا۔
"گوہر! کیوں خوامخواہ خود کو الجھا رہے ہو اور جانتے کیا ہو اس لڑکی کے بارے میں۔ بلاوجہ حمایت مت کرو اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔ میرا مسئلہ ہے میں دیکھ لوں گا۔" ڈاکٹر حماد نے اسے ٹالا۔
"ہسپتال سے نکلوانا چاہتے ہیں انہیں۔" گوہر اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔
"ہاں نکلوانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے وہ لڑکی اس ہاسپٹل میں گوارا نہیں ہے۔" اس بار ان کا لہجہ سخت تھا۔
"آپ بہت غلط کر رہے ہیں بھائی!" اپنی بات کہہ کر پریشان سا گوہر باہر نکل گیا۔
"حماد! کیا خبر گوہر ٹھیک کہہ رہا ہو اور پھر وہ لڑکی بھی تو بضد ہے کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔" اتنی دیر سے خاموش بیٹھا قمر بولا۔
"کس کی باتوں میں آرہے ہو۔ کل کا بچہ ہے یار! کیا تجربہ ہے اسے لوگوں کا لوگ اندر سے کچھ ہوتے ہیں باہر سے کچھ۔ جہاں تک اس لڑکی کی بات ہے مجرم نے بھی کبھی جرم کا اعتراف کیا ہے۔ وہ تو خود کو معصوم ہی ظاہر کرے گی نا۔" ڈاکٹر حماد نے کوفت سے کہا۔
"ویسے لڑکی ہے بڑی جی دار۔ تمہارے ساتھ کوئی اپنے آپ کو خود اسکینڈلائز کرلے۔ ہمت کی داد تو دینی پڑے گی۔" قمر اپنی جون میں واپس آگیا۔ "میری مانو چھوڑو اس لڑائی جھگڑے کو۔ شادی کرلو اس سے۔ کیا خبر واقعی بے چاری نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں متوجہ کرنا چاہا ہو۔ ظاہر ہے تمہیں متوجہ کرنے کے لیے عام طریقہ تو کام آنہیں سکتا تھا۔" اس کی گھورتی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے قمر نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔
"فضول مشورے اپنے پاس رکھو۔" وہ خفگی سے بولے۔ قمر ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔
"پتا ہے اب اس نے کیا کیا ہے۔ جب سے سب کو معلوم ہوا ہے کہ میں اس کے خلاف پینل بیٹھا رہا ہوں۔ اس نے یہ مشہور کردیا ہے کہ چونکہ ہمارا بریک اپ ہوگیا ہے اسی لیے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے میں اس کے خلاف رپورٹ بنا رہا ہوں۔" صبح سے ان کو اس نئی بات پر غصہ آیا ہوا تھا۔
"ہوں لڑکی تو کافی خطرناک ہے۔" قمر سنجیدہ ہوگیا۔
"تم اس خطرناک حسینہ کے خلاف منصوبے بناؤ۔ میں چلتا ہوں۔" کچھ دیر بعد سر جھٹک کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

✡ ✡ ✡

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ وارڈ کے باہر کھڑی تھی جب گوہر اس کے پاس آیا۔
"میں مصروف ہوں۔" ثانیہ نے رخ پھیرا۔
"آپ مجھے اگنور کر رہی ہیں۔ اتنے دنوں سے میں آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔" وہ خفا ہوا۔
"میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔"
"میں آپ سے کوئی ایسا سوال کرنے نہیں آیا جس کا جواب آپ نہ دے سکیں۔ پلیز مجھ سے بات کریں۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ آپ ایسی حرکت کرسکتی ہیں۔"
ثانیہ گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف مڑی "اتنا یقین ہے تمہیں۔" اس نے گوہر کے پریشان چہرے کو دیکھا۔
"بالکل ہے اور اس پر بھی ہوگا جو آپ بتائیں گی۔" گوہر کا لہجہ مضبوط تھا۔
وہ اس کے ساتھ باہر آگئی۔ ایک پرسکون گوشے میں وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ ثانیہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ان میسجز کا ذکر گول کرگئی اور یہ بھی کہ وہ جانتی ہے یہ سب کس نے کیا ہے۔
"میں حیران ہوں یہ سب کرکے کسی کو کیا ملے گا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

"پتا نہیں۔ مجھے خوشی ہے تم نے میرا یقین کیا۔"
ثانیہ کو حقیقتاً خوشی ہوئی تھی۔
"مگر بھائی' ان کو میں کیسے روکوں وہ تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔" وہ شرمندگی سے بولا۔
"کرنے دو جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ میری وجہ سے اپنا تعلق مت خراب کرو۔ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں گوہر۔" ثانیہ نے اسے اس مشکل سے نکالنا چاہا۔
"آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ کی ساری محنت۔"
ثانیہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کچھ نہیں ہوتا' چھ مہینے جو میں نے گائنی وارڈ میں ہاؤس جاب کی ہے' اس کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ باقی چھ مہینے کسی اور ہسپتال میں کرلوں گی۔ تم پریشان مت ہو۔"
"آپ نے سائبر کرائم میں رپورٹ کی؟ آپ کو کرنی چاہیے۔ آپ کا مزید نقصان ہو سکتا ہے۔"
"ہوں' کروں گی۔ تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔" ثانیہ نے موضوع بدل دیا۔
ثانیہ کا ہاسپٹل سے نکالا جانا ان کے گھرانے کے لیے ایک دھچکا تھا۔ وہ ہمیشہ سے محنتی رہی تھی۔ اپنے ہر کام کو اچھا کرنے کی دھن اس پر سوار رہتی تھی۔ ایسے میں اس کی اتنی کوتاہیاں سامنے آنا اور ہاسپٹل سے نکال دیا جانا سب ہی کے لیے حیران کن تھا۔ کرنل شہاب کے لیے صرف یہی بات ناقابل یقین نہیں تھی بلکہ ڈاکٹر حماد کے ساتھ افیئر اور بریک اپ کے قصے جو ہاسپٹل میں مشہور تھے' وہ بھی ان تک پہنچ گئے تھے۔ ثانیہ ان کے رویے سے پریشان تھی۔ دو دنوں سے انہوں نے نہ اس کی طرف دیکھا تھا نہ بات کی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب کرنل شہاب دفتر سے واپس آئے۔ ثانیہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ آج اس کا ارادہ تھا کہ وہ خود ان سے بات کرے گی۔ وہ اپنی فیورٹ بیٹی سے کیسے اتنے دن خفا رہ سکتے تھے۔
"ابو! مجھے پکڑا دیں۔" آگے بڑھ کر اس نے ان کے ہاتھ سے چیزیں لینا چاہیں۔ مگر کرنل شہاب اس کو نظر انداز کر کے مہرین سے چائے بھجوانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ قریب کھڑی اقدس نے افسوس سے ثانیہ کے بجھتے چہرے کو دیکھا جس کی وجہ کرنل شہاب کا سرد اور اجنبی رویہ تھا۔
اس سے پہلے کہ اقدس کچھ کہتی ثانیہ صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
"آپی!" اقدس جلدی سے اس کے پاس بیٹھی۔ چائے کا کہہ کر آتی مہرین بھی تیزی سے قریب آئی۔
"آپی۔ پلیز چپ ہو جائیں نا۔" اقدس نے اس کے گرد بازو حمائل کیے۔
"ثانیہ پریشان مت ہو۔ ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔ بھلا وہ تم سے بھی ناراض رہ سکتے ہیں۔" مہرین نے بھی اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے تسلی دی۔
کچن سے نکلتی امی لاؤنج کا منظر دیکھ کر پریشانی سے قریب آئیں۔ "اللہ خیر' کیا ہو گیا۔ رو کیوں رہی ہو؟"
"ابو کی ناراضی کی وجہ سے رو رہی ہے۔" مہرین نے بتایا۔ ثانیہ ابھی بھی روئے جا رہی تھی۔
"بس کرو ثانیہ! ناراض نہیں ہیں' شاک لگا ہے انہیں اور پھر الٹی سیدھی باتیں سن کر آئے ہیں وہ ڈاکٹر حماد کے متعلق۔ میں بات کروں گی۔ ذرا ٹھنڈا ہو جائے ان کا غصہ۔ ابھی تو یہ ٹاپک بھی نہیں چھیڑنے دیتے۔" انہوں نے سمجھایا۔
ان کی بات سن کر اقدس کو سخت طیش آیا۔ "بس کریں امی۔ آپ ہمیشہ ان کے رویے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیوں سنیں انہوں نے لوگوں کی باتیں' کیوں یقین کیا۔ ایک بار بھی اپنی بیٹی سے پوچھا' کوئی سوال کیا۔ ثانیہ آپی تو ان کی فیورٹ بیٹی ہیں نا۔ پھر اعتماد کیوں نہیں کیا اپنی بیٹی پر۔ جانتے نہیں ہیں کیا آپی کو۔ میرے بارے میں کوئی کہتا اور وہ یقین کر لیتے تو ذرا افسوس نہ ہوتا مجھے۔ پہلے ہی کون سی میں ان کی بیٹی

ہوں۔"

"اقدس! چپ ہو جاؤ۔ باپ ہیں تمہارے۔ تم سب سے پیار کرتے ہیں۔ زیادتی نہیں کریں گے۔" امی نے سختی سے اسے ٹوکا۔

"نہیں امی! اب میں بچی نہیں رہی جسے آپ بہلا لیں گی۔"

ثانیہ اپنا رونا بھول کر اقدس کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگی۔ مہرین نے پریشانی سے کرنل شہاب کے کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ غصے میں باہر ہی نہ آجائیں۔

"زیادتی تو وہ ہمیشہ سے کرتے آرہے ہیں میرے ساتھ اور کوئی محبت وحبت نہیں کرتے وہ۔ کم از کم مجھ سے تو ہرگز نہیں کرتے۔ صرف اپنی لائق بیٹیوں سے محبت کی ہے انہوں نے۔" اقدس کے اندر کی تلخی کو محسوس کرکے ثانیہ کا دل کٹا۔

"ایسی بات نہیں ہے اقدس، وہ تم سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔"

"رہنے دیں آپی! میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ دونوں سے اگر میں متنفر نہیں ہوئی نا تو صرف امی کی وجہ سے کیونکہ امی نے ہمیشہ مجھے آپ دونوں سے محبت کرنا سکھائی ہے اور آپ مجھے بتائیں کیا صرف ان بچوں سے محبت کرنی چاہیے۔ جو ذہین اور لائق فائق ہوں۔ بڑے اور اعلیٰ گریڈز لائیں۔ جن سے والدین کا سر فخر سے بلند ہو۔ کیا کم نمبر لانے والے بچوں کا محبت پر کوئی حق نہیں ہوتا۔

میں چاہے کم نمبر لاتی تھی، پوزیشن نہیں لیتی تھی مگر پڑھتی تو تھی۔ ابو کے رویے نے ہمیشہ مجھے ڈی گریڈ کیا۔ اسی لیے میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوا۔ نہیں پڑھنا چاہتی میں کیونکہ وہ مجھے ثانیہ اور مہرین دیکھنا چاہتے تھے جو میں نہیں بن سکتی۔ میں اقدس ہوں۔ کسی کے جیسا نہیں بننا مجھے۔" اقدس اپنے آنسو صاف کرتی کمرے میں بھاگ گئی۔

امی اپنا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ثانیہ اپنی پریشانی بھول کر اقدس کی کہی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ جبکہ کرنل شہاب کو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مہرین کے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تین گھنٹوں سے وہ اسٹڈی میں بند تھے۔ کھانے کے لیے بھی منع کر دیا تھا۔ ثانیہ ہمت کرکے اٹھی اور اسٹڈی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ہلکی سی دستک دے کر اندر آگئی۔ سنگل صوفے پر بیٹھے کرنل شہاب نے ہاتھ میں کتاب پکڑ رکھی تھی جبکہ منتظر نظریں دروازے پر تھیں۔ ثانیہ کو اندر آتے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کرکے سنٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ ثانیہ ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذہن میں الفاظ کو ترتیب دے کر اس نے بولنا شروع کیا۔

"مجھے اندازہ ہے ابو! میری وجہ سے آپ کو سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کو حق ہے۔ آپ ناراض ہو سکتے ہیں۔

لیکن ابو اپنے دل سے پوچھیں۔ کیا وہ ساری باتیں جو میرے نام کے ساتھ جوڑی گئی ہیں وہ سچ ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کی ثانیہ بھلا ایسا کچھ سوچ سکتی ہے۔ وہ سچ نہیں ہے ابو! کچھ بھی سچ نہیں ہے۔"

وہ روتی ہوئی سر جھکائے بولے جارہی تھی۔

"مجھے معاف کر دیں ابو! ایسے ناراض مت ہوں۔"

کرنل شہاب کا ہاتھ اس کے سر پر آکر ٹھہر گیا۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"جب کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کیوں مانگ رہی ہو۔"

"آپ ناراض جو ہیں۔ ہاؤس جاب سے جو نکالی گئی ہوں۔ حالانکہ ان میں سے چند غلطیوں کے علاوہ میری کوئی غلطی نہیں تھی۔" اس نے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

”رپورٹ غلط تھی تو اسٹینڈ کیوں نہیں لیا۔“
”سمجھیں۔ کسی کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں اپنے محسن کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اور چھ مہینے میں کسی اور ہاسپٹل میں لگالوں گی۔“ اپنی آنکھیں پونچھتی وہ مسکرائی تھی۔ ”ایک اور بات کہوں۔“
انہوں نے سر ہلا کر جیسے اجازت دی۔
”اقدس کو بھی معاف کر دیں۔ چھوٹی ہے۔ اس لیے آپ کی محبت کو نہیں سمجھتی۔“ ثانیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔
انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”زیادتی تو اس کے ساتھ ہوئی ہے۔ جانے انجانے میں تم دونوں کو اہمیت دیتے دیتے خود سے بہت دور کر دیا اس کو۔ ناراضی تو بنتی ہے اس کی۔ ٹھیک کہتی ہے میں نے تفریق کی اور احساس بھی نہیں ہوا کہ میری ایک بیٹی کس احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے۔“ ان کے لہجے میں ندامت تھی۔
”آپ پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ثانیہ سے ان کی افسردگی برداشت نہیں ہوئی تھی۔

✡ ✡ ✡

”دیکھا آپی! کیسا فٹ پلان تھا میرا۔ مانتی ہیں نا پھر میری صلاحیتوں کو۔“ فریحہ چہکی۔ لیپ ٹاپ گود میں رکھے وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر فریال بیٹھی فیشن میگزین کے اوراق الٹ رہی تھی۔
”بالکل مانتی ہوں‘ جینئس بھی ہو اور اچھی ہیکر بھی... ویسے مجھے لگتا ہے ثانیہ کو شک ہو گیا ہے کہ سب میں نے کیا ہے۔“ فریال کو اس دن والا واقعہ یاد آیا جب وہ ثانیہ کو تنگ کرنے کی غرض سے گئی تھی۔
”ہوتا رہے‘ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کون سا ثابت کر سکتی ہے کچھ۔ آپ تو خوش ہیں نا‘ وہی ہوا ہے جو آپ چاہتی تھیں۔“
”خوش تو بہت ہوں۔ یہی چاہتی تھی میں اور دیکھو کیسے زبردست طریقے سے میں نے اسے ہاسپٹل سے نکلوایا ہے۔ اب شہاب انکل کو بھی پتا چلا ہو گا کیسی ہے ان کی بیٹی۔ ڈاکٹر حماد والا قصہ تو ان سے برداشت ہی نہیں ہوا ہو گا۔ اب دیں نا پارٹی اپنی بیٹی کی اتنی بڑی کامیابی پر۔“
لاؤنج کے داخلی دروازے سے اندر آتے سراج صاحب نے فریال کی پوری بات سنی تھی۔ تیز قدموں سے وہ آگے بڑھے۔ چہرے پر شدید غصہ تھا۔
”اچھا‘ تو تمہارا ہاتھ ہے ثانیہ کو ہاسپٹل سے نکلوانے میں۔“
ان کی آواز پر دونوں بری طرح چونکیں۔
فریحہ کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ گرتے گرتے بچا تھا۔
فریال بھی سٹپٹا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔
”بجائے شرمندہ ہونے کے اپنے کارنامے پر خوش ہو رہی ہو۔“ ان کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔
”یہی تربیت کی تھی ہم نے۔ اسی لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ ایک دن یہ کارنامے انجام دو۔“ ان کا تذلیل آمیز لہجہ فریال کو سلگا گیا۔
”مجھے کیوں الزام دے رہے ہیں اب۔ آپ نے ہی تو بنایا ہے مجھے ایسا۔ یہ مقابلہ بازی آپ کی ہی سکھائی ہوئی ہے۔“ فریال کا گستاخ انداز انہیں اشتعال دلا رہا تھا۔ مگر وہ ضبط کیے کھڑے رہے۔
”ثانیہ نے اے پلس لیا ہے۔ ثانیہ نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔ فریال! تمہیں بھی ثانیہ جیسے مارکس لینے ہیں۔ آپ کو ہمیشہ اس کے کریڈیز‘ ٹرافیز‘ میڈلز نظر آئے۔ میری تیسری چوتھی پوزیشنز آپ کو کبھی اچھی نہیں لگیں۔ انکل ہمیشہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی کو سیلیبریٹ کرتے رہے اور آپ مجھے اس سے مقابلے پر اکساتے رہے۔ کبھی اپنی کامیابی پر میں خوش نہیں ہو سکی صرف اس لیے کہ ثانیہ ہمیشہ مجھے آگے کھڑی ملی۔ اب کیوں شکوہ کر رہے ہیں آپ آج اگر میں نے اسے پیچھے دھکیلا ہے تو برا کیوں لگ رہا ہے آپ کو۔“
”میں نے تمہیں کمپیٹیشن دینا چاہا تھا تاکہ تم پہلے سے زیادہ محنت کرو۔ پہلی پوزیشن لاؤ‘ آگے بڑھنا

سیکھو۔ اس لیے نہیں کہ تم اس سے حسد کرو۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نرم پڑے تھے ورنہ فریال کا انداز انہیں سخت برا لگا تھا۔

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے حسد کرنے کی۔ آپ اسے میرے مقابل لے کر آئے ہیں ورنہ اس جیسی دس بھی میرے برابر نہیں ہو سکتیں۔" فریال کے لہجے میں اپنی خوب صورتی کا غرور تھا۔

"اور پلیز مجھے سمجھانے کے بجائے انکل کو تسلی دیں۔ ویسے بھی اپنی بیٹی کے افیئر سے وہ کافی اپ سیٹ ہوں گے۔ جس بیٹی کی وہ مثالیں دیتے تھے آج اس کا افیئر پورے ہاسپٹل میں مشہور ہے۔" فریال کے زہر میں بجھے الفاظ انہیں تپا گئے۔

"اپنی زبان کو لگام دو فریال۔"

بیگم سراج ان کی اونچی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے نکلیں۔ "کیا بات ہے کیوں جوان بیٹیوں پر غصہ کر رہے ہیں۔"

"اپنی اس اولاد سے پوچھو جس کے ذہن میں اتنا زہر بھرا ہوا ہے۔" وہ ان پر برسے تھے۔

"اگر زہر ہے تب بھی آپ کا ہی دیا ہوا ہے۔" فریال نے کندھے اچکائے۔

"فریال! بدتمیزی مت کرو، جاؤ اپنے کمرے میں۔" اسے ڈپٹ کر گھورا تھا انہوں نے۔ فریحہ بھی ان کے اشارے پر فریال کے پیچھے لاؤنج سے چلی گئی۔

"دیکھا تم نے کس قدر ڈھٹائی تھی اس کے لہجے میں۔" سراج صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک دو تھپڑ ہی فریال کو لگا دیتے۔

☆ ☆ ☆

پارٹی کا انتظام گھر کے لان میں کیا گیا تھا۔ پورا لان روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ایک حصے میں باربی کیو کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ لان کی سجاوٹ اور میز کرسیوں کی خوب صورتی کو سراہتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کہ بے دھیانی میں سامنے سے آتے روحان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ قریب سے آتی اس کے کلون کی خوشبو نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا تھا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے ہوئی۔ اس خنکی میں بھی اسے اپنی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔

"وہ میں جلدی میں اندر آ رہی تھی اچانک سے آپ سامنے آ گئے۔" اقدس نے جھکی پلکوں کے ساتھ کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی زندگی میں بہت سے حادثات اچانک ہو جاتے ہیں اور پھر ہماری ٹکر تو ہوتے ہوتے رہ گئی۔ بائے دا وے نائس ڈریس۔" روحان کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اقدس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"تھینک یو۔" اقدس مسکرائی۔

اس نے بلیک کلر کا ٹراؤزر، شرٹ پہن رکھا تھا۔ پوری شرٹ پر گولڈن کلر کا ہلکا کام تھا۔ جبکہ دوپٹہ جو اس نے شانوں پر پھیلا رکھا تھا اس کی کناری پر گولڈن ڈوری لگی ہوئی تھی۔ بالوں کی مخصوص پونی ٹیل کے بجائے فرنچ ناٹ بنا رکھی تھی۔ ہلکے میک اپ نے اس کے نقوش کو خوب صورت نکھار بخشا تھا۔ آج کی پارٹی کے لیے وہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ خوشی اس کی آنکھوں اور مسکراہٹ سے محسوس کی جاسکتی تھی۔

"میں تو سمجھ رہا تھا آپ چیف گیسٹ کی طرح سب سے آخر میں آئیں گی۔" روحان کے لہجے میں شرارت تھی۔ بلیک کلر کے سوٹ میں اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ اسے کوئی شہزادہ ہی لگا تھا۔

"میں تو ملیحہ کے کہنے پر آ گئی۔"

"اچھا کیا۔ یہ گھر آپ کا بھی ہے۔" روحان کے مسکراتے لہجے میں کچھ خاص تھا یا اقدس کو محسوس ہوا تھا، وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ بس اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔

کیمرے کی کلک کی آواز پر دونوں نے اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں ملیحہ ہاتھ میں کیمرا لیے کھڑی تھی۔

"تمہارا کیمرا تو چیک ہو گیا روحان، واقعی پکچر اچھی آئی ہے۔" مسکراتی ہوئی وہ ان کی طرف آئی۔

"یہ کیا۔" ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر اس نے دونوں کو گھورا۔ "پارٹی کی تھیم بلیک ہے۔"

"نہیں تو۔" روحان نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر تم دونوں نے میچنگ کیوں کی ہوئی ہے۔ ویسے تو فیسٹیول کے کرتا دھرتا تم دونوں ہی ہو' میچنگ تو بنتی ہے۔"

"اتفاق ہے ورنہ پری پلان تو نہیں تھا۔" اقدس کے سادگی سے کہنے پر ملیحہ شرارتی انداز میں مسکرائی۔

"کچھ اتفاقات خاصے خوش گوار ہوتے ہیں۔"

"ان پر پھر کبھی غور کریں گے۔ اقدس کو اندر لے جاؤ۔ میں باہر کے انتظامات دیکھ کر آتا ہوں۔ مہمان آنے والے ہیں۔ دیکھ لو سب تیار ہیں یا نہیں۔"

روحان اپنی بات کہہ کر لان کی طرف چلا گیا۔ اقدس ملیحہ سے باتیں کرتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

لان مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سب ہی خوش گپیوں میں مصروف ساتھ ساتھ کھانا انجوائے کر رہے تھے۔ آس پڑوس کے لوگوں کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ کا اسٹاف' روحان کے اسٹوڈنٹس کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

ایک میز کے گرد اقدس' مہر' ملیحہ اور نتاشا بیٹھی تھیں۔

"دعا یاد ہے' ہماری کلاس فیلو تھی نائنتھ میں۔ کل ملاقات ہوئی اس سے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی' اُدھر ہی شفٹ ہوئی ہے۔ سن رہی ہو۔" کباب منہ میں رکھتے ہوئے مہر نے اس کی بے توجہی نوٹ کی۔

ملیحہ اور نتاشا کھانا لینے کے لیے اٹھ کر گئی تھیں۔

"ہوں۔ مہر کتنی خوب صورت ہے نا وہ۔"

مہر نے اقدس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا فریال رائل بلو کلر کی ڈبل شرٹ اور کیپری میں ملبوس تھی۔ شرٹ پر سلور اور بلو اسٹونز کا کام تھا۔ خوب صورت لمبے بال پوری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ پیروں میں سلور ہائی ہیلز پہن رکھی تھیں۔ خوب صورت مسکراہٹ لبوں پر بکھرائے وہ اسے کوئی ساحرہ لگی۔ بہت سی توصیفی نظریں اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

"لڑکی ہو کر میری نظر نہیں ہٹ رہی۔ کیا کوئی شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جو اس کی خوب صورتی کو نظر انداز کر سکے۔" اقدس کی سنجیدگی سے کہی بات کو وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

ایک گہرا سانس لیتی وہ اقدس کی طرف مڑی۔

"حسین تو فریال بہت ہے' اس میں تو کوئی شک نہیں مگر ظاہری حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اور میرے نزدیک صرف صورت دیکھ کر کی جانے والی محبت محبت نہیں ہوتی۔ حسین صورتیں تو بہت سی ہوتی ہیں۔ آج ایک کی صورت سے محبت ہے تو کیا کل دوسری سے ہو جائے گی۔"

"اور پہلی نظر کی محبت؟ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔" اقدس نے بحث شروع کرنا چاہی۔ مہر چڑ گئی۔

"مجھے نہیں پتا میں نے کوئی پی ایچ ڈی نہیں کر رکھی۔ ہوتی ہو گی بھئی۔ تمہیں اسے تاڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی یہ خوشگوار رات مت برباد کرو۔" پھر کسی خیال پر مہر شرارت سے مسکرائی۔

"ویسے اگر میں لڑکا ہوتی تو ثانیہ آپی یا مہرین آپی میں سے کسی سے شادی کرتی۔ دیکھو کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔" مہر نے ان کی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں وہ اپنی امی' صاعقہ آنٹی اور مہر کی امی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ ملیحہ بھی ان کے پاس کھڑی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ "اچھا میں نہ نظر آتی تمہیں۔" اقدس بھی شرارت پر آمادہ تھی۔ مہر نے ناقدانہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

"نہیں بھئی سوری۔ میں کیوں ایسی لڑکی کے بارے میں سوچتی جو روحان تیمور کی محبت میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہو۔ تمہیں میں روحان تیمور کے لیے چھوڑ دیتی۔"

مہر کے مزے سے کہنے پر اقدس نے خفگی سے اسے

گھورا۔ یہ وہ سچ تھا جس کا اعتراف وہ خود سے کرتے بھی گھبراتی تھی اور مبر کتنی روانی سے بول گئی تھی۔ وہ دونوں تو کوئی اور موضوع چھیڑ چکی تھیں مگر ان کے قریب سے گزرتی فریال اگلا قدم اٹھانا بھول گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ دونوں بھی کرسیاں کھینچ کر ان کی میز پر آگئیں۔ ملیحہ اور نتاشا پہلے ہی ادھر بیٹھی ثانیہ اور مبرین سے گپ شپ کر رہی تھیں۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی۔ فضا میں چار سو رات کی رانی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عبداللہ ان کے قریب آیا۔

"کسی کو کچھ چاہیے۔" اس نے گویا اپنی خدمات پیش کیں۔ سب ہی کے ہاتھوں میں گرین ٹی سے بھرے کپ تھے۔

"عبداللہ! گرین ٹی لادو۔" مبر نے جھٹ سے فرمائش کی کیونکہ وہی دونوں تھیں جن کے ہاتھ خالی تھے۔ سویٹ کھا کر سیدھی ادھر آئی تھیں۔

"میں لا دیتا ہوں اقدس آپی آپ لیں گی۔"

"ضرور۔" اقدس نے مسکرا کر کہا۔ وہ سر ہلاتا چلا گیا۔

"اقدس بیٹا میرا موبائل کہاں رکھا تھا۔" صاعقہ آنٹی نے اس سے پوچھا۔

"آنٹی لاؤنج میں انگیٹھی پر رکھا تھا۔ چاہیے تو لا دوں۔"

"لا دو۔ اصل میں میری بہن کال کر رہی ہوں گی۔" اقدس سر ہلاتی اٹھ گئی۔

ابھی وہ داخلی دروازے کی طرف جاتی سیڑھیوں کا پہلا اسٹیپ ہی چڑھی تھی کہ پیچھے سے آکر فریال اس کے سامنے دوسرے اسٹیپ پر کھڑی ہو گئی۔ اقدس کو رکنا پڑا۔ فریال کی سلگتی نظریں اقدس کے سراپے پر تھیں۔

"خاصی تیزی میں ہو۔"

"اندھا دھند چلنے والے اکثر منہ کے بل گرتے ہیں۔ یہ جو تم غلط سمت کا تعین کر بیٹھی ہو نا اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔" اقدس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔ آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی تھی۔

"یہ محض سراب ہے جس کا پیچھا تم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔" اس کے متذبذب تاثرات دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

"اوہو آئم سوری۔ میں تو بھول ہی گئی۔ اتنی مشکل گفتگو اقدس شباب جیسی لوزر کی تو سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔" اقدس کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

"چلو آسان لفظوں میں بات کر لیتے ہیں۔ یہ جو روحان تیمور کے ساتھ کا خواب تمہاری آنکھوں میں ہے نا۔ یہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ فریال سراج کے ہوتے ہوئے وہ کبھی تمہیں اہمیت نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہے۔ ان فیکٹ محبت کرتا ہے مجھ سے اور اگر میں نہ بھی ہوتی تب بھی تم میں کچھ ایسا نہیں ہے کہ روحان جیسا بندہ تمہیں پسند کرے۔ جس لڑکی کو گھر والے کچھ نہیں سمجھتے ہوں باہر والے اسے کیوں اہمیت دینے لگے۔" اس کا چبھتا ہوا لہجہ اقدس کے دل کو چھلنی کر رہا تھا۔ نظریں زمین پر گاڑے وہ حوصلے سے کھڑی تھی۔

"بائے دا وے مشورہ ہے تمہارے لیے۔ ٹھیک ٹھاک ہی ہو اگر اپنے جیسا کوئی ڈھونڈ لو۔ کیونکہ تم جیسی عام لڑکی کے لیے روحان تو نہیں ہو سکتا۔" جاتے جاتے بھی وہ اسے ذلیل کر گئی۔

اپنی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو اس نے نہیں روکا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اسے صاعقہ آنٹی کا موبائل لانا تھا۔ تیزی سے گھر کا بیرونی گیٹ پار کرتے اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ روحان تیمور کی جگہ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا فریال نے 'وہ ایک لوزر تھی اور اس بات کا احساس اسے بچپن سے دلایا گیا تھا۔ ہمیشہ زندگی کے میدان میں پیچھے رہ جانے والی اقدس شباب بھلا محبت میں کیسے جیت سکتی تھی؟

☆ ☆ ☆

"سرپرائز کر دیا روحان لنچ پر انوائٹ کر کے۔" وہ سیدھی ہاسپٹل سے آرہی تھی۔ لنچ ٹائم سے پہلے ہی روحان نے اسے فون کر کے لنچ ساتھ کرنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔

"میں نے سوچا آج میں لنچ پر بلاؤں۔ ہمیشہ آپ خود ہی آتی ہیں۔" روحان نے اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو اس کے مزاج کا خاصا تھی۔

"کیا پلان ہے، کہاں لنچ کرنا ہے۔" فریال شانت سی اپنے خوب صورت بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

"یہیں کرتے ہیں، میں نے کہہ دیا ہے، تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا۔" وہ اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھے۔

"اس دن پارٹی بہت اچھی تھی اور تمہارے ریسٹورنٹ کا کھانا، اس کی تو کیا بات ہے امیزنگ۔ ارینجمنٹس بھی بہت اے ون تھی۔" فریال نے کھلے دل سے تعریف کی۔

"تھینک یو۔ کیا پلانز ہیں آگے زندگی میں۔"

"اسپیشلائزیشن کرنے کا ارادہ ہے۔"

"اور شادی، اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

روحان کے سوال پر وہ بھرپور انداز میں مسکرائی۔

"ہوں، شادی کا پلان پہلے تو نہیں تھا۔ ممی تو کب سے چاہتی ہیں کسی پروپوزل پر ہاں کر دوں میں ہی ٹالتی رہی۔ مگر اب سوچ رہی ہوں کوئی اچھا لگے تو کر ہی لوں۔"

"مجھے بھی پہلے کبھی سوچنے کا موقع نہیں ملا اس بارے میں۔ اسٹیبلش بھی ہو چکا ہوں پر کچھ سالوں تک شادی کا پلان نہیں تھا۔ اب امی ابو کی بھی خواہش ہے اور پھر ملیحہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے چکر بھی کم ہو جائیں گے۔ مصروف ہو جائے گی اپنی زندگی میں۔"

"اس لیے تم شادی کا سوچ رہے ہو۔" فریال نے کہا۔

روحان کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں بازو ٹیبل پر رکھے وہ ایک ہاتھ سے پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔ نظریں بھی اسی پر تھیں۔

"صرف یہ وجہ نہیں ہے۔ ایک بڑی وجہ محبت کا وہ خوب صورت احساس ہے جو میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا۔"

"اور کون ہے وہ خوش قسمت لڑکی۔" فریال نے بے اختیار پوچھا۔

"تم ہی ہو فریال۔ محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔" وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر خوشی روشنی بن کر اتر رہی تھی۔ مگر روحان تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔ فریال کو لگا دفتر کی چھت اس پر آن گری ہو۔

☆ ☆ ☆

"کیا سوچ رہے ہیں۔" کرنل شہاب کو سوچوں میں غرق دیکھ کر ان کی بیگم نے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"مشکل میں ڈال دیا ہے تیمور نے۔" انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔

کپڑے تہ کرتے ان کے ہاتھ رکے۔ "مشکل کیا ہے، اچھا، شریف، رکھ رکھاؤ والا بچہ ہے اور پھر تیمور بھائی کی فیملی کو ہم ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ آپ کہیں ثانیہ کی وجہ سے تو نہیں پریشان ہو رہے۔ اس کے بھی کچھ پروپوزلز آئے ہوئے ہیں۔ میرا تو خیال ہے دونوں کے رشتے ساتھ ہی طے کر دیں گے۔"

"آپ بات کو سمجھ نہیں رہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ منتظر نظریں شوہر کے چہرے پر تھیں۔

"ٹھیک ہے، روحان ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ اس کا مزاج، اخلاق، شرافت سب اپنی جگہ۔ مگر بیٹی کا رشتہ کرتے وقت بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ خاندان والوں کو اور دوسرے ملنے والوں کو میں کیا بتاؤں گا کہ میرا داماد باورچی ہے، کتنی سبکی ہو گی خاندان میں۔"

"حد کرتے ہیں آپ بھی۔ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے

کوئی چور اچکا ہے۔ پڑھا لکھا محنتی بچہ ہے۔ اپنا ریسٹورنٹ چلاتا ہے۔ آپ اپنی اسی پرانی سوچ کی وجہ سے یہ رشتہ گنوا دیں گے۔ اس قدر محبت کرنے والے لوگ ہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں گے۔" ان کا موڈ خراب ہوا۔

"میں نے کون سا انکار کر دیا ہے۔ فیصلہ تو سوچ سمجھ کر ہی کرنا پڑتا ہے۔"

"انکار نہیں کیا مگر تیور آپ کے یہی ہیں۔ وہ داماد آپ بے شک ڈاکٹر' انجینئر ڈھونڈ لیں مگر خدا کے لیے اس بے کار سی سوچ کے پیچھے روحان کے رشتے سے انکار مت کریں۔" وہ تپ کر کہتی اٹھ گئی تھیں۔ کرنل شہاب کے چہرے پر پرسوچ لکیریں تھیں۔

☼ ☼ ☼

روحان تیمور اس سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ فریال سراج کو چھوڑ کر وہ کیسے پسند آ گئی اسے؟ کیوں نظر انداز کر دیا اس نے فریال جیسی حسین لڑکی کو؟ کیا خاص تھا اس لڑکی میں کہ روحان کی نگاہ اس پر سے نہیں ہٹتیں۔ اس کے دل میں محبت کا احساس فریال کے لیے کیوں نہیں جاگا تھا۔

بہت سی سوچوں نے اس کا ذہن منتشر کر رکھا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ گاڑی کے اسٹیئرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت تھی۔ گلابی لب بھینچے ہوئے تھے اور گاڑی فل اسپیڈ سے بھاگ رہی تھی۔

"محبت کا وہ خوب صورت احساس جو میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا۔"

"بہت شاندار شخصیت کا مالک ہو گا وہ جسے میں منتخب کروں گی۔"

"تمہارا گوہر نایاب بھی دیکھ لیں گے۔"

"اس کے علاوہ کبھی کوئی اچھا ہی نہیں لگا۔"

بہت سی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ سامنے کا منظر اسے ٹھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھند تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئی تھی۔ ایک زور دار دھماکا ہوا تھا۔ سامنے سے آتے ٹرک سے اس کی گاڑی ٹکرائی اور الٹ گئی۔ آس پاس بہت سی آوازیں تھیں' شور تھا۔ مگر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ثانیہ دستک دے کر اس کے کمرے میں آئی۔

"کیا کر رہی ہو۔"

"ناول پڑھ رہی تھی۔ آپ آئیں نا۔" اقدس نے ناول بند کر کے رکھ دیا۔

"سونے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ مہرین تو کب کی سو گئی۔ سوچا تمہیں دیکھ لوں۔" ثانیہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"مہرین آپی جلدی نہیں سو گئیں۔"

"ہوں۔ اس کے فائنلز قریب ہیں۔ صبح فجر کے وقت اٹھ کر پڑھتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کیوں نہیں جا رہیں اتنے دنوں سے۔" ثانیہ نے اقدس کو بغور دیکھا۔

"اچھی خاصی شیف بن چکی ہوں۔ اب جا کر کیا کروں گی۔" ثانیہ کی بات ہنسی میں اڑاتی' اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

پارٹی کے بعد سے وہ نہ تو انسٹی ٹیوٹ جا رہی تھی نہ ہی اس نے انکل تیمور کے گھر کا رخ کیا تھا۔ وہ خواب جو اس نے اپنی آنکھوں میں بسائے تھے انہیں نوچ کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ سوچ لیا تھا اس نے کہ کبھی روحان تیمور کا سامنا نہیں کرے گی۔ اس کے دل میں اگر فریال ہے تو اقدس بھی اسے دل سے نکال دے گی۔ اپنی ذات کا تماشا بنوانا اسے گوارا نہیں تھا۔

"سچ بتاؤ' یہ جو اتنے دنوں سے اداس پھر رہی ہو' کیا وجہ ہے اس کی اور اس دن اچانک پارٹی چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔"

"بتایا تو تھا طبیعت خراب ہو گئی تھی۔"

"فریال سے کیا بات ہوئی تھی وہاں سیڑھیوں پر جب تم دونوں کھڑی تھیں۔"

"ایسے ہی حال احوال پوچھ رہی تھیں وہ۔" اقدس بمشکل بول پائی۔ وہ منظر اسے یاد آگیا تھا۔

"روحان کو پسند کرتی ہو نا تم۔" اقدس ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ منہ کھولتی ثانیہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"ہر بات سے انکار کر رہی ہو۔ اس بات سے مت کرنا۔ بڑی بہن ہوں تمہاری۔ تمہیں جانتی بھی ہوں اور دیکھنے کے لیے دو آنکھیں بھی ہیں میرے پاس۔"

اقدس سٹپٹائی اس کی نظریں جھک گئیں۔ "آپ کو کیسے پتا چلا۔"

ثانیہ کو اس کا لال چہرہ دیکھ کر ہنسی آئی۔ "یہ جو روحان کو دیکھتے ہی تمہاری آنکھیں چمکنے لگتی ہیں نا۔ بہت پہلے ہی سمجھ گئی تھی میں۔"

"ہاں مگر میرے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے' وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔"

"انکل تیمور نے روحان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" اقدس بے یقین تھی۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

میرا اور ان کا کوئی میچ نہیں ہے۔ وہ پرفیکٹ ہیں اور۔۔۔"

ثانیہ نے اس کی بات کاٹی۔ "کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ صرف وہی پرفیکٹ نظر آتا ہے جس میں وہ خوبیاں ہوں جو آپ کسی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ پرفیکشن تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اور تم میں کوئی کمی نہیں ہے اقدس۔ اپنے آپ کو ڈی گریڈ مت کرو۔ اس احساس کمتری سے نکلو۔ تم بہت اچھی ہو۔"

کافی دیر سے باہر کھڑے کرنل شہاب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بھول گئے تھے کہ انہیں اسٹڈی میں کتابیں رکھنے جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ اس کا سر' بایاں بازو اور دونوں ٹانگیں زخمی ہوئی تھیں۔ اس کا ایکسیڈنٹ خطرناک تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ وہ کومے میں جاتے جاتے بچی تھی۔

گہری خاموشی تھی جو اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس اس کی فیملی تھی۔ اس کے کولیگز بھی ملنے آرہے تھے۔ مگر اس کے پاس جیسے بات کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ اکثر وہ نظرانداز کرنے کے لیے سوتی بن جاتی تاکہ کوئی بات چیت کرنی ہی نہ پڑے۔ یہ اس کے کالج کا اسپتال نہیں تھا جہاں اسے لایا گیا تھا اور یہ ایک بات اسے اچھی لگی تھی۔

سارے دن وہ چت لیٹی چھت کو دیکھتی رہتی۔ ذہن میں پچھلی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی۔ روحان کے الفاظ جیسے اس کے اندر کھب گئے تھے۔ اس کے چہرے پر خراشیں آئی تھیں۔ جن پر وہ بار بار ہاتھ پھیرتی تھی۔ ایک دن نرس اسے ایسا کرتے دیکھ کر مسکرائی۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔ آپ کی خوب صورتی میں کمی نہیں آئے گی۔"

اور وہ جواباً" مسکرا بھی نہیں سکی۔ کیا بتاتی کہ خوب صورتی میں کمی تو شاید پہلے ہی آچکی تھی۔ یا اس خوب صورتی کا کوئی فائدہ تھا ہی نہیں۔ جس پر وہ اتراتی تھی۔ بچپن میں اپنی تعریفوں پر وہ شرما جایا کرتی تھی۔ پھر جب ثانیہ سے اس کی سرد جنگ شروع ہوئی۔ تب اسے اپنی تعریف اچھی لگتی۔ اسے لگتا ایک یہی چیز ہے جس میں ثانیہ اس سے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ تب اس کی شخصیت میں اپنے حسن کا غرور جھلکنے لگا تھا۔ آس پاس والوں کی توصیفی نظروں کو وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔

ثانیہ آئی تھی اس سے ملنے مگر وہ سوتی بنی رہی۔ ممی سے اس کے بارے میں پوچھتی ہوئی وہ ہمیشہ کی طرح تھی پرسکون سی۔ پتا نہیں وہ اتنی پرسکون' مطمئن کیسے رہتی تھی۔ سونے کا ڈراما کرتی ہوئی فریال نے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھیں بند تھیں جب کوئی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے آنے والے کو پہچان لیا مگر ہمیشہ کی طرح وہ سوتی بن گئی۔

"فریال! مجھے معلوم ہے تم جاگ رہی ہو۔" ان کی نرم آواز پر فریال نے گہرا سانس لیتے ہوئے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ پتا نہیں کیسے وہ اس کی ہر بات جان لیتے تھے۔

"آپ کیوں آئے ہیں؟ میں آپ کی سائیکو پیشنٹ (پاگل مریض) نہیں ہوں۔"

ڈاکٹر جنید کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ آئی تھی۔ "مانا کہ سائیکاٹرسٹ ہوں۔ مگر یہاں صرف تمہاری عیادت کے لیے آیا ہوں۔ میں پہلے بھی آیا تھا جب تم سچ مچ کی بے ہوش تھیں۔"

"ہو گئی عیادت، دیکھ لیے کتنے زخم آئے ہیں۔ خوش ہو جائیں فریال بھی کبھی بے بس سی بستر پر پڑی نظر آئی۔" فریال کے لہجے میں تلخی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ بیڈ پر رکھتے وہ تھوڑا سا جھکے تھے۔

"تم جانتی ہو تمہارے نقصان پر میں کبھی خوش نہیں ہو سکتا ۔۔۔ فرسٹریٹڈ ہو۔ کیا صرف اس ایکسیڈنٹ کی وجہ سے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" آہستہ آواز میں کہتے اس نے نظریں چرائیں۔ ان کی جانچتی نظریں وہ اپنے اوپر اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

"فریال!" ان کی دھیمی آواز پر وہ ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ ان کی گہری آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح نرمی تھی۔

"کچھ بوجھ دلوں پر پتھر کی مانند ہوتے ہیں۔ اتار لیے جائیں تو وجود کو ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں۔ اور اگر نہ اتارے جائیں تو ان کی چبھن ساری زندگی محسوس ہوتی رہتی ہے۔"

وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا جانتے تھے وہ فریال ان کی گہری آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھ نہیں سکی تھی۔ وہ سیدھے ہوئے۔

"چلتا ہوں، تمہارا تو لمبا پروگرام لگتا ہے ہاسپٹل میں رہنے کا۔" وہ جاتے جاتے مڑے۔

"کوئی بھی بات ہو فریال، تم مجھ سے کر سکتی ہو۔ میں کبھی تمہارا برا نہیں چاہوں گا۔"

نرمی سے کہتے وہ باہر نکل گئے۔ فریال گم صم سی دروازے کو دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

روحان اس سے ملنے آیا تھا یہ بات اسے ممی سے پتا چلی کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ آج کل اتنی ڈپریسڈ تھی کہ کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور روحان سے تو کسی صورت بھی نہیں۔ جو کچھ وہ اس سے سن چکی تھی اس کے بعد اس کے سامنے فی الحال وہ نارمل انداز اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ لمبی بات کرے گی تو اس کے اندر کی تلخی ضرور زبان پر آجائے گی۔ وہ بس خاموش رہنا چاہتی تھی۔

ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوتے ہی وہ اگلے دن ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ سب ہی اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ ابھی اس کی چھٹیاں باقی تھیں اور اسے آرام کی ضرورت بھی تھی۔ اور ممی نے روکا بھی تھا مگر ضد کر کے وہ آتو گئی تھی مگر زیادہ دیر اس سے وارڈ میں کھڑا نہیں رہا گیا۔ زخموں کی تکلیف سے مجبور ہو کر وہ ہاؤس آفیسرز روم کی طرف آئی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ دروازے پر ہی ٹھٹک کر رک گئی۔

"ثانیہ کے ساتھ اس نے جو کیا ہے نا۔ مجھے تو لگتا ہے اسی کی سزا ملی ہے اسے۔" حنا کی تپی ہوئی آواز آئی۔

"برے کام کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔ صلہ تو اسے ملے گا ہی اگر ابھی نہیں بھی ملا۔ مگر ثانیہ کو یوں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میری مانتی، سائبر کرائم میں رپورٹ کرتے۔ سب کچھ کھول کر ڈاکٹر حماد کے

سامنے رکھتے۔ فریال کو بھی اچھا سبق ملتا۔ لیکن ثانیہ ہمیشہ اسے صاف بچالیتی ہے۔" فرح بولی تھی۔

"تب ہی تو اسے شہہ ملی ہے' ویسے جتنی حسین فریال کی صورت ہے ناا تناہی سیاہ دل ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں شکل بھلے واجبی ہو انسان کی پر سیرت اچھی ہونی چاہیے۔"

"کبھی کبھی انسان کے اعمال کی سیاہی صورت پر بھی نظر آنے لگتی ہے۔" فرح نے تبصرہ کیا۔

توکیا اس کا دل واقعی سیاہ ہو گیا تھا یا پھر اتنا سخت کہ کسی کو نقصان پہنچا کر بھی وہ سکون سے تھی اور کیوں تھی ثانیہ اتنی اچھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی سے قبول کرلیا تھا۔ اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں وہ خود کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔

اسپتال سے باہر آتے ہوئے وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ کس طرف جانا چاہتی تھی اور کس طرف پاؤں پڑ رہے تھے۔ بس سوچیں اور آوازیں تھیں جن کی بازگشت اسے بے چین کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اپنے دفتر میں اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ یہ وہ فریال نہیں تھی جو ہر وقت شاہانہ موڈ میں رہتی تھی۔ اداس ویران سی ٹوٹی بکھری سی یہ تو کوئی نئی فریال تھی۔

"بیٹھو فریال" وہ چپ چاپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا آپ سے مل لوں۔"

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔ پر سچ یہ ہے کہ اگر تم صرف یہاں سے گزر رہی ہوتیں تو کبھی میرے دفتر نہ آتیں۔" ڈاکٹر جنید کا لہجہ متبسم تھا۔ ان کی گہری نظریں لب کاٹتی فریال پر تھیں۔

"کیا کہنے آئی ہو فریال۔" انہوں نے نرمی سے اسے بولنے پر اکسایا۔

"ثانیہ کو ہاسپٹل سے میں نے نکلوایا ہے۔"

نظریں جھکائے وہ انہیں سب بتاتی چلی گئی۔ اس دوران وہ خاموش رہے تھے۔ انہوں نے فریال کو ٹوکا نہیں تھا۔ اپنی بات مکمل کرکے فریال نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے شاید' چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

"آپ کو مجھ سے نفرت محسوس ہو رہی ہوگی۔" فریال نے اس خاموشی کو توڑا جو کچھ دیر کے لیے ان کے درمیان ٹھہر گئی تھی۔

دونوں کہنیاں ٹیبل پر رکھتے وہ آگے ہوئے۔ "میں تم سے نفرت نہیں کر سکتا فریال۔ تم جانتی ہو یا محبت ہوتی ہے یا نفرت دونوں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔"

وہ سر جھکا گئی۔

"دیکھو فریال! جب میں نے یہ سب سنا تھا تب ہی مجھے لگا تھا کہ ہو نہ ہو تمہاری اس میں انوالومنٹ کہیں نہ کہیں ہوگی۔ تم ثانیہ کو پسند نہیں کرتیں' یہ بات میں کالج کے وقت سے جانتا ہوں۔ اس وقت بھی تم ثانیہ کو تنگ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ اس کے لیے کھڑا کر دیتی تھیں۔ مجھ سے بھی تمہارا یہی جھگڑا رہتا تھا کہ تمہارے ساتھ ساتھ میں اسے کیوں پڑھا دیتا ہوں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس کس چیز نے دلایا ہے۔ تم میرے پاس آئی ہو تو میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ تم جا کر ثانیہ سے معافی مانگو۔ اپنے دل کو اس بوجھ سے آزاد کرو اور اس کے لیے وہ کرو جو تم کر سکتی ہو۔"

"اسے مجھے معاف نہیں کرنا چاہیے۔" فریال نے ٹیبل کی سطح کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

"میں تمہارا اسٹیٹ آف مائنڈ سمجھ رہا ہوں۔ انسان کے اندر اچھائی اور برائی دونوں ہوتی ہیں۔ کوئی بھی مکمل برا یا اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں کمال یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اچھائی کی روشنی کو تلاش کریں' خود اپنا محاسبہ کریں اور اپنے محاسبے کے لیے اپنے اندر اترنا پڑتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سب صاف نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔" ان کے سمجھانے کا انداز بہت خوب

صورت تھا۔ فریال کو اپنی افسردگی کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔

"اور دل کی سیاہی کے بارے میں کیا کہیں گے۔" اس بار فریال نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ مسکرائے۔ "تمہیں لگتا ہے تمہارا دل سیاہ پڑ گیا ہے۔ سو سمپل، وہ کام نہ کرو جو دوسروں کو بے سکون کر دے۔ بڑا کرو اپنے دل کو سب کے لیے۔"

"چلتی ہوں بہت وقت لے لیا آپ کا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

"فریال۔" وہ جاتے جاتے مڑی۔

"کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو۔ کوئی اور مسئلہ ہے تو ڈسکس کر لو۔" وہ اپنی جگہ سن ہوئی تھی۔

"اوکے پھر کبھی سہی۔" وہ اس کی خاموش نظروں کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ اس کے دفتر سے نکلتے ہی ڈاکٹر جنید نے موبائل اٹھا کر کال ملائی۔ سلام کا جواب دیتے ہی وہ بولے۔ "ثانیہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

☼ ☼ ☼

آج ایک بار پھر اسے وہاں آنا پڑا جہاں دوبارہ نہ آنے کا اس نے خود سے عہد کیا تھا۔ دفتر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے بیٹھے ڈاکٹر حماد پر نظر پڑی جن کے چہرے پر ثانیہ کو دیکھ کر حیرت پھیل گئی۔

"فریال آئی تھی آپ کے پاس۔" ان کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر وہ پوچھ رہی تھی۔

"جی آئی تھیں ابھی ابھی اور کچھ انکشافات کر کے گئی ہیں۔" سامنے رکھی فائل پر کچھ لکھتے ہوئے وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

"آپ اس کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔"

ہاتھ روک کر انہوں نے بغور اپنے سامنے کھڑی پُراعتماد سی ثانیہ کو دیکھا۔ "میں سمجھ نہیں پا رہا آپ دونوں کو۔ آپ خاموشی سے ہاسپٹل سے چلی گئیں۔ اب وہ آکر سارا معاملہ اپنے سر لے رہی ہیں بلکہ اپنی طرف سے سارے ثبوت بھی ساتھ لائی تھیں۔ آپ کی آئی ڈی کھول رہی تھیں۔ میری طرف سے آپ کو کیے گئے میسجز دکھا رہی تھیں اور اب آپ ان کی حمایتی بن کر آگئی ہیں۔ کیا سمجھوں میں اس سب کو۔"

"آپ وہ ہی سمجھیں جو پہلے سمجھ رہے تھے۔ مجھے ہاسپٹل سے نکلوانا تھا میں نکل گئی۔ اب مزید آپ فریال کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔" ثانیہ نے بات ختم کرنی چاہی۔ دائیں ہاتھ کا مکا اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے وہ پیچھے ہوئے۔ گہری آنکھیں ثانیہ کے سرخ پڑتے ہوئے چہرے پر تھیں۔

"آپ مجھے ڈکٹیٹ نہیں کر سکتیں۔" ثانیہ نے سنگ کر اس الٹی کھوپڑی والے بندے کو دیکھا۔

"اور پھر جو اعتراف فریال کر رہی ہیں اس کے بعد آپ تو بے قصور ہوئیں۔ سزا فریال کو ملنی چاہیے تھی نہ کہ آپ کو۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کو ڈکٹیٹ کرنے کا۔ جو معاملہ دب گیا ہے۔ اسے دبا رہنے دیں۔ ویسے بھی یہ میرا اور فریال کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے اسے کوئی سزا نہیں دلوانی۔" سنجیدگی سے کہتی وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

ڈاکٹر حماد کے چہرے پر پُرسوچ لکیریں تھیں اور نظریں ثانیہ پر تھیں۔ جو دروازے کے پاس رکی اور بغیر مڑے بولی۔

"آپ کے لیے مشورہ ہے، سزائیں دینے کے بجائے معاف کرنا سیکھیں۔ خود بھی سکون سے رہیں اور دوسروں کو بھی رہنے دیں۔"

کھٹاک سے دروازہ بند کرتی وہ غائب ہو چکی تھی مگر ڈاکٹر حماد کی سوچتی نگاہیں دروازے پر ہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے بھائی کو سمجھانا ناممکنات میں سے ہے۔ پھر بھی تم ان کو سمجھاؤ پلیز۔ ان پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے مجھے کہ وہ میری بات پر غور بھی کریں گے۔" وہ دونوں اس وقت کالج کے کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ ہاسپٹل سے نکلتے ہی وہ اس کے ساتھ بنے کالج میں آ

گئی تھی۔

"اچھا ریلیکس کریں۔ میں بھائی سے بات کروں گا۔ اتنے برے نہیں ہیں جتنا آپ انہیں سمجھ رہی ہیں۔" جوس کا گھونٹ بھرتا ہوا گوہر بولا۔

"سوری لیکن اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔ اپنے آگے دوسرے کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔" ثانیہ کے تپ کر کہنے پر گوہر کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلی تھی۔ اسے یاد آیا کیسے وہ دونوں کی شادی پلان کر رہے تھے۔

"اچھا چھوڑیں، مجھے یہ بتائیں ڈاکٹر فریال نے آپ کے ساتھ اتنا برا کیا پھر آپ ان کے لیے اچھا کیوں سوچ رہی ہیں بلکہ پہلے بھی آپ جانتی تھیں۔ تب بھی خاموشی سے اپنا نقصان کروالیا۔ کیوں؟"

"میں بھی اگر اس کے ساتھ وہی کرتی جو اس نے کیا تو ہم دونوں میں کیا فرق رہ جاتا اور اصل وجہ کچھ اور ہے۔ ہمارے فادرز بہت اچھے دوست ہیں اور یہ دوستی بہت پرانی ہے۔ تب شروع ہوئی تھی جب انکل سراج نے میرے ابو کی جان بچائی تھی۔ ابو کسی سرچ آپریشن پر تھے اور وہ انکل کا علاقائی گاؤں تھا۔ پہاڑی علاقہ تھا۔ وہاں لڑائی کے دوران ابو کو گولیاں لگی تھیں۔ انکل کو وہ ایک چھوٹی سی کھائی میں نیم مردہ حالت میں ملے تھے۔ چھوٹا سا علاقہ تھا، اسپتال میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ طبی امداد کے بعد وہ ابو کو قریبی شہر لے گئے۔ وہاں کتنے ہی دن ان کے ساتھ رہے۔ بس تب سے چلی آرہی ہے یہ دوستی۔ اور فریال کو معاف کرنے کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ہمارے محسن کی بیٹی ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر دونوں انکلز کی دوستی اتنی گہری ہے تو فریال صاحبہ کو آپ سے کیا پرخاش ہے۔" گوہر متذبذب تھا۔ ثانیہ نے گہرا سانس لیا۔

"یوں سمجھ لو کہ اس میں ہمارے بڑوں کی غلطی ہے۔ بچپن میں میری اور فریال کی اچھی دوستی رہ چکی ہے۔ مگر آہستہ آہستہ جب بڑوں نے ہمارا تقابل شروع کیا تو یہ ختم ہی ہوگئی۔ شاید فریال کی بدگمانی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ میری کامیابیوں کو ابو نے ہمیشہ سیلیبریٹ کیا جبکہ فریال کو انکل نے مجھ سے کمپیئر کیا۔ میرے جیسا بننے پر اکسایا۔ حالانکہ وہ کوئی نالائق اسٹوڈنٹ نہیں تھی۔

بچوں کے ذہن بہت نازک ہوتے ہیں۔ اپنے اردگرد ہونے والی ہر بات وہ نوٹ کرتے ہیں۔ مجھے زیادہ اہمیت دینا اسے مجھ سے بدگمان کر گیا۔ انکل اسے کمپیٹیشن دے کر زیادہ اچھی پرفارمنس کی توقع کرتے رہے جبکہ اس کا ذہن ان باتوں کو نگیٹو لیتا رہا۔ میرے خیال میں تو اس کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی ہے۔"

"بچوں کو آپس میں کمپیئر نہیں کرنا چاہیے۔" گوہر متفق ہوا۔ "آپ کی سوچ بہت پوزیٹو ہے۔"

"بقول میری امی کے ثانیہ نے ساری زندگی کتابوں میں منہ دیے رکھا ہے چاہے کورس کی ہوں یا دوسری۔" وہ ہنسی۔

"مگر میرے نزدیک کتابیں سب سے اچھی ساتھی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی دوسروں کے تجربات آپ کو وہ کچھ سکھا دیتے ہیں جو خود سے سیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

"یار ٹون چھوڑیں 'اسکالر بن جائیں۔" گوہر نے شرارتی انداز میں کہا۔

"مشورے کا شکریہ۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ تم اپنے ہٹلر بھائی سے بات کرلینا۔" اپنا ہینڈ بیگ پکڑے وہ اٹھ گئی۔

"اوکے۔" گوہر مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آرٹیکل پڑھنا' بڑا دلچسپ ہے۔" کرنل شہاب نے ثانیہ کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں اس وقت اسٹڈی میں بیٹھے اپنے اپنے مشغلے میں مصروف تھے۔

"جی۔" ثانیہ نے اپنی کتابوں سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کچھ دیر ان کا خوشگوار موڈ دیکھتے رہنے کے بعد

اس نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی۔
"ابو! روحان کے رشتے کے متعلق کیا سوچا آپ نے۔" کرنل شہاب نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا اخبار تہ کیا۔
"کوئی فیصلہ نہیں کرپایا۔" وہ سنجیدہ تھے۔
"جواب تو دینا ہوگا نا۔ صاعقہ آنٹی کا فون آیا تھا۔ ابھی تو امی نے ٹال دیا پر کب تک اور جہاں تک روحان کی بات ہے' وہ بہت اچھا ہے۔ تب ہی تو آپ صاف انکار نہیں کرپا رہے۔"
"مجھے اس کی خوبیوں سے انکار نہیں ہے مگر ہے تو وہ ایک باورچی اور یہ ہمارے ہاں کوئی اتنا عزت دار پیشہ نہیں ہے۔ خاندان والے سب ہی سوال کریں گے کہ باورچی سے بیٹی کیوں بیاہ دی۔"
ثانیہ نے اپنی کتاب بند کرکے ان کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب یہ ٹاپک چھیڑا تو پوری بات کرکے رہے گی۔
"تو باورچی ہونے میں کیا برائی ہے ابو۔ پہلی ترجیح آپ تعلیم کو دیتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے تعلیم ہی اس شعبے میں حاصل کی ہے۔ بحیثیت قوم ہم کھانے کے شوقین ہیں۔ سب کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا کھانا کھائیں۔ مہنگے سے مہنگے ریسٹورنٹ میں جاکر کھاتے ہیں اسی شوق کے پیچھے۔ آدھی سے زیادہ زندگی تو ہماری کھانے کے گرد گھومتی ہے۔ جب کھانے سے اتنی محبت ہے تو پکانے والے کو عزت کیوں نہیں دے سکتے۔ کیوں اس سے رشتہ داری جوڑنا ہمارے لیے باعث شرم ہے۔ پکاتی تو گھر کی عورتیں بھی ہیں تو اگر یہ کام اتنا ہی برا ہے تو کیا وہ عزت کے قابل نہیں ہیں؟"
"کھانا پکانا عورتوں کا ہی کام ہے۔ وہ نہیں بنائیں گی تو کون بنائے گا۔" انہوں نے بے اختیار کہا۔
ثانیہ مسکرائی۔ "یہی تو بات ہے نا ابو۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ کام عورتیں ہی کریں گی' مرد نہ کریں۔ عورتیں بھی تو مردوں کی طرح ڈاکٹر' انجینئر بنتی ہیں تو پھر وہ بھی یہ چھوڑ دیں۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں جس سے منع کیا گیا ہو۔ یہ ایک حلال طریقہ ہے روزی کمانے کا اور اس سے بڑی بات کیا ہوگی۔ آج آپ اپنی سوچ بدلیں گے تو کل کو دوسرے بھی اس سوچ کو اپنانے لگیں گے۔" ثانیہ کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔ جو کچھ تذبذب کا شکار تھے۔
"روحان بہت محنتی ہے ابو۔ اس نے اپنے شوق پر بہت محنت کی ہے اسی لیے تو آج اتنا کامیاب ہے۔" ثانیہ نے ایک اور پوائنٹ سے انہیں قائل کرنا چاہا۔ مگر وہ خاموش ہی رہے۔
"آپ سمجھتے ہیں نا کہ اقدس کے معاملے میں آپ سے زیادتی ہوئی ہے تو اگر۔۔۔ آپ اس زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں تو روحان کے رشتے سے انکار مت کریں۔ اس کی خوشی اسی میں ہے۔" ہمت کرکے اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ ہی دیا۔
انہوں نے نظریں جھکائے بیٹھی ثانیہ کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ان دونوں کی باتیں سن چکے ہیں۔
"جاؤ اپنی امی سے کہو صاعقہ بھابھی کو فون کردیں۔ ہمیں روحان کا رشتہ منظور ہے۔" خوشگوار انداز میں کہتے وہ اخبار اٹھا چکے تھے۔
ثانیہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ "تھینک یو ابو۔" وہ پرجوش ہوکر باہر بھاگی۔ جلدی میں اپنی کتابیں سمیٹنا بھی بھول گئی۔ وہ مسکرا کر مطالعے میں مشغول ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

"میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹر حماد کا فون اس کے لیے حیران کن تھا۔
"مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔" ثانیہ بھی جلدی سے بولی۔
"آپ سے فریال کے متعلق بات کرنی ہے۔"
"تو کریں بات۔" ثانیہ جزبز ہوئی۔
"فون پر نہیں ہوسکتی۔ میں آپ کا انتظار کروں گا شام چار بجے مون لائٹ کیفے میں۔" خدا حافظ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ ثانیہ کو بولنے کا بھی موقع

نہیں دیا۔ اس نے حیرت سے فون کو گھورا۔
"ارے واہ میں کیوں جاؤں۔ آرڈر ایسے دے رہے ہیں جیسے میں ان کی ماتحت ہوں۔" ثانیہ کو تاؤ آیا۔
تین بجے تک اس کا جانے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی کتابیں لے کر وہ اسٹڈی میں پڑھنے کے لیے بیٹھ گئی۔ بیس منٹ بھی جب سر کھپانے کے باوجود ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تو کتابیں بند کرتی وہ اٹھ گئی۔ بے چینی سی تھی کہ جانے ڈاکٹر حماد کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔
چار بج کر تین منٹ پر وہ کیفے پہنچی تھی۔ کیفے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک کونے والی ٹیبل پر اسے وہ بیٹھے نظر آگئے۔ ثانیہ کے قریب پہنچتے ہی وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ سلام کا جواب دیتی وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"بتایئے کیا بات کرنی ہے فریال کے بارے میں۔" بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔
"فریال کے خلاف میں کوئی ایکشن نہیں لوں گا۔"
"یہ بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔" ثانیہ نے حیرت سے ان کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔
"اصل بات تو کچھ اور ہے اگر فریال کا نام نہ لیتا تو آپ کبھی نہ آتیں۔"
"دھوکے سے بلایا ہے آپ نے مجھے۔" ثانیہ تپ کر کھڑی ہوئی۔
"ثانیہ پلیز بیٹھیں۔۔۔ اوکے آئی ایم سوری۔" ان کے مصالحت آمیز لہجے پر وہ بیٹھ گئی۔
"مجھے احساس ہے میری وجہ سے آپ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ لیکن آپ پچویشن دیکھیں تو اس میں میرا غصہ بنتا تھا۔ میرے لیے کسی کے ساتھ اسکینڈلائز ہونا چھوٹی بات نہیں تھی۔ جبکہ خود کسی نے جان بوجھ کر یہ سب کیا ہو۔ ہاں آپ کے خلاف جو غلط رپورٹ بنائی تھی وہ زیادتی تھی' نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ میری طرف سے اپنا دل صاف کر سکتی ہیں۔"
"میرے خیال میں اب اس بات کو ختم کر دینا چاہیے۔"
"آپ کا دل بہت بڑا ہے۔" ان کی بھوری آنکھیں اس کے روشن چہرے پر تھیں۔
"دل میں نفرت اور عناد پالنے سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے اور دل کی سختی انسان کو بے حس بنا دیتی ہے۔" سادگی سے کہتی وہ انہیں بہت اچھی لگی۔ وہ ہولے سے مسکرائے۔
"ہوں' ویسے بھی کسی نے مجھ سے کہا ہے معاف کرنے میں ہی سکون ہے۔" وہ بہت کم مسکراتے تھے۔ ثانیہ کو ان کی مسکراہٹ بھلی لگی۔ مگر دوسرے ہی پل وہ سنجیدہ ہو چکے تھے۔
"آپ دو دن میں ڈیوٹی پر موجود ہوں گی اور یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"
"تھینک یو' میں اب چلتی ہوں۔" وہ ہینڈ بیگ اٹھا رہی تھی جب وہ جھجکتے ہوئے بولے۔
"ثانیہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی۔"
"یہ خیال آپ کو کیوں آیا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہے۔ ان کی بات بہت ہی غیر متوقع تھی۔
"کیونکہ آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں نے کبھی کسی کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ صرف آپ ہی ہیں جس کے لیے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ ہاں آپ اچھی ضرور لگنے لگی ہیں۔ بہت سوں کو کہتے سنا ہے کہ محبت کے بغیر شادی نہیں کرنی چاہیے مگر میرے خیال میں نکاح ایک ایسا رشتہ ہے جو آہستہ آہستہ دونوں فریق کے دلوں میں محبت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے بس دلوں میں گنجائش ہونی چاہیے۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتے رہے لیکن وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔
"آپ کچھ کہیں گی نہیں میرے پروپوزل کے بارے میں۔" وہ کھنکھارے۔

"میں آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ میرے ماں باپ کریں گے۔" اس کے اندر کی خوداعتماد لڑکی بیدار ہوئی۔

"میں اپنے والد کو بھیجوں گا۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے دوبارہ سے اسپتال جوائن کیے آج دوسرا دن تھا۔ وارڈ کی طرف جاتے فریال نے اسے روکا۔

"ثانیہ! آئی ایم سوری۔" نظریں جھکائے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "مجھے معلوم ہے صرف سوری اس سب کے لیے کافی نہیں ہے جو میں تمہارے ساتھ کرتی آئی ہوں۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے ہم اچھے دوست رہ سکتے تھے اگر میں اپنے دل میں تمہارے لیے نفرت نہ بھرلیتی۔ غلطی میری ہی ہے اس لیے میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔"

ثانیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ تھامے۔

"دوستی میں نو سوری نو تھینک یو۔ ہم پہلے بھی دوست تھے آج بھی دوست ہیں۔ اب تو بدگمانیاں ختم ہوگئیں نا تو بس پھر کوئی بری بات ہم یاد نہیں کریں گے۔"

فریال دھیرے سے مسکرائی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ثانیہ اسے کھلے دل سے معاف کردے گی۔

"اس دن اقدس سے بہت کچھ غلط کہہ دیا میں نے۔ شرمندگی ہو رہی اب۔ میرا سوری اس تک پہنچا دینا۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔" لب کاٹتے ہوئے وہ اداسی سے بولی تھی۔

"میں اس سے بات کروں گی۔" ثانیہ نے اس کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر تسلی دی۔

"ایک بات کہوں۔" ثانیہ جھجکی۔ فریال نے سرہلا کر جیسے اجازت دی۔ "ڈاکٹر جنید بہت اچھے ہیں۔"

"مگر میں اچھی نہیں ہوں۔" اس نے محض سوچا اور ثانیہ سے کہا۔ "ہوں جانتی ہوں۔"

"زندگی میں ایک اچھے محبت بھرے ساتھ کی ضرورت سب کو ہوتی ہے اس بارے میں سوچنا ضرور۔ چلو وارڈ کا چکر لگالیں۔" ہلکے پھلکے انداز میں کہتی وہ وارڈ میں داخل ہوگئی۔ فریال بھی اس کے ساتھ تھی۔

☼ ☼ ☼

"فریال ملی تھی۔ شرمندہ تھی سوری کررہی تھی تم سے۔ جو بھی اس نے تم سے کہا اس سب کے لیے۔" وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب ثانیہ نے اقدس سے کہا۔

"وہ بہت بدل گئی ہے۔ نئی فریال دیکھی ہے آج میں نے 'الجھی الجھی' اداس سی۔ تم بھی اسے معاف کر دو۔"

اقدس خوش دلی سے مسکرائی۔ "آپ نے کہہ دیا میں نے معاف کردیا۔" اسی وقت مہرین تیز تیز بولتی ان کے پاس آئی۔

"ہفتہ رہ گیا ہے تم دونوں کے نکاح میں اور میرے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے۔ تم لوگوں کے تو سسرال سے آجائیں گے۔ میرا کیا بنے گا۔"

"اقدس کا تو جوڑا آجائے گا مگر میرے سسرال میں کوئی خاتون نہیں ہے۔ انکل نے پیسے دیے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے شاپنگ کرلوں۔" ثانیہ کو بھی فکر ستائی۔

دن تو واقعی کم تھے۔ دو ہی دن ہوئے تھے رشتہ طے ہوئے۔ شادی تو تین مہینے بعد ہونی طے پائی تھی مگر انکل تیمور کی خواہش تھی کہ ابھی نکاح کردیا جائے۔ کرنل شہاب نے اقدس اور روحان کے نکاح کے ساتھ ہی ڈاکٹر حماد اور ثانیہ کے نکاح کی تجویز سامنے رکھی، جو منیر صاحب نے بخوشی مان لی تھی۔

☼ ☼ ☼

کرنل شہاب کا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ خاص کر لان میں سب سے زیادہ رونق تھی جہاں نکاح کی تقریب رکھی گئی تھی۔ سردیاں شروع ہوچکی تھیں جس کے باعث ماحول میں ٹھنڈ تھی۔ نکاح کے بعد اب دونوں کپل اسٹیج پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

ثانیہ نے ہلکے گرے رنگ کی شرٹ اور لہنگا پہن رکھا تھا۔ جس پر سلور رنگ کا خوب صورت کام تھا۔ سر پر شاکنگ پنک دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ لائٹ سے میک اپ میں وہ عام دنوں سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ ساتھ بلیک سوٹ اور گرے ٹائی میں ڈاکٹر حماد بیٹھے تھے۔ ثانیہ' حنا اور فرح کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر حماد دوسرے صوفے پر بیٹھے روحان سے کوئی بات کر رہے تھے۔ روحان بلیک سوٹ اور اسکن کلر کی ٹائی میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ کنفیوز سی اقدس بیٹھی تھی۔ اسکن شرٹ اور لہنگے کے ساتھ میرون دوپٹہ اس پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ خوب صورت میک اپ نے اس کے نقوش کو اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تیز تھی۔ رہ رہ کر مہر پر بھی غصہ آ رہا تھا جو کافی دیر سے اسٹیج سے غائب تھی۔

اسٹیج سے کچھ فاصلے پر اپنی نشست پر بیٹھے کرنل شہاب نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ ایک ان کی ذہین بیٹی تھی جس نے اپنی ذہانت کی وجہ سے سب سے زیادہ پیار اور توجہ سمیٹی تھی۔ دوسری ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو ان کے رویّے کی وجہ سے ہمیشہ بدظن رہی تھی۔ اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اسے خود سے دور کر کے انہوں نے بہت زیادتی کر دی تھی۔

صرف ذہین بچے ہی ہماری توجہ کے مستحق نہیں ہوتے بلکہ وہ بچے جو قابلیت میں کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ بھی ہماری توجہ کے اتنے ہی حق دار ہوتے ہیں۔

ثانیہ اپنی ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت کی وجہ سے یہاں تک پہنچی تھی۔ اگر وہ اقدس کو بھی محنت کا سبق دیتے اور اسے ڈی گریڈ کرنے کے بجائے اس کی قابلیت کو سراہتے تو وہ آج یوں تعلیم ادھوری چھوڑے نہ بیٹھی ہوتی۔ لیکن آج وہ کسی قدر مطمئن تھے کیونکہ اس کا ہاتھ انہوں نے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دیا تھا جس کے بارے میں یقین تھا کہ اس کے سنگ چلتے ہوئے ان کی یہ بیٹی زندگی میں محنت سے آگے بڑھنا سیکھ لے گی۔

☆ ☆ ☆

لان کے قدرے تاریک گوشے میں وہ الگ تھلک سی بیٹھی نظر آئی تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ یوں اکیلی بیٹھی تھی ورنہ وہ تو دوستوں کے جھرمٹ میں اپنے خوشگوار موڈ کے ساتھ ہر تقریب کو انجوائے کرتی تھی۔ سفید رنگ کی لمبی فراک اس نے پہن رکھی تھی۔ ساتھ ہم رنگ تنگ پاجامہ تھا۔ سفید ہی دوپٹہ ایک کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ فراک اور دوپٹے پر سلور رنگ کا خوب صورت کام تھا۔ لمبے چمک دار بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اپنی دودھیا رنگت کے باعث سفید رنگ کے جوڑے میں وہ کوئی حور ہی معلوم ہوتی تھی۔ یا پھر موم کی نازک سی گڑیا جس کو ہاتھ لگانے پر اس کے میلے ہو جانے کا خطرہ ہو۔

کچھ دیر اس کو خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کی طرف قدم بڑھانے لگے۔ آج بھی انہیں وہ دن یاد تھا جب وہ پہلی بار کالج کی لائبریری میں انہیں ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔

"آپ جنید ہیں' فورتھ ایئر کے ٹاپر؟" نئی کتاب پر سے سر اٹھا کر انہوں نے اس پُراعتماد سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان کے سر ہلانے پر وہ بلا جھجک سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"میں فریال سراج ہوں' فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ۔ ایک ٹاپک سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سمجھا دیں پلیز۔"

اور یوں وہ اکثر ان سے کوئی نہ کوئی ٹاپک سمجھنے کے لیے آنے لگی تھی۔

بلاشبہ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ لیکن اس کا کسی کے ساتھ کبھی کوئی افیئر نہیں رہا تھا۔ وہ سب کو حد میں رکھنا جانتی تھی۔ یہ اس مغرور لڑکی کی وہ خوبی تھی جس نے انہیں اس کا مزید اسیر بنایا تھا اور یہی وجہ تھی کہ جب اس نے اپنے لیے ان کی محبت محسوس کی تو وہ ان سے کترانے لگی تھی۔ اپنی مخروطی انگلیاں آپس میں پھنسائے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی وہ انہماک سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ آج میک اپ کے نام پر اس نے

ہلکی سی پنک لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کے دلکش نقوش سامنے والے کو مبہوت کردینے کے لیے کافی تھے۔
اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ کھنکارے۔ وہ چونک کران کی طرف متوجہ ہوئی۔
"کسی ہو؟" سامنے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔
وہ ڈاکٹر جنید کو دیکھ کر حیران تھی۔ "ٹھیک ہوں۔"
"لگ تو نہیں رہیں۔ کچھ ہے فریال جو بدل گیا ہے۔" اب کی بار انہوں نے اس کی اداس آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ان کی گہری آنکھیں اسے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھیں۔
"آپ یہاں کیسے۔ ثانیہ نے بلایا ہے؟" فریال نے نظریں چرائیں۔ وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی تھی۔
"ہوں۔۔ ثانیہ نے بھی اور حماد نے بھی۔ ایک سیمی نار میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دوست سے کافی دوستی ہے اس کی۔ ہم دونوں کو ہی انوائٹ کرلیا۔" کچھ پل خاموشی سے گزر گئے، پھر انہوں نے ہی بات کا آغاز کیا۔
"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے۔"
فریال نے ایک گہرا سانس لیا۔ "کچھ سوالوں کے جواب بہت مشکل ہوتے ہیں اور آپ تو مجھے جاننے کا دعوا کرتے ہیں نا۔ بتائیں اس تبدیلی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔"
"کوئی ایسی بات ہے، جو تم بتانے سے ڈرتی ہو۔"
فریال اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ اس ٹھنڈ میں اسے اپنے ہاتھ مزید سرد ہوتے محسوس ہوئے۔
"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے تردید کرنا ضروری سمجھا۔
"وہ بات کیا تھی جو اس دن بھی تم چھپا گئی تھیں۔۔ مجھ سے۔۔"
"مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اس دن موقع نہیں ملا، لیکن آج بتا سکتی ہوں۔" ان کی بات کاٹتی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی وہ انہیں پہلے والی فریال لگی تھی۔ بے خوف اور نڈر۔ سامنے والے کے جذبات کی پروانہ کرنے والی۔
"روحان تیمور کو پسند کرنے لگی تھی۔ شادی کرنا چاہتی تھی اس سے، مگر اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔ مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے۔ یہ ہی بات اس دن میں کہتے کہتے رہ گئی تھی۔" بات کرتے ہوئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ دودھیا رنگت میں سرخی گھل گئی۔ لب کاٹتی وہ ان کے بولنے کی منتظر تھی۔ مگر وہ خاموشی سے اٹھ گئے۔
وہ چونک کر مڑی تھی۔ دور جاتے وہ صاف نظر آرہے تھے۔ جانے روشنیاں بجھنا شروع ہوگئی تھیں یا اسے ہی آس پاس تاریکی بڑھتی محسوس ہورہی تھی۔ آج وہ اس کی زندگی سے، ہمیشہ کے لیے نکل گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"مسز حماد خاصی جلدی میں لگ رہی ہیں۔" اس آواز پر وہ بے اختیار مڑی تھی۔ ڈاکٹر حماد اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے پارکنگ ایریا میں کھڑے تھے۔
"آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟" ثانیہ حیران سی ان کے قریب آئی۔ "آپ کا انتظار۔"
"اچھا اس لیے رات کو آپ مجھے جلدی آنے کا کہہ رہے تھے کہ صبح کچھ خاص ہونا ہے اسپتال میں۔"
ان کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کیا ہمارا ملنا خاص نہیں ہے۔"
اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ثانیہ نے خالی پارکنگ کا جائزہ لیا۔ "ہم تو روز ہی ملتے ہیں۔"
انہوں نے گہرا سانس لیا۔ "ہوں۔۔ دور، دور سے، وارڈ میں سب کے درمیان۔۔ آج میرے دل نے کہا کہ اس خوب صورت صبح کا آغاز اپنی بیوی کے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر کیا جائے۔" ثانیہ نے خوش گوار احساس میں گھر کر ان کے سنجیدہ چہرے پر پھیلتی بھرپور مسکراہٹ کو دیکھا۔
"اتنے کنجوس کیوں ہیں آپ۔"
"کنجوس۔۔ مگر میں نے تو ابھی تک تمہیں کوئی شاپنگ نہیں کروائی۔ اس کا فیصلہ کیسے کرلیا تم نے۔"

ان کے لہجے میں حیرت در آئی۔
"مسکرانے کے معاملے میں تو خاصے کنجوس ہیں۔" دھیمی مسکراہٹ ثانیہ کے لبوں پر پھیلی۔
"آج کل تو بہت خوش ہوں اس لیے میرے خیال میں فیاضی سے مسکرا بھی رہا ہوں۔ مگر تو باقاعدہ مذاق اڑاتا ہے میری خوش مزاجی کا، ناشتا کیا تم نے؟"
"جی... میں تو کر کے آئی ہوں۔ آپ نے نہیں کیا۔" ثانیہ کو خیال آیا۔
"مگر نہ کیا ہوتا تو کراتیں؟"
ان کے سوال پر ثانیہ شرارت سے مسکرائی۔
"بالکل، فوراً" کیفے لے جاتی آپ کو۔ دیکھیں، کتنا خیال ہے مجھے آپ کا۔"
"ہوں، وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ ویسے پراٹھے بنانے آتے ہیں۔"
"آں... پراٹھے، نہیں تو... مجھے تو کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔" ثانیہ کے جھجک کر کہنے پر وہ ہنسے تھے۔
"آپ ہنستے بھی ہیں۔"
"جناب! ہم بھی انسان ہی ہیں۔" انہوں نے اپنی ہنسی دبائی۔
"اور ہنسے کیوں تھے؟"
بھئی گوہر کو اپنی بھابھی کے ہاتھ کے بل دار پراٹھے کھانے کا شوق تھا۔ اسی کی شکل سوچ کر ہنس رہا ہوں، جب اسے معلوم ہوگا کہ اس کی فیورٹ بھابھی کو کچھ بنانا نہیں آتا۔" ان کے مذاق اڑانے پر وہ چڑ گئی۔
"ابھی دو مہینے ہیں شادی میں، سب سیکھ لوں گی۔ ویسے بھی میری بہن بہت اچھی کک ہے اور بہنوئی بھی تو شیف ہیں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"
"ڈلیٹ سی۔ آج کا ڈنر ہم ساتھ کریں گے۔" ثانیہ کو منہ کھولتے دیکھ کر انہوں نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ اٹھائے۔
"تم منع نہیں کروگی کیونکہ میں آنٹی سے اجازت لے چکا ہوں۔ کسی اچھی سی جگہ پر اچھا سا ڈنر کروانا چاہتا ہوں۔ بہت سی باتیں کرنا اور سننا چاہتا ہوں۔" مسکرا کر سر ہلاتی وہ ان کے دل کو شاد کر گئی۔

ڈاکٹر حماد کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ثانیہ آج بہت خوش تھی۔ وہ تلخی جو کچھ عرصہ پہلے ان کے درمیان آئی تھی۔ اب اس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ بس محبت تھی جو دونوں کے دلوں میں سما گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ممی آج کل اس پر خاصی تپی ہوئی تھیں۔ ممی کے سوتیلے بھائی اس رشتے کو جوڑنے کے خواہش مند تھے جو ان کے والد نے برسوں پہلے طے کیا تھا۔ پاپا کی ماموں سے پہلے ہی دوستی تھی اور ان کے بیٹے سے بھی وہ مل چکے تھے۔ اس لیے وہ نانا کے قائم کردہ رشتے کو جوڑنا چاہتے تھے۔ جبکہ ممی اس رشتے کی سخت مخالف تھیں، لیکن پاپا ان کے اعتراض کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ ان کے خیال میں ممی محض سوتیلے بھائی کو ناپسند کرتی ہیں۔ اس لیے انکار کرنا چاہ رہی ہیں اور پاپا کو ان کی فیملی ہر لحاظ سے پسند تھی۔ انہوں نے فریال سے اس کی مرضی پوچھی تھی اور اس نے فیصلے کا حق ان کو دے دیا تھا۔ جس پر ممی آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔
"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی فریال، اتنے پروپوزلز آئے تھے، تب کیوں انکار کر دیا۔ اگر ہماری مرضی سے شادی کرنی تھی تو تب بولتیں اور ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا اب انکار کر دو۔"
"مجھے پاپا کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور ویسے بھی پرسوں ماموں کی فیملی آنے والی ہے بھاول پور سے۔"
قریب بیٹھی فریحہ نے موبائل پر سے نظریں اٹھا کر فریال کو دیکھا۔ "لڑکا پاپا کو پسند ہے، آپ کو تو نہیں اور کیا خبر وہ آپ کو اچھا نہ لگے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آپ تو اپنے کسی رائٹ مین کا ذکر کیا کرتی تھیں کہ جب وہ ملے گا تب ہی شادی کریں گی۔"
"جب رائٹ ٹائم پر کوئی نہیں ملا تو اب کسی رائٹ مین کی خواہش نہیں ہے۔" عجیب سی ہنسی ہنستی وہ اٹھ گئی۔
"ممی، پاپا کو لڑکا پسند ہے تو کر لینے دیں مجھے ان کی

مرضی سے شادی۔ آپ فریحہ کے لیے کوئی شان دار پروپوزل ڈھونڈ لیجیے گا جو آپ کے معیار پر پورا اترتا ہو۔" سنجیدگی سے کہتی وہ چلی گئی۔

"ہو کیا گیا ہے اس کو؟" ممی نے اچنبھے سے فریحہ کو دیکھا۔

"رہنے دیں ممی! مت اپنی انرجی ویسٹ کریں۔ ان کا دماغ الٹ گیا ہے۔ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی ہیں۔ کل تک معافیاں مانگتی پھر رہی تھیں اور آج اچانک سے ایک ان دیکھے لڑکے سے شادی کی ہامی بھرلی۔ چھوڑ دیں ان کو ان کے حال پر۔" تیزی سے ٹیکسٹ کرتی فریحہ نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی فریال اس کی بات سن چکی تھی۔ گہرا سانس لیتی اندر چلی گئی۔

اس کے بعد ممی نے خاموشی اختیار کرلی تھی اور وہ جانتی تھی کہ پاپا کی وجہ سے ہی سہی، ممی، ماموں کی فیملی کو اچھے سے اٹینڈ کریں گی، آخر ان کی بیٹی کا مستقبل بھی تو اس گھر سے جڑنے والا تھا۔ وہ اس رشتے کے لیے مان تو گئی تھی، مگر ایک بے کلی سی وجود پر چھا گئی تھی۔ ڈیوٹی ٹائم ختم ہونے سے دس منٹ پہلے ہی وہ باہر نکل آئی۔ موبائل بیگ میں ڈالتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سامنے کا منظر اسے اپنی نظروں کا دھوکا لگا۔ بڑے بڑے قدم اٹھاتے وہ ڈاکٹر جنید ہی تھے جو اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

"آپ۔۔۔؟" فریال اتنی بے یقین تھی کہ قریب آنے پر ان کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکی۔

"آج ایک اور حیثیت سے تم سے ملنے آیا ہوں۔" دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ اطمینان سے کھڑے تھے۔ فریال خاموشی سے ان کے بولنے کی منتظر تھی۔

"انکل چاہتے تھے میں تم سے مل لوں۔ تمہارے غنی ماموں کا بیٹا ہوں، جنید غنی۔" ایک دھچکا تھا جو ان کے الفاظ نے فریال کو پہنچایا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہے تو کیا کہے۔ بس ہکا بکا سی انہیں دیکھے گئی۔

"کچھ کھو گئی نہیں۔" اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"آپ۔ آپ کب سے جانتے تھے یہ سب۔" ہوا کے دوش پر اڑتے بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی وہ بمشکل بول پائی۔

انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے سورج کی مدھم ہوتی شعاعوں کو دیکھا۔

"پہلے دن سے، انکل نے ابو سے ذکر کیا تھا کہ تم میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ پھر تم آئیں اور کچھ ہی دنوں میں مجھے معلوم ہوگیا کہ تم میرے کالج میں آئی ہو۔ بعد میں تم خود مجھ سے پڑھنے کے لیے آئیں۔ میں جب بھاول پور سے آیا، تب میں نے ابو کو منع کیا تھا کہ انکل کو نہ بتائیں، کیونکہ وقت سے پہلے میں اس رشتے کو حوالہ بنا کر تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ پھوپھو شروع سے ہمیں پسند نہیں کرتی تھیں، اسی لیے مجھے یقین تھا کہ ان کی بیٹی بھی ہرگز اس رشتے کو اتنی جلدی قبول نہیں کرپائے گی، لیکن تقدیر نے ہمیں پہلے ہی ملوا دیا۔" ایک نظر اس کی خاموش منتظر سی آنکھوں پر ڈال کر وہ پھر سے گویا ہوئے۔

"تم نے جس رشتے کی ہامی اب بھری ہے۔ میرے لیے یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دادا جی نے جوڑا تھا یہ رشتہ، بہت محبت کرتے تھے وہ مجھ سے، تم سے۔" زیر لب مسکراتے جیسے کچھ یاد آیا تھا انہیں۔

"جب انہوں نے ہمارا رشتہ جوڑا تو پھوپھو خوش نہیں تھیں، بس خاموش ہوگئیں۔ آنا جانا انہوں نے پہلے سے بھی کم کردیا تھا۔ پھر تم لوگ سعودی عرب چلے گئے۔ میں میٹرک میں تھا اس وقت، دادا جی کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ انہوں نے کبھی مجھے تمہیں بھلانے نہیں دیا۔ اس نو عمری میں تمہارا احساس میرے اندر بس گیا تھا اور یہ سب ان ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی اپنے پوتے اور نواسی کو اکٹھے دیکھنے کی۔ تم لوگوں کی واپسی سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چلے گئے، مگر جاتے جاتے مجھے پابند کرگئے کہ صرف فریال سراج ہی میری زندگی کی ساتھی بنے گی۔

اسی لیے میں کسی قابل بن کر تمہارے سامنے آنا چاہتا تھا۔"

سنجیدگی سے انہیں دیکھتی فریال ان کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ "ایک ان دیکھی لڑکی سے محبت کرلی آپ نے۔ کیسے مان لوں میں۔ اگر میں ایسی نہ ہوتی جیسی ہوں تو۔۔"

"میں نے تمہاری صورت سے محبت نہیں کی فریال! تمہاری محبت میرے اندر گھولی گئی ہے' اسی لیے تمہاری خامیوں سمیت تمہیں چاہا ہے۔"

ڈاکٹر جنید نے گویا اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھا تھا۔ ان کی گہری آنکھوں سے نظریں چراتی فریال کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔

"اس دن تم نے کہا' تم روحان کو پسند کرتی ہو۔ اگر اس سے محبت کرتی ناں تو میری ناراضی کی فکر نہ ہوتی تمہیں۔ میری محبت اور میرے پُریقین رویے سے تم ہمیشہ چڑتی رہیں' لیکن مجھے ناپسند کبھی نہیں کیا اور اب تو لگتا ہے کچھ کچھ محبت بھی کرنے لگی ہو مجھ سے۔"

فریال نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بھرپور انداز میں مسکراتے وہ اسے اپنے اپنے سے لگے۔

"میں تمہارے اندر اترا ہوں فریال۔ سب سے زیادہ جانتا ہوں تمہیں۔" شوخی سے سرگوشی کرتے وہ اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر گئے تھے۔

"آج بھی اگر میں ویسی ہی مغرور سی فریال ہوتی' پھر کیا کرلیتے آپ۔" اپنے چہرے پر پھیلی سرخی کو زائل کرنے کے لیے وہ بولی۔

سر پر ہاتھ پھیرتے وہ بڑے دلکش انداز میں ہنسے۔

"آخر سائیکاٹرسٹ کس دن کے لیے بنا ہوں۔ تھوڑا بہت تو تمہیں سیٹ کر ہی لیتا۔"

"جی نہیں' ایسے نہیں ہوتا۔" فریال نے اپنی ہنسی چھپائی۔

"مجھے یقین تھا فریال' اپنی محبت پر اور اپنے رب کی مہربانی پر بھی کہ تم پلٹ کر میرے پاس ہی آؤ گی۔"

محبت بھری سرشاری سے کہتے وہ اس کے دل کے تار ہلا گئے۔ واقعی یہ رب کی مہربانی ہی تو تھی کہ اتنی کوتاہیوں کے باوجود وہ نوازی گئی تھی۔ ایسا شخص اس کا مقدر بنا دیا گیا تھا جس کے دل میں اس کے لیے بے لوث محبت تھی۔ وہ پرنم آنکھوں سے مسکرادی۔

✡ ✡ ✡

ساری خوشی اور جوش نکاح کے بعد کچھ ہی دنوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

نکاح کی تقریب میں روحان نے اسے ایک بار بھی مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھا وہ سارے وقت ڈاکٹر حماد اور ان کے دوست قمر سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی دن تک منتظر رہی کہ شاید روحان اسے کال کرے یا انسٹی ٹیوٹ سے غیر حاضری کے متعلق ہی کچھ پوچھ لے اور کھٹک تو وہ تب گئی تھی جب ایک دن ملیحہ اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ وہ ملیحہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ روحان کو لاؤنج میں آتے دیکھ کر ملیحہ شرارت سے بولی تھی۔

"دیکھو روحان! آج کون آیا ہے اس گھر کی رونق بڑھانے۔ تم بھی بیٹھو ہمارے ساتھ۔"

"سوری ٹائم نہیں ہے۔ اسامہ کی کالز آرہی ہیں مجھے' جانا ہے۔"

اپنے کف لنکس بند کرتا وہ چلا گیا تھا۔ اقدس کو مخاطب کرنا بھی اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا اور عجیب تو ملیحہ کو بھی لگا تھا۔ وہ روحان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی' چاہے کتنی ہی عجلت میں کیوں نہ ہوتا' یوں سامنے والے کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اقدس کے سامنے شرمندہ ہوتی وہ روحان کی مصروفیت کا ذکر کرنے لگ گئی تھی۔

روحان اس رشتے سے خوش نہیں تھا' یہ خیال اقدس کے ذہن میں کھب گیا تھا۔ اگلے ہی دن روحان کسی کام سے گھر آیا تھا۔ لان میں کھڑی اقدس کو وہ صاف نظر انداز کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ گیٹ سے اندر آتے ہوئے اس پر ایک سنجیدہ سی نظر ڈال چکا تھا۔ اقدس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا رویہ اس قدر

اجنبی اور عجیب کیوں ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ فون پر مہر سے یہ ہی ڈسکس کر رہی تھی۔ جب وہ تپ گئی۔

"تم خود کیوں نہیں بات کر لیتیں ان سے۔ پوچھو آخر مسئلہ کیا ہے۔ بیوی ہو تم ان کی۔" مہر نے اُسے اچھا خاصا جوش دلا دیا تھا۔ موبائل بند کرتی وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے مہر۔ سمجھتے کیا ہیں آخر اپنے آپ کو اور اب میں ان کی بیوی ہوں' اسٹوڈنٹ نہیں ہوں کہ انہیں کچھ کہہ نہ سکوں۔"

بلیک کلر کا لانگ کوٹ کپڑوں کے اوپر پہن کر گردن کے گرد اسکارف لپیٹتی وہ انسٹی ٹیوٹ جانے کے ارادے سے کمرے سے نکلی تھی۔ اور سیدھا روحان کے آفس آئی تھی۔ آفس کو خالی پا کر اس نے گھڑی دیکھی۔ آفس کھلا چھوڑ کر وہ پتا نہیں کہاں غائب تھا۔ شاید لاک کرنا بھول گیا ہو۔ یہ سب سوچتے اقدس نے ایک نظر پورے آفس پر ڈالی۔

ہر چیز اپنی جگہ پر ویسے ہی موجود تھی۔ وہ ٹیبل کی طرف آ گئی۔ لیپ ٹاپ بند پڑا تھا۔ ساتھ ہی کچھ پیپر ویٹس اور میگزین پڑا تھا۔ وہ میگزین کھول کر صفحے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ روحان کے آرٹیکل "نوڈ کارنر" والے صفحے پر اس کا ہاتھ رک گیا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ روحان تیمور جیسے سامنے ہی تھا۔ پورے انہماک سے اس کی تصویر کو تکتی وہ بھول گئی تھی کہ کہاں بیٹھی ہے۔ چونکی تو تب جب کسی نے کھنکھارتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ سامنے کھڑے روحان کو دیکھ کو وہ گڑبڑا کر اس کی کرسی سے اٹھی تھی۔

"وہ۔۔۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔" نظریں جھکائے وہ بمشکل بول پائی۔ اس کی سنجیدہ نظروں کو وہ اپنے اوپر محسوس کر رہی تھی۔

"خیریت۔" ہاتھ میں پکڑے صفحے پیپر ویٹ کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"بات کرنی تھی آپ سے۔" وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

"بیٹھیں۔" میز کی دوسری طرف پڑی کرسیوں کی طرف اس نے قدم بڑھائے' مگر وہ ہاتھ سے اشارہ کرتا اس کی طرف آیا۔

"یہیں بیٹھ جائیں۔" اس کو قریب آتا دیکھ کر اقدس جز بز ہوتی بیٹھ گئی۔ اب تو رہ' رہ کر مہر کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا کہ کیوں بلا سوچے سمجھے منہ اٹھائے اس سے بات کرنے چل پڑی۔

روحان اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اقدس کو اپنے باقی ماندہ حواس بھی سلب ہوتے محسوس ہوئے۔ اس کی جیکٹ سے اٹھتی اس کے کلون کی مہک نے اقدس کے دل کی دھڑکنوں کو بڑھا دیا تھا۔

"کیا بات کرنی ہے۔" اس کو خاموش دیکھ کر روحان نے ہی پہل کی۔

"آں۔۔۔ پھر کبھی کر لیں گے۔ آپ مصروف ہوں گے۔" جلدی سے کہتی ہوئی وہ اٹھی تھی۔

"اقدس' واپس بیٹھیں۔" روحان کا سختی سے کہنا اس کے اندر کی خود اعتماد لڑکی کو جھنجوڑ گیا۔ مہر کی کہی باتیں بھی اسے یاد آ گئیں۔ وہ خفا خفا سی بیٹھ گئی۔

"آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو نہ کرتے۔ جس سے مرضی کر لیتے' لیکن اب اس طرح کے رویے کا مطلب؟ آپ میری انسلٹ نہیں کر سکتے۔"

"میں نے کوئی انسلٹ نہیں کی۔"

"مجھے یوں اگنور کرنا انسلٹ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ شادی نہیں کرنی تھی' تو نہ کرتے۔" وہ مزید تپ گئی۔

"یہ بار بار ایک ہی بات کا مطلب؟ مثلاً" کون ہے جس سے شادی کر لیتا۔"

"کوئی تو ہو گی۔"

"ہوں۔۔۔ ہے تو سہی ایک لڑکی۔ میری اسٹوڈنٹ ہے۔ محبت بھی مجھ سے بہت کرتی ہے۔ سوچ رہا ہوں اگر تم اجازت دو تو اس سے دوسری کر لوں۔" اس کے سنجیدگی سے کہنے پر اقدس کا خون کھول اٹھا۔

"آپ۔۔۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ مجھ سے

ایسی باتیں کر رہے ہیں۔" اس کے غصیلے انداز پر روحان بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

"حد ہے' ویسے ناراض تو میں تھا تم سے اور اپنی ناراضی جتانے کے لیے ہی تو ایسا رویہ روا رکھا۔"

"میں نے کیا' کیا ہے۔" اقدس حیران سی اسے دیکھے گئی۔

"پارٹی والی رات فریال تم سے اتنا کچھ کہہ گئی اور تم خاموش کھڑی سنتی رہیں۔ ویسے تو ہر ایک سے بحث کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ بجائے کچھ کہنے کے تم نے یقین کر لیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور خود سے یہ فرض کر کے غائب ہو گئیں۔ نہ مجھ سے بات کی' نہ انسٹی ٹیوٹ آئیں' بہت غصہ آیا تھا مجھے تم پر۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا۔"

"میں دروازے کے پاس کھڑا تھا جب تم اندر آ رہی تھیں۔ تم بتاؤ کب تمہیں لگا کہ میں فریال میں انٹرسٹڈ ہوں' میں تو سب سے ایسے ہی ملتا ہوں۔"

"مجھے تو ایسا ہی لگا اور وہ دوسری لڑکی کون ہے۔" نادم ہوتی اقدس کو ایک دم خیال آیا۔

"تم ہی ہو۔" مزے سے کہتا وہ اس کے تیزی سے سرخ ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"جی نہیں' میں کوئی محبت وحبت نہیں کرتی کسی سے۔" تھوک نگلتے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں تمہیں اتنا سادہ لگتا ہوں کہ ایک لڑکی مجھ سے محبت کرتی رہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آ جائے۔ میری ہر بات کو اہمیت دے اور مجھے اس کی محبت کی خبر ہی نہ ہو اور تو اور میری تصویر کو بھی تکتی رہے۔" خوب صورت لہجے میں بولتا وہ اسے کنفیوز کر رہا تھا۔ نظریں جھکائے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

"پہلے مجھے لگا تم محض میری شخصیت سے متاثر ہو رہی ہو۔ میرا تمہیں اہمیت دینا اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن فریال کے آنے پر جس طرح تم نے ری ایکٹ کیا' میں شاکڈ ہو گیا تھا اور پھر ملیحہ کے آنے پر تمہارا ایک دم جلے جانا' بیمار پڑ جانا۔ سچ پوچھو تو تمہارا ہرٹ ہونا مجھے بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ تب احساس ہوا کہ تم میرے لیے خاص ہو اور تمہیں فریال کے لیے میری محبت نظر آ گئی' اپنے لیے میری محبت محسوس نہیں ہوئی۔"

"آپ نے بھی تو نہیں کہا کچھ۔" وہ دھیرے سے بولی۔ اپنی اسٹوڈنٹ سے رومانس کرتا اور چھچھورے ڈائیلاگز بولتا اچھا لگتا اور اتنی گرینڈ پارٹی جو دی تمہارے اعزاز میں' صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے۔"

"اپنی پارٹی میرے نام مت لگائیں۔" مسکراہٹ دباتی وہ مصنوعی خفگی سے بولی ورنہ دل کی کلی تو اس کے اظہار سے ہی کھل اٹھی تھی۔

"بیوی کو خوش کرنا بہت ہی مشکل ہے۔" جس نے بھی کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔ ویسے تمہیں خوش کرنے کے لیے میرے پاس کچھ اور بھی ہے۔" مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے قریبی دراز سے بلیک کلر کا رنگ کیس نکالا۔ اس میں سے ڈائمنڈ کی خوب صورت انگوٹھی نکالتا ہوا وہ اقدس کو حیران کر گیا۔

"اجازت!" خوب صورت لہجے میں پوچھتے ہوئے روحان نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔

جھجک کر ہاتھ آگے بڑھاتے اقدس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا ہاتھ نرمی سے تھام کر ڈائمنڈ رنگ پہناتے ہوئے روحان کی بھوری آنکھوں میں اقدس کے لیے محبت اور اپنائیت تھی۔

"تھینکس فار کمنگ ان مائے لائف (میری زندگی میں آنے کا شکریہ) محبت سے کہتے ہوئے وہ شرارت سے اس کی پونی ٹیل ہلا گیا۔ وہ بس سرخ چہرے کے ساتھ مسکراتی رہی۔ وجہ صرف روحان کی محبت نہیں تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اسے اس احساس کمتری سے نکالا تھا جو بچپن سے اس کے ساتھ رہا تھا۔ روحان کا اسے اہمیت دینا اور یہ احساس دلانا کہ وہ بھی زندگی میں کچھ کر سکتی ہے' اس کی روح کو سرشار کر گیا تھا۔ ✡

صائمہ اکرام چوہدری

شہزاد

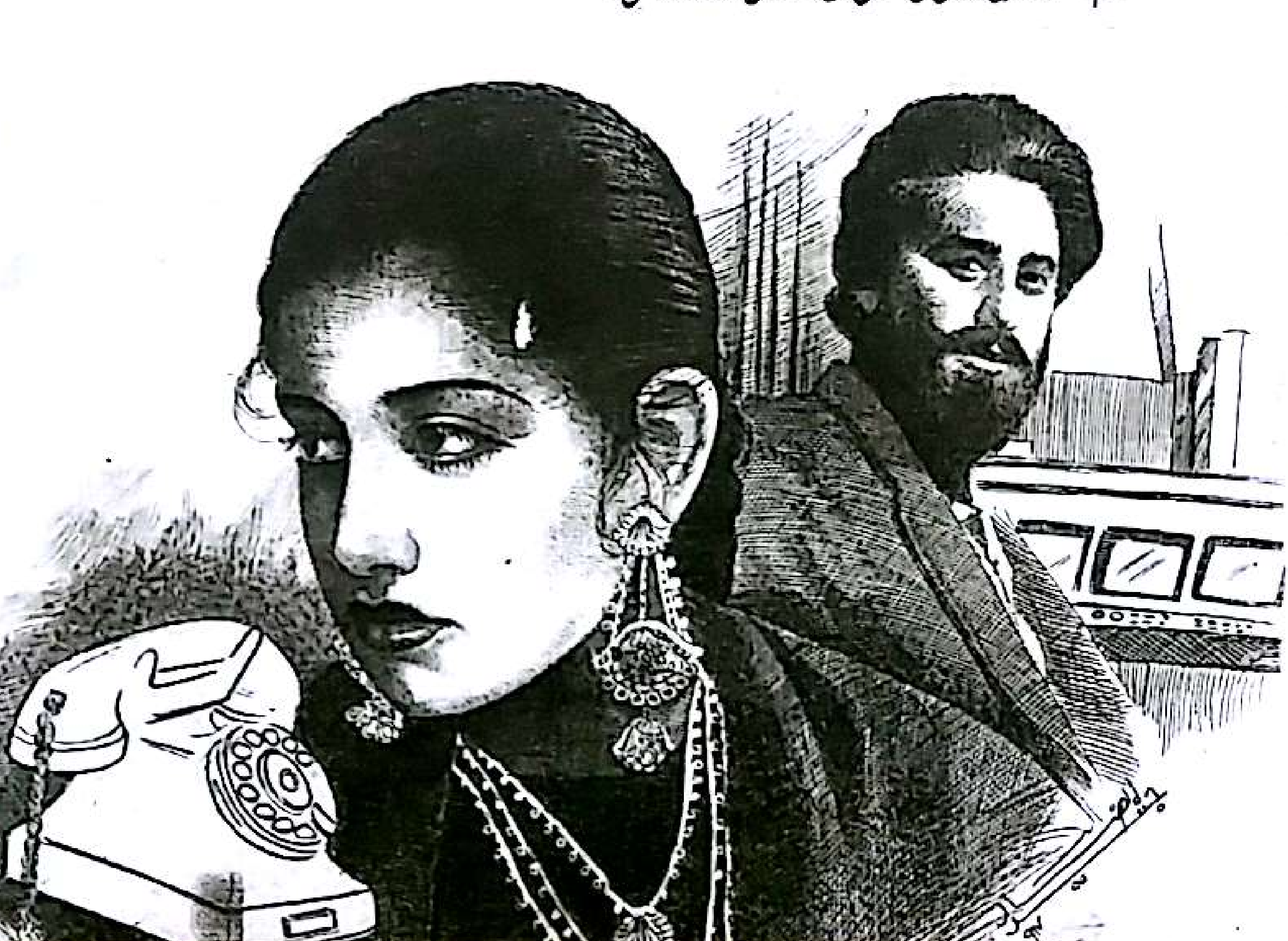
شہزاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل کشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بینچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی پٹڑی پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میر ہاؤس میں محتشم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔

محتشم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے وہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے۔ جس کا نام در شہوار ہے۔

خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبیٰ ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔



خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو' توان کے دونوں بچے نمیرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمیرہ کو لگائی بجھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوبیٰ اور در شہوار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میر انہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابیہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے' لیکن برہان کا سرد رویہ اسے افسردہ کرتا ہے۔

ٹینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ دو شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جارہا تھا۔

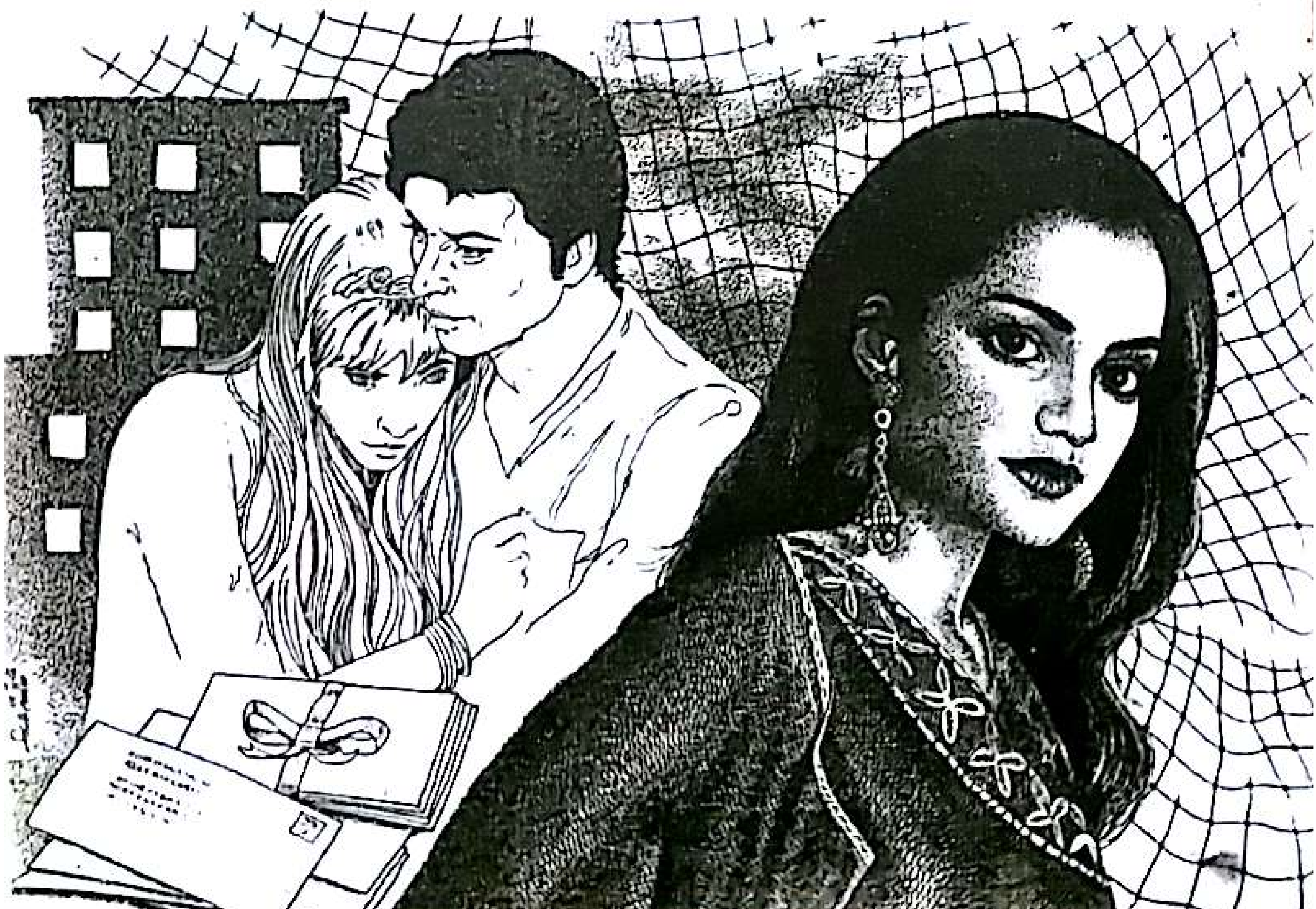
پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں' بڑی شہرزاد جسے اعلا تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھجوادیا تھا۔ رومیصہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکینڈل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خودکشی کی دھمکی دے کر شہرزاد کو پاکستان آنے پر مجبور کردیا۔ شہرزاد کی آمد ٹینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہرزاد پاکستان آئی تو ایک پرانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کردیا۔ طوبیٰ اور در شہوار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہوئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فارسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے بنگلے میں لے آیا ہے۔

محتشم علی کا بیٹا واجد شادی شدہ ہے' لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیصہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور ٹینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہرزاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شہوار اور طوبیٰ محمد ہادی کے بنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبانیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شہوار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ مناہل' ہادی کی بہن ہے۔ در شہوار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ مناہل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے



انابیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی 'شہزاد کے پاس سمجھوتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا' سیفی کے فون سے مشتعل ہو کر ٹینا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے۔ اس بات پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیصہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیصہ اسے اپنے حالات وواقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کو نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبیٰ کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبیٰ کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا ذوالکفل کو مائیکل کی آمد سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔

صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیصہ کو ارسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے۔ شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے۔ ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درِ شہوار مزید بری لگتی ہے۔

انابیہ 'درِ شہوار اور منایل کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمے کا شکار ہو جاتی ہے اور درِ شہوار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے جسے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔

صندل کے گھر والے 'شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

دسویں قسط اب

میز پر رکھی سرد چائے خشک ہونٹوں کا انتظار کرتی اب بدمزا ہو چکی تھی۔۔۔

ٹینا بیگم کے چہرے پر بیزاری، کوفت اور جھنجلاہٹ کا تاثر بہت گہرا تھا انہیں پتا چل گیا تھا کہ شہزاد نے بہادر علی اور رشیدہ کے خاندان کو گھر میں نوکری دے دی ہے اور اسی وجہ سے وہ تپی ہوئی تھیں۔۔۔

شہزاد اپنے ازلی پرسکون انداز میں کھڑی ان کے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔

''گھر میں سرونٹس کا مینا بازار لگا تا ہے شیری۔'' وہ بیزاری سے گویا ہوئیں۔

''مام، کیا فرق پڑتا ہے۔۔'' وہ مسکرا کر مزید گویا ہوئی۔۔''ان لوگوں کو ضرورت ہے۔۔۔''

''میرا گھر ہے یہ کوئی رفاحی ادارہ نہیں۔۔۔'' وہ جل کر بولیں۔

''ویسے آپ کو اس پوائنٹ پر بھی کچھ سوچنا چاہیے، آپ افورڈ کر سکتی ہیں، ہو سکے تو بے سہارا اور غریب لوگوں کے لیے ایسا ادارہ ضرور بنائیں۔'' شہزاد نے معصومیت سے مشورہ دیا۔

''شٹ اپ شیری۔۔۔'' وہ جھنجلا گئیں۔

''کول ڈاؤن مام، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ فیملی فیوچر میں ہمارے کتنے کام آنے والی ہے۔۔''

''آخر ہیں یہ کون لوگ۔۔۔؟'' وہ چونک کر بولیں۔

''قدرت کا انتقام۔۔۔۔'' اس کے معنی خیز انداز پر وہ چونکیں۔

''مطلب۔۔۔؟؟؟''

''آپ مطلب وطلب چھوڑیں، اور ریلیکس رہیں۔''

''دیکھو شیری! جو بات ہے صاف صاف بتاؤ۔۔۔''

''مام ایسا کچھ نہیں ہے، ضرورت مند لوگ ہیں، اور ان کی بیٹی کو آپ اپنے سیلون میں بھی لگا سکتی ہیں۔۔''

''پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی ہو تم۔۔۔۔۔'' وہ مطمئن نہیں تھیں۔

''ساری باتوں کو چھوڑیں، لگتا ہے بہت دنوں سے آپ نے کوئی اچھا فیشل نہیں لیا، آج سپا بھی جائیں اور پلیز یوگا کی کلاسز بھی ریگولر لینا شروع کریں۔۔''

شہزاد بڑی ذہانت سے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کروا چکی تھی۔

''کیا اسکن بہت ڈل لگ رہی ہے میری۔۔۔'' وہ فکر مند انداز میں ڈریسنگ کے شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں، شہزاد کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب ٹینا بیگم کے اگلے کئی گھنٹے اپنی ڈینٹنگ پینٹنگ میں گزرنے والے تھے، وہ اپنے معاملے میں حد درجہ حساس تھیں اور گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھتیں اور اس معاملے پر کوئی کمپرومائز کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔

''پچھلے دنوں ٹینشن بھی تو بہت رہی ہے رومی کی۔۔۔'' انہوں نے اپنے چہرے کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے خود کو تسلی دی، آنکھوں میں فکر مندی کا تاثر خاصا گہرا تھا۔

''رومی سے یاد آیا، کیا کر رہی ہے وہ۔۔۔؟'' شہزاد بہن کے ذکر پر بے چین ہوئی۔

''سو رہی ہے وہ۔۔۔''

''لیکن مجھے بات کرنی ہے اس سے۔۔۔''

''پلیز شیری، صبح تک ڈسٹرب مت کرنا اسے، پتا نہیں کتنی راتوں کی جاگی ہوئی ہے وہ۔۔'' ٹینا بیگم کے لہجے سے چھلکتی ممتا اسے اچھی لگی۔

''ڈونٹ وری، میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔۔'' اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے، ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رومی کو اٹھا کر اس سے گزشتہ دنوں کے ایک ایک منٹ کی تفصیل پوچھ لے۔ یہ سارا عرصہ ان ماں بیٹی نے کانٹوں پر گزارا تھا۔

''او کے مام، پھر ملاقات ہوتی ہے، مجھے ایک کیس پر ورک کرنا ہے۔''

''ریشماں سے کہو، ان نئے آنے والے سرونٹس کو میرے پاس بھیجے۔ اب آ ہی گئے ہیں تو تھوڑا کام تو ذمے لگاؤں ان کے۔۔۔'' ان کے انداز میں اگرچہ بے زاری تھی لیکن شہزاد کافی حد تک پرسکون ہو گئی۔

اس نے رشیدہ بوا کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر ٹینا بیگم کے سامنے میر حاکم کے خاندان کا نام نہ لے، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس خاندان کا نام سنتے ہی وہ بدک جائیں گی اور ان کو کبھی بھی ملازمت پر نہیں رکھیں گی۔ شہزاد پر فائرنگ والے واقعے نے انہیں میر حاکم کی فیملی سے اچھا خاصا خوف زدہ کر دیا تھا، اگرچہ بعد میں شہزاد نے بہت دفعہ ان کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ ان کے متعلق بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

☆☆☆

سرد موسم نے انگڑائی لی۔۔۔

اور ملکہ کوہسار مری نے دیکھتے دیکھتے ہی برف کی چادر اوڑھ لی۔۔۔۔۔

برف کے سفید گالوں نے ہر چیز کو ڈھک دیا، ایسا لگتا تھا جیسے درختوں، عمارتوں اور سڑکوں پر کسی نے سفید رنگ پھیر دیا ہو اور برفیلی ٹھنڈی یخ ہوائیں وہاں رہنے والے مکینوں کا ہر سال بھرپور ضبط اور حوصلہ آزماتی تھیں۔ وہ لوگ اس موسم کی سختیوں کے کافی حد تک عادی ہو چکے تھے۔

طوبیٰ گرماگرم سوپ کا پیالہ لیے کچن سے نکلی تو ٹھنڈ سے اس کا بُرا حال تھا۔ اگرچہ اس نے خود کو اچھی طرح سے لپیٹا ہوا تھا لیکن مری کی ہواؤں کو برداشت کرنا طوبیٰ کے لیے خاصا دشوار کن مرحلہ ہوتا تھا اور وہ اس موسم میں زیادہ تر اپنے کمبل میں ہی دبکی رہتی اور باقی لوگ اس کا اچھا خاصا مذاق اڑاتے تھے۔

''اف سردی۔۔۔ لگتا ہے ہڈیوں میں ہی گھسی جا رہی ہے۔۔۔''

وہ شور مچاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی، سوپ کا پیالہ سائیڈ میز پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کا احساس کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

''خدا کا خوف کرو بیا، ہیٹر تک نہیں چلایا تم نے۔۔۔'' طوبیٰ نے بےزاری سے انابیہ کی طرف دیکھا۔

انابیہ بغیر کسی گرم شال اور سویٹر کے کسی بت کی طرح ساکت و جامد بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی، اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس پر کوئی اسم پھونک دیا ہو۔

''پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہو تم۔۔۔ ادھر میری جان نکلی جا رہی ہے ٹھنڈ سے۔۔۔'' اس نے فوراً ہیٹر آن کیا۔

ہیٹر آن کرنے کے بعد اب وہ کمرے کی کھڑکیوں کے پردے برابر کر رہی تھی، سرد ہوائیں اللہ جانے کہاں سے اندر گھسی آ رہی تھیں۔ طوبیٰ نے اس وقت بھاری بھرکم قسم کے کوٹ کے ساتھ اونی مفلر اوڑھ رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ٹھنڈ کا احساس کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں، ایسے صمٌ بکمٌ ہو کر کیوں بیٹھی ہو، اٹھو یہ شال اوڑھو۔۔۔''

طوبیٰ، نے ایک گرم شال وارڈروب سے نکال کر اس کے سامنے پھینکی، انابیہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہیٹر جلنے سے کمرے کا ٹمپریچر تھوڑا بہتر ہو گیا تھا اور طوبیٰ کو بھی اپنا سانس بحال ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ طوبیٰ نے ڈرائی فروٹ کا جار اٹھایا اور کمبل میں گھس گئی۔۔۔

''محکمہ موسمیات نے پیش گوئی کی ہے۔ اگلا پورا ہفتہ مری میں برف باری ہوگی۔۔'' اس نے خاموش بیٹھی انابیہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔۔

''ہوں۔۔۔'' انابیہ نے ہلکا سا ہنکارا بھرا۔

''کیا گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو، کیا ہوا ہے تمہیں۔۔؟ طوبیٰ اس کی مسلسل خاموشی سے اچھا خاصا چڑ گئی۔

''کچھ نہیں ہوا، اور تم نے عشاء کی نماز نہیں پڑھنی۔۔۔'' انابیہ نے اسے بستر میں گھستے دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

''یار بیا! ٹھنڈ بہت ہے۔۔۔'' وہ شرمندگی سے گویا ہوئی، بیا نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور بیڈ سے اتری۔ ''بہت افسوس کی بات ہے۔۔''

''اچھا ناں، پڑھتی ہوں۔۔۔'' اس نے سستی سے جمائی لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم کہاں جا رہی ہو اس وقت۔۔۔؟''

''وضو کرنے۔۔۔'' انابیہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
''اچھا یار! میں بھی پڑھ لوں۔
طوبیٰ نے بھی کمبل جھٹکے سے اتارا اور گرم پانی سے وضو کر کے واپس کمرے میں آئی تو انابیہ نماز پڑھنے میں مصروف تھی، اس نے غور سے اپنی بہن کا چہرہ جانچا، اس پر محسوس کی جانے والی رنجیدگی کی ایک گہری تہ تھی۔ طوبیٰ کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔
''کیا بیا اور درِّ شہوار کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے۔۔؟'' اس نے جائے نماز بچھاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا اور پھر سر جھٹک کر نماز کی طرف متوجہ ہو گئی، سلام پھیرتے ہوئے اس کی نظریں ایک دفعہ پھر بیا کے چہرے پر اٹک گئیں۔ وہ اس وقت آنکھیں بند کیے دعا مانگنے میں مصروف تھی اور دعا کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔
''کیا ہوا ہے بیا کو، لگتا ہے درِ شہوار کو ہی کھنگالنا پڑے گا، پھر ہی اصل بات پتا چلے گی۔۔'' وہ کمرے سے نکلی' اس کے قدم درِ شہوار کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے، سامنے سے آتا شاہ میر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور طوبیٰ کا دل بھی یکبارگی دھڑکا۔ دونوں کے تعلقات کچھ بہتر ہو چکے تھے۔ شاہ میر نے شرارت سے اسے سیلوٹ کیا، وہ گھبرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگی، اس وقت میر ہاؤس کے سب ہی مکین اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔۔
''یہ تم کیا بھالو بنی گھوم رہی ہو۔۔۔؟'' اس نے شرارتی انداز سے اس کے بھاری بھرکم وزنی کوٹ اور شال پر تبصرہ کیا۔
''کیا واقعی بھالو لگ رہی ہوں۔۔۔'' اس کے ایک دم پریشان ہونے پر وہ ہنسا۔۔
''یار! تم لڑکیاں کتنی کونشس ہوتی ہو اپنی لک کے بارے میں، بس کر دو، تم ہر حال میں ہی اچھی لگتی ہو مجھے۔۔''
''تو پھر کیا ضرورت ہے ایسی فضول باتیں کرنے کی، پہلے ہی سردی نے مت مار رکھی ہے۔۔''
''اگر زیادہ ٹھنڈ لگ رہی ہے تو یہ بھی پہن لو۔۔۔'' اس نے اپنے ہاتھوں سے لیدر کے دستانے اتار کر طوبیٰ کی طرف بڑھائے۔
''تھینک یو۔۔۔۔ میرے پاس ہیں کمرے میں۔۔۔'' وہ اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے ہلکا سا گھبرائی۔
''لیکن ان میں میرے ہاتھوں کی حدت تو نہیں ہوگی۔۔۔'' شاہ میر کا ذومعنی انداز طوبیٰ کے چھکے چھڑا گیا۔
''فضول باتیں کروالو جتنی مرضی۔۔۔۔''
''اچھا پھر سنجیدہ اور اخلاقی باتیں تم کر لو، میں خاموش ہو کر سن لیتا ہوں۔۔۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔
''یہ بتاؤ شاہ میر، کل بڑی امی نے کچھ کہا تو نہیں تھا جب۔۔۔۔؟'' وہ ہلکا سا جھجک کر رک گئی، وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ اس واقعے کی طرف ہے جب تاج دار بیگم نے دونوں کو ایک ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔
''کیا۔۔؟ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔۔'' وہ انجان بن کر مسکرایا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا، اس لڑکی کا لڑنا، جھگڑنا، رونا ہنسنا، ہر چیز ہی اسے ایک خوبصورت

ادا لگتی تھی۔

''جیسے تمہیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔۔۔'' وہ اپنے ازلی مخصوص انداز میں چڑ کر بولی۔

''پوچھ رہی تھیں تمہارے اور طوبیٰ کے درمیان کیا چل رہا ہے۔۔۔'' وہ شوخ لہجے میں گویا ہوا، طوبیٰ نے بوکھلا کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تو تم نے کیا کہا ان سے۔۔۔؟'' وہ پریشان ہوئی۔۔

''میں نے کہا پیاری ماں، ہم دونوں کے درمیان ''پیار'' کا سلسلہ چل رہا ہے۔۔۔۔'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''اور اس کے بعد انہوں نے لعن طعن کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔۔۔؟'' طوبیٰ نے طنز کیا۔

''نہیں، انہوں نے تو کہا بیٹا، شاباش لگے رہو، کبھی نہ کبھی تو خشک پتھروں سے چشمہ پھوٹ ہی جائے گا۔۔۔'' وہ غیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔۔۔'' وہ جھنجھلا کر درشہوار کے کمرے کی طرف بڑھی، شاہ میر نے ایک دم جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ لیا، وہ بوکھلا گئی۔

''یہ کیا کر رہے ہو شاہ میر، کوئی آ جائے گا۔۔۔'' وہ گھبرائی۔۔۔

''میں کسی سے ڈرتا تھوڑی ہوں۔۔۔'' اس کی بوکھلاہٹ شاہ میر کو لطف دے رہی تھی۔

''پاگل ہو گئے ہو کیا۔۔۔'' طوبیٰ نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

اسی لمحے ارسل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے باہر جھانکا، وہ سامنے کا منظر دیکھ چکا تھا۔ شاہ میر نے مسکرا کر طوبیٰ کا بازو چھوڑ دیا اسے ارسل کی طرف سے کوئی ٹینشن نہیں تھی کیونکہ وہ طوبیٰ کے بارے میں اس کے جذبات سے اچھی طرح آگاہ تھا اور دونوں میں خاصی دوستی تھی۔

''ہاں بھئی ارسل، کیسے ہو، میں نے تو سنا تھا کہ کہیں گوشہ نشین ہو گئے ہو تم۔۔۔'' شاہ میر نے اس کے غائب ہونے پر طنز کرتے ہوئے اسے آگے بڑھ کر گلے لگایا، وہ دونوں آپس میں کزن ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دوست بھی تھے۔

''گوشہ نشین نہیں ہوا بلکہ بیٹھا، چلہ کاٹ رہا تھا طوبیٰ کی فرمائش پر۔۔۔'' ارسل بھی کون سا کسی سے کم تھا۔۔

''چلہ۔۔۔۔؟؟؟ کس چیز کا۔۔۔؟؟؟'' شاہ میر حیران ہوا۔

''تمہارے سدھرنے کا۔۔۔۔'' ارسل کے بے ساختہ انداز پر شاہ میر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''بہت خبیث ہو تم، میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں، پھر مال روڈ چلتے ہیں کافی پینے۔۔۔''

شاہ میر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، تو ارسل بھی اپنے جیکٹ اور مفلر اٹھانے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔۔۔

تیز طوفانی بارش کے ساتھ آنے والی منہ زور ہواؤں کے زور سے شہرزاد کے کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ جھٹکے سے کھلے۔۔۔

کمرے میں ہلکا سا دھما کا ہوا اور شہزاد ایک دم ہڑ بڑا کر جاگی۔۔۔

اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں سامنے کا منظر دیکھ کر وہ تھوڑا پرسکون ہوئی۔ کھڑکیوں کے پٹ کھلنے کی وجہ سے ٹھنڈ کا ایک طوفان کمرے میں گھس آیا تھا۔۔۔

وہ ایک لمبی سی جمائی لے کر سستی سے اٹھی اور جیسے ہی کھڑکیوں کے پاس پہنچی، بارش کی ہلکی سی بوچھاڑ نے اس پر کپکپی طاری کر دی، اس نے سرعت سے کھڑکیاں بند کر کے مخمل کے بھاری پردے آگے کیے۔ اس ساری مشقت میں اس کی آنکھوں کی نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔

سست انداز میں وہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ بلا ارادہ ہی اس کی نظر میز پر رکھے لیپ ٹاپ اور فائلوں کے ڈھیر پر پڑی جو وہ آفس سے گھر کام کرنے کے لیے لائی تھی اور ساری شام اس نے اسی پر ہی صرف کی تھی۔

وہ آج کل مسز قریشی کی خصوصی فرمائش پر کسی مشہور سیاستدان اجمل حسین کی کسی حکومتی محکمے میں کی جانے والی کرپشن پر کام کر رہی تھی، اور کل اس کیس کی فائنل ہیرنگ تھی اور وہ مکمل تیاری کے ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔

''مجھے ایک دفعہ پھر اپنے فائنل نوٹس دیکھ لینے چاہئیں۔۔۔'' اس سوچ نے اس کے اندر چستی کا احساس پیدا کیا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوئی اور کافی بنانے کے لیے اپنے کمرے سے نکل آئی، رومی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم کچھ سست ہوئے، اس نے کچھ سوچ کر اس کے کمرے کا ہینڈل گھمایا' دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا اس لیے فوراً کھل گیا۔

شہزاد دبے قدموں اندر داخل ہوئی، سامنے رومیصہ اپنے بیڈ پر بے ترتیب انداز میں سکڑی ہوئی گہری نیند سو رہی تھی اور اس نے اپنا ایک تکیہ بازوؤں میں مضبوطی سے ـــــ جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔۔۔

شہزاد کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی رومی کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا، وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن ان چند دنوں میں اپنے ساتھ صدیوں کی تھکن سمیٹ لائی تھی۔

اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بروکن فیملیز کے بچوں کا دکھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے خود ننگے پاؤں اس مسافت کو طے کیا ہو۔ جس نے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی قطرہ قطرہ تنہائی کا زہر پیا ہو، جس کے دامن میں صرف محرومیاں ہوں۔ وہ جان گئی تھی کہ جن کے حصے میں ہمیشہ آدھا سورج آیا ہو ان کا پورا دکھ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔۔۔''

شہزاد نے ہلکا سا جھجک کر اس کے بے رونق چہرے سے بال ہٹانے کی کوشش کی، اس کے لمس کو محسوس کر کے رومیصہ ایک دم ہڑ بڑا کر اٹھی، اس کا چہرہ خوف کے احساس سے زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر وحشت تھی کہ ایک لمحے کو شہزاد کو بھی اپنا دل سکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

''رومی، میری جان، یہ میں ہوں شیری، تمہاری بہن۔۔۔!!!''

''شیری۔۔۔؟؟؟'' رومیصہ کا نفس بحال ہوا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے اور اگلے ہی پل وہ شیری کے ساتھ لپٹ گئی اور دھواں دھار انداز میں رونے لگی، اس کا سارا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا، وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ شہزاد کو لگا جیسے اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

☆☆☆

درشہوار کے کمرے کا ماحول خاصا گرم تھا۔۔
آتش دان سلگ رہا تھا اور وہ کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر بیٹھی ہوئی تھی، اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے قدموں میں۔ کمبل پڑا ہوا تھا اور وہ اس وقت گود میں رکھے ہوئے لیپ ٹاپ پر اپنی اور مناہل کی کنسرٹ کی تصویریں دیکھنے میں مگن تھی۔
اچانک اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ کر کے کھلا اور درشہوار کا دل دھک سے رہ گیا' سامنے طوبیٰ کو دیکھ کر اس کا سانس بحال ہوا۔
''تم انسانوں کی طرح اندر نہیں آسکتیں کیا۔۔۔؟'' درشہوار نے بےزاری سے لیپ ٹاپ بند کیا۔
''نہیں۔۔۔۔۔'' وہ دھپ کر کے اس کے برابر میں رکھے کشن پر بیٹھ گئی اور اپنا غیر ہموار سانس درست کرنے لگی۔
''میرا تھن ریس میں حصہ لے کر آرہی ہو کیا؟''
''ہاں، تمہارے بغیر مزا نہیں آرہا تھا، سوچا تمہیں بھی انوائیٹ کرلوں' طوبیٰ نے بھی جوابی وار کیا۔
''سوری، میں کسی لڑکے کے ساتھ گھر سے تو بھاگ سکتی ہوں لیکن کسی ریس میں حصہ نہیں لے سکتی۔۔۔'' درشہوار نے سائیڈ پر رکھی مونگ پھلیوں سے بھری ہوئی پلیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھی۔
''تم سے مجھے ایسے واہیات کام کی توقع تھی'' طوبیٰ نے منہ بنا کر کہا۔
''لو اب بندہ اکیلے سڑکوں پر بھاگتا ہوا اچھا لگتا ہے کیا۔ ذرا تصور کرو۔۔'' درشہوار شوخی کے موڈ میں تھی۔
''سب باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ، بیا سے تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟''
''میں نے تو ان کی شکل ہی آج دیکھی ہے اتنے دنوں کے بعد۔''
''لیکن تم پر کس بات کا غصہ ہے انہیں۔۔۔۔'' طوبیٰ نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔
''بھئی نند اور بھابھی والی ازلی رقابت ہوگی۔۔۔۔'' درشہوار نے بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔
''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیا کا مزاج ہے ہی نہیں ایسا۔۔۔'' طوبیٰ نے فوراً بہن کا دفاع کیا۔
''پھر تم خود بتاؤ، کتنے رف انداز میں انہوں نے تمہارے سامنے مجھ سے بات کی تھی، حالانکہ میں نے تو انہیں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔۔''
''لیکن کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے، وہ اتنا زیادہ ڈسٹرب کسی عام بات پر نہیں ہوسکتیں۔''
''اب مجھے کیا پتا ان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔۔۔'' درشہوار بےزاری سے گویا ہوئی۔
''کہیں برہان بھائی کے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا ان کا۔۔'' طوبیٰ کی بات پر درشہوار اچھلی، اسے شام کا منظر یاد آیا۔
''اوہ ہاں، آج شام میں جب میں اور ہانی بھیا واپس آئے تھے تو ان دونوں کی ٹی وی لاؤنج میں ایک ہلکی سی جھڑپ ہوئی تھی۔''
''اوہ آئی سی۔ تو پھر یہ بتاؤ ناں، خوامخواہ رنگ برنگی باتیں کیے جارہی ہو۔۔'' طوبیٰ کے ساتھ ساتھ درشہوار خود بھی کچھ پرسکون ہوئی۔
''لگتا ہے اسی بات کا غصہ اتارا ہے انہوں نے مجھ پر۔۔''
''ہاں اب تو مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔۔۔'' طوبیٰ تھوڑی مطمئن ہوئی۔

''اب بندہ پوچھے' بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟'' درشہوار نے معصومیت کی انتہا کر دی۔
''ویسے تو اس گھر کے ہر معاملے میں تمہارا ہی کوئی نہ کوئی قصور ہوتا ہے، لیکن۔ طوبیٰ شرارت سے رکی۔
''لیکن کیا۔۔۔'' درشہوار نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔
''اس دفعہ تمہاری مظلومیت مجھے بھی کسی شک و شبے سے بالاتر ہی لگ رہی ہے۔'' طوبیٰ کے شرارتی انداز پر درشہوار نے ایک زوردار جھانپڑ اس کے کندھے پر رسید کیا اور ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔۔۔
''کیسا رہا تمہارا اسلام آباد کا ٹرپ۔۔۔؟'' طوبیٰ نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے منہ بنا کر پوچھا۔
''ٹرپ تو زبردست تھا، فارحہ بھابھی نے کافی شاپنگ کروائی مجھے۔۔۔'' درشہوار کی آنکھیں چمکیں۔
''میرے لیے کیا لائی ہو۔۔۔؟'' طوبیٰ بے تاب ہوئی۔۔
''بہت قیمتی تحفہ۔۔۔'' درشہوار نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔۔۔
''اچھا۔۔۔ وہ کیا۔۔۔؟؟؟'' اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔
''دعائیں۔۔۔'' درشہوار نے اس کے ارمانوں پر اوس ڈالی۔
''سنبھال کر رکھو اپنی دعائیں۔۔۔'' وہ تڑپ کر مزید بولی۔ ''جب میں جاؤں گی ناں کہیں، تو ٹکے کی بھی چیز نہیں لاؤں گی تمہارے لیے۔۔''
طوبیٰ سچ مچ اس سے خفا ہو گئی اور وہ مسکراتے ہوئے اپنی واڈروب سے ساری شاپنگ نکالنے لگی کیونکہ اسے علم تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی ناراض کیوں نہ ہو لیکن
اس سب چیزوں کا پوسٹ مارٹم کیے بغیر کمرے سے نہیں ہلے گی۔

☆☆☆

وہاج میر کو آج نور محل میں سخت گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔۔۔
آج شام ہی ان کی دا جی کے ساتھ میر ہاؤس سے واپسی ہوئی تھی اور چونکہ وہ الرجی اور سانس کے مریض تھے اور سردیوں میں ان کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو جاتا، مری سے واپسی پر ہی چھینکوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ابھی تک جاری تھا۔
ان کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا اور گلے میں بھی اچھی خاصی خراش محسوس ہو رہی تھی۔
''آپ کو جانا ہی نہیں چاہیے تھا مری۔۔۔'' فارحہ نے گرین ٹی کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے محتاط انداز میں کہا۔
''ماں باپ ہیں وہاں میرے اور اتفاق سے زندہ بھی ہیں۔۔۔'' ان کی طرف سے حسب معمول جلا کٹا ہی جواب آیا۔
''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔۔'' فارحہ گھبرا گئیں، میر وہاج کی شعلہ صفت طبیعت ان کے ہاتھ پیر پھلائے رکھتی تھی۔ ''میں تو آپ کی طبیعت کی وجہ سے کہہ۔۔۔''
''تم میری حالت کو چھوڑو اور یہ کھڑکیاں کھول کر پردے ہٹاؤ۔'' وہاج کی اگلی فرمائش نے انہیں ہکا بکا کیا۔
''باہر شدید سردی ہے وہاج۔۔۔۔'' وہ پریشان ہوئیں۔
''اور مجھے اندر گھٹن کا احساس ہو رہا ہے۔۔۔'' انہوں نے بے زاری سے اپنا سینہ مسلا۔
فارحہ فکر مند انداز میں ان کی طرف بڑھیں، جلدی سے ان کا ماتھا چھو کر دیکھا تو وہ خاصا سرد تھا۔ ان

کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرکے وہاج نے آنکھیں کھولیں۔
تو ان میں موجود سرخی اور وحشت دیکھ کر وہ گھبرا گئیں۔
''شکر ہے بخار تو نہیں ہے آپ کو۔۔۔''
''تم اپنی ڈاکٹری جھاڑنا بند کرو اور کمرے کی کھڑکیاں کھولو۔۔''
''وہاج! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، باہر بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔''
''جاہل عورت، میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے گھٹن کا احساس ہو رہا ہے، اور تم مجھے موسم کا حال سنا رہی ہو۔۔'' وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے۔۔۔
''اچھا، اچھا میں کھول دیتی ہوں۔۔'' انہوں نے جیسے ہی کھڑکی کھولی، سرد ہواؤں کا طوفان کمرے میں گھس آیا، اور ان پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔
''اُف۔۔۔!!!!'' وہاج نے منہ کھول کر ایک لمبا سانس لیا اور تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھرنے کی کوشش کی جو انہیں خاصی مہنگی پڑی۔ ان کا کچھ دیر پہلے رکی ہوئی چھینکوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور اس کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا ایک طویل دورہ پڑا۔۔
''او میرے خدایا۔۔۔'' فارحہ نے گھبرا کر ان کی کمر کو سہلایا۔۔۔
وہاج کی حالت ایک دم ہی بگڑ گئی، ان کی ناک میں خارش بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ہی سانس لینے میں بھی دقت کا سامنا ہونے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے ان کا نظام تنفس بگڑ کر رہ گیا۔
''میرا ان ہیلر لاؤ۔۔'' وہ کھانسی کے درمیان بمشکل بولے تو فارحہ نے سائیڈ میز پر رکھا ان کا ان ہیلر نکال کر ان کی طرف بڑھایا اور وہ جلدی سے اپنی ناک اور منہ سے لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔
کچھ لمحوں کی مشقت کے بعد ان کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔۔
''کھڑکی بند کر دو پلیز۔۔۔'' ان کا دماغ ٹھکانے آ چکا تھا، فارحہ نے خاموشی سے جا کر کھڑکی بند کر کے پردہ آگے کر دیا۔
''توبہ ہے، سانس لینا ہی محال ہو گیا تھا۔۔'' وہ اب اپنی اینٹی الرجی میڈیسن کھا رہے تھے۔۔۔
''پتا تو ہے آپ کو سردی کا موسم راس نہیں ہے۔۔۔''
''مجھے تو لگتا ہے کوئی بھی چیز راس نہیں ہے، نہ جانے کس کی بددعا کے اثر میں ہوں۔۔'' وہ ڈپریشن کی انتہا پر تھے۔۔
''آپ کو کوئی کیوں دے گا بددعائیں، آپ نے کس کے ساتھ برا کیا ہے۔۔۔'' فارحہ ان کے پاس بیٹھ کر نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر سہلانے لگیں۔
''سب سے زیادہ تو تم ہی دیتی ہو گی۔۔'' ان کے انداز میں تلخی تھی یا سادگی، فارحہ سمجھ نہیں پائیں۔
''اللہ نہ کرے، میں کیوں کروں گی ایسا، میرا آپ کے علاوہ ہے ہی کون۔۔؟''
''جانتا ہوں میں، اگر تمہارا بھی کوئی والی وارث ہوتا تو کب کی مجھے چھوڑ کر جا چکی ہوتیں۔۔'' انہوں نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔
''پتا نہیں آپ مجھ سے اتنا بدگمان کیوں رہتے ہیں۔۔۔؟'' وہ اداس ہوئیں۔
''میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی سے سکھ اور چین کیوں ختم ہو گیا ہے، ہر وقت کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کوئی آسیب میرے تعاقب میں ہے۔''

وہ تھکے تھکے انداز میں بولتے ہوئے اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے۔
"آپ صدقہ کیوں نہیں دیتے اپنا ؟" فارحہ نے خلوص نیت سے مشورہ دیا۔
"اس سے کیا ہوگا۔۔۔۔؟" انہوں نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔
"صدقہ سو بلاؤں کو ٹالتا ہے۔" فارحہ نے سادگی سے کہا۔
"کیوں تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔۔۔" ان کے اندر کا چور مچل کر باہر نکل آیا۔
"استغفر اللہ، میں نے ایسا کب کہا، صدقہ اور خیرات کسی گناہ کا اثر زائل کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔؟" فارحہ بھی برا مان گئیں۔
"اچھا، اچھا ٹھیک ہے جو بہتر لگے کرلو، بلکہ کوئی خیرات شیرات ہی کروالو نور محل میں۔۔۔" خلاف توقع وہ مان گئے۔
"خیرات کے لیے تو خاصے انتظامات کرنے ہوں گے۔۔۔"
"پیسوں کی کمی تھوڑی ہے میر ہاؤس کے مکینوں کو۔۔۔" وہاج کی طرف سے حسب عادت الٹا ہی جواب آیا۔
"بات پیسوں کی نہیں ملازمین کی ہے، یہاں سے بھی شفیق چچا کے گھر والوں کو بلوا لیا گیا ہے مری میں۔۔" فارحہ کو اپنا تازہ ترین دکھ یاد آیا۔
"وہاں بھی تو خاصا مسئلہ ہو رہا تھا۔" انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔
"کچھ پتا چلا بہادر علی اور صندل کا خاندان کیوں گھر چھوڑ کر گیا ہے۔" فارحہ نے ان کی دکھتی ہوئی رگ پر ان جانے میں ہاتھ رکھ دیا۔
"مجھے کیا پتا، میں ان کا پرسنل اسسٹنٹ لگا ہوا ہوں یا مجھ سے مشورہ کر کے گئے ہیں وہ لوگ؟" وہاج کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔
"میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔۔۔" فارحہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔
"جتنی عقل ہوگی، ویسی ہی بات کرو گی ناں۔۔" ان کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔۔۔ "ملازم چاہئیں ناں، مل جائیں گے تمہیں بھی، اب جا کر مجھے سوپ بنا کر دو بھوک لگ رہی ہے۔۔۔"
"ساتھ ایک دو انڈے بھی بوائل کر دوں۔۔۔" فارحہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو وہاج نے بے زاری سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب شہرزاد کی آنکھ کھلی۔
اس نے اٹھتے ہی اپنے کمرے کی دیوار گیر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے کا منظر دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ ملگجی سی روشنی میں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ زرد اور نارنجی پتے ٹیرس پر یوں گر رہے تھے جیسے کوئی دھیمے سروں میں سرگوشی کر رہا ہو۔۔۔
رات والی بارش رک چکی تھی اور فضاؤں میں چاروں طرف گہری دھند کا راج تھا۔ وہ واش روم سے فریش ہو کر نکلی، اپنا تولیہ کرسی پر پھینکا۔ اس کی بیڈ ٹی ملازمہ نہ جانے کب سائیڈ میز پر رکھ کر چلی گئی تھی۔ اس پر جمی سیاہ رنگ کی ملائی کی تہ سے نظریں چرا کر وہ جوگرز کے تسمے باندھنے لگی۔ جوگنگ اور ایکسرسائز دو ایسی چیزیں تھیں جن کے بغیر شہرزاد کی زندگی ادھوری تھی۔ بہت کم اس کے اس معمول میں تعطل آتا

تھا۔

گزشتہ رات اس نے کئی گھنٹے رومیصہ کے ساتھ جاگ کر گزارے تھے، وہ اسے فارم ہاؤس میں گزرے ہوئے دنوں کی روداد سنا رہی تھی جسے سن کر شہزاد کو کم از کم یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسے اغوا کرنے والے لوگوں میں کچھ نہ کچھ انسانیت ضرور تھی۔

رات تین ساڑھے تین بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں آ کر سو گئی تھی اور اب چند گھنٹوں کی نیند نے اسے خاصا فریش کر دیا تھا۔

وہ اپنا ٹریک سوٹ پہنے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو سامنے نئی ملازمہ رشیدہ بیڈ ٹی کا خالی کپ لیے بیٹا بیگم کے کمرے سے نکل رہی تھی، اس نے صبح ہوتے ہی اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

''السلام علیکم ---'' رشیدہ نے اسے دیکھتے ہی سلام جھاڑا۔

''وعلیکم السلام، رات نیند آ گئی تھی آپ کو نئی جگہ پر ---؟'' شہزاد کا اپنائیت بھرا انداز رشیدہ کو اچھا لگا۔

''جی بی بی جی ---''

''آپ انکل صوفی سے کہہ دیں، میرا فریش جوس ایک گھنٹے تک ریڈی رکھیں، میں جوگنگ کر کے آ رہی ہوں۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''بیٹا! دھند بہت ہے باہر، کیسے جائیں گی ----'' رشیدہ کے لہجے کی تشویش پر وہ مسکرائی۔

''ڈونٹ وری، عادت ہے مجھے ----'' وہ مسکرا کر پورچ میں نکل آئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی ہیڈ لائٹس آن کیں اور محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرتی ہوئی وہ شالیمار کلب پہنچ گئی، جہاں آنا اس کی معمول تھا۔

صبح کے اس پہر وہاں اس کے جیسے ہی چند سر پھرے لوگ موجود تھے۔ شدید سرد موسم میں اپنے گرم بستروں سے نکل کر جوگنگ کے لیے آنا دیوانوں کا ہی کام تھا اور شہزاد اس معاملے میں ان سے کم نہیں تھی۔

اس نے جیسے ہی جوگنگ ٹریک پر پہلا قدم رکھا، سیل فون کی مترنم گھنٹی گونج اٹھی۔ یہ مخصوص ٹون اس نے صرف ہم زاد کے نمبر پر سیٹ کر رکھی تھی۔

ہینڈ فری کانوں میں لگا کر سیل فون جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ اب تیز تیز چل رہی تھی۔۔

''زرد پتوں کو اپنے پاؤں تلے روندنا اچھا لگتا ہے آپ کو ---؟'' ہم زاد کے معنی خیز انداز پر وہ ہلکا سا ہنسی ---

''جی بہت زیادہ ----'' اس کے لہجے میں چھلکنے والی شوخی رومیصہ کی واپسی پر اس کے پرسکون ہونے کی گواہ تھی۔

''بہت ظالم ہیں آپ ---؟'' اس نے شکوہ کیا۔

''صبح صبح یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے آپ نے تو یہ بات دوپہر کو آرام اور سکون سے بھی بتائی جا سکتی تھی۔'' جوگنگ ٹریک پر وہ احتیاط سے بھاگنے لگی۔

کیونکہ دھند کی وجہ سے راستہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔

''ذرا سوچیں محترمہ، کتنے خزاں رسیدہ زرد پتے، آپ کے پیروں کے نیچے آ کر مسلے جائیں گے۔'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

''آپ کو صبح صبح خزاں رسیدہ پتوں کا دکھ کیوں ستا رہا ہے ---؟'' اس نے اپنی رفتار تیز کی۔

''اس لیے کہ ان میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے۔۔۔''اس کا معنی خیز لہجہ شہزاد کی سماعتوں سے ٹکرایا

''وہ کیا۔۔۔؟''وہ ہلکا سا مسکرائی

''جب انہیں کوئی اپنے پیروں تلے مسلتا ہوگا تو سوچیں کیا قیامت گزرتی ہوگی ان پر۔۔۔''

''آپ پتوں کو چھوڑیں، اپنا حال بتائیں۔۔۔''وہ بھی غیر سنجیدہ تھی۔

''خزاں کے موسم میں زرد پتوں کے چٹخنے کی آواز سنیں تو سمجھنا میرا دل بھی تمہارے قدموں تلے آ کر روندا گیا۔۔''چلتے چلتے شہزاد کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو تھمی۔زمین نے اس کے پیر جکڑ لیے، یہ تو طے تھا کہ اس شخص سے باتوں میں جیتنا ناممکن تھا۔۔۔

اس نے بلاارادہ زمین پر پھیلے سینکڑوں زرد پتوں کو دیکھا، اسے لمحے بھر کو یہی محسوس ہوا جیسے واقعی اس کا دل اس کے پیروں کے نیچے آ کر روندا گیا ہو۔ شہزاد نے ایک لمبی سانس بھر کر سرد ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں منتقل کیا۔

''پھر صاف صاف کہیں ناں، اس موسم میں جوگنگ کرنا چھوڑ دوں میں۔''وہ جل کر بولی اور ہم زاد کا قہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔۔

''ارے ہم کون ہوتے ہیں آپ کو، آپ کے فیورٹ کام سے روکنے والے۔۔۔۔''

''یہ کام تو شاید آپ کو بھی بہت پسند تھا۔۔۔''شہزاد کو اس کی کہی ہوئی اکثر باتیں یاد تھیں۔

''قسم لے لیں، اس وقت میں بھی کسی ٹریک کی خاک چھان رہا ہوں۔۔۔''اس کے لہجے کی سچائی پر شہزاد کو یقین آ گیا۔۔۔

''اس ٹریک پر کیا ریڈ کارپٹ بچھا ہوا ہے، جو کسی اور کے دل کے چٹخنے کی آوازیں آپ کو نہیں آ رہیں۔۔۔''شہزاد نے بھی اس پر بھرپور حملہ کیا اور وہ اس کی حاضر جوابی پر ایک دفعہ پھر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''آپ کہیں تو سہی کہ ان پتوں کے ساتھ آپ کا دل ہے، ایک قدم بھی اٹھا جاؤں تو نام بدل دیجیے گا میرا۔۔۔۔''

''سوری میں چیزوں کو ان کے درست مقام پر ہی رکھتی ہوں۔۔''شہزاد مسکرائی۔

''اچھا کرتی ہیں، مجھے بھی میری ہی اوقات میں رکھا ہوا ہے، چلیں پھر ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔''اس نے فون بند کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

وہ اس کی سوچوں میں گم گہری دھند میں لپٹے جوگنگ ٹریک پر تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک شخص سے بری طرح ٹکرائی۔ جو مخالف سمت سے آ رہا تھا۔

''دھیان سے۔۔۔۔''اس شخص نے بے ساختہ تھام کر اسے گرنے سے بچایا۔ایک مانوس سے پرفیوم کی خوشبو چاروں طرف پھیلی۔

''اوہ۔۔۔آئی ایم سوری۔۔۔''شہزاد ایک دم بوکھلا گئی۔

اس شخص کی گرم انگلیاں اس کے سرد ہاتھوں سے ٹکرائیں اور ہاتھ میں پکڑا سیل فون چھوٹ کر نم زمین پر جا گرا۔

''اوہ نو۔۔۔''اس نے فوراً۔ سیل فون زمین سے اٹھا کر اپنے ٹراؤزر کی جیب سے رگڑ کر صاف کیا اور اس کے طرف بڑھایا۔

''تھینک یو۔۔۔'' شہزاد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
سرد موسم میں اس شخص نے آسمانی رنگ کے ٹریک سوٹ پر نیوی بلیو جیکٹ پہن رکھی تھی اور سرخ رنگ کے اونی مفلر سے سارا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ اس پر غور و فکر کرتی وہ شخص اسی دھند میں کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔
''کون تھا یہ۔۔۔'' وہ اس کی شفاف شہد رنگ آنکھوں کی چمک پر الجھی۔۔
اس کے چہرے کے باقی نقوش وہ اونی مفلر میں چھپے ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ پائی تھی۔
لیکن کچھ تھا، جس نے اسے چونکا دیا تھا، اس شخص کا لمس بہت اپنائیت بھرا تھا۔۔۔۔
شہزاد کو عجیب سا احساس ہوا۔۔۔ وہ جوگنگ ٹریک کی سائیڈ پر رکھے سنگ مرمر کے بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم ہی بے قابو ہوئی، اس کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر اب ہم زاد کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ اس نے سرد ہاتھوں کے ساتھ کال اٹینڈ کی۔
''خوشبو اچھی لگاتی ہیں آپ۔۔۔'' اس کا شوخی سے بھرپور لہجہ شہزاد کی دھڑکنیں منجمند کر گیا۔
''لڑکیوں کو ایسی ہی دھیمی اور مسحور کن خوشبو کا استعمال کرنا چاہیے جو وہی شخص محسوس کر سکے جو دل کے پاس ہو۔'' ہم زاد بول رہا تھا اور شہزاد کی تو گویا۔
قوت گویائی ہی سلب ہو گئی، اس کے ذہن کے پردے پر دو شفاف شہد رنگ آنکھیں ابھریں۔۔
''یہ آپ تھے ناں، جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے ٹکرائے تھے۔؟'' شہزاد نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔
''اب تو گلہ نہیں کریں گی کہ سامنے نہیں آیا میں۔۔۔'' دھند کے اس پار ایک زوردار قہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔

''اتنے ہی بہادر تھے تو جم کر کھڑے ہوتے۔۔۔'' شہزاد ہلکا سا چڑ کر گویا ہوئی۔
''میں نہ صرف جم کر کھڑا ہوا، آپ کو گرنے سے بچایا اور گندی مٹی سے بھرا سیل فون صاف کر کے آپ کے سرد ہاتھوں میں بھی تھمایا، اب کیا جان لیں گی میری۔۔۔۔۔؟'' وہ اب محض اسے چڑا رہا تھا۔
''کسی لڑکی کا سیل فون ٹشو پیپر کے بجائے ٹراؤزر کی جیب سے رگڑ کر صاف کرنا، بدتہذیبی ہے۔۔'' شہزاد کے طنزیہ لہجے پر وہ پھر ہنسا۔
''کچھ بھی کہیں لیکن مجھے معلوم ہے آپ اس سیل فون کی اسکرین اب کبھی صاف نہیں کریں گی۔۔۔'' شوخی اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔
''کیوں۔۔۔'' شہزاد اب پارکنگ کی طرف بڑھنے لگی۔
''میرے ہاتھوں کا لمس ہے اس پر۔۔۔''
''ہاں فنگر پرنٹس بھجوائی ہوں نادرا کے آفس۔۔۔ دو منٹ میں سارا بائیو ڈیٹا نکل کر آجائے گا سامنے۔۔۔'' شہزاد کو اس کی ہنسی زہر لگ رہی تھی۔
''یہ بھی کر کے دیکھ لیں، پھر آپ کی کامیابی کو کسی اچھی جگہ پر کینڈل لائٹ ڈنر کے ساتھ سیلبریٹ کریں گے۔۔'' وہ سراسر اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔
شہزاد نے چڑ کر سیل فون ہی پاورڈ آف کر دیا اور جیسے ہی وہ پارکنگ میں پہنچی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، سامنے اس کی گاڑی کے بونٹ پر ایک گملا رکھا ہوا تھا جس پر لگے پودے پر چند پھول کھلے

ہوئے تھے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ اسی کی شرارت ہے۔

☆☆☆

مونیکا کے پورے گھرانے کی نظریں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔

جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں گردش کر رہی تھیں انہیں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جارج اپنی میوزک اکیڈمی سے شام پانچ بجے تک لوٹ آتا تھا اور اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔۔

''دوبارہ کال ملاؤ اپنے باپ کو۔۔'' مارتھا کا دل کسی کھائی میں ڈوبا۔

''نمبر ابھی بھی پاورڈ آف جا رہا ہے ان کا۔۔۔'' مونیکا نے پریشانی سے جواب دیا۔

''خداوند، رحم کر ہم پر۔۔۔'' مارتھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل کھڑی ہوئیں، ان کے تینوں بچوں کے چہروں پر تشویش، پریشانی اور فکرمندی کے تاثرات نمایاں تھے، جارج کے چند گنے چنے دوست تھے اور مونیکا ان سب کے ہاں فون کر کے پوچھ چکی تھی۔

''انکل جوزف کو کال کر کے پوچھو مونیکا! ان کو یقیناً کچھ نہ کچھ پتا ہوگا۔۔'' مونیکا کی چھوٹی بہن نے اسے مشورہ دیا۔

''ہاں ہاں، فوراً ان کو کال کرو، وہ بھی تو ان ہی کی اکیڈمی میں نوکری کرتے ہیں۔۔۔'' مارتھا دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹیں۔

''لیکن میرے پاس نمبر نہیں ہے ان کا۔۔۔'' مونیکا نے مایوسی سے جواب دیا۔

''تمہارے باپ کی ڈائری میں سارے نمبر لکھے ہوئے ہیں۔۔'' مارتھا کی بات سنتے ہی اس نے فوراً سائیڈ میز پر رکھی ڈائری اٹھائی اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے انکل جوزف کا نمبر مل گیا۔

جوزف انکل سے سلام دعا کے بعد ملنے والی اگلی اطلاع پر مونیکا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔۔۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔۔۔'' مونیکا کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی، مارتھا اور اس کی چھوٹی بہن لپک کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں، اور ہاتھ کے اشاروں سے اس سے پوچھنے لگیں۔

''چلیں ٹھیک ہے، آپ پلیز ان کے جاننے والوں سے پوچھ کر ضرور بتائیے گا، ہم لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔۔'' مونیکا نے فون بند کیا۔

''کیا کہا انکل جوزف نے۔۔۔'' اس کی بہن نے بے تابی سے پوچھا۔

''پاپا، آج اکیڈمی گئے ہی نہیں۔'' مونیکا نے ماں اور بہن سے نظریں چرا کر وال کلاک کی طرف دیکھا جس پر اب گیارہ کا وقت ہو رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے، وہ خود بتا کر گئے تھے مجھے۔۔۔'' اس کی ماں کی پریشانی بڑھی۔

''آپ سے کہیں اور جانے کا ذکر تو نہیں کیا تھا انہوں نے۔۔۔؟'' مونیکا نے پریشانی سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔۔۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر کہاں جا سکتے ہیں اور نمبر بھی کیوں بند کر رکھا ہے آخر۔۔۔؟'' ان کی چھوٹی بیٹی اٹھ کر پریشانی سے ٹہلنے لگی۔

''خداوند ہی جانتا ہے۔۔۔'' اس کی ماں نے پریشانی سے اپنے تینوں بچوں کو دیکھا، ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی صرف تیرہ چودہ سال کا تھا اور وہ رات کے اس پہر اسے بھی باپ کی تلاش میں گھر سے باہر بھیجنے

کار سک نہیں لے سکتی تھیں۔
جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ان چاروں کے دل میں طرح طرح کے وہم اور اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ پونے بارہ بجے کے قریب مونیکا نے فیصلہ کن انداز میں اپنی چادر اٹھائی۔ اس کی ماں اور بہن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں دلاور کو لے کر جا رہی ہوں پولیس اسٹیشن۔۔۔" اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔
"دماغ ٹھیک ہے تمہارا، رات کے اس وقت اکیلی جاؤ گی تم وہ بھی پولیس اسٹیشن۔۔۔" مارتھا کا مزاج برہم ہوا۔
"مام ہم گھر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔" وہ جھنجلا سی گئی۔۔۔
"آپی ٹھیک کہتی ہیں، ہمیں پاپا کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانی چاہیے۔۔۔" اس کا بھائی ایک دم ہی بڑا بن کر بولا تو اس کی ماں کو چپ لگ گئی۔
"لیکن اس سے پہلے ہمیں نشتر ہاسپٹل کی ایمر جنسی وغیرہ چیک کر لینا چاہیے۔" مونیکا کی بہن نے نظریں چرا کر دھیمے انداز میں مشورہ دیا۔ اسی لمحے گھر کی بیل بجی اور ان چاروں کے چہروں پر زندگی دوڑ گئی۔
"لگتا ہے پاپا آگئے۔۔۔" دلاور لپک کر گیٹ کی طرف دوڑا۔
"دروازہ پوچھ کر کھولنا بیٹا۔۔۔" اس کی ماں نے پیچھے سے آواز لگائی اور وہ دونوں بہنیں بھی بے تابی سے اٹھیں۔ جیسے ہی وہ باہر نکلیں، سامنے جارج تھکے تھکے انداز میں اپنے بیٹے دلاور کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے اور چہرے پر تھکاوٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔
"کہاں چلے گئے تھے آپ۔۔۔؟ کچھ احساس ہے کہ ہم لوگ کتنا پریشان ہو رہے تھے۔۔۔" مارتھا ایکدم ہی ان پر برس پڑیں، مونیکا نے ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں تھوڑا ٹھنڈا ہونے کا اشارہ کیا، لیکن مارتھا غصے میں دوسروں کی ذرا کم ہی سنتی تھیں۔
"بیٹا، ایک گلاس پانی کا لاؤ۔۔۔" انہوں نے اپنی عینک اتار کر سائیڈ میز پر رکھی، مونیکا نے دیکھا۔ ان کے جوتے خاصے گرد آلود تھے۔
"یہ لیں پاپا۔۔۔" مونیکا بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئے۔
ان کے تینوں بچے اور بیوی بہت غور سے ان کے چہرے کے تاثرات سے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جارج نے بھی شاید کچھ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔
"آخر کہاں چلے گئے تھے آپ، کچھ پتا بھی تو چلے۔۔۔" مارتھا نے اپنے شوہر کے تاثرات کو دیکھ کر اب کی بار دانستہ نرمی سے پوچھا۔
"لائٹ بند کر دو، مجھے نیند آ رہی ہے، صبح بات کریں گے۔۔۔" ان کا انداز خاصا پُراسرار تھا۔
"کمال کرتے ہیں آپ، ہمیں ٹینشن ہو رہی ہے، کچھ تو بتائیں۔۔۔" وہ جھنجلائیں۔
"مونیکا بیٹا، لائٹ بند کر دو۔۔۔" ان کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔
وہ سب کی نیندیں اڑا کر خود رخ موڑ کر لیٹ گئے اور کمبل اوپر تک تان لیا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ سونے کا تہیہ کر چکے ہیں، مارتھا نے جھنجلا کر اپنی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا، لیکن دونوں نے ہی انہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا ایک التجائیہ سا اشارہ کیا جو خلاف توقع مارتھا نے مان لیا تھا لیکن ان کی

اپنی آنکھوں کی نیند اُڑ چکی تھی۔۔

☆☆☆

تجمل حسین کرپشن کیس وہ جیت چکی تھی۔۔۔

وہ بڑے پروقار انداز میں اپنے ساتھی وکلاء کے ساتھ کمرہ عدالت سے باہر نکلی۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے بہت سے نمائندوں نے اسے ایک ساتھ گھیر لیا تھا، وہ اپنے ازلی پرسکون انداز میں ان کے سوالات کے فرداً فرداً جوابات دینے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ تجمل حسین حکومت وقت میں تھا، اور ان کے محکمے کی کرپشن نے پورے ملک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ آج کل جن چند کیسز پر کام کر رہی تھی، یہ ان میں سے ایک تھا۔

یہ اس کی پروفیشنل زندگی کا پہلا کامیاب کیس تھا جو اس نے مسز قریشی کی۔ مدد کے بغیر لڑا تھا۔

''ویل ڈن شیری۔۔۔ کیپ اٹ اپ۔۔۔'' سب سے پہلی کال اسے مسز قریشی کی وصول ہوئی جو اس وقت خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

''تھینک یو میم۔۔۔'' شہرزاد نے چند منٹ ان سے بات کر کے فون بند کر دیا۔

''مجھے صبح ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آج آپ کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکے گا۔'' اگلی کال ارتضیٰ حیدر کی تھی جو آج اسے کمرہ عدالت تک چھوڑنے آیا تھا۔

''تھینک یو ارتضیٰ، آپ کی بھرپور سپورٹ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔۔۔''

''آپ بہت آگے جائیں گی شیری۔۔۔''

''تھینکس ارتضیٰ، میں پھر بات کروں گی، بیچ میں مام کی کال آ رہی ہے۔۔۔''

شہرزاد نے ارتضیٰ حیدر کی کال ڈراپ کر کے ٹینا بیگم کو لائن پر لیا جو اس وقت خاصے خوش گوار موڈ میں تھیں۔

''شیری! تم نے تو کمال کر دیا، سارے چینلز پر صرف تمہارا ہی چہرہ دکھائی دے رہا ہے، سیف الرحمٰن نے بھی مجھے کہا، ناکوں چنے چبوا دیے ہیں شیری نے تجمل حسین کے وکیل کو، اور پتا ہے میں نے کیا جواب دیا۔'' وہ ایک پل کو رکیں۔۔ ''میں نے کہا سیف الرحمٰن، آخر شیری بیٹی کس کی ہے۔'' ان کے لہجے میں چھپا فخر محسوس کر کے وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

''او کے مام، شام میں گھر پر ڈیٹیل سے بات کریں گے، ابھی مجھے مسز قریشی کے چیمبر جانا ہے۔''

''او کے جانی، ٹیک کیئر۔۔۔''

شہرزاد نے جیسے ہی فون بند کر کے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائی، اسے ہم زاد یاد آ گیا، اس تمام عرصے میں اس کی طرف سے ایک سنگل میسج تک اسے موصول نہیں ہوا تھا اور وہ جو ہمیشہ اس کے سامنے ایک ہی قول دہراتا تھا کہ محنت اتنی خاموشی سے کرو کہ تمہاری کامیابی شور مچا دے۔ اب جبکہ اس کی کامیابی نے ہر طرف شور مچا رکھا تھا وہی شخص چپ کر کے بیٹھ گیا تھا اور اس کی یہ خاموشی آج سے پہلے شہرزاد کو کبھی اتنی بُری نہیں لگی تھی۔

''آخر سمجھتا کیا ہے خود کو، میں اس کی مبارک باد کے لیے مری جا رہی ہوں۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ کال کرے گا بھی تو میں خود سے اس کیس کا تذکرہ نہیں کروں گی۔۔۔'' وہ دل ہی دل میں کئی ارادے باندھ رہی تھی۔

''میم، آفس آ گیا ہے۔۔'' وہ جو اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، ڈرائیور کی آواز اسے حقیقت کی دنیا

میں لے آئی۔

وہ آفس پہنچی تو مسز قریشی کے دفتر میں ایک چھوٹی سی سرپرائز پارٹی اس کی منتظر تھی، شہرزاد کا دل محبت اور تشکر کے گہرے احساس سے بھر گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی کامیابی کو اتنے کھلے دل سے سراہا جائے گا۔

''مجھے یقین ہے تم بہت آگے جاؤ گی شیری۔۔۔۔'' مسز قریشی نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا کر محبت سے پیش گوئی کی۔

''تھینک یو میم۔ آپ کی سپورٹ چاہیے۔۔۔''

''ہادی نے بھی بیسٹ وشز کا میسج بھجوایا ہے تمہارے لیے۔۔۔'' انہوں نے کیک کا ٹکڑا اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''میری طرف سے اسپیشل تھینکس کہہ دیجیے گا انہیں۔۔۔'' شہرزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تم نے آج بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے شیری۔۔۔۔'' بیرسٹر رضا نے ہنس کر لقمہ دیا۔

''نہیں سر! میری ایسی مجال کہاں۔۔۔'' وہ مسکرائی۔

وہ اس کی زندگی کی ایک بہترین شام تھی جو اس کے کولیگز اور فرینڈز نے بہت خوبصورت بنا دی تھی، لیکن ان دلکش لمحات میں بھی وہ بار بار اپنا سیل فون اٹھا کر اس آس پر۔ دیکھتی کہ شاید اتنے ہلے گلے میں میسج کی بیپ سنائی نہ دی گئی ہو۔۔۔

ہو سکتا ہے کہ ہم زاد کی کال آئی ہو اور اسے پتا نہ چلا ہو۔۔۔ لیکن افسوس ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کا ان باکس اس کے کولیگز اور فرینڈز کے مبارک باد کے پیغامات سے بھر گیا۔ لیکن بے شمار آنے والی کالز میں کوئی بھی نمبر اس شخص کا نہیں تھا۔

دو گھنٹے بعد اس خوبصورت پارٹی کا اختتام ہوا تو شہرزاد نے بھی اپنے تمام کولیگز کا باری باری شکریہ ادا کیا۔ وہ اب اچھا خاصا تھک چکی تھی، تبھی تو سب ہی نے اسے اٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔۔۔۔

''کیا ہوا گھر نہیں جاؤ گی کیا۔۔۔۔؟'' اسے اپنے آفس کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر ایڈووکیٹ علینہ نے حیرانی سے دریافت کیا۔

''ایک دو ضروری فائلز لے کر جانی ہیں مجھے۔ وہی لینے جا رہی ہوں۔۔۔'' وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر اپنے آفس کی طرف بڑھی۔

اس نے جیسے ہی ہینڈل گھما کر اندر قدم رکھا، خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا، پورے کمرے میں ایک مسحور کن خوشبو نے اودھم مچا رکھا تھا، اس کی نظر اٹھی اور اسے خوش گوار حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا، وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے سخت بے یقینی اور حیرت سے اپنے آفس کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا چھوٹا سا دفتر بے شمار پھولوں کے رنگ برنگے گلدستوں سے بھرا ہوا تھا، میز، کرسی، ریک، کیبنٹ ہر طرف بکے ہی بکے تھے۔ لگتا تھا کسی نے پوری ہی دکان خرید کر اس کے آفس میں سجا دی تھی۔

''اوہ مائی گاڈ۔۔۔'' اس نے بے تابی سے ایک گلدستہ اٹھایا، اس پر لگے وش کارڈ پر ہم زاد نے اپنی رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا۔

''میرے بس میں ہوتا تو آپ کی کامیابی پر میں پوری دنیا کے پھول اس ایک کمرے میں بھر دیتا۔۔۔'' شہرزاد نے عجلت بھرے انداز میں دوسرا بکے اٹھایا اس پر لگے وش کارڈ پر بھی تحریر تھا۔

”پھولوں کی اگر کوئی زبان ہوتی تو آج کے بعد آپ مجھ سے کبھی نہ پوچھتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔۔“

شہرزاد کی تو گویا قوت گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی، اس کی آنکھیں نہ جانے کیوں نم ہو گئیں، وہ باری باری مختلف بکے اٹھاتی اور اس پر لگے وش کارڈز پر لکھے جملے پڑھتی اور انہیں اتار کر اپنے بیگ میں احتیاط سے رکھتی جاتی۔ اس کا دل و دماغ اب مزید کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ہم زاد کی محبت اور چاہت کا اس سے پہلے کبھی اتنا گہرا احساس نہیں ہوا تھا اسے، اور اسے لگتا تھا شاید وہ اب اس موضوع پر اس سے کبھی کوئی بات نہ کر سکے، اس نے اسے کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

”تجمل حسین کے وکیل کے تو پرخچے اڑا دیے اس دو ٹکے کی بیرسٹر نے۔۔۔“

میر حاکم ابھی ابھی میر محتشم کے ساتھ میر ہاؤس پہنچے تھے، اور ان کی آمد کے ساتھ ہی پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ خواتین جو چھٹی کے روز ذرا سستی سے ہی اٹھتی تھیں، صبح سویرے ان دونوں کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف ایمرجنسی طاری ہو گئی۔

اس وقت سب ہی خواتین کچن اور ڈائننگ روم کے چکر لگا رہی تھیں۔ میر حاکم علی کی موجودگی میں شارقہ بیگم اور ندرت بیگم بھی اپنے نمبر بنانے کے لیے خاصی متحرک ہو جاتیں، یہ الگ بات کہ تاج دار بیگم کے سامنے کسی کا بھی چراغ زیادہ دیر تک نہیں جل سکتا تھا۔ میر خاقان بھی خاموشی سے اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

”خیر بابا جان‘ دو ٹکے کی بیرسٹر ہوتی تو بھلا تجمل حسین کا وکیل وقاص جنجوعہ اسے اپنے آگے ٹھہرنے دیتا۔۔۔“ میر محتشم نے دبے الفاظ میں اسے سراہا۔

”کچھ بھی ہے، ایک دفعہ تو لطف ہی آ گیا، خود کو کوئی چیز سمجھنے لگا تھا تجمل۔۔۔“ میر حاکم کا موڈ اپنے حریف کی شکست پر خاصا خوشگوار تھا۔

”رہی سہی کسر میڈیا نے پوری کر دی، اچھی طرح سے دھویا ہے اسے۔۔۔“ میر محتشم نے بھی تمسخرانہ انداز میں اپنا حصہ ڈالا۔

”تجمل کو اب نااہل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا محتشم، لکھ لو تم یہ میری بات۔۔۔۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بابا جان، لیکن اتنی اندر کی چیزیں اور ثبوت باہر نکلے کیسے۔۔۔“ میر خاقان نے پہلی دفعہ اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”جیسے تمہارے نمبر مافیا کیس میں نکلے تھے، شجاع غنی جیسے مولے کو شاہین بنا کر لا کھڑا کیا تھا اس بیرسٹر شیری نے۔“ میر حکم علی نے اپنا سگار سلگاتے ہوئے ساتھ میں اپنے بیٹے کو بھی سلگایا۔ ان کے طنزیہ لہجے پر وہ تو جیسے انگاروں پر جا کھڑے ہوئے۔۔۔

”لیکن نتیجہ کیا نکلا، آخر کیا بگاڑ لیا انہوں نے ہمارا۔۔۔“ خاقان علی نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے متحمل انداز میں کہا۔ ویسے بھی اپنے باپ کے سامنے ان کی کہاں چلتی تھی۔

”میری وجہ سے۔۔۔“ حاکم علی نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا۔ ”ورنہ اس چھٹانک بھر لڑکی نے تو تم دونوں بھائیوں کو بھی ایک دفعہ تگنی کا ناچ نچا دیا تھا، بھول گئے یہ بات۔۔۔“ حاکم علی کا بے رحمانہ انداز میں کیا گیا تبصرہ سن کر خاقان علی دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئے۔

''اب آپ کے تجربے اور دانش مندی کا مقابلہ ہم تو نہیں کر سکتے بابا جان۔۔'' میر محتشم نے خوشامدی انداز اپنایا جبکہ خاقان علی کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ ابھی تک میر محتشم کی طرح اپنے باپ کی ہاں میں ہاں ملانے کا ہنر نہیں سیکھ سکے تھے، تب ہی تو ان کے اپنے والد کے ساتھ تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہتے اور اس بات کا احساس ان کو آج کل شدت سے ہونے لگا تھا۔۔

''بابا جان! ناشتہ لگواؤں۔۔۔۔'' تاج دار بیگم نے ہال کمرے میں جھانکا اور مسکرا کر پوچھا۔۔۔

''ہاں بھئی اور یہ بچے نظر نہیں آرہے' کیا گھر میں کوئی کرفیو لگا رکھا ہے تم نے۔۔۔'' میر حاکم کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی، قسمت کا مارا شاہ میر وہاں گھومتا ہوا آن نکلا۔

اگر اسے ذرہ برابر بھی یہ گمان ہوتا کہ بابا جان اپنی کابینہ کے ساتھ وہاں براجمان ہیں، وہ چھٹی کا سارا دن کمرے میں گزار دیتا لیکن ہال کمرے کا رخ نہ کرتا۔ داجی کی عقابی نظریں شاہ میر پر پڑیں اور وہ جو وہاں سے کھسکنے کے چکر میں تھا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

''میاں تم ملک وقوم کی خدمت کے علاوہ کبھی آتے جاتے اپنے بزرگوں کا بھی حال احوال پوچھ لیا کرو۔'' داجی کے طنزیہ انداز پر شاہ میر سٹپٹا گیا۔

''السلام علیکم داجی۔ آپ سے ہی ملنے آرہا تھا میں۔۔۔'' اس نے بوکھلا کر جھوٹ بولا۔

''بیٹا، خوامخواہ زحمت کی، مجھے بتا دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔۔۔'' میر حاکم نے شاہ میر کی طبعیت صاف کی اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال گہرا ہوا۔

ڈائننگ روم میں تاج دار بیگم کے ساتھ ناشتہ لگاتی طوبیٰ نے یہ منظر دلچسپ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پردے کے بالکل پاس آکر کھڑی ہوگئی جہاں شاہ میر کے علاوہ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس وقت سر جھکائے میر ہاؤس کے بڑوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ جن کی موجودگی میں ویسے ہی سب دبے پاؤں چلتے اور سرگوشیوں میں بات کرتے تھے۔

''ابھی تک کیپٹن بن کر ہی خواری کاٹ رہے ہو میاں۔۔۔؟'' داجی کی اس دل جلاتی مسکراہٹ کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

''ویسے محتشم! کہنے کو تو تین تین بیٹے ہیں تمہارے لیکن کام کا صرف دہاج ہی نکلا۔۔۔'' میر حاکم نے حسب عادت لفظوں کے چابک کا استعمال کیا۔

''بس بابا جان۔۔۔'' وہ شرمندگی سے بس اتنا ہی کہہ سکے۔

''برہان نے تو ماسٹری کر کے سارے خاندان کی ناک کٹوا دی اور اس پر مزید چار چاند لگا دیئے شاہ میر نے۔۔۔'' میر حاکم علی نے بھی آج سب کا دل جلانے کی قسم کھا رکھی تھی۔

''میری مانو چھوڑو یہ ملک وقوم کی خدمت، سیاست میں آؤ، اپنے باپ دادا سے کچھ سیکھو اور اپنی زندگی بناؤ، اس دو ٹکے کی نوکری میں رکھا کیا ہے۔'' حاکم صاحب کی اس بات پر شاہ میر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔

وہ ایک لفظ بھی منہ سے بولے بغیر غصے سے اٹھا اور لاؤنج سے نکل گیا۔

شاہ میر کی اس حرکت پر سب ہی دم بخود رہ گئے، خود میر حاکم علی بھی ضبط کے کڑے مراحل سے گزرے انہوں نے محض ملامتی نگاہوں سے میر محتشم کو گھورا۔ جو اپنے بیٹے کی اس حرکت پر ڈھیروں خفت کا شکار دکھائی دے رہے تھے۔ تاج دار بیگم بھی گھبرا کر ہال کمرے میں نکل آئیں۔

''یہ تربیت کی ہے تم نے اس کی، سمجھتا کیا ہے یہ خود کو، بلاؤ اسے، معافی مانگے بابا جان سے۔۔'' محتشم

علی اپنے بیٹے کی اس حرکت پر آگ بگولہ ہوئے، اور سارا غصہ تاج دار بیگم پر اتار دیا۔۔
"طبعیت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔۔۔" تاجدار بیگم نے پریشانی سے بہانہ گھڑا۔
"طبعیت تو اس کی میں سیٹ کرتا ہوں۔۔" میر محتشم لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔

میر خاقان نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی بڑی بھابی تاج دار بیگم کی طرف دیکھا جو ہراساں نگاہوں سے شاہ میر کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

حاکم علی بظاہر خاموش تھے لیکن ان کے چہرے پر پھیلا غیر فطری پتھریلا پن ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس وقت کس قیامت سے گزر رہے ہیں، ان کی تو آج تک کسی اولاد نے بھی ان کے سامنے سر اٹھا کر بات کرنے کی جرات نہیں کی تھی اور کہاں ان کا پوتا احتجاجاً ان کے سامنے واک آؤٹ کر گیا۔

شاہ میر تو کافی سالوں سے ان کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا، اس نے بھی تو باپ دادا کی بے پناہ مخالفت کے باوجود آرمی جوائن کر کے اپنے اوپر "باغی" ہونے کا ٹھپہ لگوالیا تھا لیکن اپنی خواہش سے دست بردار نہیں ہوا۔۔۔

"بے غیرت، گھٹیا انسان باہر نکلو۔۔۔" محتشم علی اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ "یہی سکھایا گیا ہے تمہاری ٹریننگ میں تمہیں۔۔" محتشم علی بلند آواز میں چیخے۔ سب ہی خواتین گھبرا کر ہال کمرے میں آکھڑی ہوئیں۔

درشہوار نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر خوف زدہ انداز سے یہ منظر دیکھا اور طوبیٰ کی تو باقاعدہ ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی جبکہ انابیہ کا تو رنگ ہی فق ہو گیا تھا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔۔

"اب تم اپنے بزرگوں کے ساتھ بدتمیزی کرو گے بے غیرت انسان۔۔۔" محتشم صاحب کے منہ سے بس جھاگ نکلنے کی کسر رہ گئی تھی۔

"کچھ پتا بھی تو چلے، میں نے کیا کیا ہے۔۔۔" شاہ میر باپ کی مضبوط گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی جدوجہد میں حلق پھاڑ کر چیخا۔

"بکواس بند کرو، جا کر معافی مانگو بابا جان سے۔۔۔" محتشم علی کا سفاک لہجہ طوبیٰ کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کر گیا۔

"کس چیز کی معافی۔۔۔؟" شاہ میر کی آنکھوں سے بغاوت چھلکی۔ "آخر میں نے کیا گستاخی کی ہے۔" شاہ میر نے طیش سے مغلوب آواز میں کہا۔

"بکواس کرتے ہو تم بڑوں کے سامنے، اور پھر پوچھتے ہو تم نے کیا، کیا ہے۔۔۔" محتشم علی نے غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے گھما کر ایک زوردار تھپڑ اپنے بیٹے کے منہ پر دے مارا۔ سب ہی نے سانس روک کر یہ منظر دیکھا۔ درشہوار بھاگ کر برہان کو بلا لائی جو خود بھی یہ سین دیکھ کر بوکھلا گئے تھے۔۔

"بدبخت انسان! باپ دادا کو آنکھیں دکھاتے ہو، آخر تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔" محتشم علی غضب ناک لہجے میں دھاڑے، برہان اور ارسل دونوں ان کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔۔

"بابا جان پلیز کول ڈاؤن۔۔۔" برہان نے مداخلت کی، جو اسے بھی مہنگی پڑی۔

"تم چپ رہو، تم کون سا کسی سے کم ہو، ٹکے ٹکے کی نوکریاں کر کے میر خاندان کے آباؤ اجداد کا نام

روشن کر رہے ہو۔'' انہوں نے برہان کو بھی ایک دم جھاڑ دیا
اور ان کا چہرہ متغیر ہوا۔ ارسل نے برہان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش دلا سا دیا۔
''بابا یہ اچھا نہیں کر رہے آپ۔۔۔'' شاہ میر نے انگلی اٹھا کر کہا۔ اس کے رویے میں دُور دُور تک بھی کوئی۔ لچک نہیں تھی اور یہی بات اس کے باپ کا فشار خون بلند کرنے کا سبب بن رہی تھی۔
''اب تم مجھے اچھے بُرے کی تمیز بتاؤ گے۔۔۔۔'' میر محتشم علی کی آواز ایک دبی دبی سی غراہٹ تھی۔
''شاہ میر بیٹا، جا کر اپنے داجی سے معافی مانگو۔۔۔ جاؤ میرا بیٹا۔۔۔'' تاجدار بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی۔
''جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کس چیز کی مانگوں۔۔۔؟'' شاہ میر نے ہونٹوں کو پھیلا کر استہزائیہ انداز سے پوچھا، اور محتشم علی اس باغیانہ انداز پر
ایک دفعہ پھر مشتعل ہو کر اس کو مارنے کو لپکے لیکن اس دفعہ انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔
''بس بابا جان بس۔۔۔۔'' شاہ میر نے باپ کا ہاتھ درمیان میں ہی روک لیا۔
شاہ میر کی آہنی گرفت کی مضبوطی پر محتشم تھوڑا ڈھیلے پڑے، اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ پاک آرمی کی ٹریننگ نے ان کے بیٹے کو جسمانی طور پر خاصا مضبوط بنا رکھا ہے تب ہی تو وہ اچھا خاصا تھپڑ کھا کر بھی ایک انچ اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔
''شاہ میر! اپنے باپ کا ہاتھ چھوڑ دو۔۔۔'' تاج دار بیگم خوف زدہ انداز میں بولیں تو شاہ میر نے جھٹکے سے باپ کا بازو چھوڑ دیا، وہ ہلکا سا لڑکھڑائے۔
''بھائی جان! لحاظ کا رشتہ قائم رہے تو بہتر ہو گا، جوان اولاد اور وہ بھی بیٹوں سے پنگا لینا کوئی آسان کام نہیں۔۔۔'' میر خاقان کے ہونٹوں پر ایک زہریلے تبسم نے کروٹ لی۔ انہیں پہلی دفعہ بیٹیوں کا باپ ہونے پر فخر ہوا تھا۔
''اسے کہو، ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جائے' میں ساری زندگی اس بدبخت کی شکل نہیں دیکھوں گا۔'' محتشم علی کا سارا لہو ان کے چہرے پر سمٹ آیا۔ ان کے اس اعلان پر تاجدار بیگم تڑپ کر آگے بڑھیں۔
''کیا ہو گیا ہے محتشم صاحب، بچہ ہے، میں سمجھا دوں گی۔۔۔۔'' انہوں نے بوکھلا کر اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن محتشم صاحب اس وقت اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھے۔
''یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، تمہاری بے جا شہ پر یہ سورما بن کر باپ دادا کے سامنے آ کھڑا ہوا ہے۔۔'' ان کا نفس مزید تیز ہوا۔ ''ایسا کرو تم بھی اس کے ساتھ ہی دفعان ہو جاؤ، میں نہ تمہاری اور نہ تمہاری ـــــــ بدبخت اولاد کی منحوس شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔۔''
تاج دار بیگم کی رنگت خطرناک حد تک سفید پڑ گئی۔ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت ہوئیں۔
شارقہ بیگم اور ان کی سوتن ندرت بیگم کے دلوں میں ایک ساتھ کئی پھلجڑیاں پھوٹیں۔ یہ منظر دیکھنے کی انہیں بہت سالوں سے حسرت تھی۔ جو آج جا کر پوری ہوئی تھی لیکن میر حاکم علی نے ان کو کھل کر لطف اندوز ہونے کا موقع ہی نہیں دیا۔
''تاج دار کہیں نہیں جائے گی، جس نے جانا ہے وہ جائے یہاں سے۔۔۔۔'' میر حاکم علی نے غضب ناک لہجے میں کمرے میں صور پھونکا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے ہال کمرے سے نکل گئے۔۔۔۔۔

شاہ میر نے اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر کو بڑی مشکل سے دبایا اور پاؤں پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ اپنا بیگ لیے اندر سے نکلا اور کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر میر ہاؤس سے باہر نکل گیا۔ ارسل نے بوکھلا کر اس کا تعاقب کیا۔

☆☆☆

''مجھے لگتا ہے، میر ہاؤس میں کوئی بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔۔۔''

سڑک پر جمی ہوئی برف پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے سعد نے ہادی کی معلومات میں اضافہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

وہ دونوں اس وقت سی ایم ایچ میں موجود اپنے ایک دوست کی عیادت کر کے واپس آ رہے تھے۔ مری میں برف باری کا سلسلہ تو کچھ دیر کے لیے رک چکا تھا، لیکن سردی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور سڑکوں پر پیدل چلنا بھی انتہائی مشکل تھا کیونکہ جگہ جگہ برف کے ڈھیر جمے ہوئے تھے۔

''خیر سے یہ وحی کب اتری آپ پر، کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔۔۔''

ہادی نے طنزیہ انداز سے سعد کی طرف دیکھا، جس کی خواتین کی طرح ٹوہ لینے والی عادت ہادی کو اکثر ناگوار گزرتی تھی۔

''کچھ دیر پہلے ارسل کا کزن شاہ میر اپنا بیگ لیے غصے سے نکلا تھا اور ارسل اسے روکتے ہوئے بار بار کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔'' سعد نے کچھ دیر پہلے کا دیکھا ہوا منظر بیان کیا۔

''تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ اندر کوئی جنگ پلاسی ہوئی ہوگی۔۔۔'' ہادی نے بیزاری سے سر جھٹکا۔

''بے وقوف انسان! کچھ نہ کچھ تو ہوا ہی ہوگا، جو اچھا خاصا نوجوان جس کی اسی علاقے میں پوسٹنگ ہو، وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اپنا گھر چھوڑ کر نکل آئے''

سعد نے اپنا ماہرانہ تجزیہ اس کے سامنے پیش کیا۔

اسی وقت میر ہاؤس سے ایک لینڈ کروزر نکلی، ڈرائیونگ سیٹ پر میر خاقان علی کے ساتھ میر حاکم علی کو دیکھ کر ہادی نے برا سا منہ بنایا۔ وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ میر خاقان گاڑی میزائل کی طرح اڑاتے ہوئے لے کر جا رہے تھے۔۔۔۔

''یار کیا فٹ قسم کی لینڈ کروزر ہے، میرا تو دل آ گیا ہے اس پر۔۔۔'' سعد نے گاڑی کی طرف دیکھ کر تبصرہ کیا۔

''دھیان سے۔ اس کے ٹائروں کے نیچے آ کر کچلا گیا تو اس موسم میں قبر کھودنا بھی مشکل ہو جائے گی۔''

ہادی نے ہنس کر کہا۔

''ویسے ایک بات ہے کہ میر حاکم علی کی پرسنالٹی ہے۔۔۔'' سعد نے کہا ہادی نے برا سا منہ بنایا۔

''ان کو دیکھ کر پتا ہے پہلا خیال کیا آتا ہے میرے ذہن میں۔۔۔۔'' ہادی چلتے چلتے رکا۔

''کیا۔۔۔؟؟؟'' سعد نے بے تابی سے پوچھا۔

''یہ کہ شیطان کی مجسم شکل سو فیصد یہی ہونی چاہیے۔۔۔'' ہادی جل کر بولا اور اس کی اس بات پر سعد نے حلق پھاڑ قہقہہ لگایا۔

''لو ایک اور فلمی سین دیکھ لو، ان محترمہ کو اس موسم میں بھی سکون نہیں۔۔۔'' ہادی کی نظر میر ہاؤس کے گیٹ پر پڑی۔۔

"یہ تو رو رہی ہے۔۔۔" سعد بے چین ہوا، ہادی نے بھی غور سے دیکھا، وہ اپنے بازو کی پشت سے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بے دردی سے صاف کر رہی تھی اور پھر وہ ان کی مخالف سمت میں چلنا شروع ہوگئی تھی اس لیے سعد اور ہادی کو اب اس کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی، وہ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔

"پاگل ہوگئی ہو درشہوار، اس وقت جاؤ گی میس، گولی مار دے گا میرو تمہیں۔۔" ارسل اس کے ساتھ چلتے چلتے مسلسل اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے تو شاید نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہی ہو درشہوار۔۔۔" ارسل نے غصے سے اس کا بازو پکڑ کر روکا۔ وہ دونوں اب عین ہادی کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے بحث کر رہے تھے اور سعد اور ہادی کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے اور وہ ان کی موجودگی سے ابھی تک بے خبر تھے۔۔۔

"مجھے بس بات کرنی ہے میرو بھیا سے، ان کو واپس لانا ہے۔۔۔" وہ بات کرتے کرتے ایک دفعہ پھر رو پڑی۔

"میں فون پر بات کروا دیتا ہوں تمہاری۔۔۔" ارسل نے نرم لہجے میں ایک نئی تجویز دی۔

"نہیں، میں خود جاؤں گی۔۔۔" وہ بھی اپنی ضد پر اڑی تھی۔

"دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا، وہاں جا کر نیا تماشا کری ایٹ کرو گی۔۔۔ چلو واپس۔۔۔" ارسل نے اس دفعہ قدرے سختی سے کہا اور درشہوار کا بازو پکڑ کر اسے زبردستی واپس گھر کی طرف لانے کے لیے مڑا تو ان دونوں کو سامنے دیکھ کر بے حد خجالت کا شکار ہوا۔

درشہوار کا چہرہ آنسوؤں کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی ذہنی خلفشار کا شکار لگ رہی تھی۔

"از ایوری تھنگ او کے۔۔۔؟" سعد نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

ہادی کی نظریں پہلی دفعہ شعوری طور پر درشہوار کی طرف اٹھیں، وہ اس وقت اپنا نچلا لب بے دردی سے کاٹ رہی تھی اور اس کا سارا وجود ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بڑے صدمے سے گزری ہو۔۔

"آپ لوگ اندر آجائیں پلیز۔۔۔" ہادی نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت کہا۔ درشہوار نے آنسوؤں سے لبالب نظریں اٹھا کر ہادی کی طرف دیکھا، ان میں ہزاروں شکوے مچل رہے تھے، وہ بے اختیار نظریں چرا گیا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

"سب ٹھیک ہے ناں۔۔۔؟" سعد نے محتاط انداز میں پوچھا۔۔

"ہاں یار۔۔۔ وہ بس۔۔۔" ارسل نے اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے بمشکل اتنا ہی کہا۔۔۔

"اٹس او کے، چلو ہماری طرف، ایک کپ کافی کا ہو جائے۔۔۔" سعد نے موضوع بدل کر اس کی مشکل آسان کی تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔۔

"نہیں یار، پھر سہی، ابھی گھر جانا ہے مجھے۔۔۔" وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔

"او کے۔۔!" سعد نے تھوڑا سا ہٹ کر اسے جانے کا راستہ دیا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا اور سعد اور ہادی اپنے

گھر کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئے۔۔۔ مری کے موسم نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے روئی کے گالوں جیسی برف ایک دفعہ پھر زمین پر سفید رنگ کی چادر بچھانے لگی۔

☆☆☆

ایک بے نام سا اضطراب رومیصہ کے پورے وجود میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔

اسے ٹینا ہاؤس میں واپس آئے ہوئے پورے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور ابھی تک ارسل نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، وہ اسے اپنے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر دے کر آئی تھی اور اس تمام عرصے میں اس کا سیل فون کہیں کھو گیا تھا اور وہ ابھی تک نیا نمبر اور فون خرید نہیں سکی تھی۔

اس نے کچھ سوچ کر ٹینا بیگم کا نمبر ملایا، جو تیسری ہی بیل پر اٹھا لیا گیا تھا۔ ''ہاں رومی، بولو۔۔'' ٹینا بیگم کو اندازہ تھا کہ اس نمبر سے اس وقت رومیصہ ہی انہیں کال کر سکتی ہے۔

''مام پلیز، آپ نے میرا نیا سیل فون اور سم کارڈ لیا۔۔۔'' اس کی بے چینی پر وہ مسکرائیں۔

''ہاں ڈارلنگ۔۔۔۔ میری گاڑی میں رکھا ہے۔۔۔''

''تو کب آئیں گی آپ واپس۔۔؟''

''بس راستے میں ہوں۔ تم نے کھانا کھایا۔۔۔''

''جی۔۔۔'' اس نے بیزاری سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

رومیصہ نے کچھ سوچ کر ارسل کا نمبر ڈائل کیا جو اسے ازبر تھا۔ اس کی کال پہلی ہی بیل پر کاٹ دی گئی، رومیصہ کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ اس نے کچھ سوچ کر دوبارہ اس کا نمبر ملایا جو اس دفعہ اٹینڈ کر لیا گیا تھا۔

''ارسل کہاں ہو، رومیصہ بات کر رہی ہوں۔۔۔'' وہ بے تابی سے گویا ہوئی۔

''آئی ایم سوری یار، میں اس وقت ایک اہم مسئلے میں الجھا ہوا ہوں، رات کو اسی نمبر پر کال بیک کروں گا۔۔''

ارسل نے مزید اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر کال کاٹ دی، جس سے اسے ایک دفعہ پھر دھچکا سا لگا تھا۔۔۔

اس نے بیزاری سے کارڈلیس فون کاؤچ پر پھینکا اور لاؤنج میں ٹہلنے لگی، ٹھیک پانچ منٹ کے بعد لاؤنج کا دروازہ کھلا اور شہزاد کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ بلیک جینز پر وہ سرخ کلر کا بڑا اسمارٹ سا سویٹر پہنے ہوئے خاصی اسٹائلش لگ رہی تھی۔

''ہائے رومی، ہاؤ آر یو۔۔۔۔'' شہزاد نے آگے بڑھ کر بے ساختہ اس کے گالوں پر پیار کیا۔

''فائن۔۔۔'' رومی کا دل اس وقت افسردگی کے گہرے اثرات کے زیر اثر تھا لیکن پھر بھی وہ زبردستی مسکرا دی۔ اچانک اس کی نظر شہزاد کے پیچھے کھڑے ایک ہینڈسم سے نوجوان پر پڑی، جو پولیس یونیفارم

میں تھا۔
"ارتضی! یہ ہے میری کیوٹ سی سسٹر رومیصہ۔۔۔" شہزاد نے تعارف کی رسم نبھاتے ہوئے اس شخص کو مخاطب کیا۔
"ہائے رومیصہ، کیسی ہیں آپ۔۔۔" ارتضی حیدر نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ رومی نے ہلکا سا ہاتھ چھو کر سوالیہ نگاہوں سے شیری کی طرف دیکھا۔ ارتضی حیدر کے ساتھ یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔
"یہ ارتضی حیدر ہیں، میرے بہت اچھے دوست۔۔۔" شہزاد نے مسکرا کر اس کے ان کہے سوال کا جواب دیا۔ "تمہارا رو حیل والا کیس یہی فالو کر رہے ہیں، یہ تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔"
"کیسے سوال۔۔؟" رومیصہ تھوڑی سی خوف زدہ ہوئی تو دونوں نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔
"ارے آپ کیوں ڈرا رہی ہیں انہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا۔۔۔۔" ارتضی نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔۔
"رومی، میری بہن ہے، ڈرتی نہیں بلکہ لوگوں کو ڈراتی ہے۔۔" شہزاد نے مسکرا کر اسکی طرف دیکھا اور بولی۔۔ "رومی! تم ارتضی کو کمپنی دو۔ میں اپنے ایک دو ڈاکومنٹس لے کر آتی ہوں ابھی۔"
شہزاد دانستہ اسے ارتضی کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی، وہ چاہتی تھی کہ ارتضی اس سے بے تکلف انداز میں ساری باتیں پوچھ سکے جو اس کے کیس میں آئندہ اس کے کام آ سکتی تھیں۔
اپنے کمرے میں آ کر وہ بڑے سکون سے فریش ہوئی، بالوں میں برش کر کے اس نے ایک دو ڈاکومنٹس اپنے لیپ ٹاپ سے یو ایس بی میں کاپی کیے اور تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد وہ لاؤنج میں آئی تو ارتضی اکیلا بیٹھا ہوا پرسکون انداز میں چائے پی رہا تھا۔
"ارے، رومی کہاں گئی۔۔۔؟" وہ حیران ہوئی۔
"اس کی کوئی کال آ گئی تھی، ابھی گئی ہے یہاں سے۔۔۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔
"کال۔۔۔؟ کہاں پر۔۔۔؟ اس کے پاس تو ابھی سیل فون ہی نہیں۔۔۔۔" وہ چونکی تو ارتضی بھی تھوڑا سنبھل کر بیٹھ گیا۔
"پی ٹی سی ایل پر۔۔۔"
"اوہ اچھا۔۔۔ یہ بتائیں کہ کیا نتیجہ نکلا ساری گفت و شنید کا۔۔؟" شہزاد نے سنجیدگی سے پوچھا۔۔
"آپ کو شاید اچھا نہ لگے۔۔۔۔" وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔
"مطلب۔۔۔؟" وہ الجھ گئی۔۔۔
"رومیصہ بہت سی باتوں میں جھوٹ بول رہی ہے۔۔۔" ارتضی کی بات پر شہزاد کو شاک لگا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔
"ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس اغوا کے کیس میں کسی کو دانستہ طور پر بچانا چاہتی ہے۔۔۔" ارتضی کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے شہزاد پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ اور اسے لگا جیسے کسی نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قرۃ العین سکندر

محبتوں کے آسیب

رات کا پچھلا پہر تھا۔ یخ بستہ ٹھنڈی ہواؤں کی سرد سرگوشیاں شرر شرر کانوں میں کوئی ایسے راگ الاپ تھیں۔ جیسے کسی کی صدا کی بازگشت ہو۔ انمول نے نہاں خانوں میں مچلتی بے چینی کو سوا نیزے پر پایا تو ہراساں ہو کر اچانک کھڑکی کے پاس آ گئی۔

لگتا تھا جیسے اس تنہائی میں رات کی تاریکی میں ہوا کے دوش پر جھکورے کہتی کوئی صدا اٹھی ہو، اس کو پکارا ہو۔

"انمول۔ انمول!"

جوں ہی اس نے کھڑکی کھولی، یک بارگی برف بار ہواؤں نے اس کے رخساروں کو بوسہ دیا۔ برف بار ہوا بھی اس کے اندر چمکتی سسکتی ہوئی اس آگ کو



ٹھنڈا کرنے سے قاصر تھی، کہر میں لپٹی یہ اداس راتیں تو اس آگ کو جیسے اور بھڑکا دیتی تھیں۔ ان ہی راتوں میں اس نے پہلی مرتبہ موسیٰ کو دیکھا تھا۔

موسیٰ کا تصور آتے ہی دل میں اک میٹھی سی کسک اٹھی تھی جو بعد ازاں ٹیس بن گئی تھی۔

میں اپنے بستر پر نیم دراز
خنک آتی ہواؤں سے
پوچھتی ہوں
وہ کیسا ہوگا
تخیل پرواز مجھے اڑائے لے جاتی ہے
کشاں کشاں
ان ہی درو بام کی جانب
کیوں ویران ہے یہ دل کی چوکھٹ
کسی لبیک کی صدا گونجتی ہی نہیں
کسی زخمی پرندے کی سسکتی ہوئی آخری پکار ہو
جیسے

دو گرم سیال آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر رخساروں پر ڈھلک سے گئے تھے۔ سوچ پر لگائے کشاں کشاں اسے ماضی کی پگڈنڈیوں پر لے جانے لگی تھی۔

☆☆☆

عالم حیات وضع دار اور اصول پسند انسان تھے۔ انہوں نے بیٹوں اور بیٹیوں کے زندگی گزارنے کے الگ الگ معیار کے پیمانے مقرر کر رکھے تھے۔ شملہ اونچا تھا۔ دوسروں کی نظریات کی عینک لگا کر جیتے رہے۔ والدہ حیات نہ تھیں ایک بڑی آپا کلثوم تھیں جنہوں نے ساری زندگی بھائی کو اپنے اشاروں پر چلایا تھا اور یہی سبق پڑھایا تھا کہ بیوی کو سر پر نہیں بٹھایا جاتا بلکہ بیوی تو پاؤں کی جوتی ہوتی ہے جب چاہو پہن لو اور جب چاہو اتار کر دوسری پہن لو۔

نامعلوم اس معاملے میں وہ کیوں مار کھا گئی تھیں کہ بھابھی کو ہر طرح کی تکلیف اور اذیت سے دوچار کرنے کے باوجود سوکن کا دکھ نہ دے پائی تھیں اور اپنے بھائی کو عقد ثانی پر کسی طور آمادہ نہ کر سکی تھیں۔ یہ بھی ایک معمہ ہی رہا۔ بیوہ بہن یہیں بھائی کے گھر رہائش پذیر تھیں۔ اگرچہ ٹوہ لینے کی عادت سے مجبور ہو کر بہنوں اور چھوٹے بھائی کے گھر کے بھی چکر لگاتی رہتی تھیں۔

ہر طرف لگائی بجھائی اور مصیبت تباہی لانے کی منطق پر مکمل پیرا تھیں۔ کئی بار کے آزمودہ حربے آزماتیں اور سرشاری کی کیفیت سے دوچار فاتح عالم بن کر لوٹ آتی تھیں۔

عالم حیات کے فیصلوں کی ڈور کلثوم کے ہاتھ میں تھی۔ جدھر چاہتیں موڑ دیتی تھیں۔ عالم حیات بھی وہیں مڑ جاتے تھے۔

زہرہ بیگم کے تین لعل تین بیٹے تھے۔ عامر، حاشر اور ذاکر، مگر کیے بعد دیگرے آغاز میں تین بیٹیوں کی پیدائش ان کے گلے کا طوق بن چکی تھی۔ پھر وہ دوبارہ سر اٹھا کر نہ دیکھ سکی تھیں۔ اگر کبھی تین بیٹوں اور سپوتوں کے زعم میں سر اٹھانا بھی چاہا تو ان کی گردن جھٹک دی گئی۔

اسی صف میں ردا اور صبا تھیں اور آخر میں سب سے چھوٹی انمول تھی۔ اگرچہ حیات عالم بیٹیوں کو پاؤں کی زنجیر تصور کیا کرتے تھے۔ نند اور بھابھی کی روایتی چپقلش میں بیٹیوں کی کوئی وقعت نہ رہی تھی،

کلثوم آپا کی تعصب کی نظریات کی عینک لگا کر عالم حیات بیٹیوں کو پاؤں کی جوتی تصور کیا کرتے تھے۔ کلثوم آپا کسی طور خوش ہونے والوں میں سے تھیں ہی نہیں۔ بہنیں شروع سے ہی اپنے بھائیوں کے مقام کے فرق سے بخوبی واقف تھیں، مگر انمول چھوٹی تھی۔ جب پٹی بھر کر آموں کی لائی جاتی اور دان کے طور پر چند بچی بچی گٹھلیاں آتی تھیں۔ باقی بہنیں راضی خوشی کھا لیتی تھیں، مگر انمول ناک بھوں چڑھاتی تھی۔

''میں نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی یہ خیرات مجھے

گوارا ہے۔'' انمول کا منہ بن جاتا تھا۔
روتی بسورتی صورت دیکھ کر اماں اسے چپکے سے کچن کا اشارہ کرتی تھیں اور چھپا کر رکھا ہوا پورا آم اس کو دے دیتی تھیں اور وہ بھی چپکے سے کھا لیتی تھی اور امی اس کی محبت میں وارے صدقے جاتی تھیں۔ عامر بڑے تھے اور ہو بہو ابا کی روش پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ ذرا جو کوئی بہن کھلکھلا کر ہنس لیتی تو وہیں اسے جڑ دیتے تھے۔ پھوپھو کلثوم کا سمجھایا تھا کہ بھائی چھوٹے ہوں تو بھی وہی بڑے اور مختار کل ہوا کرتے ہیں اور بہنوں کے ہر طرح کے اچھے برے فیصلوں کے مجاز ہوا کرتے ہیں۔
ابا اپنے ہونہار سپوت کے تیور دیکھ کر دل ہی دل میں کھل اٹھتے تھے، مگر سرد مہری کی چادر اوڑھے رکھتے تھے کہ ان کی بے تحاشا خوشی ہی ان کے چہرے پر ہلکی سی نرمی لا پاتی تھی۔
ابا کی سرد مہری کے باوجود گھر میں واحد انمول ہی تھی جو شوخی اور طراری سے ادھر سے ادھر تتلی کی مانند اڑتی پھرتی تھی۔ ابا کے سامنے وہ بھی چپ کی مہر لبوں پر ثبت لیے سر جھکائے پھرتی تھی۔ گھر میں وہی دن خوشیوں سے پر ہوا کرتے تھے جب پھوپھو چھوٹے چاچو کی طرف جاتی تھیں۔ نامعلوم وہاں کیا حالات رونما ہوتے تھے، مگر یہاں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔
☆☆☆
آج کل بھی پھوپھو، چاچو کی طرف تھیں۔ گھر بھر میں جیسے خوشیوں نے ڈیرہ جمایا ہو، مگر پھوپھو کی واپسی کسی دھماکے —— سے کم نہ تھی۔ وہ صبا کے لیے اپنی نند کے بیٹے کا رشتہ لائی تھیں، چونکہ یہ رشتہ پھوپھو کا منتخب کردہ رشتہ تھا تو انکار کوئی جواز ہی نہ تھا۔ اس دھماکا خیز خبر نے گھر کی خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا کیا تھا۔ اماں نے مبہم انداز میں تحقیق کروانے کو کہا تو ابا نے انہیں کم عقل گردانتے ہوئے ایسے طعنے دیے کہ وہ کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئیں۔
''کم عقل! میری بہن کی سسرال کی تعریفوں کے ڈنکے ہر سو بجتے ہیں۔ آخر میری بہن کا سسرال ہے، تم اپنی ناقص عقل اپنے پاس ہی رکھو۔''
یوں صبا کی شادی کی تیاریاں —— عروج پہ تھیں۔ صبا گم صم سی کیفیت سے دوچار تھی۔ شادی میں سب اہل خانہ خوش باش تھے سوائے خود صبا اور زہرہ بیگم کے۔ ایک خوف سا حائل تھا دل کی خوشی میں نامعلوم، کیسے لوگ ہوں گے، یہ بھی کسی بدلے کی پاداش میں تجویز کردہ سزا تو نہیں۔ کوئی سازش تو نہیں کلثوم آپا؟
لاتعداد سوالات، اور خوف و ہراس تھا دل کے نہاں خانوں پر دستک دیتا ہوا۔ جس گھر میں ہنسی کی جلترنگ بھی گناہ کے مترادف تھی۔ آج ڈھولک رکھی گئی تو سب سے چھپ کر راگ الاپنے والی بہنوں کو بھی علی الاعلان ڈھولک کی لے پر سر بکھیرنے کا موقع مل گیا۔
سبز اور پیلے کامدانی کپڑوں میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ وہ پوری ترنگ میں تھی جب لڑکے والوں کے مہندی لے کر آنے کا شور اٹھا تھا۔ پھر لڑکے والوں اور لڑکی والوں میں گیت سنگیت کی مقابلہ بازی شروع ہوئی۔ نامعلوم کیوں انمول کو یوں لگا کہ وہ کسی کی نظروں کی حصار میں ہے۔ اس نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا، مگر اس غالب احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ خاموشی سے ڈھولک ردا کو تھما کر رفو چکر ہو گئی تھی۔
وہ لان کے عقبی جانب آ گئی تھی۔ کرسی پر بیٹھی کچھ ملول سی تھی۔ بہنیں کس قدر جلد پرائی ہو جاتی ہیں تب ہی آہٹ پر چونک کر اس نے دیکھا۔ گہری ڈارک براؤن آنکھوں میں جگنوؤں کے دیپ جلتے ہوئے لو دیتے ہوئے، محبت کا کوئی انوکھا اعتراف کر رہے تھے۔ وہ سٹپٹا سی گئی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ اٹھ کھڑی ہوتی۔ مقابل عین سامنے آ گیا تھا۔
''سنیں، آپ واقعی اس کس قدر حسین ہیں یا

مجھے ہی اتنی حسین دکھائی دے رہی ہیں۔"

وہ سخت متعجب ہوئی تھی تب ہی ردا کی آمد پر وہ پلٹ گیا تھا۔

"موسیٰ نام ہے میرا اور آپ کا؟" وہ جیسے اس کے پلٹ جانے کی ہی جیسے منتظر تھی جھٹ تیزی سے بھاگی تھی۔

گہری ڈارک براؤن آنکھیں، گندمی رنگت، اونچا قد، دل نشیں خدوخال کا مالک موسیٰ بے حد وجیہہ وخوب صورت تھا۔ یہ اس کی موسیٰ سے پہلی ملاقات تھی۔ مہندی کی پوری تقریب میں وہ موسیٰ کی نظروں کی تپش سے گھبرائی اور شرمائی رہی۔ وہ ایک لڑکی تھی اور صنف نازک کو رب العزت نے یہ خوبی ودیعت کی ہے کہ وہ نظروں کا بھید بھاؤ خوب جانتی اور پہچانتی تھی۔

سیاہ ستاروں کی جھلمل کرتی فراک میں اس کا دمکتا روپ کھِل سا گیا تھا۔ موسیٰ کی گہری ڈارک براؤن کے حصار میں رہنا نا معلوم کیوں اسے خوش گمانی میں مبتلا کرنے لگا تھا۔

کوئی تو ایسا ہے جو صرف اس کا خواستگار ہے۔ اس کی چاہت کا متمنی ہے۔ اس کے روپ کو سراہتا ہے۔ اب اس کی آنکھیں بھی ان دیکھے خوابوں کی تعبیر کی خواہاں تھیں۔

اگلے دن رخصتی کے دن سیاہ کامدار سوٹ پر سفید ستاروں والی کہکشاں نے اس کے چہرے پر بھی دھنک رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔ موسیٰ بے حد جذب کی کیفیت سے دوچار انمول کے حسن جاوداں میں کھوسا گیا تھا۔ سارے چہرے فقط اس ایک چہرے کی رعنائی کے سامنے کس قدر پھیکے اور دھندلا سے گئے تھے۔ موسیٰ، پرویز بھائی کا دور کا عزیز تھا، مگر پرویز بھائی کا گہرا دوست تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹ، کئی تصاویر وہ لمحہ بھر میں انمول کی لے چکا تھا۔ ہنستے ہوئے، کھلکھلاتے ہوئے افسردگی و حزن سمیٹے چہرے پر وہ انمول تھی۔ وہ حقیقتاً موسیٰ کے لیے بے حد انمول تھی۔ رخصتی کے وقت انمول سسک سسک کے روئی تھی۔ بہن کی جدائی کا غم اسے ستا رہا تھا۔ موسیٰ اس کے کان کے پاس آکر ہولے سے بولا۔

"مانا کہ روتے ہوئے بہت حسین لگتی ہیں، مگر اب بس بھی کر دیں۔ دل کو گراں گزر رہا ہے آپ کا رونا۔"

وہ ہڑبڑا کر رونا دھونا سب بھول بھال گئی تھی۔ پھر صبا امی اور ابا کی دعاؤں کے حصار میں رخصت ہو کر روتی ہوئی پیا کے گھر سدھار گئی تھی۔

الوداعی منظر میں موسیٰ کی آنکھوں کا ارتکاز آخری لمحے تک انمول کو حصار میں لیے رہا۔

☆☆☆

سب ہی اداس اہل خانہ کل دعوت ولیمہ کے خیال سے نئے عزم کے ساتھ محوِ خواب ہو چکے تھے۔ محض انمول کی آنکھوں سے نیند روٹھ سی گئی تھی۔ اس نے کسل مندی سے کروٹ لی تھی اور آنکھیں موندی تھیں۔

دو گہری ڈارک براؤن آنکھیں اس کو مسکراتے ہوئے تک رہی تھیں۔ انمول نے گھبرا کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ محبت یوں ہی بسا اوقات اپنا وار چلاتی ہے کہ کوئی جائے پناہ نہیں ملتی وہ۔ ساری رات کشمکش کا شکار رہی پھر خود کو اسیر محبت ہونے سے روکتے روکتے تھک ہار سی گئی اور دل کو انکار کرتے کرتے نڈھال سی ہوئی اور پھر اس نے رات کے پچھلے پہر خاموشی سے موسیٰ کی محبت پر لبیک کہہ دیا تھا۔

محبت نے انمول کو لاچار بنا ڈالا تھا اور موسیٰ کے اظہار محبت پر اس نے اقرار کی مہر ثبت کر ڈالی تھی۔ شرمائی گھبرائی وہ کس قدر حسین لگ رہی تھی۔

"کل میں واپس جا رہا ہوں۔ جاتے ہی اماں کو بتاؤں گا کہ میں نے اس کے لیے ایک حسین سی بہو تلاش کر لی ہے۔"

محبت انسان کو نڈر بنا دیتی ہے۔ وہ سب کو مصروف دیکھ کر موسیٰ کے ساتھ شادی ہے۔ ہال کے دروازے سے دوسرے حصے میں آ گئی تھی جہاں کسی

اور ہی شادی کا فنکشن چل رہا تھا۔ جدائی کے احساس نے انمول کو بے حد آزردہ کر دیا تھا۔

موسیٰ بنا کہے اس کے چہرے پر بکھرے حزن کے رنگ پہچان گیا تھا اور درحقیقت محبت کا ہی اعجاز تھا کہ محبت بنا کہے بنا بولے ہی محبوب کے ہر احساس سے آشنا کر دیا کرتی ہے۔

''دیکھو پلیز......اداس مت ہو۔ انمول محبت اتنی کمزور تو نہیں ہوتی۔ میں جلد آؤں گا کوئی جھوٹی تسلی اور دلاسہ نہیں بلکہ یہی سچ ہے۔ یہ میرا کانٹیکٹ نمبر ہے۔ تم جب چاہو مجھے پکار لینا۔''

موسیٰ کی مخمور آواز جذبات کی شدت سے بھاری ہو رہی تھی۔ وہ اسے بہلانے کے جتن کر رہا تھا اور وہ دل گرفتہ سی نم آنکھیں لیے بیٹھی تھی۔

موسیٰ نے بڑھ کر اس کی نم آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں آس کے دیپ تھے جنہیں انمول نے بڑھ کر تھام لیا تھا۔ پھر موسیٰ انمول کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

موسیٰ اپنے وعدوں کی پاس داری میں سچا تھا۔

اسی آس و نراس کے عجیب مخمصے میں الجھی انمول اپنی محبت کا تاج محل سجاتی سنوارتی رہتی تھی۔ تب ہی صبا شادی کے بعد پہلی مرتبہ گھر آئی تھی۔ گھر بھر میں چہل پہل تھی۔ صبا کی شرمگیں مسکراہٹ بات بے بات مسکراتے لب اور کسی بات پر اچانک چونک جانا اس کے چہرے پر ______ انوکھے رد پہلے رنگ بکھرے تھے۔

انمول بھی تو ست رنگی پھوار میں بھیگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں گہری سوچ میں ڈوبی چہرے پر دل نشیں مسکان سجائے موسیٰ کے خیالات میں گم تھی جب صبا آ گئی۔ صبا کی کھوجتی نظروں میں اسرار تھا۔ تذبذب کی کیفیت تھی۔ یوں جیسے الفاظ تراش رہی ہو۔ مدعا بیان کرنے سے قبل لفظوں کو سنوار رہی ہو۔

''کیا سوچ رہی ہو انمول جو اس قدر حسین رنگ تمہارے چہرے پر بکھر گئے ہیں۔'' انمول بری طرح چونک گئی تھی۔ یوں جیسے اس کی محبت کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''نہیں تو، مجھے بھلا کیا سوچنا ہے؟'' انمول نے جھٹ انکار کر دیا۔

''اچھا باہر پرویز کے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔ پوچھو گی نہیں کون ہے وہ۔'' صبا کے انداز پر انمول کا دل دھڑک اٹھا۔

''کون؟'' انمول کو اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

''وہی جس کو تم نے سہانے سپنے دکھائے ہیں۔ آس دلائی ہے تم لڑکیاں چار لفظ کیا پڑھ لیتی ہو۔ خود کو عقل کل سمجھنے لگتی ہو۔ جانتی ہو ناں ابا ذات سے باہر شادی بیاہ کرنے کے قائل نہیں ہیں اور پھر بھی تم محبت کا سودا کر بیٹھیں۔'' صبا نے بھی دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس وقت تمام اہل خانہ پرویز اور موسیٰ کی آؤ بھگت میں لگے تھے۔

''آپا! کیا آپ کو وہ سچا نہیں لگتا؟ کیا یہی دلیل کافی نہیں ہے اس کی محبت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ آپا! میری آنکھوں سے رو پہلی کرنوں والے خواب مت چھینو۔ ابھی تو ان آنکھوں نے محبت کے تاج محل میں رنگ بھرنے شروع کیے ہیں۔ ابھی سے ان رنگوں کو مت چھینو۔'' انمول سسک اٹھی تھی۔

''بہت بچکانہ رویہ ہے تمہارا۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت چھپ نہیں سکتی اور میں تمہاری خیر خواہ ہوں، دشمن ہوتی تو ابا کو بتا چکی ہوتی۔'' صبا نے اس کے لرزتے وجود کو تھاما تھا۔

اس کی لہو رنگ آنکھیں اس کی چاہت کی شدت کی غماز تھیں۔ صبا نے تاسف سے بہن کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔ سچ ہے کہ محبت پر کوئی زور نہیں چلتا ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن انمول کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں صرف بابا جان ہی حائل نہ تھے بلکہ پھوپھو کا بھی مسئلہ تھا اور پھر اس کے بعد عامر کا محاذ بھی — باقی تھا۔ وہ کہاں کہاں انمول کے اس محاذ میں اس کے ساتھ صف آرا ہوتی؟ صبا نے اس کا

ہاتھ محبت سے تھاما۔

"اٹھو کھانا کھالو۔" بہن کی بات پر وہ بھی اثبات میں سرہلاتی باہر کی جانب آئی تھی۔

"آجاؤ۔ وہ فقط اتنی دور سے تمہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے آیا بیٹھا ہے پھر واپس بھی جانا ہے۔"

صبا کی بات پر وہ دل کو سنبھالتی لاؤنج سے گزری تھی۔ کوئی آپ کی ایک جھلک پانے کے لیے اتنا بے قرار ہو تو دل ازخود تفاخر کے احساس سے بھر جاتا ہے، مگر یہاں تو معاملہ دوطرفہ تھا۔ دونوں فریقین محبت کی پیاس میں دیدار کی آس لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ جانے کب کا آیا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کا بجھا ہوا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ موسیٰ کی نگاہوں میں مدھم امید کے جگنو جل اٹھے تھے۔ یک بارگی تمناؤں نے کروٹ لی تھی اور محبت نے انمول کے چہرے پر دھنک رنگ بکھیر دیے تھے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں جگنوؤں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

"اچھا آنٹی اب میں چلتا ہوں۔" پرویز نے موسیٰ کو اشارہ کیا تھا۔ جس کی نگاہیں انمول کے مبہوت کردینے والے حسن سے خیرہ ہورہی تھیں۔

موسیٰ، فاخرہ اور اشعر کا اکلوتا بیٹا تھا اور انہیں موسیٰ سے بے حد توقعات وابستہ تھیں۔ موسیٰ اسیر محبت ہوچکا تھا اور پھر اس نے اپنی والدہ سے انمول کی بات کی تھی۔ والدہ نے بہ خوشی اس رشتے کے لیے آمادگی ظاہر کردی تھی۔ موسیٰ نے انمول کو اس کے گھر اپنے والدین کو بھیجنے کی بابت بتادیا تھا۔ پرویز نے اس معاملے میں حیات عالم سے درخواست کی تھی کہ ایک نظر ہی سہی وہ اس رشتے پر ایک بار غور کریں گے۔ وہ اگلے دن ہی حیات عالم کے گھر میں موجود تھے۔

حیات عالم کا بنگلہ شان دار تھا۔ بے حد قیمتی فرنیچر اور بیش قیمت سجاوٹی چیزوں سے سجا یہ وسیع و عریض ڈرائنگ روم اہل خانہ کے عمدہ ذوق کی اعلیٰ ترجمانی کررہا تھا۔ وہ بے حد مرعوب ہوئے تھے۔ وہ واقعی خاندانی تھے۔ جدی پشتی رئیس تھے تب ہی حیات عالم ڈرائنگ روم میں آئے تھے۔

"خوش آمدید۔ کہیے جناب کیسے آنا ہوا؟"

حیات عالم دوٹوک بات کرنے کے قائل تھے۔ باقی سب ان کے نزدیک فضولیات اور لغو باتیں تھیں۔ خواہ ان کا ایسا رویہ دوسروں کے لیے کتنا ہی گراں ہوتا۔

"ہم آپ کی بیٹی انمول کو اپنے گھر کی بہو بنانے کی خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں۔" اشعر صاحب نے مناسب لفظوں کا چناؤ کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تھا مگر یہ سنتے ہی حیات عالم کی تیوریوں پر بل پڑگئے تھے۔

"دیکھیے، میرے داماد کے حوالے سے آپ لوگ قابل قدر ہیں، مگر ہم اول تو انمول کو ابھی بچی گردانتے ہیں دوسرے ہم برادری سے باہر شادی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم خاندانی ہیں اور رشتے ناتے کے لیے بھی خاندانی لوگوں کو ہی اولین ترجیح دیں گے۔"

حیات عالم نے بے مروتی کی انتہا کردی تھی۔ چہرے پر ناگواری سجائے بیٹھے تھے۔

فاخرہ بات کو ابھی تک سنبھالے جانے کی خواہش لیے بولی تھیں۔ "آپ لوگ خدارا برا مت مانیں۔"

"بس جی، ہمیں کوئی شادی وادی نہیں کرنی ہے اپنی بچی کی اور میں صاف بات کرنے کا قائل ہوں۔ اس کی کیا اوقات ہے، بیگم کو بھی اجازت حاصل نہیں کہ میرے معاملات میں چوں چراں کرے۔ آپ لوگوں کو رخصت کے لیے دروازہ کا راستہ میری آپا دکھا دیں گی۔ کیوں کلثوم آپا؟"

حیات عالم یہ کہہ کر دبنگ انداز میں وہاں سے چلے گئے تھے پیچھے مایوسی کی فضا چھوڑ گئے تھے۔

"اب اٹھو، باقی کیا سننا رہ گیا ہے؟" اشعر صاحب نے اپنی بیگم کی جانب دیکھ کر کہا۔

"جی سننے کی بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ آپ جیسے ٹٹ پونجیوں سے ہم بھلا کیوں رشتا جوڑنے لگے۔ اپنی بچی کے لیے میں خود ہیرا لڑکا ڈھونڈوں

گی۔'' کلثوم آپا نے مزید ٹکڑا لگایا تھا۔

''مگر شاید وہ آپ کی بیٹی کا منظور نظر نہ ہو۔'' اشعر صاحب بھی اب چپ نہ رہ سکے تھے۔

''کیا مطلب ہے آپ کی بات کا؟'' کلثوم بیگم کے تو کان کھڑے ہو گئے تھے۔ یعنی یہ رشتہ ان کی بھتیجی کی منشا سے آیا تھا۔ بات بہت بڑی تھی جس سے وہ اپنی بھاوج کا جینا بھی دوبھر کر سکتی تھیں۔

''یہی کہ خاندانی کہلانا آسان ہے، اپنی بیٹی کو تو قابو میں کریں پہلے۔'' اشعر صاحب کا لہجہ زہر خند تھا۔

پردے کی اوٹ سے دیکھتی انمول دھڑام سے فرش بوس ہو گئی تھی۔ اس کے ارمانوں کا تاج محل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا اور مسمار ہو جانے کے بعد کرچیاں دل میں پیوست ہو چکی تھیں۔ صاف انکار کے بعد محبت کی داستان بھی جیسے ختم ہو چکی تھی، مگر نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے انمول کو طعنہ ملنے لگا تھا۔ موسیٰ کے نام کا طعنہ، ہر لحظہ اس پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔

پھر عامر نے خاندانی ہونے کا اچھا ثبوت دیا تھا۔ پڑوس کی لڑکی سے خفیہ نکاح رچا کر خاموشی سے بیوی کو پکڑ کر گھر لے آیا تھا۔ ابا تھرا رہے تھے۔ غصیلے انداز میں گرج رہے تھے۔

''تمہاری اتنی جرأت کیسے ہوئی۔ کم عقل'' ناہنجار۔

''ابا جان خاندان کے چکر میں مجھے کوئی لڑکی اپنی ہم پلہ نہ ملتی تو میں کیا کنوارا رہتا؟ جانے دیں ابا جان یہ خاندان کے ڈھکوسلے تو آپ فقط اپنی بیٹیوں کے لیے بچا رکھیں۔'' عامر نے بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدتمیزی سے کہا اور اپنی بیوی کو کمرے میں لے گیا اور باپ کا دل ڈوب گیا تھا۔

عامر کی بیوی کے آتے ہی گھر بھر پر اس کا تسلط ہو گیا تھا۔ کلثوم آپا کو اپنی کی اصل اوقات کا تو اب احساس ہوا تھا۔ جب ہر بات پر وہ کلثوم آپا کو طعنوں بھرے جملوں سے نوازتی تھی۔ کلثوم آپا اگر شکایتی انداز میں بھائی سے کہتیں تو بھی حیات عالم خاموش رہتے تھے۔ شاید وہ خود اپنے بیٹے کی اس حرکت پر خود سے جنگ لڑ رہے تھے یہ وہ بیٹا تھا جس کو فوقیت دے کر انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھیڑ بکری کی طرح سمجھ رکھا تھا، مگر اسی بیٹے نے آج اپنی بیوی کے ہاتھوں ان سب کی عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی تھی۔

''میں آج کھانے میں بریانی کھاؤں گی۔'' مصباح حکمیہ انداز میں کلثوم آپا سے بولی تھی۔

''ارے تو اپنی ساس کو کہو۔ میرے منہ نہ لگو۔'' کلثوم پھوپھو کے تیور بگڑ گئے تھے۔

''ان کی تو طبیعت میرے آتے ہی ناساز رہنے لگی ہے اور پھر اس دن آپ نے جو بریانی بنائی تھی مجھے تو وہی کھانی ہے۔ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو پھر بنا کر دیں۔'' مصباح کا انداز فقط ان کو نیچا دکھانا تھا۔ مغلوب کرنا تھا کیونکہ اس گھر میں واحد وہی تھیں جو اس پر بھاری پڑ سکتی تھیں۔

''لڑکی بات سنو' عقل تو ٹھکانے پر ہے۔ تم ہوتی کون ہو مجھے اس گھر سے نکالنے والی۔'' کلثوم پھوپھو کا طیش سے برا حال تھا۔

''وہ تو آج عامر ہی بتائیں گے۔ ذرا شام ہو لینے دے بڑھیا۔'' وہ بھی دوبدو بولی تھی۔

تب شام کو یہ عقدہ کھلا کہ حیات عالم کی خاموشی کا اصل سبب کیا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری جائیداد عامر کو کسی اچھے موڈ میں دان کر دی تھی۔ یہ بنگلہ بھی عامر کی ہی ملکیت تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عامر بیوی کو لایا تو وہ اسے عاق نہ کر سکے۔ آج تو وہ خود عامر کے دست نگر تھے۔ بیٹے کو مان دے کر انہوں نے خود کو ہی گرا دیا تھا۔

عامر نے دھکے دے کر پھوپھو کو نکالنا چاہا۔ تو ردا اور انمول کے ساتھ ماں اور باپ نے خاموشی سے گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔

''اب کہاں جائیں گے۔ ہم یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ کیا ضرورت تھی آپ کو ساری جائیداد اس کے نام کرنے کی۔ اس بنگلے کو تو چھوڑ دیا ہوتا اب

کہاں دردر کی ٹھوکریں کھائیں گے۔" کلثوم کی زبان کو کہاں قرار حاصل تھا۔

"چپ ہوجائیں خدا کے لیے آپا، یہ سب آپ کی لگائی ہوئی آگ ہے جس میں آج ہم سب جل رہے ہیں۔ آپ نے ہی تو سبق پڑھایا تھا کہ بیٹے کو اپنا اثاثہ سمجھو۔ اس کے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کرو۔ تو دیکھ لیں آپا' آج میں نے اس کے منہ سے نکلی ہر بات پوری کردی ہے اور خود سڑک پر آگیا ہوں۔" ایک لمبی چپ کے بعد حیات عالم سڑک کے بیچوں بیچ دو جوان بیٹیوں کو لیے کھڑے نم دیدہ بولے تھے۔

تب ہی اچانک پرویز کی نگاہ ان لوگوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ ملنے کے ارادے سے آیا تھا۔ ساتھ میں وہ دشمن جاں بھی تھا جسے بھلانے کی ہر سعی بے کار گئی تھی۔ پھر ان لوگوں کو موسیٰ نے اپنے ایک فلیٹ میں پناہ دی تھی۔ حیات عالم اس کے اتنے ملنسار رویے پر آج نادم سے تھے، مگر لب کشائی نہ کی تھی۔

کلثوم آپا نے دربدری سے بچنے پر شاید زیست میں پہلی مرتبہ رب کریم کا شکر ادا کیا تھا۔ سب کے دل اداس تھے۔ عرصہ دراز پہلے کیے گئے اپنے فیصلوں پر وہ پچھتا رہے تھے۔

"باباجان! پریشان نہ ہوں۔ ہم ہیں ناں آپ کا بازو۔" ذاکر نے انہیں تسلی دی تھی۔ وہ رو پڑے تھے۔

"باباجان! میں آپ کی طرح سخت مزاج نہ بن سکا جس کا گلہ آپ نے ہمیشہ کیا ہے، مگر امی جان کی طرح نرم دل ضرور بن گیا ہوں۔ میں نے جاب کے لیے اپلائی کیا ہے۔ میری جاب لگ گئی ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے اور رہی بات عامر کی اب اتنی آسانی سے وہ ساری جائیداد پر قابض نہیں ہوسکتا۔ میں نے کیس فائل کردیا ہے۔"

پھر ذاکر نے واقعی بیٹا بن کر دکھایا تھا اور جس دن یہ لوگ کیس جیت گئے۔ ذاکر کے گلے لگ کر بے حد روئے تھے۔ حیات عالم کا زعم کا بت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوچکا تھا۔

"اباجان آج میں آپ سے دو چیزیں مانگوں گا' اب امید ہے انکار نہیں کریں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ میری بہنوں کے مستقبل کا فیصلہ مجھے کرنے دیں۔ دوسرا ابا اب سارے معاملات میں خود دیکھوں گا آپ کے آرام کے دن ہیں۔ ہر فیصلہ آپ کا ہی ہوگا۔ صرف مشقت بھرے ہاتھ میرے ہوں گے۔"

ذاکر نے پھر ردا کی شادی ماموں کی طرف طے کردی تھی۔ جس پر ابا چاہ کر بھی نہ بول سکے تھے اور کلثوم پھوپھو خوب جلی کڑھی تھیں کہ نند کی جانب بچی جائے ان کو کب گوارا تھا اور تب تو رو ہی پڑیں جب اشعر کے گھر والے موسیٰ کے رشتے کی بابت آئے اور موسیٰ کے لیے ذاکر نے ہاں کردی تھی۔

مگر حیات عالم ٹھوکر کھا کر سنبھل چکے تھے انہوں نے بڑھ کر اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، یہ رشتہ تو خدا نے آسمانوں پر ہی طے کر رکھا تھا جسے ہونا ہی تھا۔ جن کو ملنا ہو وہ مل ہی جاتے ہیں اور واقعی جب انمول ماں باپ کی دعاؤں کے حصار میں روتی ہوئی وداع ہوکر موسیٰ کے گلشن کو مہکانے آئی تو موسیٰ کی خوشی دیدنی تھی۔ خود انمول کا دل بے قابو تھا۔ اسے ڈر تھا شاید اسے خود ہی اپنی خوشی کی شدت سے نظر نہ لگ جائے اور موسیٰ نے جب اس کا چہرہ ہاتھ سے اونچا کیا تو اس کا شرم سے برا حال تھا۔

"کتنی شدت سے اس پل کی آرزو کی تھی میں نے، یہاں اس گھر میں اکثر تم کو خیالوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ اس کمرے میں تم سے لاتعداد مرتبہ حال دل کہا ہے اور آج تم میری ہو' بالکل میری اپنی۔ آج وہ خواب ٹوٹے گا نہیں کیونکہ تم حقیقت بن کر میری زیست میں آگئی ہو۔"

موسیٰ کا لہجہ مخمور تھا۔ اس نے انمول کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ وہ نظریں جھکائے اپنے مجازی خدا کی محبت سے معمور دل لیے اپنے حقیقی خدا کی شکر گزاری میں اپنے دل کو سجدہ ریز پارہی تھی۔ محبتوں کے نصیب میں ملنا ہی ہوتا ہے اگر ان کی صداقت میں ذرہ بھر کھوٹ نہ ہو۔

☆



اس وقت جو دریا ہے

ہم تم بھی نہیں ہوں گے، یہ پل بھی نہیں ہوگا
اس وقت جو دریا ہے، کل صبح نہیں ہوگا
آنسو کی طرح لمحے، پلکوں پہ لرزتے ہیں
پھر وقت کے دریا میں اس طرح اُترتے ہیں
پہنائی صحرا میں
جس طرح کوئی ذرّہ
بے نام و نشاں ہو جائے
ہونے کا گماں ہو جائے
یہ جمتا ہوا آنسو، یہ ٹھہرا ہوا لمحہ
اک جھیل سی ہے جس میں
اک وصل رسیدہ کے کچھ پھول مہکتے ہیں،
کچھ عکس لرزتے ہیں
یہ عکس لرزنے دے، یہ پھول مہکنے دے
اس جھیل کے ساحل پہ اس چاند کو چھُپنے دے
آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہوا پرچم ہے
ساحل کے ادھر ہر سو اک ہجر کا موسم ہے
اس ہجر کے موسم میں
یہ جھیل کہیں ہوگی، یہ چاند کہیں ہوگا
اس وقت جو دریا ہے! کل صبح نہیں ہوگا!!

امجد اسلام امجد

اس کا سوچا بھی تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یک جا گزری

آ گلے تجھ کو لگا لوں مرے پیارے دشمن
اک مری بات نہیں، تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

میں تو صحرا کی تپش، تشنہ لبی بھول گیا
جو مرے ہم نفسوں پر لبِ دریا گزری

آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

میری تنہا سفری میرا مقدّر تھی فراز
ورنہ اس شہرِ تمنا سے تو دُنیا گزری

احمد فراز

عشق میں تازگی ہی رہتی ہے
وہ نظر چھیڑتی ہی رہتی ہے

جانے کیا ہو پلک جھپکنے میں
زندگی جاگتی ہی رہتی ہے

لاکھ وہ بے نیاز ہو جائیں
حسن کی دلکشی ہی رہتی ہے

جھوٹے وعدوں کی لذتیں نہ پوچھ
آنکھ در سے لگی ہی رہتی ہے

درد خود آگہی نہ ہو جب تک
کائنات اجنبی ہی رہتی ہے

کچھ نئی بات تو نہیں قابل
ہجر میں بے کلی ہی رہتی ہے

قابل اجمیری

براہ راست اثر ڈالتے ہیں پیار کے بول
کسی دلیل سے منوانے تھوڑی ہوتے ہیں

جو لوگ آتے ہیں ملنے ترے حوالے سے
نئے تو ہوتے ہیں، ان جانے تھوڑی ہوتے ہیں

اسی زمیں کے غزالوں سے ہوتے ہیں آباد
دلوں کے دشت پری خانے تھوڑی ہوتے ہیں

ہمیشہ ہاتھ میں رہتے ہیں پھول ان کے لیے
کسی کو بھیج کر منگوانے تھوڑی ہوتے ہیں

مزاج پوچھتے ہیں کس تپاک سے ہر بار
اگرچہ وہ ہمیں پہچانتے تھوڑی ہوتے ہیں

کسی غریب کو زخمی کرے کہ قتل کرے
نگاہ ناز پہ جرمانے تھوڑی ہوتے ہیں

شعور تم نے خدا جانے کیا کیا ہوگا
ذرا سی بات کے افسانے تھوڑی ہوتے ہیں

انور شعور

ادارہ

اِس ماہ کی مسکراہٹیں

دل جلا

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس دوران گارڈ ایک کمپارٹمنٹ میں آیا اور بولا۔ ''جو مسافر نصیب نگر جا رہے ہیں، انہیں نہایت افسوس سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ وہاں کا ریلوے اسٹیشن تباہ ہوگیا ہے، وہاں آگ لگ گئی ہے۔''

ایک لمحہ کو خاموشی رہی، پھر ایک مسافر دوسرے کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، جب تک ہم نصیب نگر پہنچیں گے، اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو جائے گا۔''

ٹریفک جام

کراچی کی ایک سڑک پر مسافر بس شام سے لے کر صبح تک ٹریفک جام میں پھنسی رہی۔ سورج نکلا تو ایک صاحب بس سے اترے اور تھکے تھکے انداز میں قریبی پبلک فون تک پہنچے۔ انہوں نے ایک نمبر ملایا اور بولے۔

''کون...... چوکیدار...... ہاں، میں صفدر بات کر رہا ہوں۔ صاحب آئیں تو انہیں بتا دینا کہ آج دفتر نہیں پہنچ سکوں گا کیونکہ کل رات کو میں گھر ہی نہیں پہنچ سکا تھا۔''

کمی

کرکٹ کے ایک جنونی شائق نے اپنے دوست کو بتایا۔ ''میری بیوی کہتی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ کو ترک نہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔''

''ہاں واقعی، یہ تو بہت برا ہوگا۔'' اس کے دوست نے افسوس سے کہا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو......! میں واقعی اس کی کمی شدت سے محسوس کروں گا۔'' کرکٹ کے شائق نے غم زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

موسیقی

دو دوست ایک محفل میں شریک تھے۔ ایک دوست نے دوسرے دوست کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، وہ سامنے سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے سو رہا ہے۔''

دوسرا دوست بگڑتے ہوئے بولا۔ ''یار! چھوڑو بھی، اتنی سی بات کے لیے مجھے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔''

ستم ظریفی

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سگار سلگاتے دیکھ کر ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے نرمی سے ان سے کہا۔ ''تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔''

وہ صاحب ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔

''محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی نہ کیا کریں۔''

مجبوری

پاگل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہ داری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کا چہرہ اور تاثرات دیکھ کر کانپ گئیں، کچھ آگے جا کر

انہوں نے نیچی اور خوف زدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ ”خدا کی پناہ! کیسی خوف ناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟“

”کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”آپ اسے کوٹھری میں بند نہیں رکھتے، کیا یہ آپ کے قابو میں نہیں آتی؟“

”نہیں......اسے کوٹھری میں بند نہیں کیا جا سکتا اور نہ یہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ خاتون نے جاننا چاہا۔

”کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

آپ اپنے دام میں

”بیگم! تم نے شام کا اخبار آج پڑھا؟“ شوہر نے بیوی کو مخاطب کیا۔ ”آج تک ہمارے ملک کا نظام نہ سدھر سکا۔ کچھ بھی نہ بدلا، نہ کوئی ایسی جگہ ہے، جہاں باعزت آدمی سکون سے بیٹھ سکے۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ایک محب وطن شہری ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں ملک کے قوانین درست کرنے میں معاونت کروں۔“

”پہلے آپ اپنی حالت تو درست کر لیجیے......!“ بیگم نے تنگ کر کہا۔ ”الٹا پاجامہ پہن کر صبح سے ادھر ادھر گھوم پھر رہے ہیں۔“

مثالی پروفیسر

پروفیسر صاحب دوپہر سے رات گئے تک ایک صاحب کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ آخر کار میزبان بولا۔ ”مجھے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں لگ رہا، لیکن مجھے اٹھ کر علی الصباح اسلام آباد کے لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔ آیئے میں آپ کو دروازے تک چھوڑنے چلوں۔“

”خدا کی پناہ!“ پروفیسر صاحب یک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ ”میں تو یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ تم مجھ سے ملنے میرے گھر آئے ہو۔“

سنہری موقع

ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ ”آپ فوراً ٹیکے لگوا لیں، ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے، لوگوں کو کاٹیں گے اور وہ مر جائیں گے۔“

آدمی نے کہا۔ ”برائے مہربانی مجھے ایک کاغذ اور قلم دے دیجیے۔“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ وصیت لکھنا چاہتے ہیں؟“

آدمی نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر صاحب! میں تو ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں، جنہیں میں کاٹنا چاہوں گا۔“

وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے دفتر میں اپنے ساتھی کو بتایا۔ ”میرے اور میری بیوی کے درمیان پانچ ماہ بے حد خوشیوں بھرے گزرے، مگر آج سے ہمارے درمیان زوردار جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔“

دوست نے پوچھا۔ ”اس تبدیلی کی وجہ......؟“

ان صاحب نے جواب دیا۔ وہ پانچ ماہ کے بعد آج ہی اپنے میکے سے واپس آئی ہے۔“

نسخہ شادمانی

بیوی! دیکھو نا! ہمارے پڑوسی نے پچاس انچ کا ایل سی ڈی، ٹی وی خریدا ہے، آپ بھی خرید لائیے نا!“

شوہر! ”ارے ڈارلنگ، جس کے پاس تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو، وہ کیونکر فالتو کا وقت ٹی وی دیکھنے میں برباد کرے۔ بیوی! ”اوہ آپ بھی نا......!“

”میں ابھی آپ کے لیے پکوڑے بنا کر لاتی ہوں۔“

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

سیدہ لوبا سجاد ——— کہروڑ پکا

خلوص و مہر و وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب اور کوئی کام کریں
جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم بھی سہی
اب اتنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

قوال افضل گھمن ——— کراچی

جو خیال تھے نہ قیاس تھے وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
جو محبتوں کے اساس تھے وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے
یہ خیال سارے ہیں عارضی یہ گلاب سارے ہیں کاغذی
گل آرزو کی جو باس تھے وہی لوگ مجھ سے بچھڑ گئے

ثمرہ، اقرا ——— کراچی

دیکھا جو تیر کھا کے کمین گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

حنا سلیم اعوان ——— آخون باندی

جرم گر میں نے کیا ہے تو بتایا جائے
ایسے چپ چاپ نہ سولی پہ چڑھایا جائے
یہ عداوت کی فضا راس کسے آئی ہے
کیوں نہ ایک دیپ محبت کا جلایا جائے

مسرت الطاف احمد ——— کراچی

تھا میسر آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کا اندازہ سفر کی رائیگانی سے ہوا

اقصیٰ ناصر ——— گلستان جوہر

ہم فقیروں کو کم نظر آئے
اس نگر میں تھے شہریار بہت
اس نے مجبور کر دیا ورنہ
ہم کو خود پر تھا اختیار بہت

شازیہ سحاب ——— لیہ

کئی دلوں کا مقدر عذاب ہوتا ہے
ہمارا دل بھی ان ہی میں شمار ہے شاید

عظمیٰ غلام نبی ——— کراچی

ڈوبے ہیں غیب میں میرے شہر کے کئی اہل ہنر
تو میرے قلم کو ان پسماندگیوں کے بھنور میں نہ ڈال

نادیہ اشرف ——— دائے وِنڈ

مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ورنہ اسلوب زمانہ پر ہنسی آئی بہت

عائشہ جہانگیر مرالی ——— کبیروالا

تو نے ہی کہا تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتا بھی دیکھ

اقرا عزیز ——— گاؤں دریا خان جلبانی

ہر کوئی رو کر دکھائے یہ ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

تحریم اکرم چودھری ——— ملتان

اس نے اپنے خط میں مجھ کو کتنے درد سے لکھا ہے
اب تو گاؤں آیا کرنا اب تو سڑکیں پکی ہیں

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

ندا، نفیسہ ——— فیصل آباد

چیز کڑوی ہے مگر دھوپ سے بچنے کے لیے
نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگا لیتے ہیں لوگ

خزیمہ ریاض ——— گاؤں سدوکی

ڈھل چکا ہے وہ خواب کا موسم
دل پہ گزرا ہے اک عذاب کا موسم

مرسلہ: شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

"کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت نہ لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو تہمت اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔"

فائدہ:۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کی بابت یہ کہے کہ وہ تو فاسق یا کافر ہے جبکہ وہ فاسق یا کافر نہیں ہے تو خود کہنے والا عند اللہ فاسق یا کافر قرار پائے گا۔ اس لیے اس قسم کے دعووں سے بچنا چاہیے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا

ریاکاری کی تین علامتیں ہیں۔

1۔ خلوت میں تو کاہل رہتا ہے (عمل نہیں کرتا) اور لوگوں کے سامنے چست و چالاک۔

2۔ جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو بڑھ چڑھ کر بات کرتا ہے۔

3۔ تیسری یہ کہ ملامت اور سرزنش سے اپنے عمل کم کر دیتا ہے۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

بے کاری

حضرت عمرؓ جب کسی کو کوئی ظاہری حالت میں خوش حال دیکھتے تو دریافت فرماتے۔

"کیا یہ شخص کسی پیشے سے وابستہ ہے؟"

جب لوگ کہتے کہ "نہیں"

تو آپ فرماتے "یہ شخص میری نظر سے گر گیا۔"

ان کا کہنا تھا کوئی بھی کام خواہ کتنا ہی معمولی ہو لوگوں سے سوال کرنے کی نسبت اچھا ہے۔

فساد کی سزا

بنی اسرائیل میں ایلاف نامی بادشاہ آیا تو اللہ نے ان کے ایلیا نامی پہاڑ میں برکت دی۔ یہاں کوئی دشمن داخل نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کے محتاج ہوتے تھے۔ خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص مٹی کا ڈھیر لیتا اور وہاں بیج ڈال دیتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اور اس کے اہل و عیال کے لیے خوراک پیدا کر دیتے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنے پاس موجود زیتون کے پھل کو نچوڑتا تو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے تیل نکلتا لیکن جب ان میں فسادات کی کثرت ہوئی اور انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو بھلا دیا تو دشمن نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہیں شکست ہوئی۔ انہیں قتل کیا گیا اور ان کے بیوی بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

ابلیس کا دوست اور دشمن

نقل ہے کہ حضرت یحییٰ ابن ذکریا علیہ السلام نے ابلیس کو دیکھا اور اس سے پوچھا۔

"تیرا بڑا دشمن کون ہے اور زیادہ دوست کون ہے؟"

ابلیس نے جواب دیا "زاہد بخیل میرا سب سے بڑا دوست ہے کیونکہ وہ محنت برداشت کرتا ہے اور بندگی بجا لاتا ہے لیکن اس کا بخل اس کی عبادت کو برباد اور ناچیز بنا دیتا ہے اور فاسق سخی میرا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ اچھا کھاتا ہے اور اچھا پہنتا ہے اور اچھی طرح زندگی بسر کرتا ہے مجھے یہ ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سخاوت کے باعث اس پر رحم فرمائے اور اس کو توبہ کی توفیق مرحمت

فرمائے۔"

خوفِ خدا کی برکت

شیخ شبلی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا ہے۔
"کوئی روز ایسا نہیں ہوا جس میں مجھ پر خوفِ خدا غالب ہوا اور اس دن حکمت و عبرت کا دروازہ مجھ پر نہ کھلا ہو۔"

اعتدال

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے فرزند سے فرمایا کہ "کبھی کبھار گوشت کھا لیا کرو، ایک بار روغن استعمال کرو، ایک بار دودھ، ایک بار سرکہ' ایک بار بغیر سالن کے روٹی کھاؤ۔" (اس کو اپنا معمول بنالو)

عمل

شیخ ابوعثمان حیری رحمتہ اللہ علیہ کو ایک دعوت میں بلایا گیا تاکہ ان کے تحمل کی آزمائش کی جائے۔ چنانچہ جب وہ صاحب خانہ کے یہاں پہنچے تو اس نے ان کو اندر نہیں جانے دیا اور کہا کہ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ یہ سن کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ابھی کچھ راستہ طے کیا تھا کہ صاحب خانہ آپ کے پیچھے پہنچا اور آپ کو واپس لے آیا لیکن پھر لوٹا دیا۔
اسی طرح کئی بار آپ کو بلایا اور واپس کر دیا۔
آخر کار صاحب خانہ نے کہا۔
"واقعی آپ ایک عظیم جواں مرد ہیں۔"
آپ نے اس شخص سے کہا۔
"یہ جو کچھ تم نے دیکھا یہ تو کتے کی عادت ہے کہ جب اس کو بلاتے ہیں وہ بلانے پر آجاتا ہے اور جب اس کو دھتکارتے ہیں تو واپس ہو جاتا ہے۔ پس یہ کوئی قابلِ قدر بات تو نہیں۔"

عمر فانی کا سامان

حضرت نوح علیہ السلام نے بانس کا گھر بنایا تو لوگوں نے کہا۔
"آپ اگر اینٹوں کا گھر بناتے تو کیا حرج ہوتا؟"
حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔
"جس کے لیے مرنا ضروری ہے اس کے لیے یہ بانس کا گھر بھی بہت ہے۔"
حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کے سفر میں ایک پختہ عمارت اینٹوں سے بنی ہوئی دیکھی۔ اسے دیکھ کر آپ فرمانے لگے۔
"مجھے ہرگز یہ خبر نہیں تھی کہ اس امت میں لوگ ایسی عمارتیں بھی بنوائیں گے جیسی ہامان نے فرعون کے لیے تیار کی تھی۔ اس لیے کہ فرعون نے ہی سب سے پہلے پختہ اینٹ بنوائی تھی اور ہامان سے کہا تھا اے ہامان میرے لیے گارے پر آگ روشن کر یعنی اینٹ بنا۔"
حضرت حسن بصریؒ نے کہا ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات میں ہاتھ چھتوں میں لگتا تھا۔" (مکانوں کی چھتیں اتنی نیچی ہوتی تھیں)
شیخ فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں۔
"مجھے اس بات سے تعجب نہیں ہے کہ کوئی شخص مکان بنائے اور اس کو چھوڑ جائے بلکہ مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ کوئی شخص یہ دیکھے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔"

اللہ کی رضا پر راضی

ایک گروہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ خداوند تعالیٰ سے پوچھیے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے تیری رضا حاصل ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔
"(ان سے کہہ دو) میرے حکم پر تم راضی رہو میں تم سے راضی رہوں گا۔"
حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی۔
"میرے دوستوں کو دنیا کے غم سے کیا کام کہ وہ مناجات کی لذت کو اپنے دل سے دور کرے گا۔"

یاد رکھیے

☆ سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو اس کے کرنے والے

کی نظر میں چھوٹا ہو۔
(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

☆ جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو کلام کم ہو جاتا ہے۔ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

☆ انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔ (افلاطون)

☆ ظاہر پر نہ جا۔ آگ دیکھنے کو سرخ ہوتی ہے لیکن اس کا جلایا ہوا سیاہ ہو جاتا ہے۔
(شیخ سعدی)

☆ مجھے اعتدال پسندوں سے نفرت ہے اور انتہا پسندوں سے محبت۔ اعتدال پسندوں نے کامیابی اور ناکامی کے درمیان راہیں تلاش کر رکھی ہیں جو گمنامی کے گڑھے میں لے جاتی ہیں۔
(خلیل جبران)

(مستنصر حسین تارڑ)
نمرہ، اقرا۔ کراچی

قرآن کی سچائی

ممتاز مغربی دانشور گیری ملر نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ لکھتا ہے۔

حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام ابولہب تھا۔ ابولہب کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شدید عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیچھا کیا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جاتے وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات جھٹلاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے یہ چیز سفید ہے تو وہ جھٹ بول اٹھتا "نہیں یہ تو کالی ہے"۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے کہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں رات ہے"۔

قرآن میں ابولہب کا بھی ذکر آیا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلنا اس کا مقدر ہے۔ مطلب یہ کہ وہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گا۔ کافر ہی رہے گا۔

"گیری ملر لکھتا ہے۔

"اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابولہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ اگر وہ مسلمانوں سے کہتا۔

"دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مسلمان بنالو۔"

اور جب وہ مسلمان بنالیتے تو کہتا "لو بھئی تمہارا قرآن جھوٹا ثابت ہو گیا۔ اب بولو۔"

لیکن ابولہب نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہی تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے۔ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکا۔

علاج

علامہ منذری فرماتے ہیں، ہمارے شیخ عبداللہ حاکم کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ بہت سے علاج کیے مگر پھنسیاں ختم نہیں ہوئیں۔ تقریباً سال بھر اس تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد وہ جمعہ کے دن امام ابو عثمان صابونی کی مجلس میں پہنچے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ امام صابونی نے ان کے لیے دعا کی حاضرین نے آمین کہی۔

اگلے جمعہ کو ایک عورت نے امام صابونی کی محفل میں ایک پرچہ بھجوایا۔ اس میں لکھا تھا۔

"پچھلے جمعہ کو شیخ عبداللہ حاکم کی دعائے صحت کے بعد میں گھر گئی۔ وہاں جا کر بھی میں نے ان کی صحت کے لیے بہت دعا کی۔ اسی رات مجھے خواب میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ عبداللہ سے کہو وہ مسلمانوں کے لیے وسعت کے ساتھ پانی پہنچانے کا انتظام کریں۔"

شیخ حاکم کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک سبیل بنا دی جس سے لوگ خوب پانی پیتے تھے۔ اس واقعے کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ شیخ پر شفا کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پھنسیاں ختم ہو گئیں اور چہرہ پہلے کی طرح صاف اور خوبصورت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال زندہ رہے۔



خط آپ کے

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔37- اردو بازار، کراچی۔
Email: shuaa@khawateendigest.com

آپ کے خط اور ان کے جواب لیے حاضر ہیں۔
اللہ رب العزت آپ کو، ہم کو صحت، عافیت اور دائمی خوشیاں عطا فرمائے۔ ہر دکھ، تکلیف اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔ آمین۔
اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف۔
پہلا خط اورنگی ٹاؤن سے عائشہ رباب کا ہے۔ لکھتی ہیں
سرورق اچھا لگا۔ حسب عادت، حسب معمول پہلی شعاع سے شروع کیا۔ حالات حاضرہ پر بڑی گہرائی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ پھر حمد ونعت کی طرف آئی۔ ''پیارے نبی کی پیاری باتیں'' ہمیشہ کی طرح اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح راستہ دکھاتی ہوئی تھیں۔ ''بندھن'' میں شہزاد شیخ کا انٹرویو اچھا لگا ان کے تمام جوابات قدرتی سے لگے۔ تصنع سے پاک ''خط آپ کے'' وہ سلسلہ ہے۔ جسے غلطی سے بھی نہیں چھوڑتی میں اس بار ''صائمہ مشتاق'' کا خط بیسٹ آف دا منتھ تھا۔ دل کی باتیں صفحوں میں بکھری ہوئی نظر آئیں۔
خواب شیشے کا پڑھا، کہانی تو بس ایک بند گلی میں جھٹکے کھاتے، راستہ ٹٹولتے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹکریں کھا رہی ہے۔ ''شہزاد'' پھر غائب۔ لگتا ہے مصنفہ پانچ سال سے پہلے ختم نہیں کرنا چاہتیں۔ افسانوں میں ''تماشا'' سب سے بہترین لگا۔ ''دل برائے فروخت''، ''پیاز زندگی'' بھی زندگی کی حقیقتیں آشکار کرتی کہانیاں تھیں۔ ''سود وزیاں کا حساب'' اختتام بہت ہی دکھی کر دینے والا تھا۔ ''ناولٹ'' میں ''کبھی روشنی'' گھریلو سی روایتی سی کہانی اچھی لگی۔ سچ کہوں تو ثانیہ میں مجھے اپنی جھلک نظر آئی۔ ''یہ جہاں'' عطیہ خالد کچھ متاثر نہیں کر سکیں۔ ''سنو تم لوٹ آنا'' کچھ بھی نیا نہیں تھا اس کہانی میں — مکمل ناول میں ''سنہری دھوپ'' کا ذکر کیا جائے تو دعا کا کردار ہی غصہ دلانے والا ہے۔ عمیر کا اپنے والد سے جھوٹ بولنا بالکل بھی صحیح قدم نہیں ہے۔ ''اتنی سی بات'' اچھی تحریر تھی۔ سہاگ رات کو ہی زارا کی بیماری ہضم نہیں ہوئی۔ ''کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں'' سدرہ حیات نے بہت ہی کمال کا لکھا ہے۔ ختم نہ ہونے کے باوجود اختتام تک ناول نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے آخری کہانی جس کا فہرست میں ذکر ہی نہیں ہے۔ ''یہ کہانی نہیں'' شازیہ الطاف ہاشمی نے اتنا جامع اور بہترین لکھا ہے کہ بے ساختہ دل شاباش دینے کو چاہا ''ویلڈن''۔

ج: پیاری عائشہ! بہت خوشی ہوئی آپ نے شعاع پر اتنا اچھا تبصرہ کیا۔ تمام سلسلوں کے بارے میں لکھا اور ہر کہانی کے تمام کرداروں پر تبصرہ کیا۔ امید ہے آئندہ بھی ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

سدرہ انور کوٹ محمد حسین سے لکھتی ہیں
ہمارا گاؤں منڈی فیض آباد سے 5 کلومیٹر کے فاصلے پہ ہے اور ہر مہینے کا ڈائجسٹ ہمیں 15 تاریخ کو ملتا ہے بس یہ کہوں گی کہ شعاع جیسا ڈائجسٹ کہیں ہے اور نہ ہی ہوگا۔ عفت جی اور صائمہ جی آپ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہے اور ایمل رضا جی سرخ آندھی کے ساتھ روح میں اتر گئی ہیں آپ۔ اور میں نے لاگ کے نام کی ایک اسٹوری بھیجی تھی پلیز بتا دیں کہ وہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔

ج: پیاری سدرہ! ہمیں احساس ہے کہ بہت سے شہروں میں پرچا بہت تاخیر سے پہنچتا ہے تو ایسے میں پرچا

پڑھ کر تبصرہ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ کی تجویز اچھی ہے۔ ہم غور کریں گے۔

حافظہ فوزیہ اسد نے چیچہ وطنی ضلع ساہیوال سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

انشاجی کے صاحبزادے رومی انشا کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ دکھ اور شدید صدمہ مجھے اس سال بھی ہوا تھا جب انکل جی محمود ریاض صاحب کے دو جوان بیٹوں کی وفات ہوئی تھی۔ اس سال میں نئی نئی قاری بنی تھی اب تو میری اپنی بیٹیاں اس ایج میں ہیں، وقت بھی کیسے کیسے ہیروں کو مٹی میں دفن کر گیا۔

راشدہ رفعت کا حقیقت سے قریب افسانہ پڑھ کر دل خوش ہوا ویسے بھی راشدہ جب بھی لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں!

عفت سحر طاہر کا ناول بہت بہت زبردست ناول ہے عفت کا انداز بیاں بہت اچھا ہے۔

ناولٹ سب ہی زبردست تھے آخر شعاع میں شائع ہوئے ہیں تو اعلا ہی ہوں گے نا!

شازیہ جمال اور نعیمہ ناز نے اپنے قدم جما ہی لیے۔ ''سنہری دھوپ'' میں سلویٰ بٹ جزئیات نگاری سے ان کے مشاہدے کی باریکی کا اندازہ ہوتا ہے!۔

''تاریخ کے جھروکوں'' کا سلسلہ بہت زبردست ہے۔ شاعری دل کو بھانے والی لکھا کریں نہ سمجھ میں آنے والے شعر شائع کر دیتے ہیں۔

ج: پیاری فوزیہ! ایک طویل مدت سے شعاع نے آپ کو باندھ رکھا ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مریم اسد اور منزہ اسد کو ہماری جانب سے پیار اور دعائیں۔

کوثر خالد جڑانوالہ سے رونق محفل ہیں، لکھا ہے

پانچ دنوں کی نمازیں آج قضا پڑھیں کیونکہ ایک دن لاہور والے آئے۔ نند، عمرے کے لیے جارہی ہے 19 کو تو بیٹا بہو اور میری ماں بھی ملنے آگئیں۔ ہمارا ثمر دوست کی کار خود چلا کر آیا۔ پندرہ دن قبل بھی یہ لوگ آئے تھے۔ کیونکہ میری عزیز سہیلی زاہدہ (جو سب کی سہیلی تھی) وفات پا گئی۔ ہمارے خالد کی طرح طویل بیماری مگر ہمت نہ ہاری۔ پرسوں اور کل دو لحاف تیار کیے، سردیاں ہیں۔ نہانا مشکل ہو گیا۔ ہمت بھی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ لہٰذا رسالے پڑھنا اب جرم لگتا ہے۔ سرسری کہانیاں پڑھتے ہوئے جو لکھاری دلچسپ لگیں۔ ''خواب شیشے کا'' کے علاوہ۔ ان کے نام سدرہ حیات، منشا محسن اور تمیرا افضا اول رہیں۔ شازیہ جمال کا قلم بھی اچھا رہا۔ ''خط آپ کے'' بہنوں! بیٹیوں اور بھانجیوں! آپ ہمیں خالہ اماں۔ دادی جو مرضی کہیں منظور ہے۔ بھئی دوستی میں تو بچوں کو باجی بھی کہا جا سکتا ہے اور دادی کو کاکی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بچے ٹیوشن کے لیے آنے والے ہیں۔ آج اتنا ہی کافی سمجھیں۔ آئندہ کا بھی خدا جانے۔ اللہ حافظ۔

ج: پیاری کوثر! ہمیں آپ کی مصروفیات کا بخوبی اندازہ ہے۔ بیمار اور بوڑھی ساس کی خدمت کے ساتھ ساتھ آپ دوستیاں اور رشتہ داریاں بھی خوب نبھاتی ہیں۔ پھر ماشاء اللہ سگھڑ بھی اتنی کہ لحاف رضائیاں تک خود تیار کرتی ہیں۔ اتنی مصروفیات میں وقت نکال کر شعاع پڑھنا اور پھر ہمیں خط لکھنا واقعی بہت ہمت کی بات ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور ہمت دے۔ آمین۔

امامہ ملک نے چنگی بانڈی ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے

پچھلا اور پہلا خط تو آپ نے شائع کیا نہیں، غصہ بہت تھا پر اب پھر اس امید پر لکھنے بیٹھ گئی کہ شاید ردی کی ٹوکری کا پیٹ بھر گیا ہو اور وہ سو رہی ہو۔

سب سے پہلے تو میرے گاؤں کا تعارف...... چنگی بانڈی جو کہ اپنے نام کی طرح ہی چنگا ہے ہری پور شہر کے شمال مشرق میں واقع ہے...... پندرہ ہزار کے قریب آبادی والے ہمارے گاؤں میں سوائے گیس کے ہر سہولت موجود ہے الحمد للہ...... چھ پرائمری اسکول، ایک گرلز مڈل اسکول اور ایک بوائز ہائی اسکول ہے۔ لڑکیوں کا ہائی سکول گاؤں سے باہر سرائے صالح میں ہے اور ڈگری کالج بھی...... پرائیویٹ اسکولز کا تو شمار ہی نہیں...... پانی کے دو ٹیوب ویل بھی ہیں جو اگرچہ پورے گاؤں کے لیے ناکافی ہیں مگر گاؤں کے زیادہ تر گھروں میں بورنگ ہوئی ہے اس لیے کمی نہیں ہوتی...... گاؤں کی خوب صورتی کو چار چاند لگاتی نہریں ہیں اور آم اور لوکاٹ کے باغات ہیں...... گاؤں کے لوگ محنتی ہیں اور زیادہ تر سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ہیں...... سرکاری ملازمتوں

والے بھی تقریباً سب ہی لوگ ٹیچنگ، پولیس اور آرمی نیوی کے شعبے میں ہیں۔ حنا سلیم اعوان کے گاؤں آخون باندی کے مغرب میں اور اقصیٰ طیب الرحمٰن کے گاؤں مونن کے سامنے شمال مشرق میں چنلی باندی واقع ہے۔ یہ تو تھا ہمارے گاؤں کا تعارف۔

اب آتے ہیں شعاع کی طرف۔ ماڈل بہت پیاری لگ رہی ہے "شہرزاد" کو نہ پا کر "خواب شیشے کا" کی طرف بھاگے...... مہرماہ کی عقل پر افسوس ہوا...... پھر "خط آپ کے" میں آئے...... آہ...... (خوشی والی آہ) یہ کیا ......؟؟؟ پورے اکتیس خطوط...... ویسے یہ سیدہ نسبت زہرہ شاید بیرون ملک پڑھنے گئی تھیں نا؟ ابھی تک واپسی نہیں ہوئی کیا؟؟؟ اور یہ کیا آپ نے نئی بات نکالی ہے راہ چلتے رشتے؟؟؟ اب اگر اپنی امی، دادی کی عمر کی عورت سے میں دوستی کروں تو اس کو نام سے تو نہیں بلاؤں گی نا۔ کہانیوں پہ تبصرہ راشدہ رفعت کا "زندگی کبھی تیرگی" اچھا لگا موضوع پرانا تھا ویسے، ہماری بھی دعا ہے ایک عدد ہدایت ہمیں بھی مل جائے۔ عطیہ خالد نے اچھا لکھا اور گیتی کے کردار نے بہت متاثر کیا۔ تمیرا فضا کا نام فہرست میں سمیرا فضا لکھا تھا۔ تمیرا نے ایک تلخ حقیقت بیان کی۔

سدرہ حیات اچھا لکھتی ہیں۔ "کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں" بہت اچھی لگی پہلی قسط۔ قراۃ العین نے بھی بہترین لکھا۔ دانیال کے ساتھ اس سے زیادہ برا سلوک ہونا چاہیے تھا۔ اسٹوری آف دی منتھ کا اعزاز دیا جاتا ہے "اتنی سی بات"—— زبردست کہانی تھی۔ ویسے زارا کے پاس ایک مصطفیٰ بھائی تھا۔ میرے پاس پانچ مصطفیٰ جیسے بھائی ہیں اور ابو کے ساتھ ساتھ دادا کا پیکیج فری۔ اگلی دفعہ جب خط لکھوں گی (اور پتہ نہیں کب لکھوں گی) تو اپنی امی کا "تاتاجوڑا" سروے بھی بھجواؤں گی۔ ام ایمان قاضی نے بھی اچھا لکھا اور افسانوں میں شازیہ الطاف ہاشمی کا "یہ کہانی نہیں" بازی لے گیا۔

اقتل آنی! آپ جو مواد لکھتی ہیں اس کا حوالہ دیا کریں کہ کہاں سے لیا ہے۔

ج: پیاری امامہ! آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے یا تاخیر سے موصول ہوئے ہوں گے اس لیے شامل نہیں ہو سکے۔ ویسے اطمینان رکھیں تاخیر سے موصول ہونے والے خط بھی ہم پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

جن تاریخی واقعات کا آپ نے پوچھا ہے وہ "تاریخ طبری" سے لیے گئے ہیں۔ یہ اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخ کی کتابیں ضروری نہیں مذہبی لحاظ سے بھی مستند ہوں۔ مختلف تاریخ دانوں نے ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز سے لکھا ہے۔ اس لیے غلطی کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ آنی کہنا یا دادی آپ کی مرضی پر منحصر ہے ویسے بڑی عمر کی خاتون کو بھابی یا آپی بھی کہہ سکتے ہیں۔ کم از کم کسی کو آنی کہنا ہمیں تو پسند نہیں ہے ویسے آپ کو اجازت ہے آپ چاہیں تو ہمیں آنی کہہ سکتی ہیں۔ ہمیں قطعاً اعتراض نہیں ہوگا۔

آپ کے گاؤں کا احوال جان کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ بے اختیار دل چاہا کہ کبھی موقع ملا تو آپ کے مہمان ضرور بنیں گے۔

مریم مسعود احمد نے حافظ آباد سے لکھا ہے

ضلع حافظ آباد کے چاول پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔ شعاع کے ساتھ وابستگی کو تقریباً آٹھ سال ہو چلے ہیں۔ زندگی کے بہت سے رموز و اسرار ہم نے اس ڈائجسٹ کی بدولت حاصل کیے۔ اس ماہ ٹائٹل خوب صورت تھا۔ "شہرزاد" کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ "اتنی سی بات" عمدہ کاوش تھی۔ زارا اور جمشید کے کردار پسند آئے۔ "کبھی روشنی، ناولٹ بہت خوب۔ ثانیہ ایک مثالی کردار ہے سب لڑکیوں کے لیے۔ "یہ جہاں" بہترین تحریر تھی۔

سنو تم لوٹ آنا بھی بہت پسند آئی۔ یہ بات واقعی ماننے والی ہے کہ شعاع آج بھی اپنا معیار ویسے ہی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جیسا آج سے سالوں پہلے تھا۔

ج: پیاری مریم! ہم نے حافظ آباد کے آم تو کھائے ہیں، وہاں کا چونسہ واقعی بہت مزے دار ہوتا ہے۔ چاول کے بارے میں پہلی بار سنا ہے۔ یقیناً مزے دار ہوتے ہوں گے۔ پاکستان کی ہر چیز ہی بہت عمدہ ہوتی ہے، پھل، سبزیاں، دالیں، چاول۔ ایک بار پیاز کی قلت ہوئی تو انڈیا سے پیاز آئی تھی۔ تب اندازہ ہوا کہ ہماری پیاز تک ان کی پیاز کے مقابلے میں سو گنا بہتر ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی کبھی قدر نہیں کی۔

شعاع کی قدردانی کے لیے شکریہ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

ایمان زہرہ شیرازی نے ڈھڈیال سے لکھا ہے

میں شعاع 6th کلاس میں تھی تب سے پڑھ رہی ہوں امی سے چھپ کر پڑھتی تھی پڑھنے کا چسکا اسکول سے پڑا جب میری ایک کلاس فیلو ڈائجسٹ لے کر آتی تھی۔ میں کہانیاں بھی لکھتی ہوں مگر لکھ کر اپنی الماری میں رکھ دی ہیں کبھی ہمت ہی نہیں ہوئی کہ بھیج دوں۔ کیا میں اپنی کہانی بھیج دوں۔

ج: پیاری زہرہ! آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی لکھائی اچھی نہیں ہے ہمیں تو خیموں کی لکھائی میں لکھے ہوئے خط بھی موصول ہوتے ہیں اور ہم وہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

افسانے لکھنا زیادہ مشکل کام ہے جو آپ انجام دے ہی چکی ہیں تو بھجوانے میں کیا مسئلہ ہے۔ تھوڑی ہمت کی ہی تو ضرورت ہے۔ بھجوادیں۔ آپ نا تا جوڑا ہے کہ سلسلے میں لکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور لکھیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ ہر سلسلے میں لکھیں۔ ہم نے یہ سلسلے اپنی قارئین کے لیے ہی تو شروع کیے ہیں، سلسلوں کی تحریریں بھی آپ ایک ہی لفافہ میں افسانے کے ساتھ بھجوا سکتی ہیں۔

ناظمہ زیدی نے چک اعظم سے محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں

راشدہ رفعت کی کہانی بہت خوب، صبر کا اجر مل ہی گیا۔ "تماشا" فلمی سا افسانہ اچھا نہیں لگا۔ "دل برائے فروخت" بھی خاص متاثر نہ کرسکا۔ "عطیہ خالد" نے اچھا لکھا۔ کہاں تو ہیرو صاحب گیتی کے پیچھے پاگل تھے اور کہاں بیٹی پر نظر۔ خیر خوب جواب دیا گیتی نے "پیاز زندگی" نے اداس کردیا۔ "سنہری دھوپ" آگے بڑھا۔ مجھے اپنا انداز صحیح لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دعا اور حسن والا۔ پلیز بتادیں صحیح ہوں کہ غلط۔

"سدرہ حیات" اچھا ناول ہے کچھ ہٹ کے بہت خوب۔ "اتنی سی بات" اچھا ناول تھا۔ گڈ شازیہ جمال۔

"سنو تم لوٹ آنا" سب سے بہترین ناول۔ ناول آف دی منتھ۔ دیہاتی ماحول اور کزنز کی نوک جھونک۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

"شازیہ الطاف" کی کہانی اچھی تھی مگر مجھے ہیروئن پر اعتراض ہے کہ اگر اولاد نہ ہو تو مرد کو باندھنے کا کیا فائدہ؟ خود ہی دوسری شادی کروادیتی۔ یہ تو اس کا شرعی و جائز حق ہے۔

"باتوں سے خوشبو" بہترین ماشاء اللہ "نانا" اس مرتبہ قدرے اچھا تھا۔ سکون سا ملا پڑھ کے "تاریخ" زبردست باقی تمام مستقل سلسلے بہت خوب تھے۔

آخر میں لکھاری بہنوں سے ایک درخواست ہے کہ پلیز بہن، بہن یا کزن، کزن کے تقابلی جائزوں والی کہانیاں نہ لکھا کریں۔ ایک کے ساتھ برا اور ایک کے ساتھ اچھا۔ ایسے قارئین کے ذہن میں بھی منتقمانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

میری طبیعت پچھلے چند ماہ سے علیل ہے۔ تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ میری صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

خواتین کے ایڈ میں، افسانے کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ نہ ہی، نہ شائع پر خود سوزی کی کوشش۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے مٹھی بھر شیریں بادام کھاتے کھاتے، دانت کے نیچے کوئی کڑوا بادام آجائے۔ جسے نہ نگل سکیں نہ باتی تھوک سکیں۔

ج: پیاری ناظمہ! بادام ایک ایک کر کے کھایا کریں۔

یہ تو اچھی بات ہے کہ اب صبر کرنا سیکھ لیا ہے۔

منتقمانہ جذبات والی کسی حد تک درست ہے تقابل تو گھر گھر کی کہانی ہے۔ لیکن اسے ہوا نہیں دینا چاہیے۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ غصہ نفرت، انتقام کے ساتھ محبت مروت، ایثار و قربانی بھی ہے۔ یہ سارے رنگ مل کر جو تصویر بناتے ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ امثل آپ کی علالت کا سن کر بہت افسردہ ہیں، ان کا کہنا ہے۔ ناظمہ جی نے کون سے سخت میسج کا ذکر کیا ہے۔ ناظمہ تو بہت اچھے میسج کرتی رہی ہیں۔ ان کی آپ سے بات بھی ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور ڈھیر ساری خوشیاں دے۔

اقراء ممتاز نے سرگودھا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

آج مجھے جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے "تاریخ کے جھروکے" ہر دفعہ کوئی نہ کوئی واقعہ بعض باتیں ایسی ہیں جو ہمیں معلوم ہی نہیں۔

بندھن میں شہزاد شیخ اور اس کی مسز حنا شیخ سے ملاقات اچھی رہی خط آپ کے میں سب بہنوں کو پڑھا۔

ناولٹ زندگی بھی تیرگی۔ کبھی روشنی اچھی اسٹوری تھی۔ ہدایت اللہ ایک اچھا مرد ثابت ہوا۔

افسانہ ''دل برائے فروخت کیا واقعی ہی نیلی آنکھوں والے لوگ بے وفا ہوتے ہیں۔ منشا محسن علی نے اس اسٹوری میں نام کیسے رکھے ہیں۔

ناولٹ ''یہ جہاں'' زوہیر کی سوچ اتنی گھٹیا نکلی۔ مکمل ناول اتنی سی بات کیا کمال اسٹوری تھی۔ جمشید نے ثابت کر دیا کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔

ناولٹ سنو تم لوٹ آنا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ام ایمان قاضی کی کوئی اسٹوری نہ پسند کی جائے۔

ہما نواب سے ملاقات اچھی رہی آپی جی آپ سے پوچھنا ہے کہ شعاع کا تبصرہ کس تاریخ تک آپ کو پہنچ جانا چاہیے فاطمہ شریف اگر تمہارے پاس شعاع جولائی 2017ء یا خواتین جنوری 2013ء کا ہے تو کومل شہزادی کو دے دینا میں اس سے لے لوں گی۔ ضرور دینا۔

ج: پیاری اقراء! ہم نے سیاہ، نیلی، بھوری، سنہری سبز ہر رنگ کی آنکھوں والے لوگوں کو بے وفا دیکھا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نیلی آنکھوں والے باوفا ہوتے ہیں یا بے وفا۔ ویسے بھی کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کہ نیلی آنکھیں ہوں گی تو لازماً بے وفا ہوں گے اور سیاہ آنکھوں والے باوفا ہوں گے۔

خط اس طرح بھجوائیں کہ 16 تاریخ تک ہمیں موصول ہوجائے۔

کراچی سے سیدہ زہرہ جمال نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

''کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں'' بہترین جملے، کردار، منظر نگاری اور سب سے بڑھ کر کہانی (یعنی پلاٹ) اس کہانی کی تعریف کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ

کچھ کہانیاں ایسے چونکا دیتی ہیں کہ میں باقاعدہ صفحات پلٹ کر خاص طور سے رائٹر کا نام دیکھتی ہوں اور پھر وہ رائٹر میری پسندیدہ رائٹر کی لسٹ میں شامل ہوجاتی ہیں کہ اب سے ان کی کہانیاں (اگلی، پچھلی) ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنی ہیں تو اس شمارے میں وہ رائٹر سدرہ حیات ہیں۔ بس یہ ہی کہانی اور رائٹر کی تعریف ہے۔

پھر فہرست میں موجود اپنی پسندیدہ رائٹر نعیمہ ناز کے نام پر نظر پڑی۔

''ہم صورت گر کچھ خوابوں کے'' یہ وہ تحریر تھی جس نے نعیمہ ناز کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی، پھر ''ادا فروش'' واہ کیا موضوعات چنتی ہیں یہ۔ ''ساغر'' کا کردار اور ادا فروش کی ''ماڈل'' ان کے احساسات، حساسیت اور مسائل کس خوبی سے انہوں نے بیان کیے وہ قابل تعریف ہے اور سب سے بڑھ کر ان کے موضوعات مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ یکسانیت سے عاری ہوتے ہیں۔

''پیاز زندگی'' ہر لڑکی کی زندگی کی عکاسی کرتی یہ کہانی انتہائی منفرد انداز سے لکھی گئی ہے۔ انجام میں اس کہانی کی خوب صورتی پنہاں ہے۔ تمیرا فضا بہت خوب اور جس کہانی کے اختتام نے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھیری وہ انمول تحریر تھی ام ایمان قاضی کی ''سنو تم لوٹ آنا''۔ ''زندگی بھی روشنی کبھی تیرگی'' کے نام کے بالکل حسب توقع ہدایت کی زبان میں ایک تہذیب، شائستگی اور دانائی نظر آئی وہیں ثانیہ کا کردار بے مثال لگا۔

ممکن ہے حقیقت میں کسی نے ایسا کردار نہ دیکھا ہو، میرے لیے ایسے جیتے جاگتے مثالی کردار میری زندگی میں میری دو ممانیوں کی صورت موجود ہیں۔ جنہوں نے میری نانی کی (جن کی حالت بھی بتول بیگم جیسی تھی) اپنی سگی ماں کی طرح خدمت کی اور ان کی وفات پر ایسے ہی آنسو بہائے جیسے ان کی اپنی ماں ہوں۔ بلاشبہ ثانیہ کا کردار ہم سب قارئین کے لیے ایک مثال ہے''یہ جہاں'' تلخ حقیقت پر مبنی ایک اہم پیغام دیتی کہانی عطیہ خالد بہترین اضافہ ہیں۔ بہت عمدہ یشاز یہ الطاف ہاشمی کی یہ کہانی نہیں ہم اہم پیغام دیتی تحریر ''دل برائے فروخت'' سادہ سی تحریر مگر انداز اچھا تھا۔ مجھے نام اچھے لگے ''سونل'' اور ''مثنی'' اور انداز بیان بہت خوب ''سود و زیاں کا حساب'' اور انجام بالکل پرفیکٹ۔ ''اتنی سی بات'' بھی اچھی تھی۔ اس بار شمارہ پورا ہی زبردست تھا، ہر کہانی دوسری سے مختلف۔

ج: پیاری زہرہ! بڑے خوب صورت انداز میں آپ نے رائٹرز کو سراہا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ موضوع یکساں ہوئے ہوں۔ ہم تو ہمیشہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کرتے ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ گھریلو موضوعات کے ساتھ سماجی، رومانوی، سبق آموز، تفریحی اور دستیاب ہو تو مزاحیہ کہانی کو بھی ضرور جگہ دیتے ہیں۔

آپ حالم نہیں پڑھ رہیں شاید وہ سپر فینٹسی بھی ہے

اس میں سسپنس اور مسٹری بھی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک پیغام بھی دے رہی ہے۔ اور ہم نے بھی اپنی رائٹرز کو پابند بھی نہیں کیا کہ وہ صرف ساس نندوں پر لکھیں۔وہ معاشرے کی جراحی کے لیے اپنے قلم کو بطور نشتر ضرور استعمال کریں۔ ہمارے صفحات حاضر ہیں۔پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثوبیہ شین نے باغ خورد اٹک سے لکھا ہے

کاغذ کی ناؤ بھی ہے کھلونے بھی ہیں بہت
بچپن سے پھر بھی ہاتھ ملانا محال ہے

آہ!وہ بیتا ہوا بچپن، کاش کہ گزرا ہوا وقت واپس آسکتا۔اگر گذرا وقت واپس نہیں آسکتا تو یوں کیوں نہیں ہوتا کہ ماضی کے نقوش ذہن سے مٹ جائیں۔

آج دل بے حد اداس ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، ویرانی ہی ویرانی ہے۔سوچا آپ سے حال دل کہہ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا کرلوں۔

ج: پیاری ثوبیہ!انسان ہمیشہ ماضی اور مستقبل میں جیتا ہے اور یہی اس کی غلطی ہے۔جو گزر گیا وہ گزر گیا اور جو ہوگا وہ ہو کر رہے گا تو کیوں نہ حال میں جیا جائے۔ آج کی خوشیاں، آج کی محبتیں یاد رکھیں۔محبت کرنے سے ہی محبت ملتی ہے۔اچھے دوست بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں جو ہمارا دکھ بانٹتے ہیں ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اندھیروں اور مایوسی میں ہمارا ہاتھ تھامے رہتے ہیں۔آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہم سے بانٹنا چاہا اس کے لیے شکر گزار ہیں۔

مقدس آصف،رائے ونڈ ضلع لاہور سے لکھتی ہیں

نومبر کا ٹائٹل پسند آیا۔سادہ سا انداز تھا ماڈل کا۔ ''شہزاد'' کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔''خواب شیشے کا'' عفت جی ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں۔سدرہ حیات کا مکمل ناول بہت زبردست آئندہ ماہ دیکھ کے حلق تک کڑوا ہوگیا۔اقدس کا کردار بہت اچھا ہے۔پلیز اقدس کو رلائیے گا مت۔''سنہری دھوپ'' بالکل پسند نہیں ہے۔ افسانوں میں ''یہ کہانی نہیں'' نمبرون پہ رہا۔راشدہ رفعت جی نے بہت اچھا لکھا۔ واقعی رشتوں کو نبھانا آرٹ ہے۔''تاریخ کے جھروکے'' ہر بار کی طرح زبردست تھے۔باقی سارا رسالہ ہی زبردست ہے۔قاری بہنوں سے التماس ہے کہ میرے لیے دعا کیجئے میرا (16) اکتوبر کو ایکسڈنٹ ہوا ہے جس کی وجہ سے میری کولہے کی ہڈی تین جگہ سے فریکچر ہوئی ہے ڈاکٹر نے تین ماہ فل بیڈ ریسٹ بولا ہے۔نہ میں اٹھ کے بیٹھ سکتی ہوں اور نہ اپنے پیارے بیٹے (علی حسن) کے کام کرسکتی ہوں اب بھی لیٹر لیٹ کے لکھ رہی ہوں۔

ج: پیاری مقدس! آپ کے ایکسڈنٹ کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو شفائے کاملہ عطا کرے۔آمین۔

آپ کی محبت ہے کہ آپ نے بستر پر لیٹ کر ہمیں خط لکھا، آپ کی اس محبت کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔یہ محبتیں ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔

فوزیہ تمر بٹ بانیہ عمران اور آمنہ رئیس گجرات سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

زندگی آ بیٹھ ذرا بات تو سن
دوست بھول بیٹھے ہیں، کوئی مشورہ تو دے

مابدولت کا ذاتی شعر ہے۔

ماڈل پسند آئی۔پہلی شعاع پہلے نگاہوں میں سمائی اور باتیں دل میں اترنے والی۔سب سے پہلے ''خواب شیشے کا'' پڑھا۔اس ماہ کی قسط قسم سے بہت بور تھی۔کچھ تو اسٹوری میں نیا پن لائیں۔

دوسرا ناول سنہری دھوپ پڑھا۔الیاس ماموں اور عمر کی جو درگت بن رہی ہے۔بہت اچھا لگ رہا ہے۔

راشدہ رفعت کا ویل ڈن ایک تو تحریر اچھی تھی دوسرا ہدایت اللہ کی یاد تازہ کروادی۔طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی یہ تحریر پڑھ کر۔سدرہ حیات کے کچھ خواب ان آنکھوں میں بہت دلچسپ لگا۔ام ایمان کا تم لوٹ آنا بھی فیورٹ رہا۔ہیروئین سے زیادہ مجھے ہیرو وہ اچھے لگتے ہیں جو مخلص اور وفا شعار ہوں۔

افسانوں میں قرۃ العین کا ''سود و زیاں کا حساب'' نمبرون رہا۔''تماشا'' دوسرے نمبر پر اور ''پیاز زندگی'' تھرڈ پر۔بندھن میں شہزاد شیخ دونوں کپل اچھے لگ رہے تھے۔جب سے تجھ سے ناتا جوڑا اتنا قریبی رشتہ تھا (خالہ) کا تو کیا پہلے پتا نہیں تھا۔اتنی ہی ظالم تھی تو نہ رشتے کرتے۔ہما نواب کے زمانے کی ایک ساتھی فنکارہ ہوتی تھی ہم نام بھی ہما میر۔ان کو بھی ڈھونڈ کے لائیں۔

تاریخ کے جھروکوں سے بہت اچھا تھا۔ موسم کے پکوان کچھ نہ کچھ ٹرائی کرتی رہتی ہوں ناظمہ حماد (چکوال) کو میرے ہاتھ کی بنی بریانی بہت پسند ہے۔
ہر دوسرے خط میں قاری فرینڈ در شہوار کو چھچھوری کہہ رہی ہیں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ بھئی در شہوار ہادی کو پسند کرتی ہے شاید محبت بھی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مرضی ہے کہ وہ اس رشتے کو کیسے ہینڈل کرے۔
کوثر جی کو بہت سارا اسلام اور نئے مہمان (پوتے) کو ڈھیروں پیار۔
ایک ریکویسٹ ہے بنت سحر اور سمیرا حمید سے کوئی اچھا سا ناول لکھوائیں۔ اقصیٰ شمس کوثر جی، ثمینہ جی کو میرے خط کا انتظار رہتا ہے۔ شاید آپ کو بھی پتا نہیں' یہ میری خوش فہمی ہے یا غلط فہمی۔ چار دن سے دانت میں درد ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے کہ دل کا درد زیادہ ناقابل برداشت ہوتا ہے یا دانت کا۔ ویسے دانت کا درد نانی یاد کروا دیتا ہے۔
خیر تمام قاری دوستوں (خالہ، آنٹی بہن کہنے پر پابندی ہے بھئی) کے تبصرے اچھے تھے اور آپ کے تو کیا ہی کہنے ہیں مجال ہے جو کسی کو بخش دیں۔
چار صفحوں کا خط چار لفظوں میں بیان کر دیتی ہیں ویسے ہی جیسے ٹیلر کو سوٹ کا کپڑا دیں تو ڈیزائننگ کے نام پر آدھا کپڑا غائب ہو جاتا ہے۔
ج: پیاری فوزیہ! ہمارے دل میں درد ہو یا دانت میں ہمیں تو بس اللہ یاد آتا ہے۔ محبت تو واقعی چھچھوری نہیں ہوتی مگر محبت کرنے والی چھچھوری ہے۔
بالکل فوزیہ آپ کے اتنے جامع اور دل چسپ خط کا ہمیں بھی انتظار رہتا ہے۔ اور یہ قاری فرینڈ کی اصطلاح تو بہت پسند آئی۔ بہن کہنے پر ہمیں ہرگز اعتراض نہیں لیکن خالہ، آنٹی، دادی، اماں ہمیں واقعی پسند نہیں ہے۔ اچھی خاصی عمر کی خاتون جو خود دادی، نانی بن چکی ہوں جب وہ اپنی ہم عمر کو باجی یا آنٹی کہتی ہیں تو سامنے والی کے تاثرات دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کی بریانی مزے دار ہوتی ہے یا نہیں اب اس کا فیصلہ تو بریانی کھا کر ہی کر سکتے ہیں۔
مریم سعود احمد حافظ آباد سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے
آج کے اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بھی آپ کے ادارے کے ڈائجسٹ ماشاء اللہ اپنی اہمیت اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک آپ کی ان پر خلوص کاوشوں کے لیے اجر عظیم عطا کرے۔ اور اس کے ساتھ تین افسانے بھی ہیں۔
ج: پیاری مریم! بہت نوازش کہ آپ نے ہماری کوششوں اور کاوشوں کو سراہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ادارے کی ترقی میں آپ قارئین کا بھی بہت بڑا حصہ ہے آپ نے ہماری پذیرائی کی۔ حوصلہ افزائی کی تو ہم آج اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔
افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔
طٰہٰ مصطفیٰ فاروق آباد سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے
شعاع سے جو تعلق وابستگی ہے اٹوٹ، خوب صورت مستقل۔ سوچا کیوں نہ آدھی ملاقات کرلی جائے۔ تو جناب اک عاجزانہ سوال ہے کہ ایسا کون سا ذخیرہ الفاظ استعمال کیا جائے کہ ہم بھی آپ کے سوہنے من موہنے ڈائجسٹ میں لکھاری کہلائے جائیں۔
شہزاد کے ہم زاد سے متعارف کروا دیں؟ باقی سلسلے زبردست تھے۔ تو آپ بتا دیں میں کب اپنی کارگزاری بھیجوں کیونکہ مصنفہ بننا میرا خواب ہے بلکہ جنون ہے۔
ج: پیاری طٰہٰ! کہانی اگر ذخیرہ الفاظ سے وجود میں آتی تو تمام ڈکشنریاں اور لغات کہانیاں ہوتیں۔ کہانی کے لیے مضبوط پلاٹ، جان دار مکالمے، اور کلائمکس ضروری ہے پھر کہانی کو سہارا دینے کے لیے منظر کشی اور کرداروں کی نشست و برخاست بھی اپنی جگہ پر ہے۔ اس تفصیل کو لکھنے کا مقصد ان تمام قاری بہنوں کی رہنمائی کرنا ہے جو کہانی لکھنا چاہتی ہیں۔ لکھتی بھی ہیں مگر کہیں نہ کہیں ان میں سے کسی ایک اصول کو چھوڑ دیتی ہیں پھر کہانی میں دلچسپی کا عنصر بھی ضروری ہے۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر کوئی خوش گوار انجام کا ہلکا پھلکا سا افسانہ لکھیں۔
مہناز یوسف نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں
پہلی شعاع میں لکھی گئی باتوں سے سو فیصد متفق ہوں۔ واقعی ہمارے معاشرے میں عدم برداشت کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا

کرم فرمائے آمین۔

ذہین، شرارتی، ناراض اور محبتوں والی بہنوں کے خطوط سے سجی یہ محفل مزہ دے گئی۔ تمام خطوط زبردست مگر صائمہ مشتاق کے خط نے تو محفل ہی لوٹ لی۔ شازیہ الطاف کے افسانے ہر بار ایک ہی نشست میں ختم کیے۔ شازیہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔

نعیمہ ناز کا تماشا دیکھا۔ خاصا دلچسپ اور حقیقی لگا۔ شازیہ جمال ہوں اور انہیں نہ پڑھا جائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

سدرہ حیات کا مکمل ناول پڑھنا شروع کیا تو آغاز پر ہی اقدس کے دلچسپ ڈائیلاگز پر مسکراہٹ میرے لبوں کو چھو جاتی۔ بہت دیر بعد سوچا کہ دیکھوں کہ کتنے صفحے رہ گئے اختتام میں، تو اُف...... تین صفحوں بعد ''دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ'' پڑھ کر شدید ترین کوفت ہوئی۔ شازیہ جمال طارق نے کمال کا ناول لکھا۔ خاص طور سے اختتام۔ عطیہ خالد کا ناولٹ کمال تھا۔ مگر اختتام بہت جلدی میں کیا گیا کچھ واضح کر کے لکھنا تھا۔ دراصل اچھا اچھا لکھنے والی مصنفائیں بہت ذہین ہوتی ہیں۔ مگر ہم جیسے ناسمجھ قاری کا بھی کچھ خیال رکھنا چاہیے نا۔

جیسے فرزانہ کھرل بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ ان کے لکھے ڈائیلاگز بہترین ہوتے ہیں۔ مگر پچھلی دو تین کہانیاں ان کی لکھی میرے سر سے گزر گئیں۔ اتنا تجسس اتنا الجھاؤ۔ آج کل کہانی میں تجسس برقرار رکھنے پر بھی خاصا زور ہے رائٹرز کا۔ پچھلی بار ''انت بھلا سب بھلا'' بہت اچھی لگی۔ اس ماہ ایسی کوئی ہنستی مسکراتی تحریر دکھائی نہیں دی۔ اس بار کے شعاع میں ایک بھی تحریر ایسی نہیں جسے کہا جا سکے کہ ''بس عام سی تھی'' بہت خوشی کی بات ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ بھی شعاع اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے۔

راشدہ رفعت کا ناولٹ۔ واہ بھئی کیا کہنے۔ ایسی ہی تحاریر تو ہیں جو لڑکیوں میں شعور پیدا کرتی ہیں۔ قراۃ العین سکندر نے بھی بہت مختلف اور اچھا افسانہ لکھا۔ خواب شیشے کا زبردست جا رہا ہے۔

ج: پیاری مہناز یہ بتائیں کہ آپ نے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ آپ کو ہنستی مسکراتی تحریریں پسند ہیں۔ ہمیں بھی ایسی ہی تحریریں اچھی لگتی ہیں جب آپ نے پہلا افسانہ لکھا تو ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہمیں ایک ایسی مصنفہ مل گئی ہے جو مزاح بھی لکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ نے خاموشی اختیار کر لی۔ آپ کوئی ہنستی مسکراتی تحریر لکھیں ہم انتظار کر رہے ہیں۔

سعدیہ کنول نے حویلی لکھاتے لکھا ہے

کہیں پڑھا تھا کہ قلم تب اٹھاؤ جب علم چھلکنے لگے اور ایسا تو پتا نہیں کبھی ہوگا یا نہیں، اس لیے اور کوئی تحریر تو نہیں لکھ سکی آپ کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ شعاع اپنی باجی کو دیکھ کر پڑھنا شروع کیا امید ہے آگے بھی پڑھتی رہوں گی۔ حالانکہ اب شعاع میں پہلے جیسی بات نہیں رہ گئی۔ وقت، معاشرہ اور حالات بدلنے کے ساتھ شعاع بھی ویسا تو نہیں رہ سکتا تھا نا۔ پھر بھی دل تو چاہتا ہے نا کہ رنگوں کی، خوشبو کی باتیں ہوں امید کے جگنوؤں کی کہانیاں ہوں رواداری اور رشتوں کی روشنیوں سے سجی ہوئی۔ لیکن دنیا بہت فاسٹ ہو گئی ہے اس لیے کچھ نئی رائٹرز بھی کم وقت میں زیادہ لکھنا چاہتی ہیں شاید اسی لیے ڈراموں میں سے اور ادھر ادھر سے نئی پرانی کہانیوں سے لائنیں لے کر ناول لکھ لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی نئی رائٹر واقعی اچھا لکھ رہی ہیں صائمہ مشتاق کے خط کو اگر لیٹر آف دی منتھ کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے بھی وہ سب ڈائجسٹ پڑھے ہوئے (مجھے اتنا پرانا مت سمجھیں پرانے ڈائجسٹ ڈھونڈ کے اور کچھ باجی کے پڑھے ہوئے) کیا منظر نگاری ہوتی تھی کہ گرمیوں میں کوئی دسمبر جنوری کا شمارہ ملا تو منظر اور مکالمے پڑھ کے بے اختیار دھوپ میں بیٹھ کے مالٹے اور مونگ پھلی کھانے کو دل چاہا اسی طرح سخت سردی میں جون، جولائی کا شمارہ ملا تو بارش انجوائے کرنے اور آم کھانے کو دل کرنے لگا۔ پرانی رائیٹرز تو ٹی وی پہ اتنی مصروف ہو گئی ہیں کہ ڈائجسٹ کو بھول ہی گئیں انہیں کہیں کہ پیچھے رہ جانے والوں کو بھولا نہیں کرتے۔

ج: پیاری سعدیہ! اتنا اچھا خط لکھ سکتی تھیں تو اتنی تاخیر کیوں کی۔ پہلے رشتوں میں رواداری ہوتی تھی یہ درست ہے مگر محبت اور رواداری اب بھی ہے۔ بس پہلے جیسی فراغت نہیں رہی ہے۔ محبتیں تو ہیں لیکن ان کے اظہار کے لیے مل بیٹھنے کے لیے، وقت نہیں ہے۔ رنگوں اور روشنیوں کی باتیں اب بھی اچھی لگتی ہیں لیکن وہ سکون

کہاں کہ ان باتوں سے بیٹھ کر لطف اندوز ہو سکیں۔ تفریح کے بے شمار ذرائع، سینکڑوں ٹی وی چینلز انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا یہ ایک نئی دنیا ہے۔ جس میں داخل ہو تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ پھر بڑے شہروں کے مسائل آپ تو کراچی میں رہتی ہیں جانتی ہوں گی یہاں کی سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کا جو حال ہے۔ کسی سے ملنے جائیں تو چار گھنٹوں میں سے تین گھنٹے تو سڑک پر ہی گزرتے ہیں اب رائٹر رنگوں ، روشنیوں اور موسموں کی باتیں کیسے کر سکتی ہیں۔

شازیہ قیصر نے گاؤں نروال تحصیل سرائے عالمگیر سے لکھا ہے

شہزاد نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی "خواب شیشے کا" ویسے شروع میں جتنا انٹرسٹنگ تھا اب عفت سحر جی برامت مانیے گا، نہایت بور کر رہی ہیں اور "کچھ خواب ہیں" سدرہ حیات کا پڑھ کر اچھا لگا لیکن آخر میں باقی آئندہ دیکھ کر پھر ایسے لگا جیسے کڑوا کریلا کھا لیا ہو۔

فہرست میں شازیہ الطاف کا ذکر نہیں تھا لیکن آگے کہانی تھی۔ شازیہ جی کی یہ خوبی ہے وہ چھوٹے افسانوں کے ذریعے بہت بڑی بات کرتی ہیں۔ شاعری سے مجھے کوئی خاص شغف نہیں اور "تاریخ کے جھروکے" اور لطیفے میرے ہارٹ فیورٹ "حضرت آدم و حوا" کے بارے میں اتنی معلومات دینے پر بہت بہت شکریہ۔

ہمیں ہر مہینے سمیرا حمید کا انتظار رہتا ہے لیکن یہ خواتین میں تو دھڑا دھڑ لکھتی ہیں۔

ج: پیاری شازیہ بہت معذرت کہ آپ نے دو سلسلوں کے لیے اپنی تحریریں بھجوائیں اور دونوں ہی شائع نہ ہو سکیں۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" کا سلسلہ ختم نہیں کیا گیا۔ کبھی کوئی ناول طوالت اختیار کر جاتا ہے۔ کبھی قسط لیٹ موصول ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہم اس سلسلے کو شامل نہیں کر پاتے ہیں۔ ناتا جوڑا ہے میں ان شاء اللہ آپ کی تحریر ضرور شائع ہو گی۔ بہت طویل تحریریں جو کئی اقساط پر ہوں ہمیں بھی بالکل پسند نہیں۔ لیکن کسی اچھی تحریر کو صرف اس بنا پر تو ریجیکٹ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ طویل ہے۔ مجبوراً اسے دو قسطوں میں شائع کرنا پڑتا ہے۔

شبنم حنیف لاہور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع میٹرک کے پیپرز سے فارغ ہونے کے بعد اپریل 2013ء سے پڑھنا شروع کیا۔ اگرچہ گھر میں رسالے پڑھنا منع تھے پھر بھی ہم تینوں بہنیں 300 روپے پاکٹ منی سے جوڑ کر تینوں رسالے منگواتے۔ 150 کے رسالے آتے اور 150 کرایہ لگتا۔ بھائی کو تین بار جانا پڑتا۔ میرا بڑا بھائی محمد رفیق جس کی ایک ٹانگ میں فالج ہے پھر بھی وہ دو سال تک ہمارے لیے رسالے لاتا رہا۔

لیکن ایف کے بعد کوئی پابندی نہ رہی اب عمران بھائی خود ہر ماہ لا دیتے ہیں بس ایک میسج کرتی ہوں اور رسالے حاضر۔ اب تو چھوٹے بھائی نے خط لکھنے کے لیے لفافے بھی لا دیے ہیں۔ میں اپنے تینوں بھائیوں اسپیشلی بڑے بھائی کو اس خط کے ذریعے تھینک یو کہنا چاہوں گی۔ اب آتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی جانب ناول اچھی لگی شہزاد بہت اچھا جا رہا ہے "خواب شیشے کا" عفت جی ویل ڈن "سنہری دھوپ" بھی اچھا لگتا ہے۔

ج: پیاری شبنم! آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو محبت کرنے والے بھائی دیے۔ بہنیں تو سب ہی بھائیوں پر جان نچھاور کرتی ہیں لیکن بھائی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بہنوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ویسے آپ بھی بہت اچھی بہن ہیں جو بھائیوں کی محبت کی قدر کرتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی لیکن تبصرہ بہت مختصر کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

صائمہ مشتاق نے بھاگٹانوالہ سرگودھا سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع میں نے 2005ء میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں 5th کلاس میں تھی اور آٹھ سال کی تھی اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ شعاع سے وابستگی پرانی ہے۔

ج: پیاری صائمہ! اتنی طویل رفاقت نبھانے کے لیے ممنون ہیں یہ اللہ کا کرم ہے کہ قارئین ہمیشہ، زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ سے گزرنے کے باوجود شعاع کے ساتھ رہیں۔ اپنی کزن اقراء ممتاز کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔

عائشہ مرزا لکھتی ہیں

سرورق پر براجمان دوشیزہ کے لفٹ نہ کروانے پر

(ارے بھئی وہ سنگھار میں بزی تھیں) ہم سلسلوں کی جانب بڑھے "پہلی شعاع" چند الفاظ میں بہت کچھ سمجھا دیا۔ "حمد ونعت"

اور "پیارے نبی کی پیاری باتیں" سبحان اللہ۔ "گلریز" میرا مطلب "شہزاد شیخ" سے ملاقات کی بے حد خوشی ہوئی لیکن حنا شیخ کچھ زیادہ دل نہ جیت سکیں۔ "جب تجھ سے ناتا جوڑا" اس دفعہ "ط۔ ی۔ الف" کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہماری تو باجیاں یا آپیاں جو اپنے شادی کے بعد کے حالات لکھتی ہیں جن پر بہت ظلم ہوا۔ میرے خیال میں ان کو اسی وقت ظلم کے آگے ڈٹ جانا چاہیے تھا۔ ظلم سہنے والا کرنے والے سے زیادہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت کچھ نہیں کرسکیں تو آج بھی اپنا دل برا نہ کریں وہ سب یاد کرکے اور خود کسی کے ساتھ وہ سب نہ کریں جو کبھی آپ کے ساتھ ہوچکا۔

ج: پیاری عائشہ! ظلم کے خلاف واقعی ڈٹ جانا چاہیے مگر شادی شدہ خواتین اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے یا اپنی اولاد کے لیے ہر طرح کا سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ جہاں تک یاد کرکے دل برا کرنے کی بات ہے تو یہ سلسلہ کسی کو برا کہنے یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے نہیں شروع کیا گیا بلکہ اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے احساس کو جگایا جائے جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر معمولی ہوتی ہیں۔ دل پر کتنے گہرے داغ چھوڑ جاتی ہیں۔ ان باتوں کا خیال رکھیں۔

ناہید تنویر سمندری نے اشرف آباد سے لکھا ہے

۲۰۰۲ء میں شادی ہوئی تو میرے شوہر تنویر صاحب نے میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے کبھی شعاع اور کبھی خواتین لا کر دیے۔ پھر تو کسی اور ڈائجسٹ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ میرے میاں سعودیہ میں ہوتے ہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے ماشاء اللہ آٹھویں میں پڑھتا ہے احمد تنویر۔ اگر خط شائع ہوگیا تو پھر جب تجھ سے ناتا جوڑا میں شریک ہوں گی۔

ج: پیاری ناہید! سب سے پہلے تو آپ کے میاں صاحب کی تعریف کریں گے جنہوں نے آپ کا شعاع اور خواتین سے تعارف کرایا اور پھر ہر ماہ لا کر دیتے رہے اور یہ بات سمجھ میں نہیں آئی "تجھ سے ناتا جوڑا" کا خط کی اشاعت سے کیا تعلق؟ آپ اس سلسلے میں بلکہ شعاع کے ہر سلسلے میں شرکت کریں اتنے طویل عرصے سے شعاع کی قاری ہیں تو آپ کو خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار بھی کرنا چاہیے۔

جویریہ صدف گلزار نے جتوئی سے لکھا ہے

کہاں سے بات شروع کروں؟ چلیں پہلے حال کا حال کہہ دیا جائے پھر ماضی میں جھانکیں گے۔ نمرہ احمد اور سمیرا حمید دونوں ہی بہت زور قلم رکھتی ہیں۔ بہت اعلیٰ، عمدہ اور شاندار طرز تحریر کی مالک ہیں۔ ان کی تو ہر تحریر پر الگ الگ تعریفی وتنقیدی مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بلاشبہ شعاع کا ہر سلسلہ بہت اچھا، پراثر اور معلوماتی ہوتا ہے۔ اب میں ان رائٹرز کی بات کروں گی جواب نہ جانے کہاں کھوگئی ہیں۔ جیسے سسٹرز، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار، نگہت سیما، ثمرہ بخاری، ان سب کو میں بہت مس کرتی ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ان سب کے لیے "میرے گم شدہ" کے عنوان سے ایک مضمون نما خط لکھوں جس میں ان سب کی بہترین تحریروں کو مختصراً ہراؤں جو اگرچہ کئی برس پہلے پڑھی تھیں مگر اب تک حافظے میں محفوظ ہیں اور مضمون کے عنوان سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میں فاخرہ جبیں کو کتنا یاد کرتی ہوں کہ یہ ان کی ایک کہانی کا عنوان تھا۔ ان سب پیاری رائٹرز کے پرانے ناولز کو ہر مہینے شعاع یا خواتین میں دوبارہ شائع کردیں۔

ج: پیاری جویریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنی رائے کا اظہار کیا "میرے گمشدہ" مضمون ضرور لکھیں۔ یقیناً بہت دلچسپ ہوگا۔ آپ کی تجویز بہت اچھی ہے، ہم پرانی مصنفین کی تحریریں ضرور شائع کریں گے۔

واصفہ سہیل

آئینہ خانے میں



خواب

عاصم کو آپ آج کل شوکت تھانوی کے ناول پر مبنی سیریل ''چلی'' میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے عاصم اظہر گلوکاری کے میدان میں بھی اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ گزشتہ دنوں عاصم اظہر نے اپنی والدہ کے ساتھ ایک ایک ایوارڈ شو میں شرکت کی۔ جو ان کا دیرینہ خواب تھا۔ عاصم اظہر اس بارے میں کہتے ہیں کہ میرا۔ خواب سچ ہو گیا ہے، یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، جب میں ہاتھ میں اپنا ہیئر برش لے کر آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ (تو آپ بھی عاصم!) اور کسی ایوارڈ شو میں پرفارم کرنے کی اداکاری کرتا تھا۔ کبھی کسی کو ایوارڈ دینے کی اداکاری کرتا تھا۔ (اور ایوارڈ لینے کی...... بھئی اداکاری۔) اور آج یہ سب سچ ہو گیا۔ ہے۔ مجھے یہ اعزاز دیا گیا کہ



اہلیت

ہانیہ عامر کو شوبز میں آئے ابھی صرف دو برس بھی مکمل نہیں ہوئے ہیں۔ راولپنڈی سے تعلق رکھنے والی ہانیہ نے کم عمری اور کم وقت میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ انہیں حال ہی میں ایک فلم میں سپورٹنگ اداکارہ کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ہانیہ اس بارے میں کہتی ہیں کہ ''کم وقت میں زیادہ شہرت نے ان کا مزاج تبدیل نہیں کیا۔ (یہ تو آپ کو جاننے والے ہی بتا سکتے ہیں۔) وہ سمجھتی ہیں کہ انہیں جو کچھ مل گیا ہے، وہ ان کی اہلیت سے زیادہ ہے۔ (اچھا......؟) ہانیہ عامر مزید کہتی ہیں کہ انہیں آڈیشن کے اگلے روز ہی منتخب ہونے کی نوید سنائی گئی۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اپنے نوآموز ہونے کا بھی کمپلیکس نہیں رہا۔ وہ سب کے ساتھ دوستانہ بنیادوں پر کام کرتی ہیں۔ (اور دوسرے آپ کے ساتھ......؟)

میں ایوارڈ میں سب سے آخری پرفارمنس پیش کروں اور پوری شوبز انڈسٹری کے لوگ میرے پیچھے کھڑے تھے۔ اس کا تو میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میرے سامنے وہ خاتون بھی بیٹھی تھیں، جنہوں نے مجھے زندگی میں چلنا سکھایا۔ وہ میری پیاری امی تھیں۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے آج مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ میں اپنے مداحوں کے بغیر کچھ نہیں۔ (سوتو ہے)

فرق

فلموں کے حوالے سے محسن عباس کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ فلموں کے حوالے سے محسن عباس کہتے ہیں۔ ''میرا خیال ہے کہ انڈین فلموں پر پابندی لگائے جانے کے بعد ہم نے بہت سے فلم بین کھودیے ہیں۔ یہ اقدام اس لحاظ سے مزید برا ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں اچھی فلمیں نہیں بن رہیں۔'' (تو آپ کی فلم کیا ہے؟) انہوں نے مزید کہا کہ ویسے اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلم میکرز اچھی فلمیں نہیں بنا رہے یا فلم بینوں کا



معیار اونچا ہوگیا ہے۔ (پہلا خیال زیادہ اچھا ہے بھئی۔) یا یہ کہ وہ مختلف انداز کا سینما دیکھنے کے عادی ہوچکے ہیں۔ (نہیں جناب! ایسی فلمیں تو وہ پڑوسیوں کی بھی...... دیکھ لیتے ہیں، آئٹم نمبر والی۔) بہرحال ناکامی کی وجہ جو بھی ہو، لیکن میں کم از کم اتنا جانتا ہوں کہ لوگ اب اتنے سمجھ دار ہوچکے ہیں کہ وہ معیاری اور غیر معیاری فلم کا فرق کرسکتے ہیں۔ (یعنی پہلے لوگ......؟)

لگن

گلوکارہ مسکان جے کہتی ہیں۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ ٹیکنالوجی نے بہت سے لوگوں کو گلوکار بنادیا ہے۔ (جیسے کہ آپ......؟) پہلے لوگ کئی کئی گھنٹے ریاض کرتے تھے، محنت کرتے تھے۔ پھر عوام کے سامنے پرفارم کرتے تھے۔ اب کوئی ریاض کرے نہ کرے لیکن سی ڈی ریکارڈنگ کرواکے گلوکار بن جاتے ہیں۔ (تجربہ اسی کو کہتے ہیں۔) میں ذاتی طور پر لائیو گلوکاری کو پسند کرتی ہوں۔ (جی! لائیو میں گلوکارہ کم اداکاری زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ اچھل کود اور......) لیکن کبھی کبھی شوز میں یا کسی تکنیکی اعتبار سے مجبوری کے باعث سی ڈی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ (جی ہاں! آواز کی کوالٹی یا سر کی کمی کے باعث بھی) مسکان جے نے مزید کہا کہ ''جس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو، اسے محنت اور لگن کی ضرورت نہیں رہتی۔ (اوہ...... واہ...... بلے بلے۔ کیا سوچ ہے۔) بہت سے فن کار محنت اور لگن سے کام میں لگے رہتے ہیں لیکن قسمت کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ادھر اُدھر سے

جنرل پرویز مشرف خود کچھ بھی کہتے رہیں۔ ان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اپنے ٹوئیٹر اکاؤنٹ سے جنوری 2012ء میں خود اس غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

"مجھے بے قصور عافیہ صدیقی کو امریکیوں کے حوالے کرنے کا گہرا صدمہ ہے، یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔"

(مظفر اعجاز......قلم رو)

☆ برسوں پر محیط سفر اس کے ہزاروں نشیب و فراز اور لاتعداد قربانیوں کے باوجود بھی لگتا ہے پاکستانی جمہوریت ریت کی دیوار ہے۔ اس میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے دو چار کنفیوژن پھیلانے والے بیانات اور چند جذباتی تقریریں ہی کافی ہیں۔ لانگ مارچ اور دھرنے تو اسے ہلا کر رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بحرانوں، سازشوں، مار دھاڑ، جلاؤ، گھیراؤ میں خود کفیل سماج میں کیک چھوٹا ہے اور اسے جلدی جلدی کھانے کے خواہش مند زیادہ ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ہر وقت سازشی تھیوریاں اسلام آباد میں ہلچل مچائے رکھتی ہیں اور سیاسی پنڈت نئے نئے نسخے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ بات تجزیوں اور تحریروں تک رہے تو خوب میلہ لگا رہتا ہے۔

(اخبار جہاں جولائی 2014ء)

☆ میں آپ کے سامنے زندہ مثال بیٹھا ہوں۔ جس جج جاوید عاصم نے مجھے سزا دی تھی، اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ کیس میں تو کچھ نہیں لیکن میں نے جو فیصلہ دینا ہے۔ وہ میری دراز میں پڑا ہے۔

(صدیق الفاروق)

☆ صرف اہل بصیرت کی بات نہیں، میرے اللہ نے جس کسی کو بھی تھوڑا بہت علم آنے والے دنوں کا عطا کیا ہے، وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ 2012ء کا سورج پاکستان کا سورج ہے۔

(حرف راز۔ 2008ء اوریا مقبول جان)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

اسپیشل فروٹی کھیر

اجزا :

آم' انناس	آدھا' آدھا کپ
دودھ	دو کلو
چینی	دو کپ
چاول	ایک چوتھائی کپ
فریش کریم	آدھا پیکٹ
پستے' بادام	سجاوٹ کے لیے

ترکیب :

دودھ کو ابال لیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ چاول دو گھنٹے بھگونے کے بعد پیس کر دودھ میں ڈال دیں اور ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔ ساتھ ساتھ چمچہ ضرور چلاتی رہیں۔ پسی الائچی بھی ڈال دیں۔ جب کھیر گاڑھی ہوجائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈی ہونے پر کریم اور تمام فروٹس کیوبز میں کاٹ کر شامل کرلیں۔ کترے ہوئے پستے' بادام اور چاندی کے ورق سے سجائیں اور خوب ٹھنڈی کرکے پیش کریں۔

فرائیڈ بالز سینڈوچ

اجزا :

چکن قیمہ	ایک کپ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا' مرچ	حسب ضرورت
میدہ	ایک کپ
ڈبل روٹی	چھ سلائس
انڈا	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز اور لہسن سنہری کرکے چکن قیمہ' نمک اور کٹی لال مرچ ڈال کر بھونیں۔ ہری مرچ' دھنیا ڈالیں اور ٹھنڈا کرلیں۔ سلائس کو بیلن سے چپٹا کرکے اس کے کناروں پر انڈا لگائیں۔ قیمے کا مکسچر رکھ کر چاروں طرف سے فولڈ کرکے بالز بنالیں اور فریج میں رکھ دیں۔ میدے میں نمک' سیاہ مرچ اور تھوڑا سا پانی

ملا کر پتلا سا آمیزہ بنالیں۔ سینڈوچ بالز کو میدے والے آمیزے میں ڈبو کر گہرے گرم تیل میں فرائی کریں۔ ٹشو پیپر پر نکال کر اضافی چکنائی جذب کریں اور کیچپ کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

فرائیڈ مسالا چانپ

اجزا برائے ویجیٹیبل مسالا :

پیاز (درمیانہ سائز)	1عدد
ٹماٹر (درمیانہ سائز)	2عدد
شملہ مرچ (درمیانہ سائز)	1عدد
ہرا دھنیا	چوتھائی گڈی
ہری پیاز (صرف پتے)	1عدد
لہسن پیسٹ	1کھانے کا چمچ
ثابت دھنیا	1کھانے کا چمچ
ثابت زیرہ	1کھانے کا چمچ
کٹی لال مرچ	1کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	3کھانے کے چمچ

اجزا

بکرے کی چانپ	1کلو
کوکنگ آئل	1کپ
لہسن پیسٹ	1کھانے کا چمچ
ادرک پیسٹ	1کھانے کا چمچ
ثابت لال مرچ	15دانے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

ایک کڑاہی میں چانپ ' پانی ' کوکنگ آئل لہسن پیسٹ ' ادرک پیسٹ ' ثابت لال مرچ اور نمک ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ پانی خشک ہو جائے اور صرف تیل باقی رہ جائے۔ اسی تیل میں چانپ کو اچھی طرح فرائی کر کے علیحدہ برتن میں نکال لیں۔

اب پیاز ' ٹماٹر ' شملہ مرچ ' ہرا دھنیا اور ہری پیاز کے پتوں کو نارمل سائز میں کاٹ لیں۔ کڑاہی میں تین کھانے کے چمچ کوکنگ آئل گرم کریں۔ اس میں زیرہ ' دھنیا اور لہسن پیسٹ ڈال کر اتنا پکائیں کہ لہسن کا کچا پن ختم ہو جائے۔ اب تمام سبزیاں ' کٹی لال مرچ اور نمک ڈال کر کڑاہی کو ڈھانپ دیں اور درمیانی آنچ پر اتنا پکائیں کہ سبزیاں نرم ہو جائیں اب ویجیٹیبل مسالا

میں فرائیڈ چانپ اور ثابت مرچ مکس کر دیں اور 5-4 منٹ تک پکائیں۔ لیجیے مزیدار فرائیڈ مسالا چانپ تیار ہے۔ ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں اور گھر والوں کا دل جیت لیں۔

سیاہ مرچ چکن مسالا

اجزا :

چکن	ایک کلو
ٹماٹر	چار عدد سرخ
لہسن ' ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
ثابت لال مرچ	پانچ عدد
دہی	ڈیڑھ کپ
پیاز	ایک عدد درمیانے سائز کا
سبز مرچ ' سبز دھنیا ' پودینہ	حسب ضرورت
زیرہ ' اجوائن ' خشک دھنیا	آدھا آدھا چائے کا چمچہ
کالی مرچ	پندرہ سے بیس عدد
نمک ' گھی	حسب ضرورت

ترکیب :

پیاز کو لچھوں کی صورت میں کاٹ کر رکھ دیں اور ٹماٹر موٹے موٹے گول شکل میں ایک دیگچی میں گھی گرم کریں اور پیاز ڈال کر چمچہ چلاتی رہیں۔ ہلکا سنہرا ہونے کے بعد چکن ' ادرک ' لہسن پیسٹ ڈال کر بھوننا شروع کر دیں۔ دوسری طرف توے پر کالی مرچ ' سرخ مرچ ' زیرہ ' جوائن اور دھنیا بھون کر پیس لیں۔ یقین کریں اس مسالے کی خوشبو انسان کو پاگل کر دے گی۔ پسا ہوا مسالا اور نمک دہی میں ڈال کر مکس کریں۔ سبز دھنیا اور پودینہ باریک کاٹ لیں اور سبز مرچ لمبائی میں کاٹ کر علیحدہ رکھ دیں۔ اب چکن میں دہی ڈال کر

اچھی طرح پکائیں۔ جب دہی کا پانی خشک ہو جائے اور مسالا گھی چھوڑنے لگے تو ٹماٹر اور ہرا مسالا ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔ تاکہ ہوا نہ جائے۔ آنچ کم کر کے پانچ منٹ بعد چولہا بند کر دیں۔ سرو کرتے ہوئے ہلکے سے ہرا مسالا اور ٹماٹر مکس کر کے گرم گرم روٹی کے ساتھ پیش کریں

ایرانی تکے

اجزا :

گوشت	ایک کلو
پسا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
تکہ مسالا	چار چائے کے چمچے
سرکہ	آدھا کپ
ٹماٹو کیچپ	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
نمک ' تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ایک پیالی میں لیموں کا رس ' گرم مسالا اور تکہ مسالا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے پیاز تل کر نکال لیں۔ پھر اسی تیل میں اوپر والا مکسچر ' نمک اور سرخ مرچ ڈال کر بھونیں ' پھر ٹماٹو کیچپ ڈال کر ساتھ ہی تلی ہوئی ' پیاز بھی شامل کر کے تھوڑی دیر بھونیں اور چولہے سے اتار لیں۔ گوشت کی پسندے بوٹی بنوالیں اور اچھی طرح دھو کر سرکے اور اوپر والے مسالے میں مکس کر کے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر سیخ میں پرو کر کوئلے پر سینکیں۔ تھوڑا ' تھوڑا تیل لگاتے جائیں۔ لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

آگ......آگ......آگ......

یہ ہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری تھا۔ تین گھنٹے آتش زدگی کو ہو چکے تھے، آگ نے شہر کے تمام مکانوں، ممبروں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مکانوں کی چھتیں دھماکوں سے گر رہی تھیں۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں مل کر ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں جسے کوئی سکون سے نہیں دیکھ سکتا۔

یہ ہے واقعہ 67ء جب روم پر حکومت کرتے نیرو کو گیارہ سال ہو چکے تھے اور یہ قربانی، آگ و خون کی ہولی، گویا زمین کے سب سے بڑے دیوتا "نیرو" کے سامنے دی گئی۔

جب یہ تماشا ختم ہوا تو نیرو مسکراتا اور اٹھکھیلیاں کرتا ہوا مصر میں داخل ہوا اور اپنی مشہور زمانہ بانسری (جس کے سرخ اطلس کو فنیقیا کی لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔) رکھ کر مسند پر بیٹھ کر امرائے دربار سے مخاطب ہوا۔

"آج میں نے شہر روما کو سیاہ خاک کر کے واقعات عالم میں ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جلی حروف میں لکھا جائے گا، لیکن اسی خاک پر میں ایک عظیم روم تعمیر کروں گا، جس کی عظمت کے سامنے تم سب قدیم روم کو بھول جاؤ گے۔"

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا، مگر صرف ایک بار لیکن اس کرم نوازی کا وہ کتنا بڑا معاوضہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا، اس کا حال اس واقعے سے معلوم ہوگا۔

نیرو اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے، سب امراء دم سادھے بیٹھے ہیں۔ دفعتاً شیر کی سی دھاڑ سے حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔

خدام میں ایک شخص یونانی تھا جو اپنے آقا کے وطن ایتھنز سے بھاگ کر یہاں آیا اور جسے نیرو نے شراب خانے کا داروغہ بنا دیا تھا، اس کا نام تھا "دیوموس"۔

نیرو نے غلاموں کو حکم دیا کہ آج کے دن آگ کے خوب صورت مناظر نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔ لہٰذا حاضرین کو خوب جام بھر بھر کر شراب پلاؤ۔ جام بھر بھر کر سب کو دیے جانے لگے، سب بدمست ہو رہے تھے کہ اچانک نیرو کو خیال آیا کہ دیوموس نہیں ہے۔ اس نے پوچھا کہ دیوموس نظر نہیں آ رہا، کہاں ہے؟

جواب ملا کہ باہر انتظام میں مصروف ہے۔

یہ سن کر نیرو نے چنگھاڑ کر کہا۔ "میں نے دیوموس کو حکم نہیں دیا تھا کہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اسی کے ہاتھ سے شراب پینی ہے۔ جاؤ اس ملعون یونانی کو پکڑ کر میرے حضور پیش کرو۔"

دیوموس ہانپتا کانپتا ہوا آیا، قدموں میں گر کر معافی مانگی اور بولا۔ "میں نے عمداً یہ خطا نہیں کی بلکہ میں باہر کے انتظام میں اس قدر مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔"

لیکن نیرو نے جس کے سر پر خون سوار تھا آؤ دیکھا، نہ تاؤ۔ اپنا عصائے شاہی اٹھایا اور اس زور سے سر پر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ نیرو نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کونے میں ڈال دو، جب دعوت ختم ہوئی اور شراب سب کے دماغوں پر چڑھ گئی تو حکم دیا کہ دیوموس کو سامنے لایا جائے، پھر جلاد کو بلا کر حکم دیا کہ

اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ہاتھ کاٹ دیے گئے۔ دیوموس تکلیف سے چیخ رہا تھا۔ سب قہقہے لگا رہے تھے۔

نیرو نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“

”ہاں، یہ اذیت ناقابل برداشت ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے مار ڈالو، تاکہ اس عذاب سے مجھے چھٹکارا ملے۔“

نیرو نے جواب دیا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

جب دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے اپنے ایک ساتھی افریقی غلام سے کہا کہ تم مجھے ہلاک کر ڈالو۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ قصر کے ایک گوشے میں جا کر اس کی عیادت شروع کر دی، یہاں تک کہ اس کے زخم اچھے ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ تمام کام اپنے پاؤں سے کرنا سیکھ گیا۔

نیرو کبھی کبھار قصر کے مختلف گوشوں میں گھوما پھرا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے اس کا گزر وہاں سے ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن دھو رہا تھا۔ نیرو اسے بھول چکا تھا۔

حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

محل کے داروغہ نے ڈرتے ہوئے بتایا کہ یہ آپ کا غلام دیوموس ہے۔ جس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آپ نے دیا تھا۔ موت اس کی قسمت میں نہ تھی، اس لیے بچ گیا لیکن بدستور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے۔

نیرو بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ دیوموس کو حاضر کیا جائے۔

نیرو نے دیوموس کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اے میرے بھائی! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔“

دیوموس اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔

"اے آقا! میری جان کے مالک کل بھی آپ تھے اور آج بھی آپ ہی ہیں۔ آپ نے کل جو کیا، وہ بھی حق تھا اور جو آپ آج کر رہے ہیں، وہ بھی حق ہے۔"

نیرو نے کہا۔ "آج میں نے تمہیں آزاد کیا اور اپنے قصر کا محافظ مقرر کیا۔"

یہ کہہ کر دیوموس کو رخصت کیا اور متعدد غلام اس کی خدمت پر مامور کیے۔

اس کے بعد دس سال تک دیوموس زندہ رہا اور اس نے پاؤں سے کام کرنے کی ایسی عادت بنائی کہ پورے روم میں اس کی ٹکر کا نقاش اور بت تراش کوئی نہ تھا۔ اس نے نیرو کا بھی ایک مجسمہ تیار کیا جو ہر وقت نیرو کی خواب گاہ میں پڑا رہتا۔ جب 68ء میں نیرو کا انتقال ہوا تو یہ مجسمہ توڑ دیا گیا لیکن دیوموس بت تراشی و نقاشی میں مصروف رہا کیونکہ سارا روم اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

نہ اب...... نیرو باقی ہے نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم و ستم، دوسرے کا صبر تحمل، کیا یہ ایک مثال نہیں ہے؟

ممکن ہے نیرو کی روح اب بھی اس بات پر نازاں ہو کہ اس کی وجہ سے روم کو اتنا بڑا صاحب کمال سنگ تراش و نقاش میسر ہوا۔

(مسز عذرا عمران...... ملتان)

منوسمرتی یا میناس سمرتی

ہندوؤں کی مذہبی کتاب "منوسمرتی" ہے۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ اس کتاب کا اصلی نام "میناس سامری" یا "میناسمیری" ہو اور ہزاروں برس کے اندر آہستہ آہستہ بدلتا ہوا "منوسمرتی" بن گیا ہو؟

پرانے ہندوؤں کی کوئی تاریخ کہیں موجود نہیں ہے لیکن مصر کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا بادشاہ میناس کے نام سے گزرا ہے۔ اسی بادشاہ کو تمام مورخ ابھی حال تک پورے مصر کا پہلا فرعون مانتے رہے۔ بہت ممکن ہے کہ سامری نے ہندوستان آ کر اسی مصری فرعون کی طرف اپنی کتاب منسوب کر دی ہو اور اپنی یاد بھی باقی رکھنے کے لیے اس کا نام "میناس سامری" رکھ دیا ہو۔

پرانے زمانے کا مصر تمدن و تہذیب میں تو بہت آگے بڑھا ہوا تھا مگر مذہب اور روحانیات میں بہت پیچھے تھا۔ مصریوں کے پاس نہ تو کوئی مذہبی کتاب تھی اور نہ لکھی ہوئی دینی شریعت تھی۔ فرعون اور مندروں کے مہنت جو کچھ کہتے تھے، اسی کو شریعت اور دینی حکم سمجھا جاتا تھا۔ جب تک فرعونوں میں زور رہا، مصری ان ہی کو زمین پر دیوتاؤں کا مظہر یا اوتار مانتے رہے۔ فرعون امن دیوتا کا براہ راست سگا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پوجا ہوتی تھی۔ جیتے جی بھی اور مرنے پر بھی فرعون کی اطاعت کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کی خوشنودی حاصل کرنا، اسی طرح فرض خیال کیا جاتا تھا جس طرح توحید والوں کے ہاں اللہ کی اطاعت کرنا اور خوشنودی حاصل کرنا فرض سمجھا جاتا ہے۔

مصری بت پرست تھے۔ بہت سے دیوتا پوجتے تھے۔ ہر شہر بلکہ ہر گاؤں کا دیوتا الگ تھا اور وہاں صرف اسی کو پوجا جاتا تھا۔ وہی آبادی کا بچانے والا مانا جاتا تھا۔ جب کوئی آدمی اپنے گاؤں یا شہر سے چلا جاتا تھا تو اپنے دیوتا کو بھی چھوڑ جاتا تھا اور نئی جگہ کے دیوتا کی پوجا کرنے لگتا تھا کیونکہ سمجھتا تھا کہ اب دوسرے دیوتا کی عملداری میں آ گیا ہے اور یہی دیوتا کام آ سکتا ہے۔

مصریوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ دیوتا ان کی طرف سے لڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ کے مصری زیادہ لڑائیاں جیت لیتے تھے، وہاں کا دیوتا زیادہ مشہور ہو جاتا تھا۔ تھیبس شہر کے شاہی خاندان نے مصر کو دوبارہ آزادی دلائی تھی اور بہت بڑی سلطنت کھڑی کر دی تھی، اس لیے تھیبس کا دیوتا۔ امن سب سے بڑا دیوتا مان لیا گیا تھا کیونکہ اس دیوتا جیسی فتوحات کسی اور دیوتا کو نصیب نہ ہو سکی تھیں۔ پھر امن، فرعون کا خاص دیوتا بھی تھا اور سگا باپ بھی تھا،

اس لیے مصر میں سب سے اونچا نام اسی کا ہو گیا اور ہر جگہ پوجا جانے لگا۔ اگرچہ مقامی دیوتا بھی اپنی اپنی گدی پر بیٹھے رہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مصریوں کے خیال میں آدمیوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی دھوکا دینا آسان تھا، اس خیال کی تفصیل تو ہم آگے چل کر دیں گے مگر صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خود اپنے معبودوں کو ایسا سمجھتی ہو اس کے اخلاق کا کیا حال ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے کہ مصر کے تمام باشندے برائیوں اور بدکاریوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ پرانے مصر میں اعلا اخلاق کی کمی تھی۔ لوگ اس بھروسے پر کہ مرنے کے بعد دیوتاؤں کو کسی نہ کسی طرح دھوکا دے کر سزا سے بچ جائیں گے۔ برائیوں میں پڑ جاتے تھے۔

مصری، مہنتوں اور فرعونوں کے احکامات پر چلتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ حکم ایک طرح کا اخلاقی ضابطہ یا قانون بن گئے تھے، جن کو اخلاقی مصنف اور معلم اپنی کتابوں میں لکھ کر قوم کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے کچھ کچھ ٹکڑے مل گئے ہیں مگر ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مصر کے باشندوں کا اخلاق اعلا نہ تھا۔

ایک مصری مصنف کا نام ''انی'' تھا، اس کا زمانہ معلوم نہیں ہوسکا لیکن بہت پرانے وقتوں میں تھا۔ بہت بوڑھا بھی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے مکالمے کی صورت میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے ان حصوں سے بھی جو آج تک باقی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی اخلاقی حالت اچھی نہ تھی۔

''انی'' اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے لکھتا ہے۔

''اس عورت سے ہشیار رہو جو اپنے گھر سے چوری چھپے نکل کر شہر میں ماری ماری پھرتی ہے۔ نہ اس عورت کا پیچھا کر نہ اس جیسی کسی اور عورت کا۔ ایسی عورتوں کا تجربہ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایسے سمندر میں جانے کا تجربہ کرے جس کی گہرائی کا حال کسی کو معلوم نہیں ہوا۔

''وہ عورت جس کا مرد گھر سے دور ہے، تجھے خط پر خط بھیجتی ہے اور روز اپنے پاس بلاتی ہے مگر اسی وقت جب اکیلی ہوتی ہے۔ خبردار! وہ تجھے اپنے جال میں پھانس لے گی۔ یاد رکھ، یہ ایک ایسا جرم ہے، جس کے کھلتے ہی موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ چاہے آدمی نے بے وقوفی کا کام نہ بھی کیا ہو اور یہ سزا اس لیے دی جاتی ہے کہ اکیلے میں ایسی ترغیب اور بوجھ کے ہوتے ہوئے آدمی ہر قسم کا گناہ اور جرم کرسکتا ہے۔''

''انی'' کی ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے مصر میں مکاری کا دور تھا، عورتوں میں بے حیائی بڑھی ہوئی تھی۔ مردوں کو خود بلاتی تھیں، ساتھ ہی یہ مصری قانون بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اکیلے گھر میں عورت سے ملنا چاہے کسی ارادے سے ہو، بہت بڑا جرم تھا اور اس جرم پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ یہ سخت قانون اسی لیے بنایا گیا ہوگا کہ ایسے جرم عام ہو چکے تھے۔ آگے چل کر بوڑھا ''انی'' اپنے بیٹے سے کہتا ہے۔

''شراب خانوں میں جھگڑا نہ کرنا ورنہ تجھے ان لفظوں میں برا کہا جائے گا جو بے ہوشی کی حالت میں تیرے منہ سے نکل جائیں گے۔ بہت نشہ ہو جائے گا تو گر پڑے گا۔ تیرے گھر والے بے سہارا ہو جائیں گے اور خود تجھے سنبھالنے کے لیے کوئی ہاتھ بھی نہ بڑھے گا۔ تیرے جانی دوست بھی جو تیرے ساتھ ہوں گے، چلا اٹھیں گے۔ ''نکالو اس بدبخت کو۔ یاد رکھ تو پیدا ہوا ہے، کچھ کام کرنے کے لیے مگر تو پایا گیا ہے لڑھکتا ہوا زمین پر ننھے بچوں کی طرح۔''

یہ نصیحت بھی ظاہر کرتی ہے کہ مصریوں کا اخلاق زیادہ اچھا نہ تھا۔ شراب خانوں میں بدمست ہو کر لڑتے تھے اور گہرے دوست بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔

ادارہ

خوب صورت جلد کے لیے

موسم سرما میں جلد کی حفاظت کیجیے

خشک موسم میں چہرے و ہاتھوں، پیروں کی جلد پھٹنا اور چھٹنا شروع ہوجاتی ہے۔ اگر سردیوں کے آغاز سے ہی اپنی جلد کی نگہداشت و حفاظت شروع کردیں تو جلد کی حالت اتنی خراب نہ ہونے پائے۔

ہم موسم سرما میں جلد کے پیدا ہونے والے مسائل اور ان سے نجات کا طریقہ بتا رہے ہیں۔

جس پر عمل کرکے آپ سردیوں میں نکھرا نکھرا اور تروتازہ سراپا پاسکتی ہیں۔

موئسچرائزر کا استعمال

خشک ہوا کے باعث جلد پر روکھا پن اور ناہمواری پیدا ہوجاتی ہے۔ اس سے نجات کا سب سے بہترین اور موثر طریقہ یہ ہے کہ جلد کی نمی کو برقرار رکھا جائے۔ ہر بار چہرہ یا ہاتھ منہ دھونے کے بعد جلد پر موئسچرائزر کریم یا لوشن ضرور اپلائی کریں۔ روزانہ رات کو سونے سے قبل اپنی روٹین میں شامل کرلیں کہ چاہے سردی ہو یا گرمی موئسچرائزر اپنے چہرے پر ضرور لگانا ہے۔ اس سے جھریاں و باریک واضح لکیریں بھی قبل از وقت نمودار نہیں ہوں گی۔ آپ قدرتی و گھریلو طریقے پہ عمل کرتے ہوئے گھر پر بھی موئسچرائزر تیار کرسکتی ہیں۔ کیلے، شہد، دودھ، دہی اور جئی کے آٹے سے تیار کردہ آمیزہ آپ کی جلد کو نرم و ملائم اور شاداب انداز عطا کرنے میں مدد فراہم کرسکتا ہے۔ گلیسرین ایک اعلا قسم کی موئسچرائزنگ ایجنٹ ہے۔ پانی اور گلیسرین کی برابر مقدار ایک بوتل میں بھر کر مکس کرلیں۔ اب آپ اس محلول کو اپنے ہاتھوں، پیروں اور چہرے کی جلد پر بطور موئسچرائزر استعمال کرسکتی ہیں۔

سردیوں میں نہانے کے بعد جلد مزید خشک ہوجاتی ہے۔ چنانچہ کوشش کریں روزانہ نہانے کے بجائے ہفتے میں دو یا تین دفعہ نہائیں، اگر نہانے کے پانی میں چند قطرے زیتون کے تیل یا بادام کے تیل کے ڈال دیے جائیں تو جلد غسل کرنے کے بعد خشکی کا شکار نہیں ہوگی۔

سردیوں میں بہت زیادہ گرم پانی سے نہانا بھی جلد کو نقصان پہنچاتا ہے۔ کوشش کریں نیم گرم پانی کا استعمال کریں اور بال تو قطعاً گرم پانی سے نہیں دھونے چاہئیں۔

جلد کی صفائی

دن بھر چہرے پر لگی دھول، مٹی، گردوغبار، ٹریفک کا دھواں وغیرہ چہرے کی جلد پر تہ کی صورت میں جم جاتے ہیں۔ خواتین رات کو سونے سے پہلے معیاری اور جلد کی ساخت سے مطابقت رکھتا ہوا کلینزر استعمال کریں۔ آپ گھر میں قدرتی اشیا کا استعمال کرکے بہترین قسم کا کلینزر تیار کرسکتی ہیں۔

دودھ ایک اعلا قدرتی کلینزر ہے۔ آپ دودھ کو ایک پیالی میں ڈال کر اس میں چند قطرے گلیسرین کے شامل کردیں۔ اور روئی اس مکسچر میں بھگو کر پورے چہرے پر لگائیں۔ آپ دیکھیں گی تمام میل روئی پر آجائے گا۔ تھوڑی دیر آپ اس کو چہرے پر لگا رہنے دیں، اس کے بعد چہرہ دھولیں۔

اس عمل کو روزانہ دہرانے سے آپ کی جلد شگفتہ و تروتازہ ہوجائے گی اور رنگت بھی کھل جائے گی۔